

رمضان مبارک

میری

سچی کہانیاں

July
2014

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسی شمارے میں

۱۔ اگر کوئی شخص اپنے دل سے اللہ کی تعریف کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ستر ہزار سال کی عمر عطا فرماتا ہے۔
 ۲۔ اگر کوئی شخص اپنے دل سے اللہ کی تعریف کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ستر ہزار سال کی عمر عطا فرماتا ہے۔
 ۳۔ اگر کوئی شخص اپنے دل سے اللہ کی تعریف کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ستر ہزار سال کی عمر عطا فرماتا ہے۔
 ۴۔ اگر کوئی شخص اپنے دل سے اللہ کی تعریف کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ستر ہزار سال کی عمر عطا فرماتا ہے۔
 ۵۔ اگر کوئی شخص اپنے دل سے اللہ کی تعریف کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ستر ہزار سال کی عمر عطا فرماتا ہے۔

احوال

10

مدیر

قارئین کے خطوط اور حال
احوال کا دلچسپ سلسلہ

کچھ اپنی باتیں

09

کائنات جوهان

اپنے قارئین سے مخاطب
مدیر کی ہتھ دلداریاں

زندگی روٹھ گئی

07

منیرہ سہام



کلموعی

48

عزال قریشی

ایک مرد کے چنگل سے آزاد
حاصل کرنے والی عورت کی کہانی

کسے لازم دوں؟

39

[[پنہ جونسو]]

اپنی ماں کے حکم کی ممانعت
ایک بیٹی کی ہجرت خیر کہانی

کوئی اپنا نہ رہا

31

منزل حسن

زمینداری نظام کے ختم
شکار عورت کی داستان

مرد

75

محمد مزیل

اضطراب سے پر ایک مرد کی
روح میں اترتی داستان عجب

اپنے ہی دام میں

63

صہبہ عثمانی لہان

موتی ماں کے کچھ گڑھے
میں گرے ہوئی بیٹی کی داستان

مہراں

60

کنہور وسیم

معاشے کے لہریں شکار ایک
عورت کی دکھ بھری داستان

حیات جاویداں

87

محمد علی سدھانی

ہشت گردی کا شکار ہونے
والے ایک سپاہی کی زندگی کہانی

سب جائز ہے

84

عبد العزیز عابد

دوست کی دوست میں گھڑی
ایک عورت کی محبت خیز کہانی

زخمیوں کا مداوا

80

محمد عابد ملے

گھر سے بھاگنے والی
عورت کی اہم ناک کہانی

میں کون ہوں؟

110

سدرہ انور علی

فقیر کی سے روپ میں چھپی
ایک مجرم عورت کی کہانی

آتش جنوں

92

سلیم فاروقی

چنان سا حوصلہ رکھنے والے
ایک نوجوان کی ہرگزشت

وہ باتیں تیری

90

عائشہ وسیم

کراچی سے اپنے نانا کی
یاد میں ایک محبت نامہ



فون: 34930470 - 34939823 - 021-021-34939823 آپریشنر اسامہ فی الدین عباسی سٹی پریس 7-OB-7 لاہور روڈ کراچی



146 **عشق آتش**
مصباح کاشف مغل

ایک نوجوان کی افشوں میں
ذہنی مسرت بھری کہانی

138 **کھلاڑی**
مصنوع احمد

ایک کھاندہ سے مرد کی
داستانِ ہجرت و سرگودھاسے

120 **ناگن**
اعجاز احمد نواب

ہزاروں سال کی تپسیا پر
پیدا زندگی کا ایک رنگ

176 **نظر کا دھوکا**
حنا بشیری

روحانی باپ کے گرو تھوٹی
ایک شعلہ سماں تحریر

158 **مکھنی**
الوند علی ارشد

خیال اور حقیقت کی قید سے
آزاد ایک عجوبہ لڑکی کی داستان

150 **تایا**
طلحہ احمد نجم

نحوہ تپ کی روح میں اترتی
داستانِ محب، گجرات سے

208 **مکافاتِ عمل**
ناضیم خان شمس

بھوس کے گدے اجازت ملے
مہبت سے مادی آپ کی کہانی

199 **تیرے انتظار میں**
مصباح احمد جانی

مسہ میں جل کر رہا ہوں نعلے
ایک خاندان کی داستانِ محب

186 **ہنوارا**
اسلم فرہانی

دل کی طرح عورت کا ہنوارا
بھی محسن نہیں، کون سے

224 **مسئلہ**
ادارہ

آپ کے مسائل کا حل
نئی کہانیاں کا ازوال سلسلہ

220 **ایک حقیقت ایک کہانی**
دانش و ادب سنٹر

مہبت کی پیاس میں سگتی روح کی
کہانی جوانی آگ میں جل گئی

215 **مقدر کی آگ**
عاصمہ الیاس

حاصل دل کے ظلم کی عمار
ایک بچی کی عبرت انگیز کہانی



238 **فیضِ عشق**
امجد حامد

عشق کے حوالوں کیسے عشق
میں ذہنی ایک خاص خاص کہانی

234 **خن آباد**
قاریس

شعرا کے کلام سے آباد
ایک خن فہم سلسلہ خاص

لاہور: لاہور پبلشرز، لاہور پاکستان 720 روپے، لاہور 165 روپے، لاہور 155 روپے، لاہور 155 روپے، لاہور 155 روپے، لاہور 155 روپے

معروف اخبارات میں شائع ہونے والے منظرہ سہام مرزا
کے کالمز پر مشتمل کتاب ”اُجلے حروف“ شائع ہو چکی ہے



ملکی و سیاسی مسائل، معاشرتی ناہمواریوں سے نبرد آزما آج کے دیگر گوں حالات
سے پردہ اٹھاتے منظرہ سہام مرزا کے بے باک قلم سے چشم کشا تحریریں
کتاب متلوانے کا پتا:

110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ - کراچی



”زندگی روٹھ گئی“

میرے شہر کراچی کو نجانے کس کی نظر لگ گئی، جہاں خوشیاں
 تھیں، روز گار تھا..... جس کی شامیں معطر تھیں۔ جہاں راتیں
 جاگتی تھیں۔ آج وہاں ہر سو خوف کا عالم ہے۔ زندگی سک رہی ہے۔
 موت ہاتھ پھیلائے ہر ذی روح پر اپنے پنجے گاڑ رہی ہے۔ ہر منظر
 دھواں دھواں ہے اور ہر جانب یارود کی آواز ہے۔ زندگی وہاں دے رہی
 ہے۔ جوان جو کبھی زندگی سے بھرپور تھے، آج سوختہ لاشوں میں
 تبدیل ہو رہے ہیں۔ ماں ماننے کو تیار ہی نہیں کہ یہ جلا ہوا پنجرہ اس
 کے لاڈ لے کا ہے۔ بچے باپ کو پہچاننے کے بجائے ڈر کر بلک
 بلک کر رو رہے ہیں۔ بہنیں اس ہاتھ کو تلاش کر رہی ہیں جو ان
 کے سر پر سایہ فلک تھا۔ بیوہ پتھرائی ہوئی آنکھیں لیے اپنے سیاہ
 بخت کو رو رہی ہے۔ میرے شہر کو کس کی نظر لگ گئی کہ زندگی ہی
 کھو گئی..... زندگی ہی روٹھ گئی۔

منزہ سہام

ہم نہیں بھولے.....



1932.....2002ء

یہ رنگ رنگ کہانی، یہ حرف حرف فسوں
تمہارے عزم کو ہم سب سلام کرتے ہیں



www.parksociety.com

سچی کہانیاں 9

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ آپ کے خطوط اور ان کے جواب

بہت پیارے ساتھیو!

ماہ جون پوری صحت کے ساتھ گزرا، جس اور تحش نے جہاں اور بہت سی چیزوں کو اپنی لیٹ میں لیا وہیں ہمارے روپے بھی اس کی لیٹ میں آئے بنانہ روپے۔ مسلسل کچھ لکھاری ایوارڈ کی ٹکرا کر تے نظر آ رہے ہیں۔ آپ ہمارے خود فرماہنے اور شہزادہ اور بچی کہانیاں کے لکھاریوں میں زمین آسمان کا فرق ہے بسبب کہ بچی کہانیاں کو رائٹر میکر پر چھپاتے ہیں۔ بچی کہانیاں کے رائٹرز میں مفتی کے چند ایک کو چھوڑ کر پوری کھپ آن رائٹرز پر انحصار کرتی ہے جن کی ہر کہانی پر لال قلم اپنے بھرپور نقش ثبت کر کے بچی کہانیاں کے صفحات کی زینت بناتا ہے۔ ساتھیو! سوچئے اور پھر اپنے دل سے پوچھیے، یہ شور و غوغا کیا ہے!!

لکھنے ایک طویل عرصے بعد ہماری بہت سی ادبی لکھاری ساتھی قارئین شہزادہ، المعروف نانی پٹوار سے احوال میں شریک ہیں، لکھتی ہیں پیارے بیٹے کاشی چوپان! خوش رہو آہا اور ہوا میں اور اسب پیچھے نہو مجھے آگے آنے دو، ارے جگہ خالی کرو۔ تم سب کیا سمجھتے تھے؟ کہ یہ نالی خدا نخواستہ دنیا سے چلی گئی ہے کہ جو جس کا دل چاہا وہ کر رہا ہے۔ ارے میں کچھ عرصہ کے لیے صاحب فراش تھی کچھ مصروفیت ایسی تھی کہ رابھت ہو گا، مگر اب اللہ کے حکم سے آپ کے سروں پر آفت کی پرکاشہ آگئی ہے۔ ارے اتنا ظلم، اتنی اندھیر گھری کہ مجھے کھٹہ شہزادہ بنا لیا اور ظلم بالائے ظلم کہ پٹیشن بلوچستان سے بہت جبرائی کی بات ہے کہ میری بار بار وضاحت کے باوجود خلا سائل نام اور مقام لکھا۔ مجھ بوزی ہڈیوں نے آدمی آدمی رات کو لیٹ کر بھی چندہ 15، 15 لکھ کر دیے اور پھر پھر رات بھر کر لیا اور مونا مونا کر کے لکھ قارئین شہزادہ المعروف نانی پٹوار نے اس نتیجے والے بابائی نویر سے تے کیا دشمنی ہے؟ یہ کون پڑھتا ہے؟ نتیجہ وغیرہ ذرا اس کا نام اور مقام مجھے بتاؤ پھر دیکھو کیا کرتی ہوں؟؟ ایسا کاواہم کرواؤں گی کہ۔ بابا بابا۔ چلو جی یہ تو ہو گئی گب شب۔ اب آتے ہیں اپنے دوسالے کی طرف۔۔۔ سب سے پہلے منہ جی "موتا" پڑھا۔ تاکن پڑھی، ادھی جاری ہے مگر کہانی سے زبانی مجھے اندھین مووی لگ رہی ہے، فرق اتنا ہے کہ وہ دیکھتے ہیں یہ پڑھ رہے ہیں اور دوسری بات کہ بہت سی مکمل ڈلی کہانی ہے۔ مکمل 5، 6 ماہ سے نہیں پڑھ رہی سب انگٹھی پڑھوں گی۔ "کچھ اپنی باتیں" پڑھ کر بے اختیار آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ حالہ روح میں تو کوئی نہیں آتری بلکہ مجھے تو سخت غصہ آیا کہ ایک عورت (وہ بھی اپنے ہی محلے کی کس قدر آسانی سے ٹوہنا کر چلی گئی، کیا مرد اتنا سیدھا، اتنا بے وقوف ہوتا ہے؟؟ آج کل کی تو عورت اتنی سیدھی نہیں گجا کہ مرد۔۔۔ میں اب انتظار ہی کر رہے اپنے بچے کا۔ اس کو کہاں چھپائے گا اور پھر کیا ڈراما کھیلے گا۔ خادوار ہے زندگی میں سب سے بڑا تصور ماں اور باپ کا ہے۔ اتمام مجھے تو بالکل پسند نہیں آتی۔ خواہشوں کا اسیر میں نہ رہتی، امر ربی میں سمجھ یہ نہیں آتی کہ جب امر کے خاندان کا انتقال ہوا تو اس کے ماں باپ کہاں تھے۔ "مردم بچیاں" اس ٹھیک تھی، کیا کہوں؟ کہاں آ کے لے گا وہاں، بسکی ایک چینی مراد تھی۔ کیوں کہ پوری کہانی پڑھنے کے بعد پہلا خیال یہی میرے ذہن میں آیا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ محبت کا اظہار نہ ہوا اور

خود بخشی کر لی۔ بیٹیاں بھی جلتی ہیں، اپنا بویا کٹا رہی ہوں، اور حوری محبت، اچھی کہانیاں تھیں۔ سب سے زبردست جنت نظیر میرا کشمیر تھی۔ ویل ڈن، ہٹ صاحب۔ تبصرہ تو مکمل ہوا جتنا رسالہ پڑھا تھا تبصرہ لکھ دیا، اپنا انداز ہی کے ساتھ اب آپ کا حسن سلوک ہے کہ کیا کرتے ہیں؟ نام بھی کچھ لکھتے ہیں یا...؟؟ سب کو سلام، اگر زندگی رہی تو انشا اللہ اب کہانی کے ساتھ حاضر ہوں گی، والسلام۔

ہلا پیاری ڈائی جان! کیسی ہیں آپ۔ آپ کا تبصرہ۔۔۔ اور آخر آ گیا۔ احوال پوچھا ہوا شیار پاش! پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ اتنا عرصہ غیر حاضر رہنے پر قارئین سے قطعہ بننا۔۔۔ میرا خیال ہے اب آپ غیر حاضر نہ ہوں گی۔



جن دوستوں نے دعاؤں کے پھول دیے ان کی بے حد شکر گزار ہوں۔ جون کا گئی کہانیاں ملا۔ ماڈل کھل ملی سے سہارو دق بہت پسند آیا۔ منورہ آنٹی کا (اداریہ) ممتاز، ماں تو جنت ہوئی ہے۔ لیکن سبھی انہیں ایک جیسی بھی نہیں ہوتیں۔ احوال میں تمام خطوط پسند آئے، ملکہ احوال حسین جو نیچو کا خط ایسے لگا جیسے آسمان کے ستاروں میں چمکتا ہوا چاند ہو۔ رانا محمد شاہد بھیا آپ کا

اندازہ بالکل درست ہے میں کھیل سے دلہستہ تھی نہیں بلکہ ہوں۔ میرا دھیان اٹلڈی سے لہا ہوا اسپورٹس پر ہوتا ہے، سائیکل ریس، کرکٹ، باسکٹ بال یہ میرے فہرست ہیں لیکن اللہ کا شکر ہے میں آج تک کبھی ٹیل نہیں ہوئی، ویسے آپ کی بات ہے رانا بھیا کہ آپ نے لڈو کھا تو لیا لیکن اس کا ذائقہ معلوم نہیں ہوا کھل ہے بھئی۔ ممتاز احمد بھیا 26 جولائی زریں جرنیچہ آپ 8 جولائی۔ Happy Birth Day To You زندگی کی بہت ساری خوشیاں اللہ آپ پر بھجوا کرے آمین۔ اسے ویلو ایوری باؤی آر یو ریڈی؟ کیوں کہ اب ہونے لگا ہے تبصرہ۔ حال، عورت سے بڑھ کر کوئی مکار نہیں دنیا میں کرن شمیر کی خواہشات نام آسودہ، مریم بخاری شاہ کی ایک ہی راستہ، ام منال کی خارزار سے زندگی، کشمیر شہزاد کی خواہشوں کا اسیر، سویرا فلک کی بھرم نوٹ کیا، نظام مصطفیٰ کی امر رباب، الاغرازی کی مصمص پچیاں، انیسہ فضل کی شریک سفر یہ تمام سبق آموز تحریریں بہت پسند آئیں۔ آئی جنوں، شہرے کی جان بہت دلچسپ موڈ پر ہے۔ ناگن اعجاز احمد نواب کی اس کہانی سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے، لیکن پھر بھی پڑھتی ہوں، زندگی میں رسک نہ لیا تو کیا کیا؟ شائستہ کی سلوٹی، ایم اشفاق بٹ کی کہانی آکے لئے کارواں، نسیم حور کی اور حوری، عادل حسین بھیا کی بیٹی بھی جلتی ہے وغیرہ بہت پسند آئیں۔ نجن آباد میں تمام لوگوں کی شاعری پسند آئی، میری طرف سے تمام اہلیان گئی کہانیاں کورمتوں، مفقوتوں اور برکتوں والا ماہ رمضان مبارک ہو۔ اب اجازت دیں جب بھی ہاتھ دعا کے لیے اٹھیں اپنی اس بیٹی، بہن، دوست کو ضرور یاد رکھیے گا۔ سب لوگ اپنا خیال رکھیے گا زندگی رہی تو اچھے ماہیوں کے متب تک کے لیے اللہ نگہبان۔

ہلا سسر سسر و اتھارا ہوش و خروش سے کیا گیا تبصرہ تمہاری طبیعت کی جانب سے اطمینان والا گیا۔ خدا تمہیں صحت دے۔ آمین۔ تبصرہ اچھا لگا تمہارا بطور خاص ٹیلی سیائی سے لکھتا ہوں بہت بھلا۔



عادل حسین، کراچی سے شامل احوال ہیں کھتے ہیں عمارے کاشی بی! السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے، درخشاں آنٹی اور منورہ آنٹی کو بھی سلام اور دعائیں، جون کا گئی کہانیاں اپنی دراتی اب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا، منورہ آنٹی کا محتاجہ کرآ خرمیں ہم بھی دعا میں شامل ہو گئے۔ کاشی بی آپ کی اپنی باتیں ہمیشہ ہی کی طرح دل کو تھیں۔ احوال میں شامل ہو کر ہمیشہ ہی دل پارغ ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی محبت اور جذبات قتل دید ہوتے ہیں۔ باتوں میں سچائی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ اللہ اس مفضل اور اس کے لوگوں کو ہمیشہ صحت و سلامتی کے ساتھ خوش و خرم رکھے۔ اب اگر ہو جائے جی بیابوں کا۔ عزالہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ لوگ اپنے مقصد کے لیے کس حد تک گر جاتے ہیں۔ اندازیاں بھی خوب تھا۔ خواہشات نام آسودہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ مریم شاہ بخاری کی ایک ہی راستہ۔ ام

مذاہل حسین! آپ کی بات چاہی کہ میں بہت اچھی لگتی ہے، اس میں ہے کہ میں نے آئے۔

43 افراد نے شرکت کی، ان میں سے ڈاکٹر مظہر احمد عاجز، مہر شاہد حسین، علامہ رسول گل، ندیم بھٹی، ممتاز احمد، منشی محمد عزیز، ایم اشفاق بیٹ، احمد زمان خان، حاکم علی، بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری تقریر کو پسند کیا۔ علامہ م۔ ص انجمن کی خواہشات: آسودہ گردن بشیر کی یادیں پریاں، فقیل احمد امدانی کی خواہشوں کا اسیر، گلگیر شہزاد کی بھرپور ٹوٹ گیا سویرا، فلک کی اسرارہلی، عام مصطفیٰ خان کی، معصومہ چیمپیاں، طاہرہ زکی، کہاں آسکے لئے کارواں، اور صوری محبت شیم عمر کی، نصیب کی بادش محمود آکاش کی، پسند اپنی اپنی عابد حسین کی اور امانت نصرت سرفراز کی بے حد پسند آئی۔ سخن آباد میں ڈاکٹر شاہ محمد حمیرائی، عادل حسین، اسلم جاوید، شائستہ بٹال کی شاعری پسند آئی، مہر شاہد حسین آپ کی شاعری اچھی لگی۔ ڈاکٹر مظہر احمد کی شاعری نے محفل کوٹلی سخن آباد کی جان ڈاکٹر مظہر احمد کی شاعری تھی۔

☆ مسز نوید بانگی صاحبہ احوال میں آپ کی آمد انجمنی تھی، امید ہے آپ کی احوال میں شرکت میں مانع نہیں آئے گا۔

ہم نے احوال میں یہ آدھ ہے ہماری نئی قاری اور نگار ساجھی ساجھی ٹھیکر صاحبہ کی ہر گواہات بہت محبت سے مخاطب ہیں۔ جون کے گرم ترین مہینے میں ٹھنڈک کا احساس ہے "پگنی کہانیاں" چمکے سے آن پہنچا زندگی حسین ہے ہر ورق کو دیکھ کر اندازہ ہوا تو کیوں نہ تھی لیا جائے اور پگنی کہانیاں کو بغور پڑھ لیا جائے، منظرہ صاحبہ کی کھری پا قیس رسالے کے حسن میں ہمیشہ سے اضافہ کرتی آتی ہیں۔ کاشی چوہان صاحب نے جس انداز سے گلہری کی زندگی اور انسانی زندگی کی ضروریات لکھی ہیں، ابھی او خوب مشاہدہ ہے۔ چمکتا و ٹھنڈا احوال، انہوں سے نئی محفل، بہت خوب، عبدالعزیز صاحب

خوش خبری

میرے قریب دوست اور نگہاری ساتھیو! جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ ماہنامہ نئی کہانیاں قاری اور نگہاری کے لیے ایسا بڑا دل عزیز پرچہ ہے جس میں ان کے دل کی عرضیاں اور دین کی سچائیاں اس حدت پذیر ہوئی ہیں اور قلمی اور پڑھنے والوں کے دلوں کی تسکین کا سبب بنتی ہیں۔ اس بات سے انکار تو ناممکن ہے کہ نئی کہانیاں نگہاریوں کے لیے حوصلہ افزا پرچہ ہے کہ جس میں بدست بدتر تحریر بھی سچا سنوار کر پڑھنے کی زینت بنادی جاتی ہے۔ نئی کہانیوں کو یہ اعزاز بھی نئی کہانیاں کو حاصل ہے کہ اس نے بے شمار لوگوں کو گوشہ نشین نامی سے نکال کر میدان ناموری میں لاکھڑا کیا ہے اور آج وہ صفت اول کے نگہاری کہلاتے ہیں۔ یہ سلسلہ تاحل جاری ہے۔ نئی کہانیاں کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے نگہاریوں اور قارئین کی حوصلہ افزائی کے لیے کوئی نہ کوئی سلسلہ جاری کرتا رہتا ہے۔ اب نئی کہانیاں کی جانب سے آپ تمام لوگوں کو یہ خوش خبری دی جاتی ہے کہ ادارہ کی جانب سے لوگوں کے بے حد اصرار پر دوبارہ سے انعامی سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے، جس میں پہلی کہانی کو 1500 روپے، دوسری کہانی کو ایک ہزار اور تیسرے نمبر پر آنے والی کہانی کو 700 روپے دیے جائیں گے۔ لیکن اس کے لیے ادارہ نے ایک کوچن پالیسی وضع کی ہے، جس کے تحت کہانی چھپانے کے لیے کوچن منسلک کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح جس کہانی کے لیے قارئین اپنی آراء اور پسندیدگی کے ساتھ سب سے زیادہ کوچن بھیجیں گے، وہ کہانی پہلے انعام کی مستحق ٹھہرے گی۔ اسی طرح آپ کو احوال میں اپنے خطوط چھپانے کے لیے بھی خط کے ساتھ کوچن بھیجنا لازمی ہوگا۔ یاد رکھیے ایسی کوئی کہانی یا خط ہرگز برقرار نہیں رہتا جس کے ساتھ کوچن منسلک نہ ہوگا اور وہی کہانیاں انعام کی حق دار ہوں گی جن پر کوچن کے ذریعے پسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے قاری اور نگہاری حضرات اس ضابطہ کو ضرور اپنائیں گے اور اس سلسلے کو مزید آگے بڑھانے میں تعاون کریں گے۔

نے میرے خط کی تعریف کی بہت شکر ہے۔ بس جی زرا مستحید ہو جائیں چلتے ہیں لوگوں کے ذہنوں کی طرف میرا مطلب کہانیوں کی طرف۔ طالع اب اس صلیب کی کہانی تو نمیک تھی، عورت ایسی چالاک بھی ہو سکتی ہے حیرت ہے اور مرد ہمیشہ کا بے وقار، دوسری شادی کے لیے بد وقت تھا۔ خواہشات آسودہ کرن شیر صاحب کی اچھی کوشش ہے مریم شاہ بخاری کی ایک ہی راستہ خارزار ہے زندگی نامہ ناموں کی انتہام محمد اسلم آزاد کی لائق و شوق سے ہم نے کہانی پڑھنا اشارت کی مگر اگلے ہی صفحے پر انتہام۔۔۔ بحر مہر لوت گیا سویرا الف و یے ایک بات کہوں میرا نہیں خیال کہ بیوی کو زبان چلانے پر کس جائز ہے۔ یہ کوئی بہت تسکین دہم نہیں جہاں پیار ہو دباں ایسی باتیں ہوئی جایا کرتی ہیں، کہاں آکے لئے کارواں ایمہ اشفاق بٹ کی کھسی تحریر اچھی تھی۔ اب چلتے ہیں سخن آباد کی طرف کی جہاں ایک زبردست قسم کی محفل بھی ہے تہذیبی صاحب غزل کہہ کر نمبر لے گئے بھی داد، پر بھیجے عادل حسین بھی نہیں رہے، عمران لائق صاحب خوب پڑھتے ہیں، رحمان آفاق کی غزل اچھی تھی۔ قارئین کو رمضان کی برکتیں اور فضیلتیں مبارک اللہ حافظ



احوال پر چھا گیا۔
 ڈی آئی خان سے یہ آہ ہے ایم بے قرینگی کی۔ قلمی ہیں اسلام علیکم، سب سے پہلے میری طرف سے تمام پاکستانیوں نئی کہانیاں فریڈر زماٹلاف نئی کہانیاں اور محمود یہ عربیہ میں تقیم میرے کزنز کو ماہ رمضان کا مقدس ماہ بہت بہت مبارک ہو۔ 31-05-2014 بروز بدست سخت گرمی کا دن تھا۔ میں 4 بجے آفس سے نکلا، پسینے میں شرابور نیوز انجمنی پر کا تو ماہنامہ

گئی کہانیاں پر نظر پڑی جو سب سے منفرد بننا مسکرا کر ہزاروں رنگ بکھیرتا اپنے چاہنے والوں کی راہ و کھوار ہاتھ۔ ٹائٹل دیکھا بہت پسند آیا، مگر کسی گہری سوچ میں نہ رہی ہوئی رکھائی دی۔ منز و سہام کی ممتا سے لے کر امتیاز حسین ملک کی سنگ ملامت تک سب کی سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ بہت پسند آئیں۔ اپنا غلط پڑھنے سے پہلے آپ کا محبت بھرا جواب پڑھا، آپ کو میری تحریر پسند آئی، بہت بہت شکریہ۔ سخن آیا عادل حسین، ثمینہ ناز، آصف ریاض، شاہد فراز کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ ہائی دوستوں نے اچھا لکھا۔ گئی کہانیاں ہمارا اپنا چہ ہے۔ گئی کہانیاں کی ترقی ہماری ترقی ہے اللہ تعالیٰ گئی کہانیاں کو اور بہت زیادہ ترقی دے آئیں۔ میری والدہ محترمہ عرصہ 5 ماہ سے سخت بیمار ہیں۔ کاشی بھائی۔ اسٹاف گئی کہانیاں اور دوستوں سے انتہا سے ہے کہ میری والدہ کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔

پڑا آپ کی والدہ کو خدہ اشفاقے بھی ملتا کرے۔ پرچہ پسند کرنے کا شکریہ۔

جھیل منجھلو ایک عرصے بعد احوال میں رقم طراز ہیں محترم کاشی روحانی نمبر سچے سچے رومن کو تپو



کیا دوسرے وقت سے لے کر آخری وقت تک بہت ہی مین پسند رہا۔ مبارک ہو ایسے اچھے نمبر کے لیے کہانیاں ایک سے ایک تھیں۔ جلوہ جنوں، جاوید راہی کی بہت سی اچھی لگی، پھر نانا والی مرکار، نور کا ہالہ، کاپٹن یہ کہانیاں مجھے بہترین لگیں۔ ایسے سب کہانیاں بہت اچھی ہیں میری بھائی رقی اللہ وی کی مثال سورج کے سامنے نہ رہا چھرا۔ آپ کا شکریہ مجھے موقع تو دے رہے ہیں۔ وہ سہو پہنچے پسند آئی اور آتش جنوں تو میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں بہت اچھی لگتی ہے۔ سخن آباد میں عبدالعزیز جی، آفرورڈ سے رچوڑی کا کھڑا، حکیم خان کی شاعری پسند آتی۔ سب سلیس تو خوب ہیں پتہ عزم میں اسٹریٹ چاندنی، مثنوی تعریف کی جائے لم ہے۔ آپ کا کالم اپنی بات سمجھنے کو مجبور کرتا ہے اللہ ہر آزمائش سے محفوظ رکھے۔ بہت اچھی لکھائی گئی آپ کی آمد نے ہمیں خوشی سے ہلکا کر دیا۔ کیا یہ خوشی ہمیں ہر ماہ حاصل نہیں ہوگی؟؟



غلام رسول گل۔ جبکہ آپا سے لکھتے ہیں کاشی جو بان بھیا امید ہے آپ خیریت سے ہوں 30 مئی کو 2 بجے آگس میں ڈاک ہاؤس لگانے میں بند گئی کہانیاں میرے ہاتھوں میں تھیں۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے اسے غانے کی قید سے آزاد کر دیا اور احوال کی جانب لمبی پھوٹ لگائی۔ میرے قدم صفحہ 15 پر روک گئے۔ بے حد شکر۔ مور شاہد حسین خدا آپ کو سدا خوش رکھے اور تمام کام پھول سے نوازے آئیں۔ سدرہ انور علی ظہر پسند کرنے کا شکریہ اب آپ کی طبیعت یہی ہے دعا گو ہوں وقت ملے ایڈ و صاحب خدا کے کرم سے ہم ٹھیک ہیں آپ سنا میں محفل میں خوب رہتی تھی مگر چھوٹے بھائی غلام حسین، شاہد فراز، چاہید علی، ذریہ جو نیو کی محسوس ہوئی۔ اسٹائل بروہی بھائی ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ حسین جو نیو، عہد عزیز جی، آرا، محمد شاہد، مستزاد احمد امجد علی، شفقت حسین، مثنوی محمد عزیز کی خدمت میں سلام دعا میں۔ سخن آباد میں تمام غزلیں اور نظمیں اچھی تھیں۔ مور شاہد حسین آپ کی نظم اے جان، خوب رہی سدا خوش رہو۔ کاشی بھیا آپ نے کوئی تحریر لکھنے کا حکم دیا۔ کیا کریں یا حکم ہی نہیں ملتا۔

بڑا غلام رسول بھائی! جس طرح تم احوال میں آمد کے لیے وقت نکالتے ہو اسی طرح تحریر کے لیے بھی وقت نکال سکتے ہو بھائی۔

بڑا احوال میں یہ ہیں غلام حسین جبکہ آباد سے لکھتے ہیں، جون کا تازہ شمار میرے ہاتھوں میں ہے ٹائٹل اچھا ہے، محفل احوال خوب صورتی سے لگی ہوئی تھی، بس کی تھی تو اپن کی۔ یقین کریں جب جون کا تازہ شمار ملا تو میں نے ایک دم محفل احوال میں قدم رکھا صفحہ 10 سے خود کو تلاش کرتے کرتے صفحہ 29 پر پہنچا کہ میرا تو نہیں نام دیکھا ہی نہیں تھا کی اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں، لکھتے ارمانوں سے میں نے غلط تحریر کر کے پوسٹ کیا تھا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ انہوں سے کیا



شکوہ لکھ کریں۔ اب ملتے ہیں تازہ شمار سے کی طرف منورہ سہام تھی کی "ممتا" خوب صورت سبق تھا۔ آپ کی کچھ اپنی باتیں کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ مریم شاہ کی ایک نئی راستہ، نصرت سرلرازی کی امانت، عروہ بہ عذراں کی جنت نظیر میرا کشمیر بے مثال تحریریں تھیں۔ نصیب فضل شریک سفر، شاز یہ گل بکھرا موتی چمن لیا، سویرا گلک بھرم نوٹ گیا۔ خوب صورتی سے بیان کی گئیں۔ مصروفیات کے باعث باقی شمارہ زیر ملاحظہ ہے اب اجازت اس شعر کے ساتھ۔

نہ دینا خط انہیں قاصد میں اتنا ان سے کہہ دینا

جنہیں تم بھول بیٹھے ہو وہ تم کو یاد کرتے ہیں

نہارے دادا سائیں اتھرو زبردست ہے۔ خط انہیں موصول نہیں ہوا اور نہ ضرور شامل احوال ہوگا۔



۱۵:۰۰ میرا اللہ یار، بلوچستان سے ساحل ابڑو رقم طراز ہیں۔ آج 4 جون کا تازہ

شمارہ پکی کہانیاں قریبی یک اسٹور سے خریدا۔ کچھ اپنی باتیں پڑھ کر یہاں کچھ کی محسوس ہوئی جس کی وجہ سے ذاتی صفحہ، جی کاشی بگٹی بکھرا اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ تخلیق کرتے رہے۔ احوال بھی اچھا سلسلہ ہے جہاں رائٹر اور پڑستاروں سے خوب سبب شب ہوتی رہتی ہے۔ احوال میں تصویر کا جو سلسلہ آپ نے شروع کیا ہے، تھینا مجھے بہت

اچھا لگا۔ کم سے کم رائٹر ایک دوسرے کو پہچان تو سکیں گے، اس طرح بزرگ اور نو جوان کی عزت تو آ جائے گی ہمارے دلوں میں۔ ایم اسلم آزاد صاحب آپ کی کہانی "اشفاق" مجھے بہت اچھی لگی۔ آپ نے جو بھی تخلیق کی عورت کے حقوق پر کی، عورت کی اہمیت کیا ہے، اس کو اجاگر کیا۔ کلیل احمد احمدانی کی پانچ پریاں، سویرا اللک کی بھرم نوٹ گیا، مالا فراز کی معصوم بچیاں، ایم اشفاق بیٹ کی کہانیاں آتے۔ لے کارواں، نسیم عمر کی اور صوری محبت دل میں بھاگتی، کیوں کہ میں ان کا لکھن ہوں۔ نصرت سرلرازی کی امانت اور تمام رائٹرز کی کہانیاں بھی بہت ٹاپ پر تھیں۔ سلیم انکھل آپ کہاں ہیں پلیز پکی کہانیاں میں لوٹ آئیں، آپ کے بطور پکی کہانیاں سونا سونا لگتا ہے، باقی تمام سلسلے اچھے چل رہے ہیں۔

۱۶:۰۰ ساحل! آپ کی آمد نے ہمیں خوشی دی۔ تمہرے بہتر ہے مگر مکمل کیوں نہیں؟ اس کے علاوہ تمہارے ملاتے ہیں پرچے کی سرکوشش کم کیوں ہے ماس پر بھی توجہ دیں، افکاری بکھاری کا رشتہ پرچے کی مضبوط ترسیل سے ہی مضبوط تر ہوگا۔



۱۷:۰۰ احمد علی احوال میں جزل آباد سے شریک ہیں۔ لکھتے ہیں مدیر اعلیٰ منورہ سہام اور مدیر کاشی چو بان پکی کہانیاں السلام علیکم امید ہے عزرائج گرامی بخیر ہوں گے۔ 29 مئی کو یک اسٹال پر پکی کہانیاں کا دیدار ہوا۔ اس بار سردرقی بہت پسند آئی۔ محفل احوال میں اپنا مختصر ملاحظہ دیکھ کر دل بہت خوش ہوا کہ کم از کم مختصری جگہ پر ہی کسی میں ہوں تو اور یہ اپنے ہونے کا احساس آپ کی محبت اور خلوص ہے۔ ظفر علی

۱۸:۰۰ ہم خیریت سے ہیں جناب دعاؤں میں یاد رکھا کرو۔ مور شاہ حسین آپ کی نظم اچھی تھی، تمام رسول گل نے بھی بھلا دیا ہے۔ ممتا اور کچھ اپنی باتیں، دل کی آنکھ سے پڑھیں۔ مناسبتی، آتش جنوں، تانمن پسندیدہ سلسلے ہیں۔ نصیب کی بارش، جی بھی جلتی ہے اپنا بویا کاٹے رہی ہوں، پسند اپنی اپنی امانت، بکھرا موتی چمن لیا، بہت پسند آئی۔ جنت نظیر میرا کشمیر، ایک ہی راستہ، پانچ پریاں، امر ربی، اور صوری محبت، سلونی، اچھی تھیں۔ سنگ ملامت، کہاں آ کے لے کارواں، شریک سفر، خواہشوں کا اسیر، حلال، خواہشات نا آسودہ زبردست تھی۔ معصوم بچیاں، خارزار ہے زندگی، بھرم نوٹ گیا بھی پسند آئیں، جن آباد میں سب کے کلام عمدہ تھے۔ غزلیں اور نظمیں بے حد پسند آئی۔

۱۹:۰۰ احمد علی! تمہارے مختصر فط میں چھپی بہت اسیر کر دینے والی محبت کا شکریہ۔



شفقت حسین۔ حسب چوٹی سے عرض گزار ہیں، ہندو۔ گئی کہانیاں ماہ جون شامہ راکش کے ساتھ شامہ بھی نہایت ہی شاداد تھا۔ منورہ سہام کا دور یہ اور پنچ اپنی باتیں نا جواب ہے۔ احوال میں ہر ماہ جگہ دینے پر میں نوش۔ شاہ فرار اور شامہ حسین بھائی نمن آباد میں آباد تھے خوشی۔ مئی کامیابی کی دعائیں۔ شامہ رسول گل، احمد علی، حسین جو نیچو، غلام حسین، عبدالعزیز، جی، آسدرہ نور علی، محمد عزیز مئے کیسے ہیں آپ؟ کہانیوں کی ابتدا سلسلے وار تاثر سے کی پر سلیم فاروقی آتش زبوں بہت دلچسپ پڑھنے کو دے رہے ہیں۔ لوشدنی اور شدنی کے بے حد پسند ہے۔ اعجاز احمد نواب، ناگن اچھی ہے۔ سویرا فلف کی خواہشوں کا اسیر رہا بد حسین کی پسند اپنی اپنی عادل حسین کی بیٹی مکی جلتی ہے۔ بے حد اچھی تھیں۔ امر ربی غلام مصطفیٰ، امانت نصرت سر فرار، اوصدنی محبت، نسیم تحریر بے حد پسند آئیں باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں اب اجازت۔

ناگن اعجاز احمد نواب آپ کی احوال میں شرکت ہمیں خوش دیتی ہے۔ خوش رہو۔

دست کراچی سے مومنہ بھول احوال میں شریہ ہیں۔ لکھتی ہیں پیارے کاشی آپ کا روحانی فیہر لیا بہت پاکیزہ اور خوب صورت سہاروق دینے پر شریہ کہہ اپنی باتوں میں آپ کا تجزیہ پڑھا۔ بخدا امانت اللہ سہی مگر بھی لکھی یہ کیفیت طبیعت پر ضرور گراں گزرتی ہے احوال میں بھی دوستوں سے ملاقات رہی تمام روحانی کہانیاں بے حد اچھی تھیں، مکی جگہ ایمان تازہ اور یقین مستحکم ہوا ایسی کاوش آپ کو ہام عروج پر لے جائیں گی۔ حسن اتفاق اک چھوٹا سا سچا واقعہ پھر مجھے درپیش ہوا جسے میں نے کرو اور میں ڈھال کرا لسان کی شکل دے دی ہے اور یہ موضوع اور رمضان کے مین مطابق ہے، لہذا آپ اسے رمضان کے شمارے میں ضرور شائع کر دیجیے گا میں انتظار کروں گی تا امید نہیں کرنا اور ہاں یہ محض اتفاق ہے کہیں آپ اس دوسری کاوش کو میری جتنی اختراع سمجھ لیں ایسا ہرگز نہیں۔ کہانی کا اصل کردار میرے ساتھ ہی موجود ہے۔

بہت بہت اچھی بہن مومنہ بھول، آپ کی کہانی صرف صفات کی لکھی کے باعث شامل اشاعت نہ ہو سکی۔ باقی آپ کی کہانی انشاء اللہ جلد شائع ہوگی۔

انٹرفیسر فضل صاحبہ کراچی سے شامل احوال ہیں، لکھتی ہیں عزیز بھئی کاشی خوش رہو امید ہے تمام اشاف منورہ بیٹی اور بھائی رفسانہ سہام مرزا کے بخیر و عافیت ہوں گے لا اللہ تبارک و تعالیٰ سب کو صحت و سلامتی عطا فرمائے آمین اب

آتے ہیں کہانیوں کی طرف ویڈیو کاشی بیٹا ویڈیو۔ کیا بات ہے روحانی لہری جتنی بھی قریب کر رہا کم ہے کہانی کی کہانی نے مجھے تو مسرور کر کے رکھ دیا۔ جلوہ جنتوں۔ پڑوسی گل رہنا، توکان اولی سرکار مرزا محمد، ازہر دست، شان مولانا، صدف آصف، رتی اللہ والی انجیل مقاد۔ نور کا بانہ، اندا باغی، سہیزب کنول عمران، مرشد کی دعا، نسیم سیکندہ صدف، یقین کامل، تنویر خالد بھروسے، نبولی الماسی، فاطمہ ارمان اور کاکیا پلٹ مسز نوید ہاشمی اعجاز احمد نواب پر وزیر احمد بہت پسند آئیں۔

ناگن اعجاز احمد نواب۔ نسیم کہو ہے جہاں یہ بھی ایک زبردست تحریر ہے مجموعی طور پر روحانی لہری نے ولی سکون پہنچایا مجھے نور و حلالی اور پر اسرار کہانیاں بہت پسند ہیں۔ سب احوالوں اور تمام اشاف کو دعائیں سلام و بخیر۔

ناگن انجلی بی، اللہ آپ کو صحت اور لکھی لکھو دے تبصرہ آپ کا اچھا لگا۔ لگے نا، آپ کا تبصرہ ہمیں ضرور ملنا چاہیے۔

ناہیاہ لہور سے یہ احوال میں آمد ہے فیض رسول صاحب کی لکھتے ہیں جون کا شمار مکمل ہی ملا ہے میں نے یہ اچھی پورا نہیں پڑھا سوچا پہلے خط تحریر کروں کہیں تاخیر نہ ہو جائے۔ دراصل ہمارے یہاں لاہور گرین ٹاؤن میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ گئی کہانیاں وقت پر نہیں ملتا جس کی شکایت آپ سے پہلے بھی پچھلے دو شماروں میں کر چکے ہیں۔ اس کے باوجود بھی شامہ کافی لپٹ مٹا ہے۔ سب سے پہلے احوال پڑھا حرا آ یا مگر شاہ فرار اور غلام حسین کی کمی محسوس ہوئی۔ اور شاہ حسین آپ کہانی کب پڑھنے کو دے رہے ہیں۔ میں خاص کر کے آپ کی کہانیاں پڑھتا ہوں سدا خوش



رہو۔ باقی احوال میں تمام احوالی بہن بھائی دوستوں کو فیض رسول کی طرف سے سلام۔ خازن زر سے زندگی حلال، ایک نئی راستہ، سنگ دامت بہت پسند آئیں۔ کہاں آ کے لئے کاروبار، خواہشات کا آسودہ بھی اچھی تھیں۔ وقت کی کمی اور مصروفیات کی وجہ سے اتنا ہی پڑھا ہے، سخن آہا میں مور شاہد حسین اور شاہد فراز کی نظمیں خاص طور پر پسند آئیں۔ مزید تبصرہ اس بار بھی نہیں کر پاؤں گا، بشرط زندگی انشاء اللہ اگلے ماہ۔

فیض رسول تمہاری آمد کا تسلسل اور تحریر کا انداز ہمیں بتا رہا ہے کہ جتنا تم بھی بہت جلد لکھ کر کہانیاں میں بطور قلم کار یا شاعر کھائی دینے والے ہو۔



ظفر علی ایڈو۔ میٹر کر اچھی سے احوال میں تشریف فرما ہیں کہتے ہیں۔ محترم کاشی چوہان اسلام علیکم۔ کہی کہانیاں سننے ہی احوال میں خود کو تلاش کیا، صفحہ 17 پر خود کو پا کر دل خوشی سے باغ باغ ہوا۔ بے حد خواہش، احوال میں سننے لوگوں کو Well Comes اور پرانے نکاحار لائن کو سلام دو جائیں۔ جناب کس کس کے نام لکھیں۔ تمام کی تمام کہانیاں اچھی تھیں مگر مجھے عرب۔ حدنان کی جنت نظیر میرا کشمیر، فیض کی شریک سفر، ایم اشفاق کی کہانیاں آ کے لئے کارواں۔

مریم شاہ بخاری کی ایک ہی راستہ، امتیاز حسین ملک کی سنگ دامت، سیر الفک کی بحر نمونہ گہا بے حد پسند آئیں۔ ڈاکٹر شاہ محمد تیریزی کی غزل، عادل حسین، اسلم جاوید، مصمت پروین، شبنم، عاشق حسین ساجد کی غزلیں بہت اچھی لگیں مور شاہد حسین کی اسے جان خوب رہی۔ آصف ریاض، شاہد فراز، مرزا سربگ، شمیم ناز، ڈاکٹر صغیر احمد، ثلث ناز کی نظم بھی اچھی تھیں۔ اب اجازت اپنا بہت بہت خیال رکھیے گا اگر کوئی غلطی ہو تو دیں، عذرت۔

بنیاد سے بھائی احوال میں آپ کا آنا آپ کی محبت کی دلیل ہے۔ بھائی خازن! تمہاری تصویر دالے پر ہے تمہارے کتنے دوستوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔



بقولہ شریف سے ریاض حسین شاہد رقم طراز ہیں۔ مٹی کا شمار روحانی نمبر اپنے دامن میں بزرگان دین کی روحانی فیضیتیں اور ایمان افراد کو کراہیں، ریاضتیں اور روح کا پتہ تاثیر کروانے والی تحریریں لیے جلوہ افروز ہوا۔ صند علی حیدری کی تحریر دعا جامع حروف کی وہ بالائی جس کا ہر لفظ کو برنا یا پ تھا۔ عاشق حسین ساجد بھی قلم کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔ ساز اور سر کو ساتھ لے کر چلتے ہیں نہ کہیں واقعات میں لرزش آتی ہے نہ کہیں انداز بیان میں جھول پیدا ہوتا ہے۔ مجید احمد جانی نے اچھی کاوش دے کر روحانی نمبر کو روشنی بخشی۔

صدف سیکھنے کی مختصر تحریر اچھی لگی، مکمل کا دوسرا حصہ فی اعتبار سے متاثر کن تھا۔ سب نے اپنی اپنی جگہ خوب صورت انداز میں طبع آزمائی کی۔ احوال میں شامل دوستوں کی مکمل نے بے پناہ اپنائیت کا احساس دلایا۔ کاشی چوہان کی عارقات باتیں پڑھ کر رون کو تاثیر ملی کہ حق آشنائی کا ایک پتہ کار بھی چھپا ہے۔ "منہم کدہ ہے جہاں" کو پڑھ کر جن دوستوں نے میرے حوصلوں کو جلا بخشی، ان میں جناب عامر زہان بور سے والد، صند علی حیدری، آج شریف، ملک عاشق حسین ساجد، مجید احمد جانی، ماکان، عبدالغفار چچہ، مٹی نے قیاسی بھر کر تبصرہ کیا۔

بھائی ریاض! سلامت رہیے تبصرے کا شکریہ آپ کی دوسری تحریر کا انتظار ہے۔



ایڈیٹر ایک سے عمران فائق تشریف لائے ہیں احوال میں کہتے ہیں۔ جناب کاشی چوہان صاحب! تسلیات، مئی 2014ء کا شمارہ "روحانی نمبر" نظروں سے گزرا۔ پسند آیا اور دل چاہا کہ کچھ الفاظ بطور تبصرہ پیش کروں۔ حسب سابق "کچھ اپنی باتیں" سب سے پہلے نظروں سے گزریں اور آپ کی باتوں سے متفق ہونا پڑا۔ "احوال" کی طرف قدم بڑھایا تو تمام ساتھیوں کے احوال پڑھنے کو ملے۔ گزشتہ شمارے پر بڑے اچھے تبصرے پڑھنے کو ملے کچھ

فلمیں خبریں بھی پڑھنے کو ملیں۔ بالخصوص محمد اقبال زمان صاحب کی والدہ اور سدرہ انور علی کے ایکسیڈنٹ کا علم ہوا۔ دعا ہے کہ خداوند کریم انہیں جلد از جلد صحت یاب فرمائے۔ وہی بات کہانیوں اور افسانوں کی تو "جلوے جنوں" اڈل نمبر پر رہی۔ پڑوسی، شان سولہ، رتی اللہ والی، نور کا ہال، صنم گدہ ہے جہاں اور بڑو بہت خوب رہیں۔ ارشد علی ارشد کی قسط وار کہانی بڑے احسن انداز سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ موصوف کی نئی شائع ہونے والی کتاب "چاند کی دلہیز" کا اشتہار دیکھ کر خوشی ہوئی۔ خن آباد میں انٹری ماری، گیت غزل، دلگیر شیراز اچھی لگی اپنے ماموں حکیم خان حکیم صاحب کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتا ہوں۔

ہر پھول کے چہرے پہ اداسی کا سماں ہے
افسردہ بہاروں نے تجھے یاد کیا ہے
دیگر شعراء کا کلام بھی زبردست رہا۔ باقی تمام سلسلے حسب معمول خوب رہے۔ ایک نظم ارسال ہے امید ہے کہ اس رلد تصویر کے ساتھ قسط شائع کریں گے۔

جنا پیارے عمران اتم طوطے نازاؤ دیگر شعراء کا بھی خیال رکھو۔ تبصرہ مختصر مگر جامع تھا اچھا لگا۔

جنا یاد علی جنرل آباد سے لکھتے ہیں محترم کاشی بھیا دلپائی ساری لگی لگی اور اچھی دعائیں آپ کے سمیت پورے اسٹاف اور بچی کہانیوں کے پرستاروں کے نام۔ تازہ شمارہ ہاتھ میں ہے ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضر ہوں مصروفیات کے باعث پچھلے ماہ احوال میں شریک نہ ہو سکا۔ احوال احوالیوں کی خوب صورت باتوں سے، چمک رہا تھا۔ مور شاہد حسین کا خط اور نظموں کو بھانگی۔ محمد عزیز نے شکر یہ۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں بے حد پسند آئیں، سلیم فاروقی آتش دہنوں، ارشد علی ارشد معنی، ایچ ذرا احمد نواب ناگن پسندیدہ سلسلے ہیں۔ بھرم ٹاٹ گیا، شریک سفر، انتقام، امانت، پسند اپنی اپنی، نصیب کی بادشاهی ہیں۔ حلال، مایک ہی راست، کہاں آکے لے گا رواں، ماحوری محبت، سنگ ملاست بے حد پسند آئیں۔ دلگیر شیراز خواہشوں کا اسیر، ام مثال خاموشی ہے زندگی، مکن شیر خواہشات نا آسودہ، اے خوشی ہوئی۔ غزلیں نظمیں بے حد اچھی تھیں بہت پسند آئیں۔

جنا پیارے یاد احوال کے ایک شمارے تم بھی تو ہو تم سب کی سلامتی کے لیے دعا کریں۔

برہنہ طارق چاہیہ بہاولپور سے رقم طراز ہیں، مجھے اللہ پاک کے فضل و کرم سے پوری امید ہے کہ آپ اور پورے اسٹاف بہت تمام قارئین حضرات بھی خیر و خیریت سے ہوں گے۔ احوال میں یہ میری تیسری حاضری ہے یہ آپ کی محبت ہے جو ہم ہر ماہ مصروفیات سے وقت نکال کر بھی آپ کی خدمت پیش ہوئے ہیں۔ آپ بھی کھلے دل سے محبت و اچانیت کا اظہار کرتے ہیں، میں ہمیشہ آپ کا مشکور و ممنون رہوں گا۔ جون کا شمار بہت اچھا تھا بے حد پسند آیا۔ لگی کہانیاں ایک منظر در سال ہے سب سے پہلے کچھ اپنی باتیں پڑھیں۔ بے مثال تحریر لائے آپ؟ عابد حسین کی پسند اپنی اپنی، عادل حسین بھی جلتی ہے، امتیاز حسین ملک سنگ ملاست، شاز یہ گل بکھر اسوتی چن لیا، نسیم سحر ماحوری محبت، تکلیف انجم طارق اپنا بڑا کات رہی ہوں، عروہ بہرہ نازان، حسنہ نظیر میرا کشمیر بے حد پسند آئی۔ خوب صورت موضوع پر کہانیاں لکھی گئیں۔ سلیم فاروقی آتش جنوں زبردست سلسلہ ہے، معنی ارشد علی ارشد اچھا ہے، باقی شمارہ مصروفیات کی وجہ سے زیر مطالعہ ہے اجازت دیں۔ خدا حافظ

برہنہ طارق بہاولپور سے تمہاری آمد اچھی لگتی ہے مگر یاد رہے سرکولٹ ہو وہاں تو بات ہے۔

جنا یہ فیصل آباد سے ہماری لگی کہانیوں کی ابتداءات اپنے لکھی تعاون کے پھول بکھیرتی فرحت صدیقی صاحب کی آمد ہے، لکھتی ہیں اچھے اچھے کاشی چوہان السلام علیکم۔ حسب وعدہ لگی کہانیاں کے لیے حاضر ہوں۔ مجھے اپنا B2 سے B7

پُر اسرار گھائی نمبر II

نا قابل یقین، دہشت انگیز، خوف ناک سچ بیانیاں۔

جنوں، بھوتوں اور ارواح خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو
خوف میں مبتلا کر دیں گی۔



ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے.....

ایسی خوفناک کہانیاں.....

شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہا کر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرا لیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ اگست کا شمارہ، پُر اسرار کہانی نمبر II ہوگا۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمائیں۔

جولائی 2014ء

میں چچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

کوہن

برائے

احوال

نام:

تکمیل پتا:

جولائی 2014ء

میں چچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شامل اشاعت کر لیں۔

کوہن

برائے

اشاعت

کہانی

عنوان کہانی:

تعداد صفحات:

نام:

تکمیل پتا:

فون/ریسل نمبر:

جولائی 2014ء

میں چچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا کرتی ہوں۔ میری رائے میں

کوہن

برائے

پسندیدہ

کہانی

اول، عنوان:

مصنف:

دوم، عنوان:

مصنف:

سوم، عنوان:

مصنف:

نام:

شہر:

تک کا زمانہ بھی یاد آ رہا ہے۔ جب ہر شاعر میں میری کہانی ضرور ہوتی تھی۔ یہ آپ کی محبت اور خلوص ہے جس نے مجھے ہامدہ دیا ہے، تم میرے بہت بہت چھوٹے بھائی ہو۔ اور زبردست بھائی ہو۔ مکی کا شمارہ "روحانی نمبر" بہت زبردست تھا۔ بہت اچھا لگا۔ "جلوۂ جنوں" سرکارِ دل حسین شاہ کی کرامت کی کہانی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ضرور نوازتا ہے۔ کیوں کہ وہ بندے اللہ کے بندوں کا خیال رکھتے ہیں۔ جاوید راہی کا اپنا انداز بیان ہے۔ "بابا پالا" ایسے بزرگ ہمارے سامنے اور ہمارے زمانے بھی ہوتے تھے جو اچانک غائب ہو جایا کرتے تھے میرے والد صاحب اور والدہ ایسے بزرگ کو بہت پسند کرتے تھے، روزانہ کوئی نہ کوئی "بابا" رات کے کھانے پر ضرور ہوتا تھا۔ وضو کر جیسے جن ایسے بھی تھے جو گوجرہ میں میرے دادا حکیم سلطان احمد سے قرآن پاک پڑھا کرتے تھے۔ یہ پاکستان بننے سے پہلے کا واقعہ ہے جو ہمارے والد صاحب اکثر ان کے قصے سناتا کرتے تھے۔ نوٹس والی سرکار ٹھیک بنی تھی۔ حضرت میاں دربار علیہ حضرت میاں مفتی سائیں کی پرنو کہانی دل میں اتر گئی۔ وہ اب مدغوب صورت اور دل میں اتر جانے والی کہانی ہے اس کا ایک ایک لفظ کی روشنی سے جھگڑا رہا ہے۔ سورہ پے ٹھیک ہی تھی۔ پڑوسی بھی رتھی تھی، اچھو کی کہانی بہت اچھی تھی کہ اس کی کاپی مل گئی۔ واقعی جس کے دل میں قرآن ہوتا ہے اس کی حفاظت بھی اللہ ہی کرتا ہے۔ وہ میرا مہربان و پڑھ کر بھی حرا آیا، انجاز دعا کا آغاز اور انجام دونوں ہی پسند آئے، انمول عمران خان نے بھی اچھا لکھا ہے۔ ہر کہانی کا جواب اور خوب صورت ہے۔ کاپی پلٹ میں افسانوی رنگ نمایاں ہے، مکمل کا انجام بھی اچھا رہا۔ روحانی نمبر کی خاص کہانی صفر کدہ ہے جس نے بہت متاثر کیا۔ ارشد علی ارشد کی تحریر میں جاوہر ہے، انسان کی سچائی ہے، علم کا خزانہ ہے، جستجو ہی جستجو ہے۔ امید ہے اب تم خوش ہو گئے کاشی پڑھان۔ میری طرف سے سب کو بہت سلام۔



نواز آغا جی میں مزہ آ گیا۔ ہمارے سینئر لکھنے والوں کی شہرت اور تعالیٰ کی اس وقت نئے لوگوں کو بہت ضرورت ہے۔ (مرحوم آفاق، حیدر آباد سے شامل احوال ہیں لکھنے والے کاشی پڑھان صاحب امید ہے کہ خیریت سے ہوں گے۔ "کچھ اپنی باتیں" کے عنوان سے آپ کا کالم بھی بہت اچھا لگا۔) خن آبار میں اپنی غزلیں دیکھیں تو دل خوشی سے تھوم اٹھا۔ آپ کے آنے سے کئی کہانیاں میں بہار کا موسم آ گیا ہے۔ ناگن کے عنوان سے انجاز احمد نواب کی کہانی پہلی مرتبہ پڑھنے کا اتفاق ہوا اور اب دل بچھتا رہا ہے کہ پہلے کیوں نہیں پڑھی، بہت ہی دلچسپ اور سرانگیز کہانی ہے۔ کئی کہانیاں کے لیے ایک نزل روانہ کر رہا ہوں آپ کی حوصلہ افزائی کا منتظر۔

نواز پڑھان صاحب! آپ کی کچھ لکھی قصائے آفس سے پڑھ چکا ہوں پڑھان صاحب! پڑھنے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ (مرحوم اختر نواز صاحب! انور سے احوال میں شامل ہیں، لکھتی ہیں تھرم بھائی کاشی پڑھان صاحب یقیناً آپ سب بخیریت ہوں گے۔ احوال کا نیا انداز بہت اچھا ہے، کئی کہانیاں نے بروقت اشاعت کی اپنی روایات کو برقرار رکھا ہوا ہے، عموماً مینے کی ابتدائی تاریخوں میں مل جاتا ہے۔ آپ نے یہ اچھا سلسلہ شروع کیا ہے کہ نئے رائٹرز کے ساتھ ساتھ سینئر رائٹرز سے بھی تحریریں کھواتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح نئے رائٹرز کو سینئر رائٹرز سے لکھنے کا موقع ملتا ہے کئی کہانیاں کا پراسرار کہانی نمبر واقعی میں بہت پر اسرار تھا۔ اس کی بہت سی تحریریں تو ایسی تھیں کہ مجھے تو رات کو پڑھتے ہوئے بہت ڈر محسوس ہوا تھا۔ وہ کہانی نمبر مجھے اس لیے یاد آ گیا کہ آج کل میں ایک پر اسرار کہانی تحریر کر رہی ہوں۔ انسانی اندازِ جلدی بھیج دی جائے گی۔ اس کہانی کے مرکزی کردار نے خود مجھے اپنی کہانی سنائی تھی۔ آج کل میں ہر حکم بہت زیادہ دھرم میں ہے۔ میں ناچا ہوں تو بھی کہتے ہیں مجبور ہو جاتی ہوں۔ تازہ شمارہ انہی ماہ میں اس لیے تبصرہ بھی ممکن نہیں، جبکہ مجھے شمارے پہنچ رہے ہیں تو ایسے ہی ہوا گا۔ اگر زندگی رہی تو جلد ہی دوبارہ فی تحریر کے ساتھ حاضر ہوں گی تب تک کے لیے اللہ حافظ۔) (مرحوم اختر نواز صاحب! احوال میں خوش آمدید۔ آپ کے تبصرے کا ہم انتہا کر رہے ہیں، انی الحال ہمیں تعاون کے لیے شکریہ۔)



... ہمارے بہت پیارے مور شاہد حسین۔ گھر شہداد کوٹ سے احوال میں شریک ہیں۔ تمام اہل اسلام کو رحمتوں والا ماہ رمضان مبارک ہو۔ خدا ہم سب پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے آمین۔ جون کا تازہ شمارہ دلکش مائیکل کے ساتھ اپنے چلوے دکھاتے ہوئے بھرپور انداز میں وصولی ہوا۔ آئی منزلہ سہام کا ادارہ یہ جتنا سفاک، اس کی جرأت پر دل کا پٹا تھا آپ کی تحریر قابل تحسین ہے۔ محفل احوال میں انٹری کی۔ آپ نے محفل کی ابتدا خوب صورت انداز سے کی۔ محمد اسماعیل بروہی سے مل کر آنکھوں سے آنسو جھلک پڑے۔ رانا محمد شاہد بچہ کیا ہو سکتی ہے؟ اچھا بھلا شادی کا لڑو بیٹھا تھا یا کڑوا ڈرا ہوتا ہے؟ ہمیں بھی بہت شوق ہے؟ ڈاکٹر ایس وفا بھلا ہی رہا ہے۔ مصروفیت ہے یا کوئی اور وجہ ہے جی۔ سچ چمن ویکم جو ہوا سو ہو گیا، پرچہ کاشی چوہان بھیا کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ سٹیلی سید خدا آپ کو صحت مند رہتی عطا فرمائے۔ مختار اللہ دندیلکم السلام کیسے ہونا لازمی؟ تولی رضا عمرے کی سعادت کی بہت مبارک ہو۔ شاہد فراز بھیا آپ نے جھلک دکھائی پھر غائب؟ ملک احوال ادبی تحسین جو نیچو اور زریں جو نیچو غیر حاضر تھیں وجہ؟ ان کو 08 جولائی جنم دن مبارک ہو۔ سدرہ انور علی، انکل جی آ، امجد احمد، بشیر احمد بھٹی، فیضی رسول کیسے ہو؟ غلام رسول گل تہیاری دوستی کو سام، مگر غلام کو تو محفل میں لے آؤ۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شاز یہ گل کی آپ جتنی نگہم لہوئی چن لیا پڑھی۔ م۔ م۔ ایمن طلال کرن شیر، خواہشات، آسودہ مریم شاہ بخاری، ایک ہی راستہ، ام سفاک، خاور زار ہے زندگی، عمدہ تحریریں تھیں۔ ٹھیکر انجم طارق، اپنا بویا کاٹ رہی ہوں، نصرت سر فراز خان، عروہ بدایان، جنت فقیر میر اکشیر، عابد حسین پسند اپنی اپنی، عادل حسین جی بھی جلتی ہے دل کو بھاتی۔ ایم اشفاق بٹ کہاں آ کے لئے کارواں، نسیم عمر، احمادی محبت، طارق محمود آکاش، نصیب کی پادش، لاسر فراز، معصوم چیراں نصیب، فطیل، شریک سفر شائستہ میر آرزو سلوٹی نے متاثر کیا۔ انکل سلیم فاروقی آتش جنوں، تجسس اور سنسنی فطرت ہے بے حد پسند آئی۔ ارشد علی ارشد بھٹی اچھی جا رہی ہے۔ غلام مصطفیٰ خان امر دلی، دیکھ کر شہزاد خواہشوں کا سیر ہو سویرا فلک بھرم ٹوٹ گیا۔ محمد اسلم آزاد انتقام، ٹھیکر احمد احمدانی، پانچ پریاں، پراثر تحریریں تھیں۔ اگلارا احمد نواب، مانگن، ممبر (ر) امتیاز حسین ملک، سنگ سلامت، زبردست تھی۔ نجن آباد میں سب کے خیال عمدہ تھے، نظم کا۔ کا شکر ہے۔

ہلا مور شاہد تہیاری نے سے گستا ہے واقعی احوال میں رنگ اترنے لگے ہوں۔ خوش رہو۔

[ادب اکڑ ایس وفا کا کہنا ہے نکلے جس انکھ بھیا کاشی چوہان سلام دعا ہمیں خدا آپ کو سدا سلامت رکھے آمین۔ عرض یہ ہے کہ میں نے یہ عطا مور شاہد حسین اللہ غلام رسول گل بھائی کی محبت میں مجبور ہو کر تحریر کیا ہے۔ مور شاہد حسین نے ماہ مئی میں سالگرہ مبارک دینے کے بعد ماہ جون میں اس حسین محفل میں آنے کی دعوت دی اس لیے تو آنا ہی تھا۔ مور شاہد حسین اور غلام رسول گل میرے بہت ہی اچھے دوست ہیں، پرچہ کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ بہت ہی شاعر اور نہایت ہی خوب صورت مواد کی کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے ادارے کی ترقی اور آپ کی کامیابی کے لیے دعا میں۔ بڑا کفر تو نا خدا کر کے اور اب کیا کہوں بھائی وفا آپ کے لیے۔

بھلا ادب سچ چمن صاحب حیدر آباد سے رقم طراز ہیں۔ سن دو ہزار تیرہ 2013 کی آخر میں دو کہانیاں لکھی دوستی۔ نیکی کر دیامیں ڈال پائیگی کا صلہ۔ ارسال کی گئیں، خیال تھا کہ مارچ تک ضرور شائع ہو جائیں گی مگر وہ ابھی ستم گری کی بھی حد ہو گئی، شاہاش بے کاشی صاحب آپ نے تو سابقہ ادارت کا بھی ریکارڈ تو تازہ کر رکھا ہے کیا کہیں کہ کمرچی کرچی کر کے دکھلایا ہے۔ تحریریں تو بھارت میں آپ تو خطوط کی محفل میں بھی شاید کسی سفارش یا سیاسی رشوت کے بغیر عطا شائع کرنے کے موڑ میں نظر نہیں آ رہے ہیں۔



بھلا ادب سچ چمن صاحب! آپ ماشا اللہ جہانگیرہ لورز مانو دیکھے بزرگ ہیں۔ بھلا یہ تو بتائیں کہ دو صفحات کی

قسط بھی دیکھی ہے کسی پرچے میں ۱۲۲ اور ہاں آپ کے خط میں پھلجڑیاں آپ کی طبیعت کی زمین کو خوب ظاہر کرتی ہیں آپ کی غزل اس ماہ شامل اشاعت ہے۔ اب آپ کے تین ماہ اسٹاپ صفحات میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جسے شامل احوال کیا جائے بتائیے اب کیا کریں؟ اور آپ بھی اب قلم کی آبرو کا پاس کرتے ہوئے بے سرو پا تحریروں سے باز رہیں تو نوازش ہوگی۔

﴿شیراز احمد صاحب﴾: شہر کن عالم کا نونی ملکان سے رقم طراز ہیں۔ جناب کاشی چوہان صاحب السلام علیکم۔ چچا کہانیاں پڑھنے کا اکثر اقبال ہوتا رہتا ہے لب کی بار رو مانی نسر پڑھا بہت خوشی ہوئی کہ بزرگان دین کی شان و عظمت سے نئی نسل کو آگاہ کرنے کی ایک بہت اچھی کاوش ہے۔ چچی کہانیاں مئی 2014 کے شمارے صفحہ 108 پر بشیر احمد بھٹی صاحب کی کہانی بعنوان "وہ سو روئے" میں جس بات کو بطور کرامت بیان کیا گیا وہ بات ہرگز اس قابل نہیں۔ باقی بھٹی صاحب کی یہ بات ہمیں بہت اچھی لگی کہ انہوں نے کہا کہ ہشتی دروازے سے گزرنے والے پانچ وقت نماز بھی لو لیا کریں، انہوں نے پاپا فریہ نے بھی بھی نماز ترک نہیں کی۔ تو میں بھٹی صاحب کی بات کو بڑا کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ پاپا فریہ شکر گنج علیہ الرحمۃ نے ساری زندگی کبھی کسی کا ایک آنہ بھی خصب نہیں کیا پھر قلن کے پردہ فرمانے کے بعد ایک "خود کردہ فرار" کو ان کی طرف منسوب کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔

ہذا شیراز احمد! آپ کا قطع شائع کر دیا گیا ہے مگر ہماری محبت کو ہماری سمجھنے کی غلطی سمجھیں نہ نیچے گا۔ امید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔

﴿خیر پور تاج حسین شاہ سے ملکہ احوال حسین جویمہ احوال میں رقم طراز ہیں۔ پیارے بھیا کاشی السلام علیکم۔ امید کہ آپ بخیر ہوں گے، پھولوں کی نشلی خوشبو کے سنگ نیک تمنا میں آپ کے ہاں۔ گل ملی نامعلوم کن خیالوں میں کم ہیں، بھی دانیس آجاؤ تاکہ ہماری بھی من لو۔ ادا یہ منورہ آئی کی مٹا سچائی پرستی ظم زدہ کر گئی۔ کچھ اپنا باتیں آپ کی بہت اچھی لگیں۔ سور شاہ حسین بھائی، ایک تو مجھے زمانے کا مہر لگا رکھا ہے جو کہ کچھ جیب سا لگتا ہے۔ خیر آپ کی مرضی، غلام رسول گل صاحب علیکم السلام۔ خوش رہیے۔ مانی سدرہ انور بڑی نوازش طبیعت کا ساؤ بھال ہوئی مکمل؟ وہ عاؤں کے پھول آپ کے نام۔ عبدالمعز بی آئنگل وہ تو بے فکر لڑکیوں کا زمانہ تھا کہ شہرت ہوا کرتی تھی۔ خیر اب بھی ویسا ہو سکتا ہے مگر اب وہ لوگ ساتھ ہی نہیں آتے۔ محمد عزیز مجھے صاحب مدتوں بعد کوئی اپنی تحریر سرائے پر شکر یہ لگا کر رہے ہیں جو کہ اچھی بات ہے۔ ورنہ تو اب لوگ یہ زحمت ہی نہیں کرتے۔ محمد اسماعیل بروہی بھائی اللہ سامیں آپ کی بھالی کے درجات بلند فرمائے (آمین) سخن آباد میں زندگی کے ماحصل، شہینہ ناز، غزل نوید، سہیل لاکھو بھائی سور شاہ حسین بھائی ان سب نے بہت عمدہ کہا۔ کہانیاں میں خواہشات نا آسودہ کرن، بشیر شریک، سفر فیض، فضل، اوجہری محبت نسیم، پانچ پریاں، کلید احمد احمدانی، جی جی جی ہے عادل حسین، جنت نظیر میرا کشمیر عرب، مدنان جی، دفعہ ہشوں کا امیر و بھیکر شہزاد، سنگ مامست امتیاز حسین ملک، موصوم بچیاں، مال سرفراز، بکھرا موتی جن لیا شازیہ گل اور مخلصی ارشد علی ارشد کی بہت اچھا جواب تحریریں رہیں۔ آئی نذر پند کو 8 جولائی ساگرہ بہت بہت مبارک۔

﴿جی جی حسین زریذہ آئی کو ساگرہ مبارک۔ باقی نئے لوگوں کو کچھ نہ کہتا، ابھی تو وہ خاموش بیٹھے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں سنبھال ہی مشکل ہو جائے۔



﴿کراچی سے کھول عمر بن خان احوال میں شریک چچا لکھتی ہیں۔ السلام علیکم کاشی بھائی۔ کیسے ہیں؟ جون کا شمارہ ما بہت اچھا لگا اس بات کی خوشی ہوئی کہ آپ نے ذیل سرورق ختم کر دیا۔ واقعی اس سے پڑھنے میں کافی مشکل ہوتی تھی، اس بار میرا خط بھی شائع نہیں ہوا شاید لیٹ موصول ہوا ہوگا۔ میں نے ایک کہانی بھی لکھی تھی اس کا کیا بنا؟ پورا شمارہ بھر پور ہے۔ طالع بہت اچھی اور الگ انجام کی کہانی بھی پڑھ کر حروہ آ گیا۔ ویسے آپ کا کام بھی آسان نہیں

تفنی ہی کہانیاں آتی ہوں گی آپ کے پاس ان میں سے زبردست کہانیاں چن کر پیش کرنا واقعی ایک الگ کام ہے۔ سلوٹی معصوم بچیاں، پانچ پرپاں، خواہشات، آسودہ زراست گی۔ اس کے علاوہ بھی باقی تمام تحریر اچھی اور متفرق تھیں۔ ناگن کی تو کیا بات ہے اب ناگن کا زور نونا کا ۱۰۰ سے رہا ہے دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔ میں ایک غزل بھیج رہی ہوں پہلی بار پلیئر نظر عنایت کیجئے گا اور میری کہانی کا بھی جائزہ لیں گی۔ کیا ہوا؟ چلیں جی۔ کیا ہوا؟ اس بار جلدی خط بھیج رہی ہوں نہیں پھر تاخیر والی کا خطاب نکل جائے۔ سب کو سلام اور اپنا خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ

نار پیادی کنول! آپ کی محبت سر آنکھوں پر۔ تبصرہ جلدی آیا اور لگ گیا ہادی مانتوں کو سراہنے کا شکر یہ شاعری اس بار شامل شہادت ہے اور کہانی بھی جلد شائع ہوگی۔

سب سے بہت عزیز عہدہ تحریر جی آپ کو ال سے رقم طراز ہیں۔ اچھے کاٹی سلامت رہو جون کا شمار دوا۔ سرورق مائل کی سادی سبحان اللہ۔ منورہ سہام کا ادارہ بہت بڑھ کر دل ڈال رہی ہو گی۔ مبشر حسن آپ نے ہماری تصویر دیکھ کر فون کیا کہ دوسالے میں بیچنے والی تصویر بڑی گرئیں نکل ہے آپ تو ابھی تک ہیں۔ جیٹا تصویر میں قی نہیں رہیں۔ یہ 2010 کی ہے اب تو جس جیٹا ڈانچی والا بابا ہوں۔ ناشی دوست آپ کا نام "کچھ اپنی باتیں" پر چلا۔ اس قصے کے حوالے سے جو نتیجہ آپ نے ہماری بصر ترقی کی خبر یہ وہ "خوب تر" ہے۔ کہانی انشاء اللہ مضامین سے نکلے آپ کو مل جائے گی۔ محمد اسماعیل پروسی اللہ بھائی کو جنت میں اعلیٰ مقام اور آپ سب اہل خانہ کو صبر و تحمل عطا فرمائے اور دعاؤں میں پورے کیے گا۔ جی کہانیاں میں سب لوگ اچھا لکھ رہے ہیں جی جی تو چپ رہے ہیں۔ ناشی بڑے ہاں کی ہمت ہے جو سب کو نو نو آواز پر دانوں کا ایک ٹاؤ میں اکٹھا کر رکھا ہے۔ اللہ میرے سوئے کے حوصلے بلند رکھے۔ مجھے ہرے کو دیر سے میں ناؤ کھینچنے کھینچنے سوئے پھینٹے شگ جاتے۔

آواز پھرے بھائی بی آواز شیر و آواز زور ہوا رو کی قدر یہ بچا نہیں سال سے منتقد کی جا رہی ہیں۔ جی کہانیاں میں آواز زور کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ آپ سب کا استحقاق نہیں کہ کچھ نیا کرنے سے ڈرا کہ دے۔ یہ نیا ایک تحفہ ہے۔ ہمارے قلم کاروں کے لیے امید ہے آپ کچھ لکے ہوئے لکے۔



آواز شریف سے مصدق جی جی رقم طراز ہیں اس بار بھی "جی کہانیاں" حسب معمول دیر سے (31 مئی) تک سب سے پہلے نامور کالمسٹ منورہ سہام کی تحریر "مامتا" پڑھی۔ انہوں نے بی بی خبر مصدق سے مانتا کے دونوں رنگ لے لیا کیے۔ "آپنی" کچھ اپنی باتیں اس بار بازی لے گئی۔ یہ تحریر آپ کے سب سے بڑے بھائی پر حاوی تھی۔ سب آتے ہیں جی جی باتوں کی طرف۔ نصیر افضل کی شریک تحریر ایک عجیب و غریب تحریر تھی۔ لانا زکی معصوم بچیاں، امر ربی، بھر مروت گیا میں سوئے الگ قادی کو دھڑکن نہیں کر پائی۔ ایک معصوم کی بات پر اتنے بڑا رد عمل، بات پتہ نہیں ہوئی۔ "نوا بھوں کا سپر" ڈانچی شہزادی تحریر تھی جو تین تین سے انتہائی پر پور تھی۔ پانچ پرپاں ایک اچھی کہانی تھی۔ خاد زور سے زندگی، جتنی پہیلی ہوئی تھی اس سے کہیں زیادہ کھری ہوئی بھی تھی۔ کروڑوں کی کثرت نے کہانی کا تاثر جتنے نہیں دیا۔ ایک ہی راستہ، خواہشات تا آسودہ اچھی تھیں۔ اب بات کرتے ہیں ایک ایسی تحریر کی جو میرے نزدیک مٹی کے شاور کا استعمال ہی، ایک نسل کہانی کے بارے لوڑات جس میں موجود تھے۔ کاش کہانی کا نام "حالت" کی بجائے شریف راوی ہوتا۔ سلوٹی ایک معیاری تحریر تھی۔ کہانیاں کے شکار وہاں انیم حرقی اور صری محبت۔ نصیب کی بات ایک دلکش کہانی تھی۔ ڈانچی صاحب ام مبارک باد۔ حال حسین کی کہانی جی بھی جلتی ہے بہت پسند آئی۔ بہت سی اور "جیہا کروئے ویسا بھوئے" کے اخلاقی سبق کی حالت کہانی اچھا بویا کات رہی ہوں اچھی تھی۔ بہند اپنی اپنی بھی ایک معیاری کہانی لکھا جائے گی۔ نصرت سر قرنی لمانت اچھی تحریر تھی۔ اس بار بھی احوال کی محفل بڑی جلتی تھی۔ "جی آ" کو خوش آمدید۔ آخر میں ان تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں میری کہانی دعا پڑھی اور جو صد انزانی فرمائی۔ سب دوستوں کو اب۔





بہار صندھرا تیسرہ روز پروست کیا۔ اب تو ہر ماہ میں انتظار رہنے لگا ہے بھائی۔ بیو۔

بھائی بھائی بلوچستان سے اسلم آزاد نکلتے ہیں کاشی چو بان صاحب اسلم سلیم احمد

خیریت احوال میں طبع ہے کہ ماہ جون 2014 کا شمار میرے ساتھیوں سے آپ کی محنت اور کاوش، جھٹک رہی ہے، باقی رائٹرز کی کاوشوں پر تبصرہ کرنے کے لیے میں تنہیہ کا تحریریں پڑھوں گا تو قلم اور تبصرہ آپ تک مقررہ وقت تک شاید نہ پہنچ سکے۔ مگر شہر صاحب کی خواہشات نا آسودہ، مریم شاہ بخاری کی تحریر ایک ہی راستہ، برادر مریم و شیر شہر کی تحریر خواہشوں کا اسیر اور

ایم اشتیاق بٹ کی تحریر کہاں آ کے لئے کارواں پڑھیں اور ان کے خیالات سے بے حد متاثر ہوا۔ امید ہے کہ یہ حضرات آئندہ بھی ایسی تحریروں کے ساتھ شامل ہو کر سچی کہانیاں کو روٹی بکھٹے رہیں گے، دیگر دوستوں سے محذرت خواہ ہوں کہ وقت کی کمی کے باعث ان کی تحریریں پر روشنی ڈال نہیں سکتا۔ باقی ڈائجسٹ کے آخری صفحہ تک میری آنکھیں پاکستان کے بہت ہی مقبول سینئر ادیب جناب محمد سلیم اختر صاحب کی تحریر کے لیے ترستی رہیں، جو کچھ عرصہ سے نہ جانے کیوں بچی کہانیاں میں نظر نہیں آ رہے۔ آپ نے میری تحریر انتہام شائع کی، اور نہ شاید میں تو اس تحریر کو بھول ہی گیا تھا۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اسی طرح حوصلہ افزائی کریں گے۔

بھائی جناب اسلم آزاد! آپ ہی آپ گلے اور شکوے بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہمارے غلوں پر شک کرنے والے کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ آپ کی تحریر پر جو محنت ہوتی ہے اس سے انکار کر سکتے ہیں آپ 1997 پہا ہوا جو آپ کو بروقت اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ برادر مریم اولدہ بھی کہانیاں تمام لکھنا، بول ہی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور گاہے بگاہے ان کی کاوش کو منتظر پر لا کر ہٹاتا ہے۔ کبھی دیر آید درست آپ کی مصداق تو بھی کاوش آئی ہے۔ آپ نے جو غلطے شکوے کیے، یہ ہماری آپس کی بات ہے۔ ہماری لکھاری اور ہمارے مابین اسی طرح کی باتیں معمول کا حصہ ہیں، بہر حال آپ کی کاوشیں خوب ہیں اور جس طرح ہم آپ کو سنوار کر پرے کی قربانت ہوا ہے ہیں، امید ہے کہ آپ بھی سچی کہانیاں کی ترویج و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے اور صوبہ بلوچستان میں پرچہ کی اشاعت و ترویج کے لیے ہمارے شانہ بشانہ قدم بہ قدم ثابت قدم رہیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کی کاوش سے مابانہ و سالانہ خریدے فروش کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔



بھائی ظفر اللہ دہ زید مراد بھائی سے رقم طراز ہیں، جناب منزلہ آتی اور کاشی چو بان

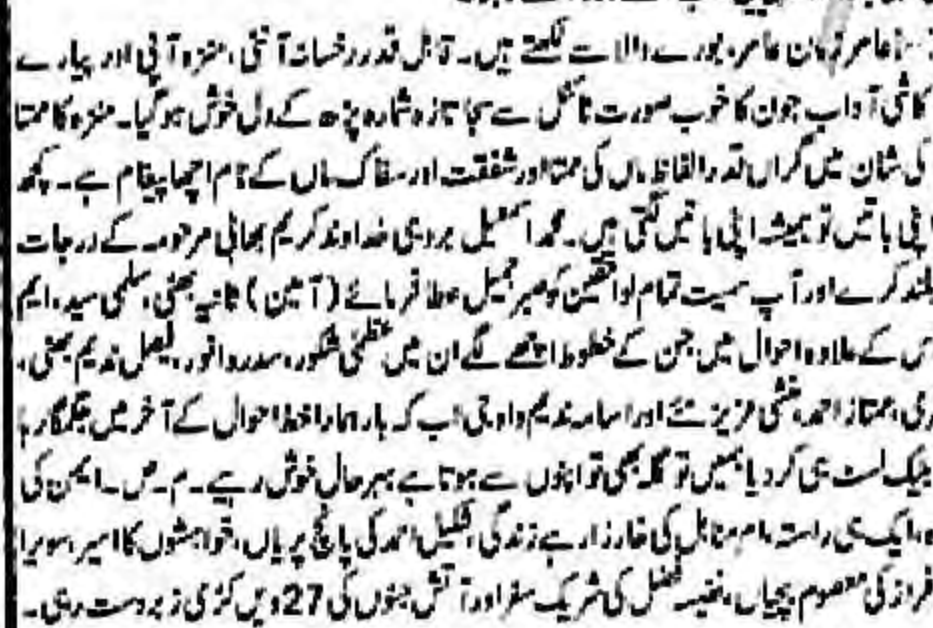
صاحب اللہ آپ کی تحمیل اور ہمارے دوست لکھاری سے یا پرانے سب کو خوش رکھے آئیں۔ جون کا پرچہ ہاتھ میں ہے جو گمراہی جون کو ملا ہے۔ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ سائل ایڈر صاحب کا اور میرا مسئلہ ایک ہی ہے آپ کو بھی پرچہ لیٹ ہوتا ہے اور مجھے بھی۔ غلام رسول گل بھائی یہ سچ ہے کہ ہم دونوں ملزوم ایک رہتے ہیں اور بعض وقت تو میں پرچہ لینے آپ کے شہر آتا

رہتا ہوں۔ ہائی صفیہ سلطانت آپ آج کل کہاں غائب ہو گئی ہوا اور ثانیہ یعنی صاحب آپ کا شکر گزار ہوں جو میری شاعری کو پسند کیا۔ احوال میں آپ کا خط پڑھ کر منہ سے واہ واہ نکلیں اور جن جن لوگوں نے پسند کیا ان کا بھی شکر گزار ہوں۔ ماہی میں ایک شاعری بھی تھی، وہ کیوں شائع نہیں کی۔ انکل جی آپ سچ کہتے ہیں ہم جو نیرنگ کو چاہیے کہ سینئر کا احترام کریں اور آپس میں محبت قائم کریں تاکہ فطرت اور جناب اعلیٰ آپ کا شکر یہ قبول سے کہ آپ نے فولڈنگ والا سسٹم ختم کر دیا۔ یہ بہت ہی اچھا کیا، ورنہ پرچے کا تو وقت سے پہلے نہ حاصل ہوتا تھا۔ اس ماہ منزلہ آتی کے ماؤں پر خوب صورت الفاظ پڑھنے کو ملے، احوال پر تبصرہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ آتش جوں اور آگن کو ایک ہی سانس میں پڑھ کر مراد آیا۔ بہت ہی خوب اور مخلص، ابھی تک زیر مطالعہ ہے ہائی تمام کہانیاں بھی بہت خوب ہوں گی۔

بھائی ظفر اللہ دہ صاحب! بہت افسوس ہوا کہ آپ نے غلط بیانی سے کام لیا، اس طرح غلط فہمیوں کو بھڑاتی ہے۔ خدا آپ کو روزگار عطا کرے۔



۱۰۰ چک نمبر ۶، ضلع ننکانہ صاحب سے رضوان احمد آرائیں پھلی بار سٹوٹ میں رقم طراز ہیں۔ محترم کاشی چوہان صاحب! امید ہے کہ آپ محترمہ، خزانہ سهام مرزا، محترمہ منتر و سهام مرزا اور ماہنامہ "پچی کہانیاں" کا تمام اسٹاف بالکل خیریت سے ہوں گے۔ ماہنامہ پچی کہانیاں کی اس محفل "احوال" میں پہلی مرتبہ حاضر ہونے کی جسارت کر رہا ہوں، مطالعہ کی حد تک پچی کہانیاں سے میرا تعلق نیا نہیں ہے۔ احوال کی اس خوب صورت محفل میں گہما گہمی دیکھ کر دل کیا کہ میں بھی اس محفل میں شرکت کروں۔ امید ہے کہ میری حاضری کو قبول کرتے ہوئے محفل میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمائیں گے۔ جون کے شمارے میں سے "ایک ہی راستہ" پانچ پریاں، امر و بی، بی بھی جلتی ہے، اپنا بویا کاٹ رہی ہوں، ہنجر، موتی، نصیب کی مارش، اور موری محبت، ممانات اور بھرم ٹوٹ گیا، بہت اچھی تھیں۔ مسئلہ وار کہانیوں میں مضمونی اور آتش جنوں اچھی جا رہی ہیں۔



شائستہ میرا رزق کی سلاطی، اشفاق احمد بت کی کہیں آ کے لئے محبت کے کارواں، ادھوری محبت نسیم حرم، ہانگن کی ساتویں قسط بھی حسب سابق اچھی تھی۔ ڈاکٹر طارق محمود آکاش کی نصیب کی بارش، عادل حسین کی بیٹی بھی جلتی ہے، گنگا پیدائش طارق کی اپنا بویا کات رہی ہوں، محبوبہ داستان، عابد حسین کی پسند اپنی اپنی، عروہ عرفان کی کشمیر جنت نظیر، نصرت سرفراز کی، انت، شاز یہ گل کی کہانی بھی زبردست رہی۔ سخن آباد میں اب کی بار، ہمارے نام کا ایک بھی پھول نہیں ہے۔ تیر رشوی، عادل حسین عادل، شمیم ناز، محبت اکرم، ڈاکٹر صفیر احمد اور شائستہ جمال کی شاعری دلوں کے بار چھوٹی میجر امتیاز ملک کی سنگ ملامت شاہکار تحریر ہے۔ تمام قارئین، رمانتاز اور اہل قلم احباب کے لیے پڑھوں، دعا میں، بڑے بھائی عبدالغفار عابد، منشی عزیز، مہر پر، عزیز احمد، دلو، سدرہ انور، منظمی شکور کے لیے سلام ظلوں۔

جن کا مرزا مان عامر نیچے آپ کا نام شامل احوال ہوا۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔

اعجاز احمد رانجیس، کراچی سے شریک احوال ہیں، لکھتے ہیں محترم کاشی چو بان صاحب۔ السلام علیکم امید ہے کہ آپ محترمہ رخسانہ سہام مرزا، محترمہ منورہ سہام مرزا اور ماہنامہ "جی کہانیاں" کا تمام اسٹاف بالکل خیریت سے ہوں گے۔ حسب وعدہ احوال کی اس ہفتی مسکراتی محفل میں حاضر ہوں۔ بے شمار پرانے چہرے عائب ہیں، نئے نئے چہرے جگمگا رہے ہیں۔ پرانے چہرے انہوں کو نہایت محبت و الفت اور دل کی گہرائیوں سے گزارش ہے کہ وہ بھی آکر اس محفل کو روشن کریں اور تمام نئے ساتھیوں کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید۔ طویل عرصے کی غیر حاضری کا مجھے سخت افسوس ہے۔ اسی کوتاہی کے ازالے کے لیے اب انشاء اللہ باقاعدگی سے حاضری کی کوشش کروں گا۔ جون کا شمار ملا، حسب معمول تمام نگہداری اپنی اپنی تحریروں کے ساتھ انصاف کرتے نظر آئے۔ یہی گئی کہانیاں کی کامیابی اور ہر دھڑکی کا راز ہے۔ جون کے شمارے میں سے حلال، ایک ہی راستہ، پانچ پرانے، ادھوری محبت، جی کہانیاں، اپنا بویا کات رہی ہوں، بکھر اموٹی اور بھرم ٹوٹ گیا بہت اچھی تھیں۔ سلسلے واد کہانیاں حسب معمول ٹھیک جاری ہیں۔ خدمتِ خلق کے لیے مسئلہ اپنی مثال آپ ہے۔ جی کہانیاں کی کامیاب اشاعت پر آپ سب کو اور تمام اسٹاف کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد اور سب کو بہت بہت سلام قبول ہو۔

بھائی اعجاز! نیچے آپ کا تصویر شامل اشاعت ہوا۔ آپ کی احوال میں ہر گز کمی اچھی بات ہے۔



بھائی شری سعید احمد، لاہور سے رقم طراز ہیں، جی کہانیاں سے وابستہ سب کو میرا سلام۔ رومانی نمبر پر جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہر کہانی ایک سے ایک بڑھ کر ایک تھی۔ جاوید رانی صاحب کی تحریر جلوہ جوں جی میں ایک سرچشمہ کشف، کرامات ہی قبل ایک بار جو پڑھنا شروع کی تو آخر تک ایک قلم میں جکڑی رہی۔ نوٹاں ملنا سرکار بھی بہت اچھی تھی "قتل" "قتل" ہوئی بہت زبردست تحریر تھی، منم کد ہے جہاں ریاض حسین شاہ کی رومانی نمبر کی خاص کہانی جی میں ہی بہت خاص تھی شروا سے آخر تک لحاظ کا انتخاب بہت ہی خوب صورت تھا خاص طور پر وہ حصہ جہاں سکندر سے کوئی بھی آواز نہ طلب ہو کر کہتی ہے "تو وہ لگی لگا کر ہٹا کر کہاں ہے" سے لے کر "پھر سمجھنا کیوں نہیں" تک سارا جہاں بہت ہی خوب صورت سے لکھا گیا ہے جیسے ایک لڑی میں موتی پروئے ہوں آج کل کچھ طبیعت خراب ہے اس لیے بھی سارا دل انجسٹ نہیں پڑھا۔ ہذا بشری تی! آپ کی محبت کے لیے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا مگر پھر بھی یاد کرنے کا بہت شکر ہے۔



شاہد فراز۔ حیدرآباد سے اپنی محبت کے پھول وائے ہیں، لکھتے ہیں پیارے بھائی کاشی چو بان السلام علیکم، محترمہ منورہ سہام کا ادارہ (ممتاز) بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے۔ کچھ اپنی باتیں آپ کے قلم سے ہمارے دل تک بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچ گئے، اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ گیارہ جی کہانیاں، تین شعلہ ساں تحریریں اور ناگن، منظمی اور آتش جنوں سے سچا جون کا سال میرے سامنے ہے۔ مجھ میں نہیں آتا کہ پہلے کون سی کہانی پڑھوں۔ معاش کے

پھر میں ایسے بھٹتے ہیں کہ جو سالہ صرف دو دن میں چارہ پیتا تھا اب وہ دن تین تک بھی ٹھہر چکا تھا۔ لیکن میں اس وقت تک
 دروازوں کوئی قسطی ہوتا تھا صرف کروڑینا۔ بھائی کلام رسول میں ٹھیک ہوں اور ملک احوال حسین جو نیچے اور آلی زریہ جو نیچے کھڑا ہوا اور
 انکل عبدالحق نے کہتے ہیں آپ کے پیارے دوست و شقائق بیٹ آپ کی پسندیدگی کا شکر یہ اور سارے پرانے احوالوں
 سے استھان ہے کہ کبھی کبھی بھول کر ہی آجی آجایا کروہ دوستوں کی مجلس میں بہت ساری دعاؤں کے ساتھ اللہ حافظ
 ہاں شاہد اتم آگئے ہو تو دیگر احوال بھی انشاء اللہ گاہے گاہے لوٹ کر آتی رہے ہیں۔

بہتر خدا صوفی کراچی سے نکلتے ہیں محترم جناب کاشی پوہان صاحب السلام علیہم وعلیٰ عہدوں کہ اللہ تعالیٰ سچائی
 لکھنے والوں کو سچی کہتا ہے کہ تمام ممبران کو اور تمام قارئین کو اپنے مفقود امان میں رکھے (آمین) سب سے پہلے میں اپنی
 تحریر دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی لیکن شعروں کی کمی کا افسوس بھی ہوا سب کو حال نہایت شکر گزار ہوں کہ میری تحریر بھی سچی کہانیاں
 کی نہایت ہی ایک تحریر اور دو سال کی کہ وہاں اس امید پر کہ جلد شائع کر دیں گے۔ نہایت ممنون و مشکور رہوں گا۔
 ہاں بھائی غیر آپ کے خط نے آپ کی سچی کہانیاں سے محبت بہت کی لیکن تبصرہ ۳۳



اللہ اعلم بشری اللہ سے سچوں میں شریک ہیں، لکھتی ہیں اسلام ٹیکسٹ کاشی پوہانی امید ہے کہ آپ اور آپ
 کا تمام اسلاف غیریت سے ہوگا اور اللہ کریم شہر کا کوئی حلقہ میں رکھے (آمین) رسالے کا بہتر ہونا
 ہوا میرا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ بہت محنت اور مظلوم سے کام لے رہے ہیں اللہ آپ کی محنت میں اور
 برکت دے۔ جون کا شہر و ملا ناٹس، ہمیشہ کی محنت بہت عام ساتھ آئے آپ پچھلے دو تین سال کے فاصلے
 دیکھیں تو آپ کو غولی اندازہ ہوگا کہ کافی عرصے سے فاصلے ایک جیسا ہی آ رہا ہے۔ صرف ماڈل کا چارہ چرو
 بھاپ دیا جاتا ہے، بھائی پلیز فاصلے پہ بھی تو پڑیں۔ کبھی ذیل سبب بھی نظر آ کرے۔ تحریریں سب کی بہت عمدہ تھیں۔ اللہ پاک
 سب کے علم میں اضافہ اور فہم میں نکھار پیدا کرے (آمین) اللہ تعالیٰ انشاء اللہ کا اسیر پانچ پانچ، امر ربی انصیب کی بارش،
 بنی بھی جلتی ہے یہ سب تحریریں مدد کی تھیں۔ مجرم نوٹ کیا، اچھی محبت، جنت خیر میرا کشمیر، انتقام بھی عمدہ تحریریں تھیں۔ روحانی
 نمبر میں شائع ہونے والی میری کہانی "دو میرا ہریان" کی بھائی میرا پڑا احمد دلو نے جس انداز میں تحریک کی ہے اور میرا جتنا حوصلہ
 بڑھایا ہے اس پر ان کا بہت بہت شکر یہ تمام احوالوں کو ملا سہارا میں اور مجھے بھی سب دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

اللہ اعلم بشری آپ احوال میں تو آئیں۔ تبصرہ کا شکر یہ! آپ کی تجویز پر عمل کریں گے۔
 اللہ اعلم بشری اللہ سے سچوں میں شریک ہیں آپ کی بزم میں پہلی بار شرکت کرو ہاں اور یہ سب کاشی
 بھائی کی محبت کا نتیجہ ہے۔ یکم جون کو ایک استاد سے میرا فریڈ اور چارہ بہت خوشی ہوئی کہ اس میں تو بہت سے جانے پہچانے اور
 محبت کرنے والے دوست اور صاحبی موجود ہیں۔ آپ کی فریڈ و جاوید فری، اشتقاق بیٹ اور بہت محبت کرنے والے انکل عبدالحق
 جی آجی آپ کی بزم میں موجود ہیں سب کو بہت بہت سلام۔ منز و سہام اور ادا رہے "من" اور کاشی پوہان کی کچھ اپنی باتیں چارہ کر
 شہرے کا آغاز کیا۔ سچی کہانیاں میں موجود کہانیاں چارہ کر کچھ نہیں آتی کہ کس کہانی کی زیادہ تعریف کی جائے، کیوں کہ ہر تحریر
 ایک سے بڑھ کر ایک نئی، حوالہ، ایک ہی راستہ، انداز اور ہے زندگی خواہش کا اسیر بہت اچھی تحریر تھیں۔ سلسلہ وار تحریریں نہیں چارہ
 سکا۔ جتن آوار میں عادل حسین، آصف ریاض، مرزا اسیر بیگ، انجمن اکرم، ملک عاشق حسین کے کلام پسند آئے۔
 ہاں ڈاکٹر صاحب! اب تو گل نہیں ہے نا کوئی اور ہاں دیکھیے ہم نے آپ کی محبت کا مان رکھا اب آپ کا فرض بنتا
 ہے کہ احوال میں ہر ماہ حاضر ہوں۔

بہتر اشتقاق شاہین کراچی سے ایک طویل عرصے بعد شامل احوال ہیں، نکلتے ہیں بہت عرصے بعد دوبارہ بلکہ۔ بارہ سچی
 کہانیاں میں کئی دوستوں کے کہنے پر حاضری دے رہا ہوں، امید ہے کہ دوست ہمیں بھولے نہیں ہوں گے۔ کئی ایک پرانے
 دوست اب بھی براجمان ہیں کئی نہیں ہیں تو فقہاء کا بد بھی ہیں، عبدالحق پڑی آ اور پڑو لو بھی ہیں حاضر زمان حاضر ہیں تو سسر
 ذریعہ بھی ہیں عزیز مئے اور فریڈ و فری بھی ہیں جو ستاراں کی طرح چمک رہے ہیں۔ میری کوشش ہوئی کہ حاضری باقاعدہ ہو۔

سمیل خان، ایسا میرے ساتھ بھی ہوا اور کچھ احباب کے باز بارونے کی وجہ سے طبع کی اختیار کرنا پڑی تھی ملک احوال سلام قبول کیجیے اور شاہد، گنجائش دل میں پیدا کیجیے، سیٹ خالی مت کیجیے گنجائش پر احسان ہے۔ عید اعزیز بتی آ بہت خوب لکھتے ہیں آپ، شمس یار کی بات کی کہ تصویر ہمیشہ فریٹس دینا، ماشاء اللہ بہت پیارے ہیں آپ۔ شمس عزیز سے ایسا مت کہو یار باقی تمام لوگ بھی تمہارے اپنے ہی ہیں ہمارا دل تو مت دکھاؤ یار، صدف حیدری بہت خوب صورت خط کے ساتھ موجود تھے، عامر زمان عامر نے بھی بہت پیار لکھا۔ شمیمہ ڈار، محبت اکرم، صبر نسیم بہت باکمال شاعری کی آپ نے، آتے ہیں کہانیوں کی طرف آتش کا سلیم فاروقی نے کمال کا لکھا۔ طارق م۔ م۔ لیکن کی خواہشات، آسودہ مایک ہی راستہ، خادزار ہے زندگی، انتقام، شریک سفر، خوب صورت سچی کہانیاں تھیں۔ سلونی بھی بہت بہترین مرد کہانی تھی۔ اشفاق بیٹ نے بھی خوب لکھا، مانکن اور مسکن سے ہمیں ابھی انیسیت نہیں ہوئی۔ شعلہ مہمان تحریروں میں انیسیت کی ہارٹ اور اپنا یو پاکٹ رہی ہوں بہت خوب۔ پسند اپنی اپنی عاہد حسین نے بہت پیار لکھا اور پردہ کی کہانیوں میں عروہ عدنان کی جنت نظیر میرا شہیر بہت خوب صورت رہی۔ کاشی بھانی آپ اور میر احباب نے حوصلہ افزائی کی تو آئندہ سے پھر پھر حاضر رہیں گے، تمام احباب کو بہت سلام، نیو کمرز کو آؤب عرض اور تمام دوستوں کے لیے نیک دعا میں ایک شعر کے ساتھ۔

نفس کو آگے پر اور وہ بھی عمر بھر رکھنا
بڑا محال ہے ہستی کو معیہ رہنا

اب اشفاق شاہین خوش آمدید! اقبال کا شعر تو یاد ہے، تو پھر دل برداشتہ لکھا ہوئے، آذان پر نظر رکھا کریں۔ امید ہے اب باقاعدہ ہمارے ساتھ رہو گے۔

ایس ایم ایس کے ذریعے احوال کا حصہ بننے والے قارئین

ہذا فریدہ عالم۔ کراچی ہذا سعید عالم۔ کراچی ہذا وحید عالم۔ کراچی ہذا ذیشان صفدر۔ حیدرآباد
ہذا مریم یوسف۔ بٹ خیل۔ ہذا منہاج علی۔ مظفر گڑھ ہذا سلیم صدیقی۔ فیصل آباد ہذا ریاض
صدیقی۔ میرپور خاص ہذا رضوان۔ ملتان ہذا امیر انیس۔ کوئٹہ ہذا الیاس غنی۔ سوات اور ولی زمان۔ پشاور
ہذا پیارے ساتھیو! ان شاء اللہ اگلے ماہ ان کی صفحات پر پھر ملاقات
ہوگی۔ آپ کی دعاؤں کا طالب

توجہ طلب

اپنی نگارشات کے حوالے سے بات کرنے کے لیے آپ 0307-2089080 پر رابطہ کر کے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ پیارے ساتھیو! آپ اپنی نگارشات ہمیں ای میل کے ذریعے بھی روانہ کر سکتے ہیں

ای میل: pearipublications@hotmail.com

ڈاکٹر ایس بی بی جعفری کہ لیسر: 110۔ آدم آرمیڈ۔ شہید ملت روڈ ریلوے شاہ ظفر روڈ، کراچی
نوٹ: قارئین اور نگارشی دوستوں سے گزارش ہے کہ آپ اپنی تحریر کاغذ کے ایک طرف، ایک
طرچہ نوکر لکھیں اور اپنا نام، پتہ اور مقام واضح طور پر تحریر کیا کریں۔ (شکریہ)

ایڈیٹر

اس ماہ کی سچ بیانیاں

اپنے دلیں سے اپنے شہروں سے مردوں کے وہ گنگیاں
جن کو پڑھ کر اپنی مٹی کی خوشبو آس پاس محسوس ہوتی ہے

کوئی اپنا نہ رہا	وقاص حسین	زمینداروں کے ظلم کی شکار، ایک عورت کی داستانِ اہم
کسے الزام دوں؟	زرینہ جو نیو	اپنی ماں کے ستم کی ماری ایک بیٹی کی عبرت خیز کہانی
کلمبوی	غزل قریشی	ایک مرد کے چنگل سے آزادی حاصل کرنیوالی عورت کی داستان
مہراں	کشور وسیم	معاشرے کے ظلم کی شکار ایک عورت کی دکھ بھری کہانی
اپنے ہی دام میں	صنوبر عباس اعوان	سو قہلی ماں کے کھودے گڑھے میں گر نیوالی بیٹی کی داستان
مرد	محمد عزیٰ	انظرب سے ہر ایک مرد کی روح میں اترتی داستانِ عجیب
زخموں کا دوا	محمد عزیز مئے	ماں باپ کی غیرت کو تیاگ کر گھر سے بھاگنے والی عورت کی کہانی
سب جائز ہے	عبدالغفار عابد	دولت کی ہوس میں گھری ایک عورت کی عبرت خیز کہانی
حیاتِ جاوداں	محمد علی سدوزئی	دہشت گردی کا شکار ہونیوالے ایک سپاہی کی زندہ کہانی
وہ باتیں تیری	عائشہ وسیم	کراچی سے اپنے نانا کی یاد میں، ایک محبت نامہ

پہلی سچ بیانی

کوئی اپنا نہ رہا

وقاص حسین

زمینداری سسٹم کی شکار ایک عورت کی داستانِ حیات

میرے وجود سے جسے جان نکلی جا رہی تھی اور پھر میں اسی جگہ پر پڑھتی رہتی تھی۔

"وہ نہیں مر سکتی... ابھی تو وہ بہت خوش خوش مٹی تھی یہاں سے، مجھے تو خوش خبری سنا کر گئی تھی وہ۔ ابھی تو اسے جینے کا سہارا ملا تھا، نہیں... یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ نہیں مر سکتی۔" میں بے یقینی کی کیفیت میں بولے جا رہی تھی۔ بھائی نے جب میری یہ حالت دیکھی تو گھر سے پانی بھرا لیا، جیسے پی کر میں کچھ سنبھلی تھی۔ جب میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں فوراً مریم کے گھر کی طرف بھاگی۔ میں جب حویلی کے گیٹ پر پہنچی تو پولیس کی گاڑی باہر کھڑی تھی۔ میں گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہ سامنے صحن کے درمیان میں اپنے نازک سے وجود کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی اور اس کے بے جان جسم پر سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ جب میں اس کی طرف بڑھی تو ایک پولیس والے نے مجھ سے کہا۔ بلا بلا آپ اس کے پاس نہیں جا سکتیں۔"

آنسوؤں نے میری آنکھوں کے سامنے کا منظر دھندلا دیا تھا۔ مجھے کچھ بھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں تو اس کی جیبتی سنبھلی تھی۔

"مجھے اس کے پاس جانا ہے، مگر وہاں..." اس

"آپی... آپی... میں چھوٹے بھائی کی آواز پر کمرے سے باہر نکلی۔

"کیا ہوا کیوں شور مچا رہے ہو...؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "آپی... آپی وہ... وہ..." اس کا ٹونف سے چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔

"اب بول بھی دو کیا ہوا ہے؟" میں نے زور دے کر کہا۔

"وہ... آپی... مریم آپی کا قتل ہو گیا ہے۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"کیا...؟" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ سب جو اس نے کہا میرا دماغ ہے، پھر میں نے بے یقینی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر تصدیق کرنے کی غرض سے پوچھا۔

"کیا کہا تم نے۔"

وہ کہنے لگا۔ "وہ... آپی... مریم آپی کا قتل ہو گیا ہے۔ اس کا بھتیجا ہے نا چھوٹا، وہ پستول سے کھیل رہا تھا کہ اس سے اچانک گولی چل گئی، جو سیدھی آپی مریم کو جا لگی۔" مجھے ایسا لگا جیسے زمین گھوم رہی ہے اور آسمان ابھی میرے اوپر آگرے گا۔ زمین نے میرے پاؤں جکڑ لیے تھے۔ یہ خبر سن کر تو میں بل بھی نہ پادی تھی۔

سب اگھا۔۔۔ کے آنسو ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایہ بوہنے لگی
 آگنی اور اس کی لاش واپس لے گئے۔
 میں چپ چاپ کر سب کو بتا رہا تھا کہ گولی ہے
 سے غلطی سے نہیں چلی ہے۔ بھلا ایک چھ سات سال کا
 بچہ کیسے گولی چلا سکتا ہے۔ عمر میں کس کو بتائی یہ سب

پوچھنے والے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا کہ میں اس کی
 بہن اور انگوٹھی لٹکائی ہوں۔

”تم کو ایک دفعہ سمجھ نہیں آئی۔“ اس نے کہا جانے
 والی نظروں سے میری طرف دیکھا اور مجھے سخت لپکے میں
 کہا۔ ”بھولا بھائی جو یہ۔۔۔ چھپے چھپے آگیا تھا مجھے سمجھ



یاد۔۔۔ یہ اس تو سب کا علم ہے کہ وہی پتے سے نہیں
 پہلی ہے۔ عمر میں ہی طرح سارا کا سارا کاؤں بڑا ہے۔
 ان کے کہہ کر آواز آتا ہے اور اگر کتا بھی تو کس لیے اسے
 انصاف کہاں سے مانا تھا۔ یہاں پر تو سب پانچ دولت
 سے بہرہ مند ہیں۔ دولت ہی سب کے ہوتے تو ان کو

ایسے خوف سے یاد نہ تھا کہ میری دونوں بھائیاں
 اور ان کی بہن اور ان کی بہن کی بہن۔۔۔ یہ میری دونوں
 بہنوں کے زعم و صورت پر رہی ہیں۔ میرے مجھے معلوم تھا
 کہ یہ ان کے خیریت کے آنسو نہیں ہیں۔ ان کے یہ روتے
 ہیں۔ ان کی یہ روتے یہ خوف میرے خوف کے آنسو ہیں۔ یہ

کو بغاوت کی سازشوں کی صورت میں مل گئی تھی۔ آج دولت نے پھر ایک اور جان لے لی اور یہ بتا دیا تھا کہ آج بھی دولت اور جائیداد ہر رشتے اور ہر تاتے سے اونچا مرتبہ رکھتی ہے۔

مریم میری بچپن کی سہیلی تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئی تھیں۔ وہ ہمارے گاؤں کے زمیندار کی بیٹی تھی اور گھر میں سب بہن بھائیوں سے چھوٹی بھی تھی۔ اس سے بڑے اس کے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ باپ اس کا ویسا ہی تھا جیسے زمیندار ہوا کرتے ہیں۔ ظالم اور غرور و تکبر والا، یاں اس کی ماں بہت اچھی، رحم دل اور نرم مزاج عورت تھی۔ چونکہ ہمارے گھر بھی زیادہ دور نہیں تھے۔ اس لیے بچپن ہی سے ہمارا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بہت تھا۔ وہ تین سال کی تھی، جب اس کی امی وفات پا گئی تھی، مریم پڑھائی میں بہت اچھی تھی اور وہ بہت ذہین بھی تھی۔ ہم نے گاؤں کے اسکول سے ہی مڈل تک تعلیم حاصل کی تھی۔ مڈل پاس کرنے کے بعد اسے آگے پڑھنے کی اجازت ملی اور نہ ہی مجھے، کیونکہ مڈل سے آگے پڑھنے کے لیے گاؤں میں اسکول نہ تھا، بلکہ اس کے لیے شہر جانا پڑتا تھا۔ اس لیے ہم دونوں نے ہی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ پڑھائی سے فراغت کے بعد پہلے سے زیادہ دولت ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ گزرنے لگا تھا۔ ہم دونوں تعلیم کلاس کی طالب تھیں، جب اس کی بڑی بہن کی شادی ہوئی تھی۔ جب بارات آئی تو میں نے دیکھا تھا کہ اس کی بہن کا دلہنا اس کی بہن سے دو گنی عمر کا تھا۔ میں نے جب مریم سے کہا کہ یہ تو آپنی سے دو گنی عمر کا ہے تو وہ ہنس کر چپ ہو گئی تھی، اور پھر کچھ دیر بعد اس نے کہا تھا۔ "تم کو تو پتا ہے کہ ہم جٹ لوگ برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے، چاہے لڑکی گھر بیٹھی بیٹھی بوزھی ہو جائے۔ تم کو میری پھر پوچھ رہی تو یاد ہی ہوں گی۔" وہ کہنے لگی تو میں نے کہا۔ "ہاں! مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ وہ ہی نہ جو چھ سات سال پہلے فوت ہوئی تھی۔" اس نے مجھے بتایا۔

"ہاں..... ہاں وہی، وہ فوت نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے خودکشی کی تھی۔"

"وہ کیوں۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ پہلے تو ہانے اس کا رشتہ نہ کیا، کیونکہ برادری میں کوئی لڑکا نہ تھا، پھر پھوپھو سے چند روپے سال چھوٹے لڑکے سے رشتہ طے کر دیا۔ پھوپھو نے بہت انکار کیا، مگر ابا نہیں مانے اور آخر جنگ آ کر انہوں نے اس پرے پنا کر خودکشی کر لی۔ اس طرح کے بہت سے قصے ہیں ہماری برادری میں۔ پہلے لڑکا برادری کا ہو، پھر دولت مند ہو، پھر چاہے عمر زیادہ ہو یا وہ شرابی ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ آدمی ابو کا دوست ہے۔ اس کی بیوی بیوی فوت ہو گئی ہے، دوسرے یہ گاؤں کا زمیندار بھی ہے۔ ہمارے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ابو نے ہی یہ رشتہ طے کیا ہے اور تم کو ابو کا تو پتا ہے نا....." اس نے بڑے دکھ سے کہا۔

اس دن مجھے بہت دکھ ہوا۔ اتنی خوب صورت آپلی اور لن کے ساتھ اتنی بڑی نا انصافی۔ اس دن میں نے دل سے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ ہم دولت مند نہیں ہیں اور میرے والد بھی ایسے نہیں ہیں۔ اسکول چھوڑے ہوئے ہمیں چار سال ہو گئے تھے۔

جب مریم کا والد ہارٹ الیک میں فوت ہو گیا تو اس دن کسی کو بھی اس کے مرنے کا کوئی زیادہ دکھ نہیں ہوا تھا، بلکہ گاؤں والوں نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا کہ مر گیا جان چھوٹی۔ "خس کم جہاں پاک۔"

مریم کے دونوں بھائی بھی اپنے والد کے ہی نقش قدم پر چل رہے تھے اور وہ بھی اسی طرح ہی کے تھے۔ اس کے باپ کے مرنے کے چھ مہینے بعد کی بات ہے جب ایک دن وہ ہمارے گھر آئی تو بہت خوش تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ کوئی خاص بات ہے۔

"جناب خیریت تو ہے نا۔ آج تو آنکھوں میں چاند چمک رہا ہے، ستاروں کی سی روشنی بکھری ہوئی ہے دیکھو میں جناب کے۔" میں نے اس کے گلے میں ہاتھیں ڈالیں۔

"ہو لو کون ہے وہ..... ہو لو..... کون ہے وہ....." میں نے گاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مجھے اس کو دیکھ کر یہ ہی لگا تھا کہ یہ لڑکی کسی کے عشق میں جلا ہو گئی ہے اور پھر اس نے بھی شرماتے ہوئے ایک نام لیا تھا۔

اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ۔۔۔۔۔

پہلے وہ ہمارے گھر روز آتی تھی پھر دو تین دن سے وہ نہیں آئی تھی اور مجھے بھی نام نہیں ملا تھا اس کے پاس جانے کا، پھر میں چوتھے روز صبح ہی صبح اس کے گھر چلی گئی۔ اس کی دونوں بھابھیاں باہر محکم میں بیٹھی ہوئی تھیں، لیکن وہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اس کی بھابی سے پوچھا۔

"مریم کہاں ہے۔" تو انہوں نے بڑی تکی سے کہا۔ "اندروں کی مری ہوئی، دیکھ لو اس کے کمرے میں، وہاں ہی ہوگی اور ساتھ میں اس کو عقل بھی دو کہ ہم اس کا پرانکس چاہتے، اس کا بھلائی سوچ رہے ہیں اور اس کو یہ بھی سمجھا دو کہ جتنا مرضی چاہے رو پیٹ لے، شادی اس کی وہاں پر ہی ہونی ہے جہاں۔۔۔۔۔" اس کی چھوٹی بھابی نے فیسے سے کہا۔ میں پریشانی میں تیز تیز قدم اٹھاتی اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھول کر جب میں اندر داخل ہوئی تو وہ بیڈ پر سیدھی لیٹی ہوئی تھی اور اپنا بازو اس نے آنکھوں میں رکھا ہوا تھا اور سسکیوں سے رو رہی تھی۔

"ارے مریم۔۔۔۔۔ مریم کیا ہوا، کیوں رو رہی ہو تم اور یہ تمہاری بھابی کیا کہہ رہی ہے؟" وہ مجھے دیکھ کر بیڈ سے نیچے اتری اور مجھ سے لپٹ کر اور زور زور سے رونے لگی۔ "میں یہ شادی نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ میں سرفراز کے بغیر مرجاؤں گی۔"

کیا ہوا ہے پہلے یہ تو بتاؤ مجھے۔۔۔۔۔ اس نے پھر زور زور سے روتے ہوئے کہا۔

"میں مرجاؤں گی مجھے بھالو۔"

"ایسا نہ کہو۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اسے روتا دیکھ کر اب میرا دل بھی گھبرا رہا تھا اور میری آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے تھے۔

"اچھا اب بتا بھی وہ آخر ہوا کیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"چھوٹی بھابی اپنے تایا کے بٹے کا رشتہ لے کر آئی ہے۔ وہ نشہ کرتا ہے، شراب پیتا ہے، لیکن اس کے باوجود بھائی بھی شادی کے لیے مان گئے ہیں۔ انہوں نے بھی

"سرفراز۔" یعنی کے میرا شک و دست لگاتا تھا۔

"یہ کب سے چل رہا ہے جناب اور مجھے آج خبر ہو رہی ہے؟" میں نے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"چل تو بچپن سے رہا ہے مگر قول و قرار آج ہوئے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بڑی سی چھپی رستم لگی تم تو۔" میں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"دیکھو میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا ہے بلکہ سب سے پہلے تم کو ہی بتایا ہے۔" اس نے شرارتے ہوئے کہا۔

سرفراز ہمارے ان کاؤں کا تھا۔ وہ میری ہی طرح ایک نارمل گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ایک ذہین اور خوبصورت لڑکا تھا اور وہ شہر میں رہ کر پڑھ رہا تھا۔ وہ وہاں ایف اے کر رہا تھا۔ اس لیے وہ ایک دو ماہ بعد گاؤں کا چکر لگاتا تھا اور پھر جب بھی سرفراز گاؤں آتا تھا۔ مریم سے اس کی ملاقات ضرور ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس محبت کی جڑیں پھیل رہی تھیں اور اب وہ بہت گہرائی میں چلی گئی تھیں۔ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی گئی تھیں۔ وقت چیز کی سے گزرتا رہا اور پھر شاید ان کی محبت کو کسی کی نظر لگ گئی۔ محبت کا جو کام ہوتا ہے، اس نے وہ شروع کر دیا۔

"آپنا۔۔۔۔۔ آپنا۔" چھوٹے بھائی نے مجھے دو تین آوازیں دیں، پھر کہیں جا کر میں اپنے خیالوں سے باہر نکل۔

"آپنا۔۔۔۔۔ وہ آپنی مریم کو لے آئے ہیں۔" میں اپنے کمرے سے باہر نکلی اور پھر مت ہاتھ دھویا اور چادر لے کر مریم کے گھر کی طرف چل پڑی۔ اب بھی سفید چادر سے اس کا وجود ڈھکا ہوا تھا۔ اسے میں دیکھ کر دیوانوں کی طرح اس کی طرف دوڑی تھی۔ سارا گاؤں جانتا تھا کہ ہماری دوستی کتنی پکی تھی۔ گاؤں کی عورتیں ہماری دوستی کی مثالیں دیتی تھیں۔ جب ہم اس کو نہلانے لگے تو ہم نے اس کے جسم پر نیل پڑے ہوئے دیکھے۔ کیا یہ نیل اس بات کی گواہی نہیں ہیں کہ اس کے ساتھ ظلم ہوا ہے؟ اس کے دل میں گولی ماری گئی تھی، مگر یہاں کوئی کیا کر سکتا تھا اور پھر مریم کو منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا گیا۔ میری جان سے زیادہ میرے دکھ سکھ کی سبکی اب

گلے لگ کر رونے لگی۔ سرفراز نے اس کو دلاسا دیا تو وہ چپ ہو گئی پھر وہ دونوں جا کر درخت کے نیچے سائے میں بیٹھ گئے اور میں ان سے تھوڑی دور کے فاصلے پر جا کر ایک درخت کے تنے سے ٹپک لگا کر بیٹھ گئی۔

میں مریم کا فیصلہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔ "یہ کیا کہہ رہی ہے؟ کل تک تو کہہ رہی تھی کہ میں سرفراز کے بغیر مر جاؤں گی اور آج کہہ رہی ہے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد ہم کبھی بھی نہیں ملیں گے۔ جہاں پر میرے بھائیوں نے رشتہ کیا ہے تو میں وہاں پر ہی شادی کروں گی۔"

تم ایسا نہیں کر سکتی مریم۔ "سرفراز کہنے لگا۔ "میں تمہارے بغیر نہیں جی سکوں گا، مجھ پر کچھ تو ترس کھاؤ۔"

"میں تمہارے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل سکتی۔ میں اپنی محبت کی خاطر اپنے بھائیوں کی عزت خراب نہیں کر سکتی۔ میں اپنی محبت کا گانا گھونٹ سکتی ہوں، مگر اپنے بھائیوں کی عزت کا جنازہ نہیں نکال سکتی۔ یہ میری مجبوری ہے کہ میں تمہارا ساتھ اب مزید نہیں دے سکتی۔" مریم سسکیوں کے درمیان بولی۔

"کون سے بھائیوں کی بات کر رہی ہو تم۔" سرفراز تلخ لہجے میں کہنے لگا۔

"جن کو تمہارا کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ جو ایک شرابی سے تم کو بیاہ دے ہیں، تم ان کی عزت کی بات کر رہی ہو۔ جن کو تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ان کو اگر واسطہ ہے تو صرف تمہارے صے کی زمین سے۔ وہ اسی لیے تمہاری شادی ایک شرابی سے کر رہے ہیں، تاکہ وہ زمین میں سے تمہارا حصہ مانگے۔ اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے صرف تم میرے ساتھ چلو، ابھی اور اسی وقت۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتی سرفراز، کوئی بھی وجہ ہو، کچھ بھی ہے، مگر میں مجبور ہوں۔ تم مجھے بے وقاف سمجھو یا کچھ اور مگر میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی، ہو سکے تو تم مجھے معاف کر دینا۔" اس نے سرفراز کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا اور اٹھ کر چل پڑی۔ سرفراز کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک رہے تھے۔ وہاں سے ہم گھر آ گئے اور پھر مریم کی شادی ہو گئی۔

انکار نہیں کیا یہ جانتے ہوئے بھی، بلکہ بھائیوں نے خوشی خوشی ہاں کر دی اور اگلے ہی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی ہے، پھر مجھ پر گھر سے نکلنے پر بھی پابندی لگا دی ہے۔ "وہ ایک دم جیسے پھٹ پڑی۔

"تم نے سرفراز کو بتایا ہے یہ سب۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں بتایا میں نے، کہے جاتی ہیں اس کو؟"

"وہ تو آپنی کو بھی فون نہیں کرنے دیتے۔ تم میرا ایک کام کرو اس نے روتے ہوئے کہا۔

"ہاں بولو۔۔۔ تمہارے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔" میں نے اس سے کہا۔

"تم ایسا کرو کہ سرفراز کو یہ ساری صورت حال بتاؤ اور اس سے کہو وہ مجھے فوراً آ کے ملے۔"

میں نے گھر آ کر سرفراز کو فون کیا اور حالات کے بارے میں بتایا تو وہ کہنے لگا۔ "اس کو کہہ دو کہ وہ بالکل ٹکر نہ کرے، میں شام تک آ رہا ہوں۔" میں نے جا کر مریم کو بتایا کہ سرفراز نے کیا جواب دیا ہے اور پھر وہ اسی شام کو آ گیا۔ اس نے آ کر مجھے فون کیا اور بتایا کہ "میں آ گیا ہوں اور مریم سے کہو کہ کل دوپہر کو وہ گنے کے کھیت کے قریب جو شہوت کا درخت ہے وہاں آ کر مجھے ملے۔"

اگلے دن صبح کو میں اس کے گھر گئی اور اس کو سرفراز کا پیغام دے دیا۔

"ٹھیک ہے، میں دوپہر کو آؤں گی جب بھابیوں سے جانتی ہوں گی، پھر ہم اکٹھے چلیں گے۔" اس کے بعد میں اپنے گھر آ گئی اور دوپہر کا انتظار کرنے لگی، اب دیکھو مریم کیا فیصلہ کرتی ہے اور کیا کرتے ہیں اس کے گھر والے۔۔۔ میں آنے والے حالات کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔

دوپہر کو مریم ہمارے گھر آئی۔ میں نے امی کو بتایا کہ میں مریم کے ساتھ جا رہی ہوں، تھوڑا سا کام ہے۔ میں تھوڑی دیر تک وہاں آئی ہوں۔ گھر سے نکل کر ہمارا نرخ کھیتوں کی طرف ہو گیا۔ دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے کوئی بھی کھیتوں میں نہیں تھا۔ ہم چلتے ہوئے وہاں پہنچے، جہاں پر ہمیں ملنا تھا۔ سرفراز پہلے سے وہاں پر موجود تھا۔ مریم بھاگ کر اس کی طرف بڑھی اور اس کے

اب یہ کھیل شروع ہو چکا تھا۔ ہر دوسرے نئے مریم مار کھا کر گھر آ جاتی اور اس کے بھائی چند ہزار روپے اسے دیتے اور رخصت کر دیتے۔ جائیداد کا حصہ دینے کے لیے اس کے بھائی بھی تیار نہ تھے۔ مریم کے شوہر کو جب بات فنی ہوئی نظر نہ آئی تو اس نے آخر کار مریم کو طلاق دے دی۔

مریم جب بھی ہمارے گھر آتی یا میں اس کے گھر جاتی تو وہ مجھے بتاتی کہ..... بھابھیاں اس کو بات بات پر طعنہ دیتی ہیں اور تھوڑی تھوڑی چھوٹی چھوٹی بات پر لڑتی جھگڑتی ہیں۔ بھائیوں کے سامنے بھی وہ ایسا کرتی ہیں، لیکن بھائی بھی انہیں نہیں روکتے۔ مجھے بتاؤ کہ مجھ سے کہاں اور کیا غلطی ہوئی ہے جو میرے ساتھ یہ لوگ ایسا کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے بھائیوں کی عزت کی خاطر اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا۔ مجھ سے کہتے ہیں کہ تم اپنا گھر نہیں بسا سکی ہو۔" بتاؤ میں انہیں کیا جواب دوں؟ میں بہت تنگ آ گئی ہوں۔ ان کی باتوں سے اور کسی دن بھی خودکشی کر لوں گی۔ اس زندگی سے تو موت اچھی ہے۔" میں نے اس کو حوصلہ دیا اور کہا کہ "ایسی کوئی بے ڈوبی مت کرنا، وقت ایک سا نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت ضرور کرے گا۔ اس کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے، مہر کر دہیں۔"

سرفراز اب گاؤں بہت کم آتا تھا۔ اب کی بار جب وہ رو سینے بعد آیا تو اس کو پتا چلا کہ مریم کو طلاق ہو گئی ہے۔ سرفراز نے ایف اے کرنے کے بعد شہر میں ہی نوکری کر لی تھی۔ جب اسے پتا چلا تو وہ چاول دینے کے بہانے ہمارے گھر آیا اور مجھے کہنے لگا کہ "مریم سے کہو کہ مجھ سے فوراً ملے، اسی جگہ پر جہاں ہم پہلے ملے تھے۔" سرفراز مریم کا دردناک حال سن کر رونے لگا تھا۔ جب وہ جانے لگا، تب تک وہ ایک فیصلہ کر چکا تھا اور پھر اس نے اپنے فیصلے سے مریم کو بھی آگاہ کر دیا۔ اس نے کہا۔ "مریم تم سوچ لو، جو بھی فیصلہ تم کرو گی مجھے منظور ہوگا۔ میں پندرہ دن بعد پھر آؤں گا۔" وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔

مریم نے مجھے بتایا کہ "وہ کہہ رہا تھا، تم میرے ساتھ چلو۔ ہم یہاں سے جا کر شہر میں شادی کر لیں گے

شادی کے بعد جب پہلی بار مریم سے میں ملی تو میں نے اس سے پوچھا۔ "کیسی ہو.....؟" اور تمہارے شوہر کا سلوک تمہارے ساتھ کیسا ہے؟" اس نے جواب دیا۔ "اب تک تو سب ٹھیک ہے۔" پھر کچھ دگ گردہ کہنے لگی۔ "آگے خدا بہتر جانے۔"

"اللہ پاک بہتر ہی رکھے۔" میں نے اس سے کہا۔ پھر وہ چلی گئی۔

اس کے پندرہ بیس دن بعد جب وہ پھر مجھے ملی تو جو کچھ اس نے مجھے بتایا، مجھے جان کر بڑا دکھ ہوا۔ اب اس کے شوہر نے اپنی اصلیت دکھانی شروع کر دی تھی۔ مریم نے مجھے بتایا کہ..... "اب وہ نشہ کر کے آ جاتا ہے اور جب میں کچھ کہتی ہوں تو مجھے غلیظ قسم کی گالیاں دیتا ہے، ماس مسر بھی اسے کچھ نہیں کہتے۔ میرے پاس جتنے بھی پیسے تھے سب کے سب وہ لے گیا اور اب وہ اور بھی مانگتا ہے۔ میں جب انکار کرتی ہوں تو گالیاں اور مارتا بھی ہے۔ اب میں کہاں سے پیدا کروں اس کے لیے پیسے؟ کہاں سے دوں اس کو نشہ کرنے کے لیے روپے۔" وہ مجھے اپنے دکھ سناتا کر روتی رہی اور پھر واپس چلی گئی۔

تین ماہ بعد جب وہ دوبارہ مجھے ملنے کے لیے آئی تو پھر مجھے پتا چلا کہ درحقیقت ایک شرابی اور نشئی سے شادی کرنے کی اصل وجہ کیا تھی؟ سرفراز نے بالکل ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ سب کچھ زمین کی وجہ سے ہوا ہے۔ نشئی سے شادی کرنے کی وجہ دراصل وہ 38 ایکڑ زمین ہی تھی، جو مریم کے حصے میں آئی تھی۔ مریم کے شوہر نے بھی اسی زمین کے لالچ میں شادی کی تھی۔

مریم کے بھائی کا خیال تھا کہ شرابی کہاں سے شادی کر دینے سے وہ حصہ نہیں مانگے گا، لیکن نتیجہ ان کی سوچ سے بالکل الٹ نکلا۔

مریم کے شوہر نے اس دفعہ یہ کہہ کر اسے گھر سے نکال دیا کہ "جاؤ اور اپنے حصے کی زمین لے کر آؤ اور جس چیز کا حصہ بنتا ہے وہ بھی لاؤ۔" مریم کے بھائیوں نے مریم کو چند ہزار روپے دے کر رخصت کر دیا۔ وہ پندرہ دن سکون سے گزرے پھر جب پیسے ختم ہو گئے تو مریم کے شوہر نے اسے پھر مارا اور گھر سے نکال دیا۔

دو ہفتے گزر چکے تھے، مگر ابھی تک گاؤں والوں کو کیا خبر ہوئی تھی، خواہ مریم کے گھر والوں کو بھی کچھ پتا نہیں چلا تھا۔

ڈیڑھ مہینے بعد کی بات ہے، جب ایک دن میں نے پولیس کی گاڑی کو سرفراز کے گھر کے سامنے کھڑے دیکھا۔ میرا دل کسی انہونی ہونے کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور پھر دوسرے دن سارے گاؤں کو پتا چل گیا کہ سرفراز مریم کو لے کر فرار ہو گیا ہے۔ پتا نہیں ان لوگوں کو کیسے پتا چلا تھا۔ اب سارے گاؤں والوں کی زبان پر ایک ہی بات تھی کہ "اگر وہ مل گئے تو چوہدری ان دونوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔" میں جب بھی یہ سب سنتی تو میری جان لہوں پر آ جاتی کہ "اب کیا ہوگا۔۔۔؟"

میں نے ان کو فون کیا تو وہ کہنے لگا کہ ہمیں پتا چل گیا ہے۔ اب گھر والے ہم پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ واپس آ جاؤ۔"

"تو کیا تم لوگ واپس آ رہے ہو۔" میں نے ان سے پوچھا تو وہ کہنے لگے۔ "جب تک یہ ہم کو یقین نہیں دلاتے کہ ہمیں کچھ نہیں کہا جائے گا، تب تک ہم واپس نہیں آئیں گے۔" اس دن کے بعد ہماری بات دوبارہ نہیں ہوئی، کیونکہ انہوں نے اپنا نمبر بند کر دیا تھا۔

دن پر دن گزرتے جا رہے تھے۔ یہی سننے میں آ رہا تھا کہ چوہدری ان کو واپس بلانے کے لیے بہت زور لگا رہے ہیں اور انہیں بہت تلاش کر رہے ہیں، مگر ان کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چلا ہے۔ مریم کے بھائی اور اس کا باپ پولیس کے ذریعے سرفراز کے گھر والوں کو تنگ کر رہے تھے لیکن جب طرف سے چوہدری کا کام ہو گیا تو اس نے ہچانیت کے ذریعے فیصلہ کر دینے کا سوچا۔ میں نے جب کھوج لگایا تو پھر مجھے پتا چلا کہ کل شام کو ہچانیت سے اور پھر ہچانیت میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ سرفراز اور مریم کو کسی صورت بھی واپس بلایا جائے۔ مریم کے بڑے بھائی نے اس بات کی گارنٹی دی کہ ان دونوں کو کچھ نہیں کہا جائے گا اور ہم عزت کے ساتھ مریم کی رخصتی کر دیں گے، جو ان سے غلطی ہوگی۔۔۔ سو ہوگی۔

فیصلے کے ایک ہفتے بعد سرفراز اور مریم گاؤں واپس

اور پھر کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے۔ تم بتاؤ اب میں کیا کروں۔" اس نے مجھ سے پوچھا۔ میں اس کی بات سن کر خاموش ہو گئی، پھر اس نے کہا۔ "اگر میں گھر سے جاؤں گی تو بھائیوں کی بدنامی ہوگی۔" میں کچھ بھی نہ بولی تو وہ بھی خاموشی سے اٹھ کر اپنے گھر کو چلی گئی۔ اس کے بعد میں جب اگلے دن اس کے گھر گئی تو وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی، وہ یہ کہ وہ سرفراز کے ساتھ ضرور جائے گی۔ اس نے کہا کہ "اگر میں کچھ دن اور اس گھر میں رہی تو اپنے ساتھ کچھ کر بیٹیوں کی، اس لیے بہتر یہی ہے تم جا کر سرفراز کو بتا دینا۔" میں نے گھر آ کر سرفراز کو فون کر کے مریم کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ اس میری بات سننے کے بعد کہا۔ "اس کو بتا دینا کہ میں اگلے ہفتے آؤں گا، تم تیار رہنا۔"

ایک ایک کر کے میں اس کے گھر سے تین چار جوڑے کپڑوں کے چپا کر اپنے گھر لے آئی تھی۔ ایک ہفتہ ایسا گزارا جیسے ایک صدی گزرتی ہے۔ عشا کی نماز سے ایک گھنٹہ بعد جب نسل ہو گئی کہ سب گھر والے سو گئے ہیں، تو مریم اپنے گھر سے میرے گھر آ گئی۔ میرے گھر والے بھی سب سو چکے تھے۔ میں نے پھر سرفراز کو فون کیا تو باجی منٹ بعد وہ آ گیا۔ جب ہم نے نسل کر لی کہ باہر کوئی نہیں ہے تو وہ دونوں موٹر سائیکل پر بیٹھ کر چلے گئے اور میں ان کے حق میں دعا کرنے لگی۔

اگلے دن شام کو ان کا فون آیا کہ ہم نے شادی کر لی ہے اور ہم دوسرے شہر چلے گئے ہیں۔ جہاں سرفراز نے آنے سے پہلے کرائے پر ایک گھر لے لیا تھا۔ گاؤں میں ابھی تک کسی کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی کہ مریم گھر سے بھاگ گئی ہے۔ میں صبح کے وقت مریم کے گھر گئی تو مریم کی بھالی نے مجھے بتایا کہ "مریم اپنے ماموں کے گھر گئی ہے۔"

"تنگ بیک واپس آئے گی۔" میں نے پوچھا تو وہ کہنے لگی۔

"پتا نہیں۔" میں مریم کے گھر اس لیے گئی تھی تاکہ مجھ پر یہ لوگ کوئی شک نہ کریں کہ مریم کے بھاگنے میں میرا بھی کوئی ہاتھ ہے۔

رونے لگی۔ میں نے اس کو بہت تسلی دی، مگر میری تسلی کا اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا تھا، ہوتا بھی تو کیسے.....؟
اس کا تو کلشن ہی اجڑ گیا تھا۔ وہ بھڑکی سوکھ گیا تھا جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں اس کا بسیرا تھا۔ ایک دفعہ پھر وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ سرفراز کورات کو بتی دفن کر دیا تھا، کیونکہ میت کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ ایکسڈنٹ کے چار دن پہنچا کہ وہ حادثہ نہیں تھا بلکہ تل تھا، جس کو حادثے کا روپ دیا گیا تھا۔ سرفراز شہر سے گھر کی طرف آرہا تھا۔ جب وہ گاؤں کی طرف آنے والے روڈ پر آیا تو بیک سے کار نے ٹکر مار دی اور کار سرفراز کے پیٹ کے اوپر سے گزر گئی اور اس کی موقع پر ہی موت واقع ہو گئی۔ اس وقت سڑک بالکل سنسان تھی۔ یہ تو سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ سب کیا دھرا جو بددی کا ہی ہے مگر بڑا کوئی بھی نہیں۔

مریم کی طبیعت اب خراب رہنے لگی تھی۔ سرفراز جب سے فوت ہوا تھا تب سے تو وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اب اس کو چکر اور ایسا بھی آنے لگی تھیں۔ دو تین دفعہ میں اس کو گاؤں کی ڈپنسری پر بھی لے کر گئی تھی اور وہاں بھی لے کر آئی تھی۔ آج لیڈی ڈاکٹر نے آنا تھا گاؤں میں۔ مریم کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک تھی، اس لیے وہ اکیلی ہی چلی گئی تھی۔ چیک اپ کروانے کے بعد وہ سیدھی میرے پاس آئی تھی اور آتے ہی اس نے مجھے خوش خبری سنائی تھی۔ بہت عرصے بعد میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی، وہ بہت خوش تھی۔ کہنے لگی۔ ”مجھے آج جینے کا سہارا مل گیا ہے۔ اب میری زندگی بڑے سکون سے گزرے گی۔“ میں نے دل کی گہرائی سے اسے دعا دی تھی کہ اے اللہ پاک اب کی بار اس کو خوشی دے دے۔ مگر کہاں.....؟ میری ہاتی دعاؤں کی طرح یہ دعا بھی قبول نہ ہوئی.....!!! اور خوشیوں کی آرزو لیے مریم منوں مٹی تلے جاسوئی۔ شاید قدرت بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ جھوٹی انا کے حصار میں قید انسانوں کی اس دنیا میں زندہ رہے۔ جہاں جیتے جاگتے انسان کو تا عمر اذیت کی سولی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔

☆.....☆

آگئے۔ مریم اپنے بھائیوں کے گھر چلی گئی اور سرفراز اپنے گھر چلا گیا۔ اس کے بعد مریم کے بھائیوں نے کہا کہ ہم رخصتی ابھی نہیں کریں گے، بلکہ ہمیں اس کام میں تین ماہ سے چار ماہ تک لگیں گے۔

سرفراز چوہدری کی بات پر اطمینان کر کے واپس کام پر شہر چلا گیا تھا اب گاؤں میں ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ مریم کے بھائی بھی خاموش تھے۔ انہوں نے بھی کچھ رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ یہ خاموشی ایک روز بہت بڑا طوفان لے کر آئے گی، اس کی کسی کو بھی خبر نہ تھی۔

”مری سے اب میری بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ جب بھی ہوتی تھی تو وہ اپنی بھائیوں کے سلوک کے بارے میں بتاتی کہ اچھا نہیں ہے، چھوٹی چھوٹی بات پر بھائیوں سے شکایتیں لگاتی ہیں اور مجھ پر ڈانٹ پڑواتی ہیں۔“

مریم کے آنے کے دو ہفتے کے بعد کی بات ہے، جب ایک شام گاؤں میں بہت زیادہ شور اور رونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو بھیجا کہ دیکھ کر آؤ کیا بات ہے۔ پانچ منٹ بعد جب وہ آیا اور کہنے لگا۔

”آئی وہ سرفراز بھائی کا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ فوت ہو گیا ہے۔“ خبر جان لیوا تھی۔ میں نے جلدی سے انی کو بتایا اور خود مریم کے گھر کی طرف بھاگی۔ اس کے گھر پہنچی تو وہ رو رہی تھی اور مجھے دیکھ کر وہ اور بھی زیادہ رونے لگی۔ میں نے مریم کو دلاسا دیا۔ ”مریم خود کو سنبھالو۔“ اس کی بہت بُری حالت ہو رہی تھی اور پھر وہ میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔ میں نے اس کو بیڈ پر لٹایا، پھر میں باہر سے پانی لے کر آئی اور اس کے منہ پر چھڑکا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے اور مجھے اس وقت کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کروں۔ میں بھاگتی ہوئی اس کی بھابی کے کمرے کی طرف گئی اور اس کو بتایا تو وہ کہنے لگی۔ ”مری ہے تو مرجانے دو میری بلا سے۔“ میں واپس مریم کے کمرے میں آ گئی۔ پتا نہیں کتنی دیر تک وہ بے ہوش پڑی رہی جب وہ ہوش میں آئی تو پھر وحالیں مار کر

دوسری مرد کہانی

کسے الزام دوں



زیریںہ جو نیچو

لاہٹی ماں کے ستم کی ماری ایک بیٹی کی عبرت خیز کہانی

www.paksociety.com

www.paksociety.com

مگر آج تک مجھے تو نے کچھ لے کے نہیں دیا۔ میری ضروریات تو جیسے غیب سے پوری ہوں گی اور اس نئی نوپلی دہائی کے خرچے تو دیکھو، گھر کا کوئی کام ہی نہیں کرتی، روزانہ اپنے لیے انگ سے لوازمات بناتی ہے۔ خود بھی کھاتی ہے اور اپنے شوہر کو بھی کھلاتی ہے۔ ابھی ابھی شادی پر اتنا سارا سامان اور کپڑے ملے ہیں، پھر بھی آئے دن کچھ نہ کچھ خریدتی رہتی ہے۔ عزیز مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ چوبیس گھنٹے محنت کرو تم اور عیش اڑائیں تمہارے بھیا بھالی۔ ارے میں پوچھتی ہوں، تجھے کیا نصیب ہوتا ہے۔ روکھی روٹی اور پرانے گھر کی لسی۔

میں نے اپنے بڑے دیورہ رشتی اور اس کی بیوی بیٹا، چورشتے میں میری ماموں زاد بہن بھی گئی ہے، کی بھرپور شکایت لگائی۔ ہماری یہ گفتگو رشتی بھائی نے سن لی تھی اور پھر جیسے میری شامت ہی آگئی تھی۔

”خاموش گندی عورت، بکواس کرتی ہے۔ جلتی ہے میری نئی نوپلی دہائی سے، کیا تو نے اسے اپنے جیسا سمجھا ہے۔ تو تو پر ایسا بچہ پیٹ میں لیے ہمارے گھر آ چکی تھی۔ اگر اس وقت پتا ہوتا تو میں تجھے کلہاڑیوں سے چیر کے رکھ دیتا، بات کرتی ہے بڑی بڑی۔“

میرے دیورہ رشتی نے جب مجھے بچے کا طعنہ دیا

”دیکھو عزیز! اس دفعہ میں چپ نہیں رہوں گی۔ فصل سے جو بھی پیسے آتے ہیں، ان پر زیادہ حق ہمارا بنتا ہے۔ ارے سارا سارا دن تم کھیتوں میں کام تم کرتے ہو اور جب فصل کاٹی جاتی ہے تو سارے پیسے رشتی بھائی لے جاتا ہے اور تمہاری محنت کے پیسوں پر وہ پورا سال عیش کرتا ہے، جبکہ ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگتا۔“

”اس مرتبہ مجھے بھی سونے کے بھسکے بنوا کے دو۔“ میں نے اپنے شوہر عزیز کو کسی کا گلاس چھاتے ہوئے کہا تو عزیز نے ٹھنڈی ساکس لیتے ہوئے کہا۔

”امبر میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ پیسے تو رشتی بھائی کے پاس ہیں۔ کل میں نے اس سے مانگے بھی تھے، مگر وہ کہتا ہے کہ فصل کے سارے پیسے قرضے کی نذر ہو گئے۔ رشتی بڑا بھائی ہے میرا، اگر نہیں دے رہا تو میں لڑ تو نہیں سکتا نا بڑے بھائی سے۔“

”اچھا جانی، ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی قرضے کا بہانہ۔ پہلے تو وہ خود عیش کرتا تھا۔ اب بیوی کی ہر فرمائش پوری کرنے لگا ہے۔“ میں نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں نئی نئی شادی ہے نا اس لیے۔“ عزیز نے کہا۔

نئی شادی تو میری بھی ہوئی تھی۔ یہ پچھنا سال ہے،



جہاں لوگوں کو سانس کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے سخت محنت اور صبر مشقت کرنا پڑتی ہے۔

میرے ماں باپ، بھائی، بہنیں چٹی آن پڑھ ہیں، اوپر سے اللہ تعالیٰ کی یہ خاص مہربانی ہے کہ ہمارے ذہنوں میں خدا نے عقل نام کی کوئی چیز نہیں ٹھوس، اس لیے ہمارا دماغ ہمیشہ خلاؤں میں گھومتا رہتا ہے۔ گھر میں لڑنا جھگڑنا ہم لوگوں کا بہترین مشغلہ ہے۔ ہم لوگ آپس میں تو بھیڑ بکریوں کی طرح لڑتے رہتے تھے، مگر ایک دن بھائی نے ایسا ڈنڈا گھما پا کہ اماں کا بازو ٹوٹ گیا اور وہ کئی دنوں تک بھائی کو بددعا میں اور گالیوں کا داگ سناتی رہی تھی۔

بھائی اور ابا جو کچھ بھی کہتے وہ آنا کا نا خرچ ہو جاتا تھا۔ مجھ سے جو بڑی بہن تھی، اس کی شادی کر دی گئی تھی اور پھر شادی کے دوسرے دن ہی ہماری بہن کا دماغ آؤٹ ہو گیا تھا۔ وہ خود تو پاگل ہو گئی تھی، مگر دو بھائی (یعنی میری بہن کا شوہر) کو بھی ساتھ میں پاگل کر ڈالا تھا اور آج تک اُن دونوں میاں بیوی کا دماغ چلتا پھرتا رہتا ہے۔

جب میری عمر صرف بارہ سال کی ہوئی تھی تو اماں، ابا اور بھائی نے امیر ہونے کے لیے مجھے پچاس ہزار روپے میں بیچ ڈالا تھا اور ان روپوں کے عوض میری منگنی ہمارے ہی خاندان کے عزیز نامی لڑکے سے کر دی گئی تھی۔

مجھے نہ تو منگنی کی خوشی ہوئی تھی اور نہ ہی مجھے شادی کی خواہش تھی۔ وقت اپنی ڈگر پے چلا رہا اور میں بالغ ہو گئی تو میرے سسرال والوں نے شادی کا مطالبہ کیا، مگر میرے بھائی نے ان لوگوں سے چند سالوں کی مہلت مانگ لی تھی۔

ایک دن میرا بھائی احمد ایک لادھیڑ عمر شخص کو ہمارے گھر لے آیا، جس کا نام شرافت بتایا تھا۔ میں نے شرافت کا نام تو سنا تھا، مگر اسے پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

”امیر..... شرافت سے میری دوستی ہو گئی ہے۔ اس لیے میں اسے گھر لے آیا ہوں، تم اچھا سا شربت بنا کر اسے پلاؤ۔“

تو میرے صبر کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ میں روتی ہوئی اپنی چھوٹی جینٹائی کے پاس گئی، تاکہ اپنے طعنے دل کی بھڑاس نکال سکوں۔ میں نے جینٹائی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”سن رہی ہونا باجی نرگس، چھنا برس ہے مجھے اس گھر میں، پھر بھی ان طعنوں سے میری جان نہیں چھوٹ رہی۔ آج بھی رفیق بھائی نے مجھے اس بچے کا طعنہ دیا ہے۔ میں بھی آج اپنی جھولی پھیلا کے خدا کے حضور اس رفیق کو بددعا دیتی ہوں کہ اس کی بیوی کا بھی بچہ پھسلے گا، اس سے بھی ایسی غلطی سرزد ہوگی جو مجھ سے ہوئی تھی۔ باجی تم تو جانتی ہونا کہ میں نے جان بوجھ کر تو گناہ نہیں کیا تھا، پھر بھی یہ سب مجھے طعنے دیتے رہتے ہیں۔“

باجی نرگس نے میری بات کو سن کر صرف اثبات میں سر ہلایا تھا اور میں آنسوؤں کا سیلاب بہا کر واپس اپنے کچن میں آ گئی تھی، کیونکہ ابھی مجھے رات کا کھانا بھی بنانا تھا اور منی کے لیے دودھ بھی تیار کرنا تھا، جس میں میں تین حصے پانی اور ایک چھنا تک مصری ڈالتی ہوں۔

قارئین! انسان غریب ہی سہی مگر اللہ عزوجل کسی کی عزت کو کالک نہ لگائے۔ اگر غلطی سے ایک دفعہ یہ کالک لگ جائے تو دنیا کا کوئی غللول اسے صاف نہیں کر سکتا، انسان مر بھی جائے پھر بھی یہ داغِ ناقیامت قائم رہتا ہے۔

مجھے بھی الہزہن میں ایسی ہی کالک لگ چکی تھی جو ناقیامت اب مٹ نہ سکے گی۔ مجھ سے بھی ایک ایسی غلطی ہو گئی تھی، جو میں کرنا نہیں چاہتی تھی، مگر میری ماں نے مجھے اس غلطی میں ڈبوئے کے لیے اہم کردار ادا کیا تھا۔

قارئین! میں جو کچھ بھی آپ کو سن رہی ہوں، شاید آپ لوگوں کو اس پر یقین آ جائے کہ دنیا میں ایسی باتیں بھی ہیں جو خود اپنی بیٹیوں کو ذلت کی دلدل میں دھکیل دیتی ہیں۔

☆.....☆.....☆

میرا تعلق معاشرے کے انتہائی پچلے طبقے سے ہے۔

"امیر آج آنگن میں پانی کا چمڑکاؤ کر رہا اور چار پائی پر بستر لگا رہا۔"

میں نے ماں کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ پہلے آنگن میں جھاڑو پھیرا، پھر چمڑکاؤ کیا اور اماں کی چار پائی کے بائیں طرف چار پائی رکھ کر اس پر شرافت کے لیے بستر لگا دیا تھا۔

پانی کے چمڑکاؤ سے مٹی کی بھینی بھینی خوشبو اور لٹک پر ہلکے ہلکے بادلوں کے بچ جھلکاتے ستارے اور ٹھنڈی ہوائ نے ماحول کو اور بھی خوشگوار بنا دیا تھا۔ میں مطمئن ہو کر اپنے بستر پر لیٹ گئی تھی۔ میں نے اپنا بازو اپنے چہرے پر کچھ اس طرح رکھا ہوا تھا کہ سامنے والا یوں سمجھے کہ میں گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں، مگر میں جاگ رہی تھی، بازو کی اوت سے میں نے دیکھا کہ اماں آ کے شرافت کے سرہانے بیٹھ گئی تھی اور پھر دونوں کوئی خفیہ گفتگو کر رہے تھے۔ میری چھٹی حس مجھے جھنجھوڑ رہی تھی کہ آج رات ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ مجھے آج نہ جانے کیوں نیند نہیں آ رہی تھی۔ کروٹ بدلتے بدلتے رات کا دوسرا پہر بھی ختم ہونے کو تھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا کہ شرافت میرے سرہانے کھڑا تھا، پھر اس نے اپنا ہاتھ دھیرے سے میرے جسم پر پھیرا تو میں جھٹکتے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

"ہش..... خاموش اندر چلو۔" شرافت نے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو میں خاموشی سے اس کے ساتھ کمرے میں چلی گئی تھی۔ جب ہم کمرے میں داخل ہو چکے تو شرافت نے دروازے کی کڑی لگا دی۔

خوف سے میرا رواں رواں لرز نے لگا تھا، پھر اس نے مجھے اپنی ہانہوں میں سمیٹے ہوئے کہا۔

"امیر میں نے بارہا گوشش کی، پر تم نے کبھی مجھے گھاس بک نہیں ڈالی، مگر آج میں تاکا میں لوٹوں گا۔ یہ پچاس روپے لے لو۔ میں تمہارے لیے ریشمی کپڑے، سلک، کاشن کے سوٹ لاؤں گا۔ میں تجھے عیش کرواؤں گا، بس تم میری خواہش پوری کر دو۔ دیکھو میں کئی مہینوں سے تمہارے لیے خرچ رہا ہوں۔" وہ اپنی دھن میں

بھائی نے آرڈر جاری کیا تو میں شربت بنانے چلی گئی تھی۔ دوسرے دن شرافت واپس چلا گیا تھا۔ تو میں نے جھن کا سانس لیا تھا، لیکن چند دنوں بعد پھر شرافت صاحب تشریف لے آئے تھے۔ وہ بھی سیدھے گھر میں۔ شرافت نے ہمارے گھر کو اپنی ملکیت سمجھ رکھا تھا، لیکن اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سب گھر والوں نے شرافت کو سر پر چڑھا رکھا تھا۔

جب شرافت کا یوں بے حجابی سے ہمارے گھر آنے کا سلسلہ شدت اختیار کر گیا تو ہمارے رشتہ داروں نے بھائی، اماں اور ابا کو بہت کھایا کہ غیر مرد کو ہاتھ کا چھالا مت بناؤ۔ ایسا نہ ہو کہ یہ پھسل کا چھالا کینسر بن جائے اور پھر ہاتھ ہی کا ٹٹا پڑے۔

رشتے داروں کی اس نصیحت کو اماں، ابا اور بھائی نے ایک کان سے سننے اور دوسرے سے نکالنے والا معاملہ بنا ڈالا، جبکہ شرافت کا ہمارے گھر آنا تیزی پکڑتا گیا۔

گرمیوں کا موسم تھا اور دوپہر کے وقت ہم لوگ آرام کر رہے تھے کہ ایک دم شرافت کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اماں اس کے ہاتھ میں آموں کا شاہ پر دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی، جبکہ میں نے کروٹ بدلتے ہوئے دیوار کی طرف مت کر لیا تھا کہ اچانک اماں نے مجھے پکارا۔

"امیر! اٹھ جاؤ شرافت بھائی کے لیے پانی بھر کے لاؤ، بہت گرمی ہے بے چارہ نہا دھولے۔" اماں کی اس بات پر شرافت کا چہرہ مجھے اور شریف دکھائی دیا تھا اور میں جلدی سے اٹھی تھی اور پانی کی بڑی ہالٹی بھر کے آنگن میں رکھ دی تھی۔

شرافت نہا کر تیار ہوا تو اماں اسے کافی دیر بھتی رہی تھی، اس کے بعد شرافت باہر چلا گیا تھا۔

"امیر، دیکھو یہ شرافت ہمارا مہمان ہے۔ پیسے والا آدمی ہے۔ اس کا بہت زیادہ خیال رکھا کرو۔" ماں نے مجھ سے کہا تھا۔

"مگر اماں اس کا روز یہاں آتا مجھے اچھا نہیں لگتا۔" میں نے اماں سے کہا تھا۔ رات ہوئی تو اماں نے کہا۔

"پچاس روپے دیے ہیں۔"
میں نے پلو میں ہاتھ لوٹ کر اپنی منگی میں بند کرتے ہوئے کہا تھا۔
"اجھا اس روپے تم خود رکھو، باقی مجھے دے دو۔
کھانے کو کچھ منگوادوں، گھر میں راشن ختم ہو گیا ہے۔"
اماں نے میرے دوپٹے کے پلو سے بندھے لوٹ کی گرہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔ اس وقت مجھے پچاس کا نوٹ ہزار کا دکھائی دے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

"سنو لڑکی..... اگلی بار پچاس سے کام نہیں چلے گا"
زیادہ لینا ہوگا۔" اماں باہر جاتے ہوئے مجھے ہدایات دے گئی تھیں اور میں اس اگلی بار کا سوچنے لگی تھی۔
"کیا اگلی بار بھی.....؟"

وقت کچھ آگے سرکا اور وہ اگلی بار بھی آگئی۔ اس دن میں نے کوئی احتجاج نہیں کیا تھا۔
جب دو مہینے گزر گئے تو میری طبیعت میں جو حمل پہن محسوس ہو رہا تھا۔ چونکہ میں انبان تھی اور مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ اس اگلی بار کار و عمل کیا ہوگا۔ جب طبیعت زیادہ بگڑ گئی تو میں نے اس ساری صورت حال کا ذکر اماں سے کر دیا تو اماں ایک رشتے دار عورت خاتون کو جسے سب دالی کہتے ہیں کو لے کر آگئی۔ اس عورت نے میرے مرض کی تشخیص کرتے ہوئے اماں سے کہا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔

یہ الفاظ سنتے ہی میرا جس پسے سے شرابور ہو گیا تھا۔ مگر اماں کو ذرا بھر بھی شرم نہیں آئی تھی۔ اگر اماں کی جگہ کوئی غیرت مند عورت ہوتی تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنی۔

اماں نے میری طبیعت کا ذکر شرافت سمیت ان سب لوگوں سے کیا تھا، جن کو وہ اپنا محسن جانتی تھی۔ اب روزانہ ہمارے گھر میں اس حوالے سے ایک میٹنگ ہوتی تھی کہ کیا کیا جائے۔

ارے تم لوگ فکر کیوں کرتے ہو۔ میں تم لوگوں کو ایسا مشورہ دیتی ہوں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔"

دوران میٹنگ چاہتی نادرو نے محفل استعمال کرتے

بولے جا رہا تھا۔
"نہیں شرافت میں نے آج تک تجھے ماما جیسا درجہ دیا ہوا تھا۔ پر تیری یہ حرکت۔" میں نے خود کو اس کے حلقہ طور باز دوں سے چھڑا کر دروازے کی کنڈی کھول دی تھی تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے باہر آ گیا تھا۔
"اماں! وضو اماں۔" میں نے اماں کو بھوڑ ڈالا تھا۔
"کیا ہے کلہوئی آدمی رات کو تجھے کیا تکلیف ہو گئی ہے۔" اماں نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہا۔

"اماں وہ شرافت میرے، وہ مجھے..... بات میرے حلق میں ہی انکس گئی تھی۔ اماں نے جماعی لیتے ہوئے کہا تھا۔
"تو جاؤ جیسا شرافت کہتا ہے دیا کرو اور ہاں پیسے ضرور لے لیتا۔"

اس وقت شرافت کے ہونٹوں پر طعنے مسکراہٹ تھی ہوئی تھی۔ مجھے اماں پر بہت غصہ آیا، پل بھر کو میں نے سوچا کہ ابا اور بھائی کو جگا دوں، مگر شرافت کی پچنگل دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ سارے گھر والے شرافت کے اسیر بن چکے ہیں۔ اس لیے خاموشی سے میں نے اپنا آپ شرافت کے حوالے کر دیا تھا۔

سورج کی تیز شعاعیں میرے بستر پر پڑ رہی تھیں۔ ہر کوئی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا تھا، مگر میں شرم کے مارے بستر میں دبی رہی تھی تو اماں نے میری جسم سے چادر کھینچتے ہوئے کہا تھا۔

"آنکھ جا امبر، دیکھ نہیں رہی سورج سر کو چڑھ آیا ہے۔ تجھے کام کاج نہیں کرنا ہے کیا؟"

ایک مرتبہ میں نے جلائی نگاہوں سے اماں کو گھور کے دیکھا اور کمرے میں چلی گئی تھی۔ تو اماں لپٹائی ہوئی میرے پیچھے اندر آئی اور میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"بتاؤ تو سہی، رات کو کیا ہوا تھا؟"
"وہی جو شرافت اور تیری مرضی تھی۔" میں نے غصے میں کہا تھا۔

"پھر کچھ بھڑا بھی یا خالی ہاتھ۔" اماں نے بھی بے شرمائی سے کہا تھا۔

میرے دونوں بازوؤں میں تین عدد انجکشن ٹھونسنے اور
رخصت ہو گئے۔

مجھے سخت تعجب ہوا کہ یہ کیسا ڈاکٹر ہے جو مرض کی
تشخیص ہی نہیں کر پایا، پھر مجھے چاہی تاہر کا وہ مشورہ یاد
آیا جو میرے شوہر اور ڈاکٹر پرنٹ لگ رہا تھا۔

دوائیوں کے استعمال سے میری طبیعت بحال ہو گئی
تھی اور اس بات پر میں بہت خوش ہو گئی تھی کہ میری ذلت،
عزت میں بدل گئی تھی۔

”امبر کل شام کو گاؤں میں شادی کا فنکشن ہے، تم
ہمارے ساتھ چلنا اور ہاں خود کو خوب اچھی طرح بنا
سنوار لینا، کیونکہ تم لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنی رہو گی،
جی ٹیلی ویژن دہن ہونا اس لیے۔ ہمارے ہاں دلہن کو بڑی
توجہ سے دیکھا جاتا ہے۔ سمجھ رہی ہوں میری بات۔
میری نند نے مجھ سے کہا۔

”جی میں ضرور چنوں گی۔“ میں نے اس کی عزت
انوالی کرتے ہوئے کہا تھا۔

دوسرے دن شام کو میں بن خمن کے دلہن کے
روپ میں نند کے ساتھ شادی کے فنکشن میں چلی گئی
تھی۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے ہوئے چند ہی لمحے گزرے
تھے کہ میری حالت اچانک سے خراب ہو گئی اور سر
چکرانے لگا میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنی نند کا
سہارا لیا میری حالت کا جائزہ لیتے ہوئے میرے
ساتھ بیٹھی ہوئی میری نند کے کان میں ایک عورت
نے کچھ سرگوشی میں کہا تھا۔

”چلو بھابی گھر چلتے ہیں۔“ میری نند نے آواز
جاری کیا تو میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا اور چپ
چاپ گھر چلی آئی تھی۔

گرمیوں کا موسم تھا اور پیدل چلنے سے مجھے شدت
کی پیاس لگی تھی، لیکن مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ میں خود
اٹھ کر پانی چیتی، اس لیے میں چار پالی پر لیت گئی اور میں
نے اپنے شوہر عزیز کو پانی پلانے کا حکم دیا تھا، لیکن چند ہی
لمحوں میں پالی کے بجائے میرے گرد سسرال والوں کا
مجموع کھڑا تھا۔

”اے گندی عورت اٹھ، نکل جا ہمارے گھر سے،
پوری برادری میں ہماری ناک کنواڑی تو نے۔“

ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں! بولو چاہی، میں جانتا ہوں، تم ہمیشہ
کے مشورے دیتی ہو۔“ بھائی نے ایک دم جوش میں آ کر
کہا تھا۔

”جیسا ایسا کر کہ امبر کی جلد سے جلد شادی کروادو۔
مگنی تو پہلے ہو چکی ہے۔ شادی ہو جائے گی تو تم لوگوں
کے سر سے ہٹا دیں گے۔“

”مگر چاہی اس طرح تو ان لوگوں کو ہٹا چل جائے
گا۔“ یہ میرے بھائی نے کہا تھا۔

”ارے نہیں پتا چل، امبر کا مگنی تر بدھو ہے بدھو۔“
اس نے بڑے دھڑکنے سے کہا۔

اگر ان لوگوں نے شور مچایا تو، ہم یہ الزام امبر کے
مگنیتر کے سر پر تھوپ دیں گے۔“ چاہی نے منہ میں
نسوڑا لیتے ہوئے کہا۔

چاہی کے اس مشورے پر ہم سب گھبرائے تو
بہت خوش ہوئے، لیکن اس وقت شرافت کی خوشی
دیدنی تھی۔

بھائی احمد نے میرے سسرال والوں کو پیغام بھجوایا
تھا کہ اس ماہ آ کے امبر کی شادی کی تاریخ بتائی کر چاؤ۔
پہلے تو میرے سسرال والے فکر مند ہوئے کہ یہ کیا ماجرا
ہے۔ جب ہم نے شادی کی بات کی تھی تو چند برسوں کے
لیے ہمیں نالتے رہے تھے اور اب اچانک.....

دوسرے مہینے میری شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی اور
بڑے سلیقے سے میری شادی ہو گئی تھی۔

صبح ہوئی تو میری طبیعت پھر خراب ہوئی شروع
ہو گئی۔ جب میری حالت میرے دیور نے دیکھی تو وہ
ڈاکٹر کو لے آیا۔

”بی بی آپ نے رات کو کھانا کھایا تھا۔“ ڈاکٹر
نے کہا۔

”نہیں ڈاکٹر صاحب۔“ میں نے جوابا کہا۔
”اور ناشتا؟“ میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں
جواب دیا۔

میں نے شرم کے بارے آنکھوں کے اوپر دوپٹا
رکھ لیا تھا۔ اب میں منتظر تھی کہ ڈاکٹر کسی بھی لمحے میرا
بھاڑا پھوڑنے والا ہے، مگر ڈاکٹر صاحب نے

آ جا۔ برادری والوں نے جو بھی فیصلہ سنایا، وہ تم لوگوں کو ماننا پڑے گا۔

رات ہوئی تو اماں اور بھائی فیصلہ سننے چلے گئے۔ فیصلے میں ہمارے خاندان کے چند اہم لوگ موجود تھے۔ "عزیز ہم نے یہ طے کیا ہے کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔ اسی طرح ہماری عزت بچ سکے گی۔" میرے دیور نے کہا۔

"نہیں بھائی، ہم مزدور لوگ ہیں جو بھی جمع پونجی تھی، وہ ہم نے امجد کو دے کے امبر کو خریدنا ہے، اگر میں نے امبر کو طلاق دے دی تو میں دوبارہ بیوی کہاں سے لاؤں گا۔" عزیز بچے ہوئے لمحے میں بولا تھا۔

لعنت ہو تجھ پر۔ اسے تو کیسا بے غیرت ہے، بیوی کو چھوڑنے کا کیا کرے گا؟ کیا اس گندگی کو تو پالے گا؟ رفیق نے عزیز کا گریباں پکڑتے ہوئے کہا تھا اور پھر دونوں بھائی آپس میں لڑ پڑے تھے۔ فیصلے میں موجود سینٹھ فاروق احمد نے دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو رفیق، عزیز اور امجد تم سب لوگ مجھے بڑا تسلیم کرتے ہو نا۔" تینوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا، تو پھر بڑے ہونے کے ناتے میں تمہارا فیصلہ کرتا ہوں اور جو بھی میں فیصلہ کروں گا وہ دونوں فریقین کو ماننا پڑے گا۔

"جی سینٹھ صاحب آپ جو بھی کہیں گے، وہ ہمیں قبول ہوگا۔" رفیق، عزیز اور امجد نے یک زبان کہا تھا۔ "دیکھو بھائی..... جان بوجھ کے لڑکی کی ماں اور بھائی امجد نے رفیق اور عزیز والوں کو رسوا کیا ہے۔ اس لیے امجد کے گھر والوں کو سزا دینا لازم ٹھہرا۔ ان کے لیے سزا یہ ہے کہ امجد کی چھوٹی بہن کی شادی رفیق کے چھوٹے بھائی سے کر دی جائے گی اور انہیں ساٹھ ہزار روپے نقد جرمانہ کی صورت میں ایک مہینے کے اندر دینا ہوگا۔ امجد، اس کا باپ اور اس کی ماں عزیز کے گھر والوں سے معافی مانگیں گے اور ایک ہفتے کے اندر اندر امبر کی ڈیوری کروا کے صرف امبر کو اس کے شوہر عزیز کے حوالے کرنا ہوگا، باقی رہا معاملہ بچے کا، سو بچہ زندہ ہو یا مردہ اب بچے کو اس دنیا میں

میرے دیور رفیق نے با آواز بلند کہا۔ میں نے کسی کو کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم لوگ ٹھہرو میں ابھی اس کی خبر لیتا ہوں۔" میرا شوہر ٹھہرتے ہوئے مجھے کمرے کے اندر لے گیا تھا۔

"اب مجھے سچ سچ بتاؤ۔ یہ سب کیسے ہوا، کس کا ہے یہ گناہ؟ تارو در نہ سب مل کے تیرا تیرہ پاڑا لیں گے۔" میرا شوہر بولنے کے ساتھ ساتھ مجھے لاتیں بھی مار رہا تھا۔

"بتاتی ہوں۔ مجھے چھوڑ دو تو سچ۔" میں نے اس سے دوتے ہوئے کہا تھا۔

جی میں آیا کہ کہہ دوں کہ میں کیا بتاتی تھیں، تم لوگ تو عقل کے اندھے ہو..... مگر میں نے یہ نہیں کہا تھا، بلکہ محل مزاحی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ عزیز میں جو کچھ بتا رہی ہوں، وہ سب سچ ہے۔ مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔" اس گناہ کے لیے مجھے اماں نے اُکسایا تھا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ دیکھنے میں سچی معصوم لگتی ہے تیری اماں۔ اگر تیرا عاشق شرافت تھا تو تو نے مجھ سے شادی کیوں کی، ہم شریف لوگوں کو بدنام کیوں کیا؟"

عزیز کی سسکیاں بندھ گئی تھیں اور وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا تھا کہ عزت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس کے بعد میرے دیور رفیق نے مجھے کمرے نکلنے کا حکم صادر کیا اور میں دو جوڑے کپڑوں کے ٹھڑے میں باندھ کر پڑوس کے بچے کے ساتھ اپنی ماں کے گھر چلی گئی تھی۔

اس عمر میں، میں سستی کم عقل تھی یہ تک نہیں جان پا رہی تھی کہ یہ معاملہ سنگین زرخ اختیار کر لے گا اور اس کا مزاج مجھے تا حیات چکھنا ہوگا۔ میرے لیے تو یہ سب کھیل تماشا ہی تھا۔

چار دن بعد میرا بھائی امجد میرے سرال والوں سے معافی مانگنے گیا تو ان لوگوں نے معاف نہ کیا اور بھائی سے کہا کہ آج رات تمہاری بہن کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا تم لوگ اگر سننا چاہتے ہو تو فیصلے کے وقت

ہیراسائٹ وہ طفلی کیڑا یا حشر ہوتا ہے جو اپنے طور پر زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ کسی دوسرے جاندار کا خون چوس کر گزارہ کرتا ہے۔ انسانوں کے علاج معالجے میں اس قسم کا سب سے مفید ہیراسائٹ یا طفلی کیڑا ایک خاص قسم کی جو تک ہے جسے Hirudo Medicinalis کہتے ہیں۔ اس جو تک کے لعاب میں ایسا چیزیں شامل ہوتی ہیں جس سے جسم کا زخمی حصہ سن ہو جاتا ہے اور خون جمتا نہیں ہے۔ 1991ء میں ڈاکٹر ڈین وٹس کی قیادت میں کینیڈا کے سرجنوں کی ایک ٹیم نے جو تک کے لعاب میں پائے جانے والے ان مخصوص اجزاء (Anticoagulants) سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مریض کی کھوپڑی کو جوڑنے کے لیے کیے جانے والے آپریشن کے دوران خون باہر نکالنے اور اسے جمنے سے بچانے کے لیے جو تک کا استعمال کیا تھا۔ طبی طور پر سب سے مفید اس ہیراسائٹ کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ یہ 27 سال تک زندہ رہتا ہے جو کسی بھی طفلی کیڑے کی سب سے طویل زندگی سمجھی جاتی ہے۔

”بھائی امجد تم مجھ پر غصہ کیوں ہوتے ہو۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ مجھے تو اماں نے کہا تھا اور نہ وہ شرافت اس کو تو مانا کہنے کو دلی کرتا تھا میرا۔“

”تم لوگ پریشان کیوں ہوتے ہو، یہ پیسے میں شرافت سے لے لوں گی۔“ اماں نے بدلتے پہنچتے ہوئے کہا تھا۔

دوسرے دن اماں شرافت سے دس ہزار روپے لے کر آ گئی تھی۔ دوسرے دن صبح کو بھائی میں اور اماں اس عورت کے ساتھ شہر چلے گئے تھے، جس نے پہلے ہی سے لیڈی ڈاکٹر سے بات طے کر رکھی تھی۔ شہر جاتے وقت میں بہت خوش ہو رہی تھی کہ میں آزاد ہونے جا رہی ہوں، اس وجہ سے جس نے میرے لکس کو گندہ کر ڈالا ہے۔ جس نے میرا شوہر مجھے سے چھین لیا ہے، جس نے مجھے رسوا کر رکھا ہے۔

جب ہم لیڈی ڈاکٹر کی کلینک پر گئے تو ہمیں علیحدہ کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا۔

ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد ڈاکٹر صاحبہ نے اپنا چہرہ کراتے ہوئے ماڈرن گالیوں سے ہمارا استقبال کیا تھا، پھر نرمی سے آٹھ انجکشن اور پلس میں ڈرپ لگانے کی ہدایات فرمائی تھیں۔

”اے لیٹ جاؤ۔“ نرس نے لات مارتے ہوئے کہا تو میں رونے لگی تھی۔

”ارے کا ہے کو رو رہی ہے۔ اس وقت تو رونا نہیں آیا

آنا چاہیے یا نہیں چاہیے۔ یہ سب کیسے ہوگا، یہ مسئلہ امیر کے بھائی امجد اور ماں کا ہوگا، کیونکہ یہ سب کیا دھرا ان دونوں کا ہے، لہذا یہ سزا امجد اور اس کی ماں کے لیے کافی ہوگی کہ ایک جیتے جاگتے پھول جیسے بچے کا اپنے ہاتھوں میں کر دیں۔“

یہ فیصلہ دونوں فریقین نے بہ خوشی قبول کیا تھا۔ اب ایک ہفتے کے اندر میری ڈیوری ہوئی تھی۔ کئی لیڈی ڈاکٹر ز سے بھائی نے بات کی، مگر میرا کیس کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں لے رہی تھی، کیونکہ ہم جاہل لوگوں کا کسی پڑھے لکھے آدم زاد سے مراسم تو تھے نہیں۔ اسی بھاگ دوڑ میں چار دن گزر گئے تھے۔ میری بدنامی کی خبر پورے گاؤں میں جنگ کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔

ہمارے گاؤں میں ایک ایسی عورت تھی جو چوتھیں گھنٹے ڈاکٹر ز کے رابطے میں رہتی تھی۔ بھائی نے جا کر اس عورت سے بات کی تو اس نے اُمید بند حالی کے ہمارا کام ہو جائے گا، مگر اس کے لیے ہمیں دس ہزار روپے کا قبل از وقت انتظام کرنا ہوگا۔

ہمارے پاس دس ہزار روپے نہیں ہیں۔“ شام نے امیر۔ بھائی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا تھا۔

بھائی کا غصہ میں ضبط نہ کر سکی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو وہاں تھے۔ میں نے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے بھائی سے کہا تھا۔

وقت میں بھول گئی تھی کہ یہ شرافت کے گندے خون سے بنا ہے، یہ حرام و ناپاک ہے۔ یہ ناجائز ہے۔ اس وقت مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا تھا۔

میں نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھایا ہی تھا کہ اچانک کسی مرد کے ہاتھوں نے میرے ہاتھوں سے اسے چھین لیا۔ میں نے پلکیں اٹھا کر دیکھا تو وہ مجھے اپنا نظر آیا، میرا بھائی احمد۔

”بھائی اسے کہاں لے جا رہے ہو۔“ میں نے اسے روکنے والے انداز میں کہا تھا۔

بھائی نے مڑ کے میری طرف دیکھا اور صرف اتنا کہا تھا۔ ”چپ“

اسی ”چپ“ کے ایک قلم نے مجھے میری اوقات یاد دلادی تھیں۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ مجھے شرافت کی زندگی گزارنے کے لیے اپنی اولاد کو خود سے جدا کرنا ضروری ہے۔

کوئی آدمی کھٹے بعد بھائی خالی ہاتھ لوٹ آیا تھا، تو میں نے اپنے زندہ وجود کو خالی خالی محسوس کیا تھا۔

”چلو امیر میں تمہیں تمہارے شوہر عزیز کے پاس چھوڑ آؤں۔“

بھائی نے مجھے سہارا دے ہوئے کہا تھا۔ عزیز کا نام سننے ہی میری جان میں جان آ گئی تھی۔

جب میں سسرال پہنچی تو سب نے مٹی بھر کے گالیوں سے اپنی بھڑاس نکالی مگر میں حیرت کدہ سے اس وقت باہر نکل گئی، جب عزیز نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔

”کیسی ہوا امیر، کیا کھاؤ گی۔“

☆.....☆.....☆

آج میں عزیز کے چار بچوں کی ماں ہوں۔ میرا شوہر مجھے کبھی طعنہ نہیں دیتا، وہ میری بہت عزت کرتا ہے۔ جیسی تو میں کہتی ہوں کہ میرا شوہر اللہ میاں کی گائے ہے۔

ہاں انگریز مجھے وہ گلابی چہرہ اور معصوم آنکھیں نہیں بھولتیں جو ایک لمحے کو میری طرف اٹھی تھیں اور پھر پھرے کے کسی ڈھیر میں گم ہو گئیں۔

☆.....☆.....☆

ہوگا جب۔۔۔۔

مرد وائف نے میری ٹانگ کھینچتے ہوئے کہا تو میری حالت غیر ہونے لگی تھی۔ میں کئی گھنٹوں تک آنکھیں بند کر کے لیٹی رہی۔ مسلسل سیدھا لیٹنے سے میری کمر آگ کا گولہ بن چکی تھی۔ میں نے اٹھ کے بیٹھنا چاہا، ابھی آدھا جسم اوپر کیا ہی تھا کہ شہاد کی آواز کے ساتھ لپکتی چلی گئی تھی۔ یہ شہاد کی آواز اس تھپڑ کی تھی جو مرد وائف نے مجھے رسید کیا تھا۔ صبح سے لے کر رات تک، ڈاکٹر کے بعد نرس، نرس کے بعد مرد وائف مجھے چھتے دار گالیاں سناتی رہیں اور ساتھ مجھے انگلشن بھی چھبوتی رہی تھی، پھر اچانک درد ایسا بڑھا کہ میری چیخ نکل گئی تھی۔ شدت درد سے میری دوسری چیخ نکلی تو اماں نے میرے منہ میں میرا ہی دوپٹے کا پلوٹھوس دیا۔ یہ وہی پلوٹھا جس میں میں نے شرافت کے دے ہوئے پچاس روپے باندھے تھے۔ میری کمر کی پیش نے مجھے بے قرار کر ڈالا تھا۔ میں نے دوسری مرتبہ اٹھنے کی کوشش کی تو لیڈی ڈاکٹر نے اپنے نرم و گداز ہاتھ سے کھینچ کر پھیر مارا تھا۔ اس وقت وہ نرم گداز ہاتھ مجھے لوہے کا محسوس ہوا تھا۔ ایک تو درد دہشتی اور دوسرے زوردار تھپڑ نے مجھے ادھ موا کر ڈالا تھا اور میرے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

مجھے اس وقت ہوش آیا جب میرے کانوں نے سنا۔ ”باشا مالہ بیٹا ہوا ہے۔“ یہ اس عورت کی آواز تھی جس کو ہم ساتھ لے گئے تھے۔

بیٹے کا سننے ہی میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو میری نظر سیدھی جا کے بچے پر ٹھہر گئی تھی۔

لیڈی ڈاکٹر نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں اٹھ کے بیٹھ گئی اور میں اس وقت اپنا سارا درد و غم بھول گئی تھی۔

اس کا گلابی رنگ، کالے گھنے ہال، وہ کسی معصوم شہزادے سے کم نہ تھا۔ وہ زندہ تھا۔ میں نے اس کے نرم جسم کو چھوا تو اس نے میری طرف دیکھا بھی تھا۔

میں نے اسے گود میں لینا چاہا، کیونکہ میں اس کی ماں تھی اور میں نے اسے اپنے پیٹ میں سنبھالا تھا۔ اس

تیسری سچ بیانی

کلمو ہی

غزل قریشی

ایک مرد کے چنگل سے آزادی حاصل کر نیوالی عورت کی داستان

چھوٹا بڑا میر سے اخلاق کا گرویدہ تھا۔ بڑی بوڑھیوں سے ہمیشہ میں نے دعا لی ہے۔ کبھی کسی مائٹے والے کو خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹایا۔ اگر کوئی مجھ سے ایسی چیز بھی مانگ لیتا جو اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہوتی تھی، تو میں کسی اور سے ادھار مانگ کر اس کو دے دیتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھ سے بھی انکار نہیں ہوتا تھا۔ اس بات پر میری امی ہمیشہ مجھے باتیں سنایا کرتیں، کیوں کہ اکثر لوگ میرے اس خلوص کا ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے اور ان کے نزدیک میری یہ خوبی ہی میری سب سے بڑی خامی تھی۔ اتنی عمر ہونے کے باوجود بھی مجھ میں لوگوں کو برتنے کا سلیقہ نہیں تھا۔ میں ہمیشہ لوگوں کی چالاکی اور ان کی اداکاری کو ان کی سادگی اور محصومیت سمجھ کر ہمیشہ ان کے دھوکے میں آ جاتی تھی اور اپنی کئی غلطیوں کا استعمال شدہ قیمتی اشیاء بلا چوں چرا ان کے حوالے کر دیتی تھی اور شاید اپنی اسی بڑی خامی کی وجہ سے میں اپنے سسرال والوں کی مکاری اور فریب کاری کو نہیں سمجھ پاتی۔ اپنی سادہ طبیعت کے پیش نظر میں سمجھتی رہی کہ وہ مجھے اپنا سمجھ کر میری غیر استعمال شدہ قیمتی اشیاء استعمال کرتے ہیں۔

یہ عقدہ تو مجھ پر بعد میں کھلا کہ وہ تو مجھے دونوں ہاتھوں سے لوٹ کر مجھے قیمتی دامن کر کے واپس مجھے میری

میرا نام انیل ہے۔ میں ضلع اہلٹ آباد کے ایک خوب صورت گاؤں کی رہنے والی ہوں، جہاں ہر طرف ہنرہ ہی ہنرہ ہے۔ پیمانہ ہر طرف ہریالی کی چادر اور مجھے ہیں اور میدانوں میں کھیتوں نے ہنرہ کی چادر بچھائی ہوئی ہے۔

ہم سات بہنیں ہیں، جبکہ ہمارا بھائی کوئی نہیں ہے۔ میری امی کو لڑکے کی شدید خواہش تھی، اس کے لیے انہوں نے کوئی بچہ فقیر اور کوئی دم درود والا نہیں چھوڑا، مگر خدا کو شاید منظور نہیں تھا۔ آخر مایوس ہو کر انہوں نے ہم بہنوں پر ہی ساری توجہ مرکوز کر لی۔

ہمارے باپا سعودیہ کے ایک پیارے سے شہر میں ہمارے لیے دن رات محنت کر رہے ہیں۔ ہمارے باپا نے کبھی ہمیں لڑکوں سے کمتر نہیں سمجھا اور ہماری ہر خواہش پوری کی اور کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔ میں اپنی بہنوں میں سب سے بڑی ہوں، مجھ سے چھوٹی چھ بہنیں ہیں۔

میں اپنی بہنوں میں سے سب سے زیادہ خوب صورت اور خوب سیرت ہوں، مگر میں نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا، بلکہ ہر اپنے اور غیر سے بہت اخلاق اور محبت سے ملتی ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اسی لیے ہر

ہونے لگا، مگر امی تھیں کہ پھر بھی ہر وقت اس کے کاموں میں لگتی رہتیں۔

جازی چوں کہ میری عمر کا تھا، سو امی ابو کا ارادہ تھا کہ جازی کو بیٹا بنانے کے ساتھ ساتھ اسے میرا شوہر اور گھر والا بھی بنادیا جائے اور یہ بات جازی کو شروع دن سے معلوم تھی۔ جازی اس فیصلے پر پہلے خاص خوش نہیں تھا، مگر میں نے والدین کی رشتہ پر خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔ جازی اچھا لڑکا تھا، اس میں سوائے نیک چیز سے بچنے کے کوئی خاص نہ اپنی نہیں تھی۔ دو ہمارے گھر دو سال رہا اور پھر ایک دن وہ ہم سب کو چھوڑ کر اور سارے تعلق رشتے ناستے توڑ کر اپنے والدین کے پاس واپس چلا گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے والدین کے ہوتے ہوئے دوسروں کو ایسے اپنا ماں باپ تسلیم کر لے۔ اسے تو میرے اور اپنے رشتے پر بھی اعتراض تھا، اس لیے اس نے اس تعلق سے بچنے کے لیے سارے رشتے ہی ختم کر دیے اور گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ میری والدہ جنہوں نے بیٹ جازی کو اپنی سگی اولاد سے بھی بڑھ کر چاہا تھا، اس کی اس بے انتہائی پر غور کردہ کنیں۔ صدمہ تو میرے والد صاحب کو بھی بہت

دلیر پر پہنچانے کے چکروں میں ہیں، مگر میری بد نصیبی کہ مجھے یہ بات اس وقت سمجھ آئی جب کمان کا آخری تیر اپنے وار کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو اپنی بد نصیبی کی داستان سنوں، میں آپ کو اپنے ماضی میں لے جاتی ہوں جہاں سے میری بد نصیبی کا آغاز ہوا۔

ہم چوں کہ سات بہنیں تھیں، ہمارا کوئی بھائی نہیں تھا اس لیے میری امی نے اپنے ایک بھائے کو اپنی بہن سے بچنے کا عقدوں پر لکھوا کر عدالت کے ذریعے اپنا قانونی بیٹا اور وارث بنا لیا۔ میرا وہ کزن اچھا زاحمد عرف جازی بہت ہوشیار اور چالاک تھا۔ اس نے آتے ہی ہم سب پر اپنا رعب جمانا شروع کر دیا اور ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے لگا جیسے کہ وہی سچ مچ کا ہمارا سرپرست اور ہمارے گھر کا اصل وارث ہو۔ امی سے بھی وہ اپنے لاڈ اور نفرتے اٹھواتا اور امی بھی سکے بیٹوں کی طرح اس کے ناز و نخرے اٹھاتی تھیں۔

وہ ہر وقت فرمائشیں کر کے امی کے ناک میں دم بٹے رکھتا اور فرمائشیں بھی ایسی کہ امی کا شوکر اور بلڈ پریشانی



یوں کہ معنی کے کچھ دنوں بعد ہمارے گھر ایک انجان نمبر سے کال آئی، فون میں نے ہی اٹینڈ کیا تھا۔ دوسری جانب کوئی لڑکی بات کر رہی تھی۔

اس نے اپنا تعارف میرے دوسرے منگیتری منکوح کے حوالے سے کرایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ "میں اور تمہارا منگیتری شاہ زیب کورٹ میریج کر چکے ہیں، مگر شاہ زیب اپنے مکان کی تیاری تک (جو کہ میرے نام پر بن رہا تھا) اس شادی کو راز رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے والدین چوں کہ اس کی اپنی پسند سے شادی کرانا چاہتے ہیں اس لیے انہوں نے تمہارا انتخاب کیا، مگر یاد رکھنا شاہ زیب تم سے کبھی شادی نہیں کرے گا، کیوں کہ وہ مجھ سے شادی کر چکا ہے اور جلد ہی وہ مجھے اپنے والدین سے ملوائے گا۔ اگر وہ والدین کی نافرمانی کی وجہ سے تمہیں بیاہ کر گھر لے بھی آیا تو تمہاری اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہوگی اور ویسے بھی جس کی دل میں جگہ نہ ہو اس کی گھر میں جگہ ہونے سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ میرا خیال ہے تم میری بات سمجھ گئی ہوگی۔ اگر تمہیں اپنی زندگی کی خوشیاں اور عزت چاہیے تو شاہ زیب سے تعلق ختم کر لو، ورنہ ہمیشہ ہیٹ کے لیے پچھتاوے تمہارا مقدر بن جائیں گے۔ ویسے تو شاہ زیب بھی جلد اپنے والدین سے بات کرنے والا ہے، مگر بہتر ہے کہ انکار تمہاری طرف سے ہو۔ میری ان باتوں کو جھوٹ مت سمجھنا۔ اگر یقین نہ آئے تو شاہ زیب سے خود بات کر لو اور تسلی کر لو اوکے۔" اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں جو دہریسور تھا بے کھڑی تھی، اس کی باتیں سن کر گویا میں پتھر کا منہ بن گئی تھی۔ میں اس سے کہنا چاہتی تھی کہ یہ سب جھوٹ ہے، بلکہ اس ہے، مگر ذکاوت سے اور بے یقینی نے گویا میری قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ میں حواس باختہ ہو کر گویا زمین پر بیخ کی طرح گڑ گڑ گئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد جب مجھے کچھ ہوش آیا تو میں دھماڑی مادہ مار کر رونے لگی۔ میری آہوں پر ان کی سمیت تمام باتیں اپنے اپنے کمروں سے بھاگتی ہوئی آئیں اور میرے رونے کی وجہ دریافت کرنے لگیں۔

روتے روتے میں نے بڑی مشکل سے امی کو فون والی لڑکی کی تمام گفتگو بتادی، پہلے تو امی کو یقین نہیں آیا۔ امی اسے کسی دشمن کی چال کہتی رہیں، مگر جب تھوڑی دیر

تھا، مگر وہ مرد تھے، ہاں ستر تھے۔ دل ہی دل میں بہت کڑھتے رہے مگر زبان سے کبھی ایک لفظ نہیں کہا۔

مجھے بھی اس رشتے کے ختم ہونے پر بہت افسوس ہوا۔ کچھ عرصہ تک تو ہم سب لوگ جانی کے لیے اُداس رہے، مگر پھر آہستہ آہستہ سب ہی اس کے بغیر رہنے کے عادی ہو گئے۔

اب میں نے بھی اپنی تعلیم مکمل کر کے سلائی، کڑھائی، کھانا پکانا اور دیگر امور خانہ داری وغیرہ بھی سیکھ لیے تھے، اس لیے امی مجھے بیاہنے کی فکر میں تھیں۔ وہ جلد سے جلد میرے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں، کیوں کہ میرے بعد میری باقی بہنیں بھی شادی کی مناسب عمر تک پہنچ چکی تھیں۔ یوں تو رشتے بہت آ رہے تھے، مگر امی کسی اچھے رشتے کی تلاش میں تھیں۔ آخر کار ایک چند خواتین جو کئی ماہ سے رشتے کے لیے مصرتھیں، امی نے انہیں ہاں کر دی دی۔ لڑکا ہماری ذات برادری کا تھا۔ اچھا، خوب صورت، پڑھا لکھا اور ہر سر روزگار۔ امی کو اور کیا چاہیے تھا۔ امی نے تھوڑی سی چھان بین کے بعد باقاعدہ رشتہ بٹا کر دیا۔ دعائے خیر کے چند دن بعد دھوم دھام سے منگنی ہوئی۔ لڑکے کی والدہ نے میرے دائیں ہاتھ کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی پہنائی اور کئی ہزار ہزار کے نوٹ میرے دوسرے ہاتھ میں تمہا دیے۔ لڑکے کی دونوں بہنوں نے بھی دو دو ہزار مجھے مہر کے طور پر دینے چاہتے ہوئے لڑکے کی ماں اور بہنیں بہت دیر تک اپنے اپنے بچے اور بھائی کے ساتھ خوش رہنے کی دعا میں اصرار کرتی رہیں۔

ہمارے محلے کی کچھ عورتیں اور لڑکیاں میری اتنی اچھی سانس مندوں کو دیکھ کر میری قسمت پر رشک کرنے لگیں اور کچھ تو حسد کے مارے انہی سیدھی باتیں بھی کرنے لگیں، مگر ہم گھر والوں میں سے کسی نے کسی کی بات پر کان نہیں دھرے کہ زمانہ تو ہمیشہ سے دوسروں کی خوشیوں پر جلتا اور حسد کرتا آ رہا ہے۔ مگر اس وقت مجھے کیا مظلوم تھا کہ یہ خوشیاں، خوش نصیبی صرف چند دنوں کی مہمان تھیں اور لوگوں کی نظر تو میرے کو بھی راکھ کر دیتا ہے اور پھر میری خوشیوں کو بھی لوگوں کی نظر کھا گئی۔ حسد کرنے والوں کا دلی ارمان پورا ہو گیا اور دوسری مرتبہ پھر میری یہ نسبت بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی۔ ہوا کچھ

آئندہ آنے والی نسلوں تک منتقل کرتے جاتے ہیں۔

تیسری مرتبہ پھر جب قسمت نے میرے دروازے پر دستک دی تو کچھ خیل و جھت کے بعد میں نے بند دروازہ کھول لیا دیا اور آنے والے کو خوشی سے خوش آغوش کیا، صرف اس لیے کہ شاید اس بار قسمت مجھ پر کوئی عنایت کرے ڈالے، شاید تقدیر اس شخص کے ہاتھوں میرے پرانے دکھوں کا مداوا کر دے اور شاید میری خزاں بھری زندگی میں پھر سے بہار آ جائے۔

آنے والا پاک فوج یعنی آری کا خوب صورت کرنل جوان تھا، فطرتی خوب صورت شخصیت و بیاضی بیارا نام۔ میری بہنیں اور میری کزنز جتنی کہ محلے والی دوستیں بھی کہتی تھیں کہ ”ندیم احمد اس دنیا کا نہیں پرستان کا شہزادہ ہے، ایسا شہزادہ جو راست بھول کر زمین پر آ گیا ہو۔“

میں تو یہ سب سن کر نازاں ہو گئی اپنی تقدیر پر۔ بھول گئی وہ سارے محلے فکروے جو مجھے اپنے نصیب سے تھے۔ مجھے ندیم احمد جیسا شخص مل جائے اسے تو گویا ساری کائنات مل جاتی ہے۔ کہانیوں، قصوں اور ڈراموں کے ہیرو تو سب ہی اس کے سامنے زیر و تھے، ہیرو تھا تو صرف ندیم احمد۔ (یہ میرا اس وقت کا خیال تھا)۔

ندیم کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ ماں تھی، سر تھے یعنی کے ندیم کے والد، مگر ان کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ کیوں کہ سارا اختیار تو ندیم کی ماں اور بہنوں کا تھا۔

ندیم کی ماں اور بہنیں بہت تیز اور شاطر تھیں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ہم سب سمیت گھر کا ایسے جائزہ لیتیں جیسے انہیں کسی نے ہماری جاسوسی پر نگ رکھا ہو۔

ہمارے سامنے پیشے کے انداز، چلتے پھرتے، باتیں کرنے کا انداز، ہماری چال و حال ہر ایک پر خاص نظر ہوتی۔

مجھ سے تو انہیں کچھ خاص ہی توقعات تھیں۔ ماں سے بھی وہیں زیادہ تیز تھیں، مگر مجھے کچھ خاص پروا نہیں تھی، کیوں کہ ندیم کے تصور نے مجھے بہت مضبوط بنا دیا تھا۔

پلا خڑا بڑھ دو ہوا میں میری اور ندیم کی محنتی طے پائی، ہم لوگوں نے ندیم کے گھر والوں سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ پچھلی دواؤں عقیبوں کے ٹوٹنے کی وجوہات سب سچ سچ بتا دیں تاکہ بعد میں انہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔ اس مرتبہ بھی محنتی دھوم دھام سے ہوئی

بعد اسی نے شاہ زیب کے نمبر پر شاہ زیب سے بات کی تو پہلے تو شاہ زیب انکار کرتا رہا، مگر جب امی نے فون والی لڑکی کا نام پتا بتایا تو شاہ زیب کچھ بوکھلانے لگا۔

امی نے شاہ زیب کو کھری کھری سنائیں اور فون پر عیارت ختم کر دیا۔ شاہ زیب کی تو مشکل ختم ہو گئی تھی، مگر مجھ پر تو قیامت ٹوٹ پڑی تھی اور میں خود کو منحوس سمجھنے لگی تھی۔ پتا نہیں میرا نصیب مجھ سے کیوں روٹھ گیا تھا۔ مجھے اپنی بد نصیبی سے ڈر لگنے لگا اور میں ہر وقت یہی سوچتی رہتی کہ ”کہیں میری قسمت کا سایہ میری بہنوں پر نہ پڑ جائے۔ کہیں ان کے لیے آنے والے رشتے میری وجہ سے واپس نہ لوٹ جائیں، کہیں میری بد نصیبی کی سزا انہیں نہ ملے۔“

بہنیں بھی میں سوچتی پتا نہیں مجھ سے ایسا کون سا بڑا گناہ ہو گیا ہے کہ جس کی مجھے اتنی بڑی سزا مل رہی ہے۔ میں نے تو آج تک کسی کا دل نہیں دکھایا تھا، کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی، پھر مجھے یہ سزا کیوں؟

دوسری منگنی کے ٹوٹنے سے میں بہت دل برداشتہ اور غمگین ہو گئی تھی اور تنہائی پسند بھی۔ اب گھر سے باہر نکلتا عذاب لگتا تھا۔ عورتوں کی عجیب و غریب باتیں، مجھے دیکھ کر آپس میں چہ میگوئیاں کرنا، میرا جی چاہتا لوگوں کی نظروں سے کہیں دور چلی جاؤں، مگر میں جتنا لوگوں سے بچتی لوگ اتنا ہی مجھے احساس دلاتے کہ میں وہ منحوس لڑکی ہوں جو اپنے گھر کی دلہیز پر سائبان کر بیٹھ گئی ہوں۔

مجھے تو لگتا تھا لوگوں کی باتیں اور طنزیہ نظریں ایک دن مجھے زندہ دگر کر دیں گی، اب تو میرے اپنوں کے رویوں کی تہہ پٹی نے بھی مجھے بہت حساس بنا دیا تھا۔ تین سال تقریباً اسی عذاب میں گزر رہے، اس دوران رشتوں والے تو آتے جاتے رہے، مگر وہ کہتے ہیں نہ کہ ”دودھ کا جلا چھا چہ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔“ اس محاورے کی مصداق ابھی میرے والدین کوئی فیصلہ کرنے سے گھبرارے تھے، مگر تقدیر ایک مرتبہ پھر میری دلہیز پر ایک نئے کھیل کے لیے دستک دے رہی تھی۔

دکھ ختم نہیں ہوتے، ہاں البتہ کم یا دم ضرور ہو جاتے ہیں۔ ان کی کسک ہمیشہ بھی ان بھی راکھ کی طرح دل میں اٹلی ہی تپش ضرور زندہ رکھتی ہے۔ ہم اگر بھول بھی جائیں تو لوگ ہمیں بھولنے نہیں دیتے، بلکہ ہر قصہ، ہر واقعہ اپنی

پر بٹھایا، جہاں میں پاؤں رکھتی وہاں وہ ہتھیلی رکھنے کو تیار دکھائی دیتیں۔ شادی کی دعوتوں کے بعد ہم دونوں اپنی سون منانے اسلام آباد بھی گئے۔ وہاں کے خوب صورت لکھات اور یادوں کو ہم اپنے کمرے میں مقید کر کے ساتھ لے آئے، چوں کہ ندیم کی پوسٹنگ آج کل اسلام آباد ہی میں تھی اس لیے ندیم نے مجھے اپنے کئی دوستوں سے بھی ملوایا۔ ان کے سب ہی دوستوں اور ان کی بیگمات نے میری بہت تعریف کی اور مجھ سے بہت متاثر ہوئیں۔ تقسیم اعزازات کی ایک تقریب میں بھی ندیم مجھے ساتھ لے کر گئے، وہاں پر بھی بہت سے لوگوں نے ہماری جوڑی کو بہت سراہا۔ ایک ماہ کی چھٹی کب ختم ہوئی، ہمیں پتہ ہی نہ چلا۔ دونوں ہی اُداس ہو گئے، مگر ندیم نے مجھے کچھ حوصلہ بھی دیا کہ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ ہر رات کی شام کو گھر آ جایا کریں گے، مگر اسے قسمت کی خرابی کہیے یا میرے سسرال والوں کا منصوبہ کہ جلد ہی ندیم نے مجھے یہ خبر دی کہ وہ ڈیوٹی سخت ہونے کی وجہ سے اب مہینے دو مہینوں بعد ہی گھر کا چکر لگا سکے گا۔ وہ بھی دو تین دن کے لیے۔ میں اس خبر سے سخت اُداس ہوئی، مگر میری سادہ دلی کہ میں آنکھیں بند کیے ہر بات پر یقین کرتی چلی گئی، بغیر کسی احتیاج کے، پھر ہمیں سے میری بد نصیبی کا آغاز ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میری ساس تندوں کے رویے بدلنے لگے۔ میری غیر استعمال شدہ اشیاء پر میری تندیں قبضہ کرنے لگیں، میرا زیور چوری کر لیا۔ ندیم کو میرے خلاف اتنا بھڑکایا گیا کہ وہ فون پر بھی میری بات سننے کا روادار نہ تھا۔

ڈیڑھ ماہ بعد جب دو تین دن کے لیے ندیم گھر آیا تو وہ بالکل بدلتا تھا۔ میری طرف تو اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، سارا دن ہاں بہنوں کے پاس بیٹھ کر ان کی سازشوں میں شریک رہا۔

رات کو جب اپنے کمرے میں آیا تو میری ہر بات پر الٹا چور کو تو الٹ کوڑا مٹنے کے مصداق مجھ پر برساتا رہا۔ اس نے میری کوئی بات نہیں سنی، بلکہ مجھے ہی ہر مٹاٹے میں قصور وار ٹھہراتا رہا، میں اس کے اتنی جلدی اور اس قدر بدل جانے پر سخت حجب بھی۔

اپنی غرض کے لیے کچھ وقت اس کا سوا ٹھیک ہوا،

بلکہ اب کی بار تو میں بہت خوش تھی کہ اتنا خوب صورت نوجوان میرا سسر بن رہا تھا (میں یہاں استراٹ کر رہی ہوں کہ ہماری تینوں مرتبہ سب سے بڑی خطا یہ تھی کہ ہم نے صرف خوب صورتی کو دیکھا اور اس کی برعکس نہ کی)۔

منگی کے بعد ندیم کی مرتبہ ہمارے گھر بھی آیا۔ وہ مجھے اکثر فون کرتا تھا اور اکثر مجھے بہت خوب صورت رو بہاں بھری شاعری سے بڑ خط بھی لکھتا تھا، جن کے ذریعے مجھے وہ احساس دلاتا تھا کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ ہم گفتگوں فون پر ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے تھے اور جب رو بہاں ملتے تب بھی ہمارے درمیان خاموشی کا وقف بہت کم ہوتا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بہت کچھ گفت کے طور پر دیا تھا۔ میری طرف سے دی گئی ہر چیز میں تو میرے احساسات، میرے جذبات اور میری محبت شامل تھی، مگر اس کے دل میں لاف، خود غرضی، مکاری اور عیاری بھی۔ یہ مجھے سات برس بعد معلوم ہوا۔ خیر منگی کے دو تین ماہ بعد ہماری شادی ہوئی۔ میرے والدین نے مجھے لاکھوں کا جہیز دیا۔ کئی تو لے سونا، پٹیلہ سے پانچ لاکھ کیش، اس کے علاوہ استعمال کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز۔ بابا تو گھر دینے کو بھی تیار تھے، مگر کچھ لوگوں نے بابا کو سمجھایا کہ یہ فلفلی مت کرنا۔ تمہاری سات بیٹیاں ہیں، کل کلاں سب بیٹیوں کے سسرالوں والوں نے ایسی فرمائش کر دی تو تم کیا کرو گے؟ یہ بات بابا کو پریشان کر گئی۔ سوانہاں نے گھر دینے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ جس دن میں انیل سے سزا نیلہ بنی وہ لکھ میری زندگی کا حسین ترین لمحہ تھا۔ میں اپنی قسمت پر بے انتہا خوش تھی۔ من کی اصل خوشی کی وجہ سے مجھ پر ٹوٹ کر روپ آیا۔ سب کہہ رہے تھے کہ یہ لیکن تو پرستان کی کوئی شہزادی معلوم ہوئی ہے۔ میری اور ندیم کی جوڑی کو لوگوں نے چاند سورج کی جوڑی سے تشبیہ دی۔

وہ رات بھی میری زندگی کی سب سے بہترین اور خوب صورت رات تھی۔ ندیم نے منہ دکھائی میں مجھے گولڈن رینگ گفت کی۔ ہم ساری رات ایک دوسرے کے ساتھ مستقبل کے سہانے سننے دیکھتے رہے اور اپنی آنے والی زندگی کے متعلق منصوبے بناتے رہے۔ شروع کے دنوں میں میری ساس تندوں نے بھی مجھے سرائی گھنوں

کرنے کی کوشش کرنے لگیں، حالاں کہ میں تو اس گھر میں ان سب کی خدمت کا جذبہ ہی لے کر گئی تھی۔ شروع کے کچھ دن تو ندیم کا رویہ بہت اچھا رہا۔ مجھے اس کی موجودگی میں ہر لمحوں محسوس ہوتا جیسے دنیا کوئی جنت ہے، میں کوئی حور ہوں اور وہ میرا دیوتا۔ خوشیاں میرے قدموں تلے زمین کی طرح بجھتی تھیں، مگر جلد ہی ان خوشیوں کو حسد رقابت کی ازنی آگ نے جلا کر کوئلہ کر دیا۔

مجھ سے تو جو برتاؤ ہوتا سہوتا، مگر میری قیمتی اشیاء کا حد درجہ نامناسب استعمال مجھے سخت تکلیف دیتا۔ کبھی جو ذخیرے سامنے کیڑوں کے لیے واشنگ مشین لگتی تو سحری سے رات گئے تک لگی رہتی، آخر میں مٹی دھول اور ریت سے انل سافیاں اور گندے پونچھے بھی مشین میں ڈال دیے جاتے۔ ایئر کولر جو گرمیوں کے آغاز ہی سے لباس کے کمرے سے نکال کر باہر برآمدے میں رکھ دیا گیا تھا۔ ساس مندوں نے اس پر بھی قبضہ جما رکھا تھا۔ ہم نو زیادہ تر ڈیوٹی پر رہتے اور میں اکیلی کمرے میں سڑی میں جھپکتی رہتی، جبکہ ایئر کولر کے سامنے ساس، مندیں اپنی چادر پائیاں بچھا کر پڑ جاتیں۔ ٹی وی، ٹیپ، میٹر، راڈ عرض ہر چیز کا بے دریغ اور بے درد استعمال ان لوگوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اگر کوئی چیز خراب ہو جاتی تو وہ میرے حوالے کر دی جاتی کہ یہاں کون ٹھیک کر دے، ہم اپنی ماں سے کہو کہ ٹھیک کرادیں۔ اور اس "ٹھیک" پر جو خرچہ آتا، وہ میری ماں کی طرف سے ہوتا۔

ندیم سے بات کر لی تو وہ کہتا کہ "میں کیا کروں، گھر کے اخراجات تمام بلز کی ادائیگی، مکان کا کرایہ میں کیسے بچت کروں، ابھی میرے سر پر جوان بہنوں کا فرض دھرا ہے۔ تمہاری فضول خرچیوں کے لیے کہاں سے پیسے آؤں۔ تمہارا باپ لاکھوں کما تا ہے، اگر تم تنہا پر کچھ تھوڑا بہت خرچ کر دیتا ہے تو کیا فرق ہے؟" اس کے جواب میں اگر میں کوئی جملہ کہنے کے لیے زبان کھولتا ہی چاہتی تو اس کی ماں ہمیشہ اس کی حمایت کرنے کے لیے آ موجود ہوتیں۔ پھر ایسے ایسے دلائل دیے جاتے کہ مجھ فریب کو خاموش ہونا پڑتا۔ میری اس چپ اور امانی کی ہر موٹی بے موقع مدد کی وجہ سے ان لوگوں کو اور شرم لگتی۔

اس نے مجھے مٹایا، ہم دونوں نے مسکرائے اور صبح پھر وہی منظر اور پھر ہمیشہ کے لیے یہی وہ منظر میری زندگی بنا گیا۔ میں آپ کو یہ بات بتانا بھول گئی کہ ندیم کے گھر والے کرائے کے مکان میں رہ رہے تھے، کیوں کہ ان کا ذاتی گھر ایک دور پرے گاؤں میں تھا۔ شہری سہائوں کی وجہ سے وہ کچھ عرصہ قبل ہی یہاں آ کر رہنے لگے تھے۔ بقول میری ساس کے یہاں مکان بتانا اس قدر مشکل تھا کہ فی الحال وہ کچھ عرصے کے لیے کرائے کے مکان میں رہنے پر مجبور تھے۔

گھر بھی ایسا تنگ کہ گویا مریخوں کا ڈربا، میرے جہیز کا سارا سامان کباڑ کی صورت اور پر تلے چڑھا گیا تھا۔ کوئی بھی چیز سلیقے سے اپنی جگہ پر نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ کمرے کی اس اتر حالت سے تو مجھے سخت کوفت ہوئی، ہاں البتہ الیکٹرونکس کی تمام چیزیں میری ساس مندوں نے اپنے مشترکہ کمرے میں رکھ لی تھیں۔ فریج، ٹی وی، واشنگ مشین، ٹیپ، ایئر کولر اور باقی کچھ دوسری اشیاء باہر برآمدے میں رکھ دی گئی۔ استری اسٹینڈ جو آئرن سمیت برآمدے میں دوما بعد ہی دونوں چیزیں بے کار پڑی تھیں۔ چوں کہ میری ساس مندیں ہر چیز کو بڑی بے دردی سے استعمال کرنے کی عادی تھیں۔ (صرف دوسروں کی چیزوں کو) سوچنے کے آئے جانے کی پروا کیے بغیر ہر چیز آن رہتی۔ فریج کا اسٹینڈ نذر بھی کچھ عرصے میں ہی ڈسٹرکٹ کر دانا پڑا، بجلی کی آنکھ پھولی کی وجہ سے فریج کے خراب ہونے کا خدشہ تھا، مگر وہاں پروا کسے تھی۔ آپ بھی کہتے ہوں گے شادی کے انتہائی شروع ہی میں نے اپنی ساس مندوں کی برائیاں شروع کر دیں۔

قادر مین کرام! جب میں ندیم احمد کی دہکن بن کر اس گھر میں آئی تب مجھے پتا چلا ندیم احمد تو اپنی ماں اور بہنوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی ہے، ایسی کٹھ پتلی جس کے تمام اختیارات کی ذمہ داری اس کی ماں بہنوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اگرچہ وہ مجھے بڑی چاہ سے ان گھر میں بیاہ کر لے گئیں، مگر ان کی دلچسپی میری ذات کے بجائے میرے قیمتی جہیز میں تھی۔ وہ سب کچھ حاصل ہوتے ہی انہیں میرا وجود کا نئے کی طرح ٹھکنے لگا، سودہ مجھے ہر طریقے سے ذمہ

حرکت سے روکا۔ بقول ندیم کے رقم اور زیور تو ہاتھ سے
مچے، مگر عزت ہاتھ سے نہیں جانی چاہیے کہ عزت کے بغیر
جینا کیا جیتا، پھر عزیز رشتے داروں کی باتوں کا خوف۔
تھانے پکھریوں کے چکر ٹھیلہ بدنامیوں کا باعث بنے۔
امی کو ندیم کی اس حرکت اور میری اس بے وقوفی پر سخت
صدمہ تھا۔ انہوں نے ابو کو بھی اس واقعے کی خبر کر دی
تھی۔ ابو نون پر مجھ سے سخت ناراض ہوئے کہ کم از کم مجھے
زیور تو ندیم کے حوالے نہیں کرنا چاہیے تھے۔ ہاں واقعی یہ
میری بہت بڑی حماقت تھی۔

ندیم تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا اس لیے
اس کا رویہ کچھ زیادہ ہی خوشامد اندر رہتا، مگر میں اتنی بڑی
بات اتنی جلدی کیسے بھول سکتی تھی۔ سو ندیم کی اتنی
(مصنوعی) نگاہوں کے بازو بھی میرا دل اب اس کی
طرف سے بہت خراب ہو چکا تھا۔

دو تین دن بعد ندیم تو اسلام آباد واپس چلا گیا، مگر
میری طبیعت اور مزاج بدستور خراب رہے۔ ایک تو
جینٹلمن ایور سے حمل، بار بار کی تے سے سخت خفا بہت
ہو رہی تھی، مگر میرے سسرال والوں کا رویہ تھا کہ
”بچہ ہے جتنی بھی طبیعت خراب ہو جائے، مگر ڈاکٹر کے
پاس ہرگز نہیں جانا۔ آخر انہوں نے بھی تو اتنے بچے پیدا
کئے تھے۔“ بقول میری ساس کے اس حالت میں اتنی
طبیعت تو خراب ہوئی ہے، سو مسئلے مسائل ہو جاتے ہیں۔
اب چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانا
فضول خرچی کے سوا کیا ہے؟ جہاں خرچ ہو ہی نا، وہاں
فضول خرچی کا بھلا کیا سوال۔“

مرتے جیتے یہ نو ماہ جانے کیوں نو سال کے برابر
ہو گئے اور ان نو ماہ میں میری ساس نے مجھے بھی ڈاکٹر
کے پاس نہیں جانے دیا، بلکہ ایک دو مرتبہ امی کے گھر
سے میں اپنی بہنوں کے ساتھ سول اسپتال کی ایک قابل
لیڈی ڈاکٹر کے پاس جاتی رہی۔ لیڈی ڈاکٹر کے کہنے
کے مطابق مجھے اس وقت اچھی خوراک، آرام اور ذہنی
سکون کی ضرورت تھی اور میرا کیس اتنا پیچیدہ تھا کہ نارمل
زوجگی کی صورت ممکن نہیں تھی۔

جب میری امی نے میری ساس سے بات کی تو وہ
بکڑی مٹی اور کہنے لگی کہ ”ڈاکٹر زعفران اپنے پیسوں کے

ندیم اور اس کے گھر والے میرا خرچ تو کیا اٹھاتے، الٹا
میرے اور میری ماں کے محتاج بن کر رہ گئے۔“

حق مہر تک ندیم نے نہیں ادا کیا، الٹا پانچ لاکھ کا جو
میرے والدین نے جہیز میں مجھے پیش دیا تھا وہ اور میرا
سونا بھی مجھ سے اس بھانے لے لیا کہ آنے جانے
کے لیے لوکل گاڑیوں پر جانے کے بجائے ہم کیوں نہ
اپنی ذاتی گاڑی لے لیں، پھر چینیوں میں بے کار
پھرنے کے بجائے بنگلہ سے کچھ نہ کچھ آمدن بھی مل
جایا کرے گی۔“

یہ پیش کش کوئی اتنی بڑی بھی نہیں تھی۔ اس لیے میں
نے بھی فوراً کیش اور سونا اس کے حوالے کر دیا، مگر کافی
دن انتظار کے بعد جب ندیم سے باز پرس کی تو پہلے تو وہ
ٹال گیا کہ ڈیڑھ کوئی اچھی گاڑی کے انتظار میں ہے۔ ایسی
گاڑی کہ کچھ عرصہ اس پر کوئی خرچ وغیرہ نہ کرنا پڑے، مگر
ایک ماہ بعد بھی گاڑی نہ آئی تو میں ندیم سے لڑ پڑی کہ
آخر وہ مجھے کب تک ٹال رہا ہے گا، میری کافی دیر تک اس
سے بحث جاری رہی۔ اس کے بعد جو اس نے بات بتائی
وہ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین ٹکالنے کے لیے کافی
تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ رقم اور وہ زیور جو وہ گاڑی کے
لیے لے گیا تھا وہ راستے میں کچھ نقاب پوشوں نے اس
سے لوٹ لی، کیوں کہ ان کے پاس ہتھیار وغیرہ تھے، اس
لیے وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔

یہ سن کر میں اپنے حواس میں نہیں رہی۔ میں نے
اس سکار اور فریبی کی بات پر یقین نہیں کیا اور اس سے
خوب لڑی اور رقم اور زیور کی واپسی کا مطالبہ کیا، مگر اب
سب کچھ بے کار اور بے سود تھا۔

میری امی کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے
مجھے سخت برا بھلا کہا۔ امی کے نزدیک میں ایک انتہائی
بے وقوف لڑکی تھی جس نے اتنا کچھ دیکھنے کے بعد بھی یہ
انتہائی بے وقوفانہ حرکت کی تھی۔ امی نے ندیم سے باز
پرس کی تو اس نے امی کو بھی یہی کہا اور جب امی نے اسے
پولیس کی فری مکی دی تو وہ اچھل پڑا کہ امی اسے جھوٹا اور
فریبی کیوں سمجھتی ہیں۔ مزید یہ کہ وہ یہ سب کر کے خود اپنی
بٹی کی بدنامی کر دیاں گی۔ امی بضد تھیں کہ وہ پولیس کی
مدد ضرور لیں گی، مگر میں نے بڑی مشکل سے امی کو اس

لیے ایسا کہتے ہیں اور وہ ہرگز میرا کیس اسپتال میں نہیں کردائے گی اور نہ ہی وہ پہلے بچے کی پیدائش ماں کے گھر ہونے دے گی۔

مگر ہم میرا شوہر اور آنے والے بچے کا باپ بننے کے باوجود کچھ زیادہ خوش نہیں تھا، اگر میں اس موضوع پر کوئی بات کرتی تب بھی وہ کچھ خاص خوشی کا تاثر نہیں دیتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ اس سے کہا کہ اب تو وہ مجھے کچھ نہ کچھ اضافی خرچ دے کہ اب ہم دونوں کو اچھی خوراک اور علاج معالجے کی ضرورت ہے، مگر ندیم نے اس کے جواب میں یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ میں اپنی ساری تنخواہ امی کی ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں، تم امی سے مانگ لیا کرو۔ میں امی سے کہہ دوں گا۔ حالاں کہ وہ بخوبی واقف تھا کہ اس کی ماں خرچ کے تمام پر کبھی مجھے ایک پھولی کوڑی بھی نہیں دے گی اور میں بھی اس کی ماں سے بات نہیں کر سکوں گی۔

میں تو گویا شوہر کے ہوتے ہوئے بھی بیوہ تھی۔ سارا سارا دن اس حالت میں بھی میں صبح سے رات گئے تک کام کرتی رہتی، تنہا بہت اور تنہا سے نہ حال ہو جاتا، ذرا سہا سہا پریشانی تو اٹھنے کو بالکل دل نہ کرتا، مگر ساس خندوں کی باتوں اور طعنوں کے ڈر سے جلدی اٹھ جاتی۔ میں نے تو اس گھر میں ہر ممکن گزارہ کرنے کی کوشش کی، حالاں کہ اس گھر میں میرے جانے کے بعد ہر طرح کی تکلیف کا سامان کیا گیا تھا۔ اکثر ہی آنے کا گھنٹہ خالی رہتا۔ صابن، واشک پاؤڈر، کھجیل، پاؤڈر اور پھولی مولی ضرورت کی تمام اشیاء میری ماں پورا کرتی رہتی۔ اکثر میں کئی کئی وقت بھوکا رہتی۔ گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہ ہوتا تو میں کئی بھانے سے ماں کے گھر آ کر ایک دو وقت کا کھانا کھا لیتی اور خشک میوہ جات یا بسکٹ وغیرہ کے ایک دو پیکٹ امی سے منگوا کر ساتھ لے جاتی۔ اس کے باوجود میری ساس خندیں آئے دن خود تو میرے ساتھ جھگڑا کرتی ہی تھیں، ندیم کے بھی کان بھرتی رہتیں۔ یہاں تک وہ اب گالی گلوچ کے علاوہ ہاتھ پائی پر بھی اتر آتا تھا، لیکن اس بات کا ذکر میں نے بھی اپنی امی سے نہیں کیا تھا۔ البتہ میری پڑوسن جو مجھے اس طرح بٹنے نہیں دیکھ سکتی تھیں آ کر میری ماں کو اطلاع کر دیتی۔ ان

کی اطلاع پر اگلے دن ہی امی ہمارے گھر پہنچ آئیں، پھر امی اور میری ساس خندوں کی لڑائی شروع ہو جاتی۔ امی مجھے کہتی تھیں کہ ”میرے ساتھ چلو کیوں اس جہنم میں رہ رہی ہو۔“ مگر میں ہمیشہ انکار کر دیتی کہ میں کسی طور پر اس گھر کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔

امی مجھے بھی نہ اہملا کہہ کر واپس لوٹ آئیں۔ انہی لڑائی جھگڑوں میں میری زندگی کا وقت آن پہنچا۔ زندگی میں کچھ ہی دن باقی تھے کہ ندیم کی طرف سے مجھے ایک شدید صدمہ پہنچا، ندیم نے فون پر مجھے ایسی خبر سنائی کہ جسے سنتے ہی میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔ میں اپنے آپ پر قابو نہ پاسکی اور بے ہوش ہو کر گر گئی۔ مجھے کافی دیر بعد ہوش آیا، مگر میں ابھی شاک کی کیفیت میں تھی۔ یہ خبر تو کافی عرصے سے ہمارے ارد گرد گردش کر رہی تھی کہ ندیم اپنے دوست کی بہن ثانیہ سے شادی کرنا چاہتا تھا، مگر اپنی ماں کی ضد کے آگے مجبور ہو گیا، لیکن اب بھی ان دونوں کا ملنا جلتا پہلے جیسا ہی تھا۔ میں تو اس خبر کو شو شائیں سمجھتی رہی، مگر آج ندیم نے خود مجھے اطلاع دی کہ وہ ابھی ابھی ثانیہ سے کورٹ میرج کر کے آیا ہے، تو مجھے اپنے کالوں پر یقین نہیں آیا۔ اس خبر نے مجھے اچانک ہی ذہنی طور پر مفلوج کر دیا۔ ندیم بے شک بہت بُرا آدمی مگر مجھے ہرگز اس سے یہ توقع نہیں تھی، میں تو دو سالوں میں ہی اتنے بڑے ظلم کا شکار ہو گئی تھی کہ میں کس سے فریاد کرتی اور کس پر الزام لگاتی کہ میری تقدیر ہی مجھے برباد کرنے پر تھی ہوئی تھی۔

اس خبر کے دو دن بعد رات کو اچانک مجھے پیٹ کے نیچے حصے میں ہلکا سا درد محسوس ہوا جو بڑھتے بڑھتے ناقابل برداشت ہو گیا۔ میری بلند آواز زاری سن کر میری ساس خندیں بھاگ کر میرے کمرے میں آئیں۔ میری ساس میری یہ کیفیت بھانپ گئی اور فوراً ہی اٹنے پاؤں باہر نکل کر اسی دالی کو بلا لائی۔ چوں کہ میرا کیس کافی وسیع تھا، سو تکلیف بھی اتنی ہی شدید تھی۔ میں نے دو دو کر آسمان سر پر اٹھا لیا اور متیں کی کہ مجھے اسپتال لے جاؤ، مگر میری ساس ذرا نہ مانی اور دس بارہ گھنٹوں کے بعد جب عباد یعنی میرا پہلا بیٹا اس دنیا میں آیا، تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ گویا مجھ میں جان ہی باقی نہیں بچی

باوجود کچھ ہی دنوں میں مائے اذہر جاتے۔ اب تو ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ دوسرے بچے کی پیدائش کے بعد ہی صحیح طرح سے میرا علاج ہو سکے گا، لیکن دوسرے بچے کی پیدائش تین چار سال سے پہلے نہیں ہوئی چاہیے۔

مجھے قدرت نے چاند سا بیٹا تو دیا مگر میرا بیٹا بھی میری طرح کوئی اچھے نصیب لے کر نہ آسکا، بلکہ دن بہ دن ہماری مصیبتوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ میری ساس یعنی عباد کی دادی نے کبھی عباد سے پیار نہیں کیا، کبھی اسے گود میں نہیں کھایا، نہ ہی ندیم اور اس کی بہنوں نے کبھی عباد سے محبت جتائی۔ عباد اس قدر پیارا تھا کہ کوئی غیر بھی اسے دیکھتا تو پیار کیے بغیر نہ رہتا، عباد تھا اتنا خوب صورت، ہانکل ندیم کی کافی۔ میں بہت کمزور تھی اس لیے میں اسے فیڈر سے ہی دودھ پلاتا کرتی۔ یہ سارا خرچ کبھی میری والدہ ہی اٹھاتیں تھیں کہ اس کے پتھر ز اور دوامیں وغیرہ کبھی کے لیے مجھے بھی ایسی بھارتی ہونا پڑا۔

ایسی لگتی تھی کہ سمجھاتی رہیں کہ "اب بھی کچھ نہیں بگڑا تم ندیم سے حلاق لے کر گھر آ جاؤ، ابھی تمہارے ماں باپ زندہ ہیں۔ ایسے شوہر کا کیا فائدہ جو اپنی خواہش کے متعلق کے علاوہ کوئی رشتہ ہی نہ رکھے، جو تمہاری ضرورت بھی نہ پوری کر سکے، والدین ہر وقت تمہیں ذلیل کرتا رہے۔" اسی کا کہنا بجا سہی مگر میں جانتی تھی ندیم جیسا کبھی ہے۔ میرے سر پر ساتباں کی طرح ہے، بے شک میں بہت خوب صورت تھی، جوان تھی، مجھے کوئی بھی شخص بارضا و رغبت اپنا لیتا، مگر مجھے اب عباد کے لیے سوچنا تھا۔ میں اسے کسی طرح کے احساس کمتری کا شکار ہونے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مجھے امید تھی ندیم ایک نہ ایک ضرور اپنے خون کی طرف کھینچا چلا آئے گا، سو میں برداشت کرتی رہی، یہاں تک کہ میرے وجود میں ایک مرتبہ پھر ندیم کی وقتی محبت کی نشانی ظاہر ہونے لگی۔ ان پانچ سالوں میں ندیم نے صرف مجھ سے اتنا رابطہ رکھا کہ وہ جب گھر آتا تھا، عنایت کے کچھ لٹے مجھے بھی سونپ دیتا تھا، جبکہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اس کے موبائل کی بپ اسے تانیہ کے احکامات یاد دلاتی رہتی۔ تانیہ ہمارے درمیان نہ ہوتے ہوئے بھی سائے کی طرح ہمارے ساتھ تھی۔

ہے۔ مجھے بچے کی پیدائش کے بعد بھی ویسی ہی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔

عباد کی پیدائش کی اطلاع میرے سینے والوں کو ملی تو خوشی خوشی میری امی اور بہنیں مشائیتوں، فرات اور دیگر لوازمات سمیت اسی وقت آن پہنچیں، مگر جب انہوں نے میرا اجڑا ہوا روپ دیکھا تو پریشان ہو گئیں اور میری زندگی کے متعلق میری ساس سے باز پرس کرنے لگیں۔ میری ساس اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ میری امی کو سب کچھ سچ سچ بتا دیتی، مگر امی پھر بھی مطمئن نہ ہوئیں اور پھر میری ساس کے باہر جاتے ہی مجھ سے پوچھ گچھ کرنے لگیں۔ ابھی میں امی کو سلی آمیز لفظ کہتا ہی چاہتی تھی کہ مجھے پھر موت جیسی سخت تکلیف محسوس ہوئی اور خود بخود ہی میں کرا بننے لگی۔ امی میری اس کیفیت پر گھبرا اٹھیں اور میری بہن سے ڈاکٹر سعد یہ کانبر ملانے کو کہا۔

آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر سعد یہ میرے پاس میرے چیک اپ کے لیے موجود تھیں۔ میری ساس نے اس پورے واقعے پر خوب ہنگامہ کیا۔ ڈاکٹر سعد یہ کے ساتھ کبھی کافی بدتمیزی کی، مگر ڈاکٹر سعد یہ نے اس جاہل عورت کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی اور میرا معائنہ کرنے لگی۔ جوں ہی ڈاکٹر سعد یہ نے مجھے دیکھا اس نے ایک آہ کے ساتھ دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے اور جلدی سے چادر مجھ پر اوڑھنا لگے ہوئے چند قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

"آئی ایم سو ری میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کی حالت تو بہت خراب ہو چکی ہے۔ یہ کیس تو اب کوئی نہیں لے گا۔ آپ نے اس کے ساتھ کیا جا لوروں والا سلوک کر دیا ہے۔ کیا آپ کو نہیں پتا تھا اس کا کیس بہت پیچیدہ تھا؟ میں تو حیران ہوں یہ سچ کیسے تھی۔" ڈاکٹر سعد یہ میری ساس سے مخاطب تھیں۔ ڈاکٹر سعد یہ کی باتوں نے میری ساس کو شرمندہ کیا تھا یا نہیں، مجھے کچھ خبر نہیں، مگر ان کی باتوں نے میری اور میری امی کی جان ضرور نکال دی تھی اور واقعی ڈاکٹر سعد یہ کی بات سچ تھی۔ میری امی نے مجھے کئی لینڈی ڈاکٹر ز کو دکھایا۔ مجھ پر بھاری لہر فرج کی، مگر میری حالت میں کوئی بہتری نہ آئی۔ مجھے دس تین مرتبہ ہنگے لگائے گئے مگر ہر مرتبہ تکلیف سہنے کے

ورنہ ماموں تو کب کا انہیں عزہ چکا چکے ہوتے۔ ماموں کی خبر گیری اور دھمکیوں کے بعد میری ساس مجھے آکر لے گئی، ندیم نے بھی ایک دو مرتبہ گھر کا چکر لگایا اور مجھے کچھ معمولی رقم بھی خرچ کے لیے دی۔

کچھ دن تو وہ لوگ میرے ساتھ ٹھیک رہے، مگر ماموں کے مسقط جاتے ہی میری ساس تندوں نے مجھ سے لڑائیاں شروع کر دیں۔ ندیم نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور پتھر کچھ کہے سنے ایک دن اچانک مجھے فون پر طلاق دے دی۔ میں روئی تیشی گھر آ گئی۔ اب کی مرتبہ بھی میری ساس نے میرے بڑے بیٹے عباد کو زبردستی مجھ سے چھین لیا اور کاشف چوں کہ تین ماہ کا تھا، اس لیے اسے میرے ساتھ بھجوا دیا۔ عباد میرے ساتھ آنا چاہتا تھا، مگر میری ساس تندوں نے اسے مضبوط جکڑ رکھا تھا۔

میرے ماموں کو جب میری طلاق کی خبر ملی تو وہ سخت رنجیدہ ہوئے، انہیں میرے سسرال والوں پر سخت غصہ تھا۔ اگر وہ پاکستان میں ہوتے تو نجانے ان لوگوں کا کیا حال کرتے، پھر ماموں نے وہیں سے فون پر اپنے ایک وکیل دوست سے رابطہ کیا۔ میرے حق مہر اور بچوں کے لیے کیس لڑنے کو کہا اور پھر ان وکیل انگل نے کچھ ہی دنوں میں ندیم پر کیس دائر کر دیا۔

کیس کالی عرصہ چلتا رہا، آخر ڈیڑھ سال بعد ندیم نے مجھے عدالت کے ذریعے کاشف کو دے دیا، اس نے وہاں یہ شرط رکھی کہ اگر میں ساری زندگی شادی نہ کروں تب وہ مجھے کاشف کو ہمیشہ ہمیش کے لیے دے دے گا، جبکہ عباد سے میں کوئی تعلق نہیں رکھوں گی۔ مجھے فی الحال کاشف کو ہمیشہ ہمیش کے لیے حاصل کرنا تھا اور دل سے میں نے یہ گواہی دی کہ میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گی، ویسے بھی اتنی ڈنٹیں اٹھانے کے بعد مرد کے اتنے فریب کھانے کے بعد مجھے مرد ذات سے نفرت ہو گئی تھی۔ میری اس رضا مندی نے مجھے میرا چھوٹا بیٹا دلایا مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ عباد کے ملتے ہی میں نے کاشف کو بھی حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

ندیم نے چوں کہ شادی کر لی تھی اور اب اس

ندیم نے مانیہ کے کہنے پر کئی مرتبہ مجھے طلاق دینے کی کوشش کی، لیکن میں ہی ہر مرتبہ اس کے پاؤں پر جانی تھی، اسے عباد کے واسطے دے کر خاموش کر دیتی تھی۔ اسے یقین دلاتی تھی مجھے اس کے نام کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے، میں اپنا اور عباد کا سارا خرچ اپنی ماں سے لے لوں گی، لیکن ندیم مجھے کسی طرح رکھنے کو تیار نہیں تھا۔ اس پر مانیہ اور اس کے بھائی کا بہت دباؤ تھا۔ وہ جلد سے جلد ہماری شادی کے اس طوق کو گردن سے اتار کر پھینک دینا چاہتا تھا، مگر میری منت ساجست اسے وقت طور پر اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ کاشف ندیم یعنی میرا دوسرا بیٹا بھی انہی کمزور لمحوں کی پیداوار تھا۔

کاشف تو عباد سے بھی زیادہ بدستی پیدا ہوا۔ مجھے اس مرتبہ بھی زورینہ والی کے آگے بھیڑ بکریوں کی طرح ڈال دیا گیا اور اس مرتبہ تو میری وہ حالت ہوئی کہ میں آئندہ کے لیے بالکل بے کار ہو کر رہ گئی۔ ان لوگوں کو مجھ سے ویسے بھی اب کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ مجھ سے تو کیا میرے پھول جیسے بچوں سے بھی انہیں کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ جب ہی تو تیسرے دن مجھے میرے پھولنے بیٹے سہستا گھر سے نکال دیا گیا۔ میں بیٹے چلنے کے قابل نہیں تھی، میں ان کے پاؤں پڑی، ان کی منتیں کیں، فریاد کرنے لگی کہ مجھے کہیں نہیں جانا، مگر میری ظالم ساس نے میری ایک نہ سنی اور کھینچے ہوئے مجھے گھر سے باہر نکال دیا۔ میرے بڑے لڑکے عباد کو زبردستی گھر میں رکھ لیا۔ وہ روتے ہوئے ماما کی پکار کر رہا تھا، مگر ان خالوں نے اس معصوم کی آہ و بکاہ پر بھی کوئی خاص توجہ نہ دی۔ میں لٹی پٹی گھر آ گئی۔ ہمارا سارا خاندان جمع ہو گیا۔ میرے ماموں نے مجھے تسلیاں دیں کہ میں کوئی غم نہ کروں۔ میرے ماموں بہت اصول پسند تھے، اس کے علاوہ عادت کے بھی بہت سخت تھے۔ ہمارے پورے خاندان میں ان کا رعب تھا۔

میرے ماموں نے میرے سسرال والوں سے بات کی اور انہیں ڈر لیا دھمکایا، انہیں وارننگ دی کہ اب اگر انہوں نے میرے ساتھ کوئی زیادتی کی تو وہ ان کا ایسا حشر کریں گے کہ ان کی سات سلیس یاد کریں گی۔ وہ تو اس سے پہلے میں نے سسرال والوں کا پردہ رکھا ہوا تھا،

ماموں سے بھی یہی کہا تھا کہ "آپ مجھے سب کچھ دے سکتے ہیں، مگر اچھی تقدیر دینا آپ کے بس سے باہر تھا۔" اچانک مجھے خیال آیا کہ میں کیوں نہ عباد کو حاصل کرنے کی بات ماموں سے کروں۔ شاید وہ میرا ساتھ دیں۔ باقی سب لوگ تو منہ پر مجھے تسلی دے رہے تھے، مگر پیٹھ پیچھے بھی کہتے۔ "شکر کرے جو شوہر نے ایک بھی دے دیا، اپنی اولاد کو ن کسی کو دیتا ہے۔" کوئی کہتا۔ "بچوں کو لے کر کیا کرے گی، کل کو بڑے ہو کر واپس باپ کے پاس چلے جائیں گے، جیسا باپ ویسے بنے۔ اپنی جوانی خراب کرے گی۔"

غرض جتنے مذاقی بھی ہائیں، مگر مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ مجھے ہر صورت عباد چاہیے تھا۔ میں نے ماموں سے بات کی، تو ماموں نے دیکھ کر میرے کیس کے سلسلے میں بات کی۔ دیکھ کر نے کہا کہ "کیس کافی کمزور ہے، مگر میں کوشش کروں گا۔" ماموں نے دیکھ کر بھاری معاونت کی پیشکش کی۔ دیکھ کر نے تو اپنی طرف سے پوری کوشش کی، مگر یہ کیس زیادہ عرصے تک نہ چل سکا، یہ مقدمہ جیلوں بارندیم جیتتا رہا۔

میں نے کئی دھانف کیے، بہت سے ختم پڑھے اور پڑھوائے، ہر ایک سے دعائیں کروائی رہی، ختم مانیں، مزاروں پر گئی، ہر غریب فقیر کو راضی کیا، امت نہیں ہاری اور کیس پھیس کروائی رہی۔

میرے لیے ماموں نے پیسے کو پانی کی طرح بہایا، اچھے سے اچھا دیکھ لیا۔ ہم سب سے بڑی عدالت میں گئے۔ ندیم کے پاس ہمارے مقابلے میں اچھا وکیل نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے اس کے پاس اتنا پیسا جو نہیں تھا اور سب سے بڑھ کر اس کے پاس ماں کی مستانیں تھیں۔ جج تاریخ پر تاریخ بڑھا کر ہماری دلیوی میں اضافہ کر رہا تھا۔ سب کہتے تھے ہم یہ کیس بھی نہیں جیت سکتے، مگر میرا دل گواہی دیتا تھا۔ میں اپنے بیٹے کو ضرور حاصل کر لوں گی۔

شاید یہ میری مستان کی تڑپ بھی یا کسی غریب کی دعا یا پھر قدرت کا کوئی معجزہ کہ ہم کیس جیت گئے تھے۔ عباد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھے مل گیا تھا

وہ لمحہ میری زندگی کا یادگار ترین لمحہ تھا جب عدالت

عدالت سے بھی اس کا لڑکا تھا، اس لیے میرے خیال میں ندیم کو مجھے عباد دلوانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ویسے بھی ان کو ہنسا کے سچے سے کیا دھچکا ہو سکتی تھی۔ سوائے اپنی انا کی تسکین کے، جبکہ میں ماں تھی، اسے اتنی تکلیفوں سے جانتا تھا، اس کے لیے اتنی مار پیٹ اور گالم گلوچ برداشت کیا تھا، اب اسے حاصل کرنا میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ میں کسی طور اسے سوتیلی ماں اور ظالم باپ کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ میں دن کو چپ چپ کر راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کے لیے روتی تھی۔ اس کی جدائی میرے لیے اتنی اذیت ناک تھی کہ مجھے لگتا میں اس کے غم میں پاگل ہو جاؤں گی اور جب سے ندیم اسے مجھ سے بہت دور نہیں ہو سکلے لے گیا تھا، میں اور بے چینی ہو گئی تھی۔

میں نے سنا تھا عباد سے ندیم کی دوسری بیوی بہت نڈاسلوک کرتی تھی۔ وہ اسے کھانے کے لیے بہت کم کھانا دیتی تھی۔ مگر کے اکثر کام عباد سے کرواتی، یہاں تک کہ بھانڈو پوچھا، آنا گوندھنا، برتن دھونا اور اپنے لیے روٹی ڈالنا سارے کام عباد اپنے ننھے سنے ہاتھوں سے کرتا تھا اور جب ندیم نے اسے ہوشل بھگوا یا تو مٹی ماہنگ پلٹ کر اس کی خبر تک نہ لی تھی۔

میرے ماموں دو سال بعد وطن واپس لوٹے تو سیدھا میرے پاس آئے اور مجھے سینے سے لگا لیا اور رونے لگے، کافی دیر بعد جب ماموں کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا، تو ماموں مجھ سے کہنے لگے۔ "ایلا تمہیں بھی کسی بھی وقت کسی چیز کی، کسی بھی طرح کی بددور کار ہو، تو تم بلا خوف و جھجک مجھے کہنا، میں اپنی بھانجی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے تو اس بات کا افسوس ہے کہ میں مستط کیوں گیا۔ اگر یہاں ہوتا تو دیکھتا ندیم تمہیں کیسے طلاق دے سکتا تھا۔ کاش میں یہاں ہوتا۔" ماموں نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ مجھے ماموں کے جذبات کا اندازہ تھا۔ وہ واقعی مجھ سے بہت پیار کرتے تھے، مگر تقدیر کے آگے کسی کی چلتی ہے، وہ مجھے دنیا کی ہر نعمت لا کر دے سکتے تھے، مگر تقدیر سے لڑنا ان کے بس کی بات کہاں تھی۔ میں نے

ہم انتہائی محبت اور یقین سے مٹانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔

عباد کو حاصل کیے ہوئے مجھے سات ماہ بیت گئے ہیں۔ طلاق سے لے کر اب تک میرے لیے اچھے سے اچھا رشتہ آیا، کچھ تو میرے بیٹوں کو بھی اپنانے کو تیار تھے، مگر اب مجھے کسی بھی مرد سے کوئی دلچسپی نہیں، اب میرے لیے میرے دونوں بیٹے عی میری کل کائنات ہیں اور ان کی بہترین تعلیم و تربیت میری زندگی کا نصب العین۔

میں اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو ہمہ وقت تیار کیے ہوئے ہوں۔ میری بھرپور کوشش ہے کہ وہ دونوں خوب پڑھ لکھ کر مستقبل کے بہت اچھے اور عظیم انسان بنیں۔ میں نے ان دونوں کو دینی اور دنیاوی دونوں علوم سے آراستہ کرنے کا تہیہ کیا ہے۔ عباد کو میں نے اپنے ہی علاقے کے ایک بہت اچھے پرائیویٹ اسکول میں داخل کروایا ہے۔ عباد ماشاء اللہ بہت ذہین اور محنتی بچہ ہے، اس نے تینوں ٹرمز میں فرسٹ پوزیشن لی ہے۔ باقی ایکٹوٹیز میں بھی اس کے فل مارکس آئے ہیں۔ عباد دین کی طرف بھی مائل ہے۔ ابھی سے وہ صبح سویرے نماز کو جاتا ہے، پانچوں وقت کی نماز ادا کرتا ہے، اسکول کی چھٹی کے بعد مدرسے جاتا ہے اور پھر ٹیوشن کے لیے۔ رات کو سونے سے پہلے عباد ہمیشہ نماز، کلمے اور مستون دعائیں دہرا کر سوتا ہے۔ مگر اور اسکول میں بھی وہ سب کا فرمانبردار اور تابعدار ہے۔ میں نے اپنے دونوں بیٹوں کی تعلیم و تربیت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور مجھے یقین ہے، میری محنت بھی مایاں نہیں جائے گی اور میرے دونوں بیٹے بڑے ہو کر معاشرے کے بہترین شہری ثابت ہوں گے۔

مجھے امید ہے میرے بیٹے مجھے بھی مایوس نہیں کریں گے اور جو کچھ میں نے ان کے لیے کیا، اس کی قدر کریں گے، میرا یقین اور ایمان ہمیشہ سلامت رہے۔ آپ دعا کریں میرا یہ یقین اور ایمان ہمیشہ سلامت رہے۔ آمین

☆.....☆

سے میرے کزن علی ایاز نے مجھے فون کر کے کہا۔ ”مبارک ہو ایاز! ہم کیس جیت گئے ہیں۔“ ہم کیس تو جیت گئے تھے مگر کاغذی کارروائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے، مجھے ڈر تھا کہ ندیم عباد کو کہیں غائب نہ کر دے، مگر سب نے مجھے تسلی دی کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ندیم ایسا کچھ نہیں کر سکتا، پھر وہ سرت کا دن بھی آ پہنچا جب پانچ سال کے بعد عباد مجھے واپس مل گیا، وہ دن ہمارے لیے حید سے کم نہیں تھا۔

عباد کے ملنے ہی ہم سب نے خوشیوں سے بھرپور جشن منایا۔ مشائیاں پانتیں، دیکھیں پکوائیں، نوافل ادا کیے، چادریں چڑھائیں۔ میری تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ امی اور بہنوں کے چہرے بھی اندرونی خوشی سے جھگڑ رہے تھے۔ سات سالہ عباد کو سب ہی گود میں لیے پھرتے رہے۔ کبھی ایک اپنی طرف کھینچتا، کبھی دوسرا جو مبارک دیتے آتا عباد کے لیے گفت لے کر آتا۔ جس دن عباد ہمیں ملے اسی دن شام کو میرے ماسوں بیٹے ہاجوں سمیت آگئے اور خوب تماشا کروایا، سارے محلے والے اکٹھے ہو گئے۔ ڈھولک کی تھاپ پر سب ہی ڈانس کرنے اور بھنگڑا ڈالنے لگے۔ ہمارے گھر میں تو گویا شادی کا سال تھا۔ سب کے چہروں سے مسکراہٹ روشنیوں کی طرح پھوٹ رہی تھی۔

ہم سب نے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ ندیم نے عباد کو واپس تو کروایا، مگر ہماری طرف سے اس کے ذہن میں اتنا خوف اور شکوک و شبہات ڈال دیے کہ وہ ہر وقت ڈرا سہا رہتا، ہر وقت انجانا سا خوف اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ اگر کوئی ذرا سا اسے ڈانٹ ڈپٹ دیتا، تو وہ لرزے لگتا۔ چھری، چاقو، سگریٹ اور ماحس سے تو وہ کوسوں دور بھاگتا تھا۔ اگر کسی کو اپنے سامنے پکڑے دیکھتا تو چپخیں مارنے لگتا۔ پھر آہستہ آہستہ جب اس کا خوف کچھ دور ہوا تو اس نے بتایا کہ ”ندیم اور اس کی بیوی دونوں اسے ہر وقت یہی کہتے رہتے تھے کہ تم ماما کے پاس مت جانا وہ تمہیں مار دیں گی، تمہیں اندھیرے گھرے میں بند کر کے باہر سے کالا لگا دیں گے، تم اکیلے رہ جاؤ گے اور ایسی بہت سی خوفزدہ کر دینے والی باتیں جو اس معصوم ذہن پر اب بھی نقش ہیں، جنہیں

چوتھی سچ بیانی

مہراں

گسٹوروسم

معاشرے کے قلم کی شکار ایک عورت کی ڈک بھری کہانی

گلاں کون ہے۔ لیکن جیسے ہی مہراں نے یہ سنا کہ دروازے پر "گلاں" ہے تو اس نے فوراً اپنی روٹی کے اوپر سالن رکھ کر احمد کے حوالے کیا کہ وہ روٹی جا کر گلاں کے دے آئے۔ اس پر میں نے کہا کہ مہراں تم خود جا کر دے آؤ تو اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ میں حیران رہ گئی کہ اسے کیا ہوا ہے جو وہ انکار کر رہی ہے۔ خیر اس کے جانے کے بعد میں نے اپنی جیٹھالی سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ مانگتے والی عورت مہراں کی بہن ہے۔ یہ سن کر میں حیران ہوئی کہ مہراں کی بہن مانگتے والی کیسے؟ ایک دن جب مہراں گھر کے کام کاج سے فارغ ہوئی تو میں نے مہراں کو کریدا۔ آخر کار وہ بڑی مشکلوں سے اپنی آب پتی سنانے پر راضی ہوئی، پھر اس نے ذور کہیں غلام میں تنگے ہوئے یوں کہنا شروع کیا۔

"مہراں کا جنم خان پور کے گاؤں قاضی بہتی پورہ میں ہوا۔ مہراں کے بعد مہراں کی ایک بہن گلاں اور ایک بھالی پیدا ہوا۔ بھالی کی پیدائش کے بعد اس کی ماں کچھ دن بیمار رہنے کے بعد اس دنیا سے چل بسی۔ وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔ مہراں جب سولہ سال کی ہوئی تو اس کے باپ نے بھالی کے لئے اس کی شادی کر دی۔ بھالی کی شادی کچھ سال بعد ہونا قرار پائی۔ مہراں کی شادی جس شخص سے ہوئی۔

جب میں شادی ہو کر کراچی سے "خان پور کٹورہ" گئی تو میرے سرال میں ایک کردار "مہراں" کا بھی تھا، جسے سب لوگ (مائی مہراں) کے نام سے پکارتے تھے۔ اس عورت کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ کوئی بے چین روح ہو۔ سارا دن کوئی نہ کوئی کام کرتے رہتا اور ساتھ میں اپنے آپ سے باتیں کرنا اس کا مشغلہ تھا۔

شروع شروع میں تو مجھے کچھ متوجہ نہیں رہا۔ کچھ کرکٹ ہوتی تھی۔ ایک وجہ تو اس کی یہ تھی کہ وہ بولنگ ٹیسٹ سرائیکی تھی اور میں ٹھہری کراچی والی۔ اس لیے مجھے اس کی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی، جس سے ظاہر ہے مجھے جھنجھاہٹ ہوتی تھی، لیکن آہستہ آہستہ وہاں رہتے ہوئے میں نہ صرف سرائیکی کو سمجھنے لگی، بلکہ کافی حد تک بولنے بھی لگ گئی تھی۔ مہراں شروع سے ہی میرے سرال میں گھر کا کام کاج کیا کرتی تھی اور اب اس کی عمر پچاس پچھپن کے لگ بھگ تھی۔

ایک دن جب ہم سب دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میری جیٹھالی کے بیٹے احمد نے جا کر دروازہ کھولا تو دروازے پر کوئی مانگنے والی عورت تھی۔ احمد نے آ کر مجھ سے کہا کہ چاچی دروازے پر "گلاں" آئی ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ



آئے اور مہراں کے بھائی کے گھر دھوا ہوا دیا۔ انہوں نے اس کے جانوروں کو چراگاہ کی کوشش کی۔ جانوروں کا شور سن کر گھر والوں کی آنکھ کھل گئی اور سب لوگ کمروں سے باہر آ گئے۔ ڈاکوؤں نے جب گلاں کودیکھا تو انہوں نے جانوروں کو چھوڑ کر گلاں کو اٹھا لیا اور اپنے ساتھ لے کر فرار ہو گئے اور پھر یہاں سے مہراں کی بربادی کا آغاز ہوا۔ ڈاکو اس کی بہن کو اٹھا کر لے گئے تھے اور بے چاری مہراں ایک پولیس اسٹیشن سے دوسرے پولیس اسٹیشن اس کی بازیابی کے لیے چکر لگاتی رہی، لیکن اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی اور اس کا بھائی بھی تھک ہار کر بیٹھ گیا تھا۔

وہاں اپنے کے حلقے میں ڈاکو کسی انسان یا جانور کو اٹھا کر لے جاتے ہیں تو تاوان کی رقم وصول کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی تاوان کا مطالبہ کر دیا تھا۔ مہراں بے چاری نے اپنے بھائی کے زمین اور جانوروں پر پچاس ہزار روپے کا

دو پر لے کر بے کاغذ شہرانی اور بھاری تھوڑا سا شراب پی کر آتا اور مہراں کو تشدد کا نشانہ بناتا۔ جب تک اس کا سر نہ منڈو رہا، ان کی زندگی میں پھر بھی کچھ سون تھا۔ سر کے مرتے ہی اس کے نرے دن شروع ہو گئے۔ ان ہی دنوں مہراں امید سے ہوئی، لیکن اس کے شوہر نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ مہراں اس حال میں بھی تھیں تو اس میں کام کرنی اور اپنا پیٹ پالتی رہی۔ اس کے بیٹے کی پیدائش کے چھ دن بعد ہی اس کے شوہر نے مار پیٹ کر دھکے دے کر اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ اپنے بیٹے کو لے کر اپنے بھائی کے گھر چلی گئی۔

اس مرتے میں مہراں کی بہن گلاں بھی جوان ہو چکی تھی۔ وہاں ہو کر اس نے ایسا رنگ روپ نکالا کہ جو بھی اسے دیکھا، دنگ رہ جاتا۔ گاؤں میں اس کی خوب سوسلی نے خوب چرچہ ہونے لگے تھے۔ ایک روز جب سب گاؤں والے گھر کی زمین سو رہے تھے تو گاؤں میں ڈاکو گھس

بندوبست کیا تھا، لیکن اس کے بھائی نے انکا سا جواب دے دیا تھا۔ مہراں بے چاری بڑھی لکھی تو نہ تھی، جو اسے پولیس والوں کی چالاکیوں اور ان کی حیلاریوں کا علم تھا۔

دراصل وہ بھی ڈاکوؤں کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ انہوں نے مہراں سے پیسے لے کر اس سے کہا کہ وہ تاولان کی رقم ڈاکوؤں تک پہنچا کر اس کی بہن کو برآمد کروائیں گے۔ اس چکر میں مہراں سڑک پر آگئی تھی اور پولیس انسپکٹر نے اس کی رقم بھی ہضم کر لی تھی اور آرام سے بیٹھ گئے تھے۔ کچھ عرصے بعد آخر کار ڈاکوؤں نے اس کی بہن کو خود ہی چھوڑ دیا، لیکن اس کی بہن کے ساتھ انہوں نے اتنی درندگی کا ثبوت دیا تھا کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ ان بے حسوں نے اس کی زبان کاٹ دی تھی، تاکہ کسی کو کچھ بتانے کے قابل نہ رہے۔ بھائی نے اس حال میں دونوں بہنوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور مہراں بے چاری محنت مزدوری کر کے لوہ گھر کی چیزیں بیچ کر اپنی بہن کا علاج کرواتے رہی۔ کچھ عرصہ علاج معالجے کے بعد گلاں کی حالت کچھ بہتر ہو گئی تو دنیا دکھاوے کو بھائی کو بھی بہنوں کا خیال آ گیا اور وہ بہنوں کو گھر لے جانے کے لیے آگیا، لیکن مہراں نے جانے سے انکار کر دیا تو بھائی نے گلاں کو ششے میں اتار لیا اور وہ بھائی کے ساتھ اس کے گھر پہنچی۔ مہراں کو اس بات کا نہایت دکھ ہوا کہ جس کے لیے اس نے اتنا دکھ درد اٹھایا تھا، اب اُسی بہن نے اس سے نظریں پھیر لی تھیں۔

بھائی تو اپنے مطلب سے آیا تھا۔ گلاں کو گھر لانے کے بعد اس کی بیوی بچوں نے اسے تو کرانی بنا کر رکھ دیا تھا۔ ان لوگوں نے اس کے ساتھ اتنا برا سلوک کیا کہ وہ دوبارہ شہم دیوانی ہو گئی۔ وہ بول تو سکتی نہیں تھی، ڈاکوؤں نے اس کی زبان جو کاٹ دی تھی اور پھر جب اس کی حالت زیادہ بگڑ گئی تو اس کے بھائی نے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ دن سے اور آج کا دن ہے، گلاں گاؤں میں گھر گھر بھیک مانگ کر گزارا کر رہی ہے اور مہراں گھر گھر میں کام کر کے مہراں کی یہ آپ ہمتا سن کر میرا دل دکھ سے بھر آیا۔ آخر کب تک عورت ہمارے معاشرے میں ظلم و ستم کا شکار ہوتی رہے گی، یہ سوچ کر میری بھی آنکھیں نم ہو گئیں۔

☆.....☆

... اور



کاشی چوہان

نوجوان شاعر کاشی چوہان کا خوبصورت شاعری سے سجا مجموعہ کا نام

شائع ہو چکا ہے



تم نے سونا بنا کے مٹی سے مجھ کو مٹی کے بھڑو بیچ دیا وہ شہزادہ اور بھی کہاں کے تارنیں کے لیے جس سے اسکا ڈھت۔ کتاب کی قیمت میں کتاب آپ کے ہاتھ میں۔ نہ کوئی لاکھ خرچ اور نہ کوئی دوسرا خرچ۔ پاکستان بھر سے صرف ایک S.M.S یا فون کال بھیجیے، کتاب آپ کی دلیز تک پہنچا دی جائے گی۔

کتاب منے کے

القریہ پبلشرز اردو بازار۔ کراچی

ایڈل اردو بازار۔ کراچی

شٹی بک پوائنٹ اردو بازار۔ کراچی

0307-2089080

پانچویں سچ بیانی

اپنے ہی دام میں



صفر عباس اعوان

سوتیل ماں کے کھودے گزھے میں گرنیوالی بیٹی کی داستان

بچپن سے ہی ایسی تھی۔ ماں کی ممتا سے محروم ورنہ وہ بن
ماں کی بیٹی جو ایک سال کی بھی نہیں ہونے پالی تھی کہ اس کی
ماں ایک دن اس کو دوتا ہوا چھوڑ کر دوسرے جہاں چلی گئی
تھی۔ اس کا باپ نور دین سبزی کی دیر تھی لگا کر گزر بسر کرتا
تھا۔ وہ صبح منہ اندھیرے لگتا اور شام کو داپس لوتا۔ نور دین
سے اس کی پرورش مشکل تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو سنبھالتا یا پیٹ
کے دودھ کو گھرنے کے لیے دودھ کی ٹھوکریں کھانے لگتا۔
نور دین کا آگے پیچھے تو کوئی تھا نہیں، سوائے چند ایک رشتے
داروں کے جو اس کی بیوی کے قتل تک اس کے گھر سے باہر
ہلے کر اس کی خبر تک نہیں لی۔ نور دین کی سالی جو اس کے گھر
کی دو گلیاں چھوڑ کر رہتی تھی، اس مشکل گھڑی میں اس کے
لیے فرشتہ ثابت ہوئی پھر نور دین کی سالی اپنی مریضہ بہن کی
آخری نشانی اپنی بھانجی سے پیار بھی بہت کرتی تھی۔ ایک
سال کی روتی کی دیکھ بھال تو وہ کر لی ہی تھی۔ نور دین کے
لیے صبح و شام کی روتی سالن کا کرنا اور گھر کی صفائی ستھرائی
بھی وہ بخوشی کرتی تھی۔ نور دین صبح سویرے ریز می لے کر
کام پر نکل جاتا تو وہ بھی روتی کو اپنے گھر لے آتی۔ سارا
دن وہ اُسے اپنے پاس رکھتی اور پھر جب شام ڈھلے نور
دین واپس آتا تو اسے اس کے حوالے کر جاتی۔ زندگی
شاید اسی طرح گزرتی تو کتنا اچھا تھا، لیکن نور دین نے
دوسری شادی کر لی۔ اس کی دوسری بیوی رضیہ اپنے رنگ

روچی آج کالج آتو گئی تھی، مگر اس کا دل بڑھائی
میں نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے تو اس نے صرف سید انکس کا
پیر پڑھا اور پھر باہر گراؤنڈ میں ایک بیچ پر آ بیٹھی تھی۔ باہر
کا موسم بہت اچھا ہو رہا تھا۔ سرسبز رنگ کے بادلوں نے
آسمان کو پوری طرح سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ٹھنڈی
ہوا بھی ساتھ چلتی ہوئی بہت خوشگوار احساس کا تار دے رہی
تھی۔ حالانکہ سادوں کا مینہ تھا۔ سادوں کے جس زور دھینے
میں ایسا موسم تو جیسے رحمت کا اشارہ ہوتا ہے۔

موسم بہت زیادہ رو میٹنگ اور پیارا ہو رہا تھا۔ کالج
میں کئی لڑکیاں انجوائے کی غرض سے کالج کی چھت پر
چڑھ دوڑی تھیں۔ بڑیک نام تھا۔ پیر پڑ تو کوئی تھا نہیں،
اس لیے لڑکیاں اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

روتی کو بھی اس کی دو گلیاں فیلو چھت پر لے جانے
کے لیے آئیں، مگر اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتے
ہیں نہ کہ اگر دل کا موسم اچھا نہ ہو تو باہر کا موسم بھلے کتنا ہی
خوب صورت اور سہانا ہو، سب بے فائدہ لگتا ہے اس وقت
روتی کا بھی یہی حال تھا وہ اکیلی تنہا بڑبڑا رہی تھی۔ انہی
سوچ کے دھماکوں کی گانٹھیں کھولنے میں لگی ہوئی تھی۔ وہ
خوش شکل، جاذب نظر نقوش کی مالک لڑکی تھی۔ مگر وہ اس
وقت کسی پریشانی میں گھری ہوئی لگ رہی تھی۔ ایسی پریشانی
جس نے اس کے دل کا سکون چھین کر لیا تھا۔ وہ تو

ایسی بات کی توقع نہیں تھی۔
 "میری اولاد ہوئی تو وہ میری اپنی ہوئی نور دین۔
 تیری بیٹی کی میں مجبوراً پرورش تو کروں گی، مگر اس سے
 زیادہ کی مجھ سے امید مت رکھنا۔"

رضیہ کافی سخت مزاج کی عورت تھی۔ نور دین کو یہ
 بات شادی کے بعد سمجھ گئی تھی۔ وہ بھی تو آخر مجبور تھا۔
 بنا کسی عورت کے گھر کوئی گھر ہوتا ہے۔ اس کی سالی کا اپنا
 گھر یاد تھا۔ آخر وہ کب تک اپنی سالی پر بوجھ بنا رہ سکتا
 تھا۔ اس نے اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی بیٹی کے لیے دوسری
 شادی کی تھی تاکہ اس کی بیٹی کو ماں کا پیار ملے لیکن
 سال بھر بعد اس کی دوسری بیوی رضیہ سے ماں ایک

روپ کی طرح دل کی بھی بڑی کالی تھی۔ وہ بہت کام چور
 اور پھوڑا بیٹ ہوئی۔ حالانکہ نور دین کی پہلی بیوی بہت وفا
 شہرہ اور سکھڑ تھی۔ بیوی بنی آئی تو اس نے اپنی بیٹی کو اس کے
 حوالے کر دیا۔

"رضیہ میری یہ معصوم بیٹی جو اتنی ہی عمر میں ماں
 کے پیار سے محروم ہوئی ہے، آغا سے یہ تیرے حوالے
 ہے۔ تو اس کو اتنا پیار دینا کہ یہ تجھ کو ہی اپنی ماں سمجھے۔"
 نور دین ابھی لہجے میں بولا۔ دوسری بیوی آئے کے
 باوجود وہ اپنی پہلی بیوی کو ابھی تک بھول نہیں پایا تھا۔
 "ہو نہ! دوسروں کی اولاد میرے سرھونے چلا
 ہے۔" رضیہ نے جھڑپ سے منہ دکھایا۔ "پرائیوٹ" بھی



بیٹی نے منہ لیا۔ ایک اور بیٹی کی نور دین کو خوشی تو ہوئی، مگر
 وہ بیٹے کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ جو بڑا ہو کر اس کا سہارا
 بنے۔ اس نے اپنی دوسری بیٹی کا نام کوثر رکھا۔ جو ہو ہو
 ماں پر تھی۔ وہی ناک نقشہ وہی سیاہ کالا رنگ روپ۔
 حالانکہ نور دین اپنی دونوں بیٹیوں کو ایک جیسا بڑھاتا تھا
 مگر رضیہ کے دل میں کھوٹ جو شروع شادی کے دن سے
 ہی پڑا ہوا تھا۔ اس پر دوسری یہ بات اس کے دل و
 اجائے کہتی کہ اس کی بیٹی کے مقابلے میں اس کی سوتیلی

اپنی ہوئی ہے بھلا۔ نور دین۔"
 رضیہ کے ان تلخ خواب کا نور دین کو پتا نہ ہوا۔
 "رضیہ تجھ سے یہ امید تھی۔ اس تو سمجھ رہا تھا کہ
 تو سب کی کہ آغا سے یہ تیری نہیں بلکہ میری بیٹی بھی ہے۔
 میں اس کو سبکی ماں کی طرح پالوں گی مگر تو تو بڑی ہی
 چھوٹے اس کی رنگ دل عودت آئی۔ مل تو تیری اولاد بھی
 ہوئی۔ کیا اس سے بھی اس طرح کا سلوک کرے گی۔"
 نور دین کو ایک دم قصہ آگیا۔ رضیہ سے نور دین کو

بچی روجی حد سے زیادہ خوب صورت اور پیاری تھی۔ اس لیے وہ اپنے دل کی بھڑاس مصوم روجی کو مار کر نکالتی تھی۔ بعض اوقات تو رضیہ کا دل کرتا کہ اس بھی جان کو مار کر اس کی ماں تک عیا پہنچا دے۔ بچی کی پیدائش کے بعد تو رضیہ اور بھی چڑچڑی اور جذبان ہو گئی تھی۔ بات بات پر وہ کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ اس کے کندھے پر بھرے لہجے سے نور دین نہیں بچ پاتا تھا، تو روجی بن ماں کی بچی کیسے بچ پاتی۔ اپنی مصوم حرکتوں پر وہ روجی کی طرح دھنک دیک جاتی۔ سوتیلی ماں کا خوف و ڈر اس سے اس کا بچپن کب بچپن کے لے گیا اس کو خبر تک نہ ہوئی۔ اس نے ہنسنا شرارتیں کرنا چھوڑ دیں۔ سوتیلی ماں کے ڈر سے روجی کمرے میں چار پائی کے نیچے عیا دیکھ بیٹھی رہتی۔ گھر میں اس کو اگر آسرا کوئی تھا تو اپنے باپ کا۔ شام کو اس کا باپ نور دین تھا ہارا لوتا تو وہ لپک کر اس کی گود میں جا بیٹھتی، مگر رضیہ اس کو ڈانٹ کر پیچھے کر دیتی۔

"اے ہٹ..... دیکھتی نہیں باپ تمہارا آبا ہے۔ آگئی ہے لاڈ کرنے۔" وہ روہا کی صورت بنا کر اپنے باپ کی طرف دیکھتی۔

"نہ رضیہ میری پھول جیسی بچی کو کچھ نہ کہا کر۔ اس کو دیکھ کر تو میں اپنے سارے دکھ درد بھول جاتا ہوں۔" نور دین اس کو ہانپوں میں بھر لیتا۔

"ہاں ایک ہی تو تیری بچی ہے۔ دوسری تو تیری کچھ گنتی عیا نہیں ہے۔" رضیہ غصے سے کھا جانے والی ٹھکروں سے اس کو گھورتی، گویا روجی کی جان ہی ٹھک جاتی۔

"ارے یہ کیا کہہ دیا، مجھے تو اپنی دونوں بچیوں سے بہت پیار ہے۔ ہاں البتہ تو ہی فرق رہتی ہے۔" نور دین اپنے دل کی بات بھی کبھار اس کو کہہ ہی دیتا تھا اور رضیہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بس جل بھن کر رہ جاتی تھی۔

روجی کچھ بڑی ہوئی تو نور دین نے اس کو اسکول میں داخل کر دیا۔ اس بات پر رضیہ نے بہت شور مچایا۔ وہ اس کو اسکول میں داخل کر دینے کے حق میں نہیں تھی، مگر رضیہ کی ایک ناچلی۔

وہ پہلے دن اسکول گئی تو وہاں کا ماحول اس کو بہت اچھا لگا۔ اس کو پہلی بار سکون و راحت کا احساس ہوا، جو اس کے گھر میں کوسوں دور تھا۔ اس کا بچپن بھی کسی بہار کی

طرف واپس اس بر لوٹ آیا۔ وہ دن بھر اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ کھیلتی، اسکول میں لڑکے بھی پڑھتے تھے، مگر اس نے کسی لڑکے کو اپنا دوست نہیں بنایا، سوائے ایک کے جو اس کا خال زاد کزن و قار تھا۔ گندمی رنگت، کالی آنکھوں والا و قار اس کا اتنا گہرا دوست سا بھی بن گیا کہ وہ باقی سب دوستوں کو جیسے بھول ہی گئی۔ وہ و قار کے ساتھ ہی کھیلتی و پڑھتی اور دونوں اکٹھے اسکول جاتے اور اکٹھے ہی واپس آتے تھے۔ و قار بھی اس کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔ وہ اسکول سے چھٹی والے دن بھی اس کے گھر کھینے کے لیے آ جاتا تھا، تو اس کی آمد پر روجی پھولے نا سہانی۔ برتن دھونا اور جھاڑو لگانے والا کام تو رضیہ نے اس کی کم عمری میں ہی اس کے کندھے پر لگھوایا تھا۔ و قار کی آمد پر وہ اپنا سارا کام جلدی جلدی کرنے لگتی تا کہ وہ جلد فارغ ہو کر اس کے ساتھ کھیل سکے۔ اس کو وہ بات اچھی طرح یاد تھی کہ ایک والدہ چھٹی والے دن برتن دھونے کے دوران اس سے ایک چائے کا کپ بے دھبائی میں ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تھا، تو رضیہ اس کی سوتیلی ماں نے دو تھپڑ اس کے منہ پر پڑ دیے تھے۔ حد سے زیادہ روجی کا خیال رکھنے والے و قار کو یہ برداشت نہ ہوا تو اس نے زمین پر پڑا ڈنڈا اٹھا کر زور سے رضیہ کے سر پر دے مارا تھا۔ و قار کا یہ اقدام خود اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔ دونوں کے گھروں میں بہت کھراہ، لڑائی، جھگڑا ہوا اور و قار کا روجی کے گھر آنا بند ہو گیا، مگر اسکول میں وہ پہلے کی طرح روز ہی لیتے تھے۔ ان دونوں کو پتا ہی نا چل سکا کہ کب بچپن کی رات مٹ چکی اور جوں کی سورت سر پر آن کھڑا ہوا۔ و قار بڑا کڑیل جوان بنا اور روجی پر تو ٹوٹ کر ایسا حسن آیا کہ ہر دیکھنے والے کی نظریں خیر ہو جاتیں۔

وقت نے ان دونوں کے جذباتوں میں ذرا برابر بھی فرق نہیں ڈالا، بلکہ اب تو ان دونوں کے دلوں میں محبت کی چٹھاس کی ملاوٹ اور جیز ہو گئی تھی۔

روجی اسکول چھوڑ کر اب کالج میں پڑھنے لگی تھی، جبکہ اس کی سوتیلی بہن کوڑ تو پانچ جماعتیں پڑھ کر عیا کمر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کی طرح بڑی کنڈہ بن ثابت ہوئی تھی۔ حد سے زیادہ جن باور خوب صورت روجی رضیہ کی آنکھوں میں تو پہلے ہی ٹھکتی تھی، مگر اس نے یہ نفرت کا بیج اپنی بچی کوڑ کے

ہمارے گھر آٹا ہی جیسے چھوڑ دیا ہے۔
 "نہیں خالو، آج کل اماں کی طبیعت نامساں رہتی
 ہے اس لیے وہ گھر سے نہیں نکلتیں۔"

"اچھا..... اللہ تعالیٰ اس کو شفا دے۔" نور دین
 آہستگی سے بولا۔

"خالو آج آپ کام پر نہیں گئے خیریت تو ہے۔؟"
 "ہاں بیٹا میری طبیعت بھی آج کچھ اچھی نہیں تھی۔
 بخار سا ہو رہا تھا، سوچا آرام کر لوں۔" نور دین دوبارہ
 چار پائی پر لیٹ گیا۔

"رضیہ خالہ نظر نہیں آرہی ہے، کہیں مٹی ہے
 کیا.....؟" وقار نے ابوہریرہ کی نظر میں دوڑائیں۔ خالہ کا
 تو بس یہاں تھا۔ وہ تو روتی کا بچہ چھنا چاہ رہا تھا۔

"ہاں..... رضیہ کوڑ کوڑے کرہا زار مٹی ہے۔ کافی دیر
 ہو گئی ہے۔ آئی ہی ہو گی۔ گھر پر صرف روتی ہے۔ اندر
 کمرے میں پڑھ رہی ہو گی۔"

یہ سن کر وقار نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا
 کہ چلو آج روتی سے چند باتیں ہی ہو جائیں گی۔

تھوڑی دیر تو وہ نور دین کے پاس بیٹھا رہا، پھر موقع
 پا کر وہ اندر کمرے میں آ گیا جہاں روتی کتاب کو گود میں
 رکھے پڑھ رہی تھی۔

وہ پڑھنے میں اتنی مگن تھی کہ اسے وقار کے کمرے
 میں آنے کا پتا ہی نہ چلا۔ اس نے جلدی سے روتی کی گود
 سے کتاب اُچک لی۔

روتی نے چونک کر سامنے دیکھا۔ وقار کو یوں
 اچانک اسنے سامنے دیکھ کر وہ حیران ہو گئی۔

"تم کب آئے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کب
 نازل ہوئے، لاؤ ادھر میری کتاب واپس کرو۔" وہ
 کتاب لینے کے لیے آگے بڑھی تو وقار نے کتاب کو
 پشت کے پیچھے چھپا لیا۔

"میں تو کب کا آیا بیٹھا ہوں، مگر جناب کو بڑھائی
 سے فرصت ملے تب نا، وہ تو شکر ہے کہ تمہاری سوتیلی ماں
 اور بہن گھر میں موجود نہیں ہیں۔ چلو تم سے دو گھنٹی بیٹھ کر
 بات ہی ہو جائے گی۔" وقار مسکرایا۔

"اچھا..... میری سوتیلی ماں اور بہن تمہاری بھی کچھ
 گفتی ہیں یا نہیں، کم از کم احترام میں خالہ ہی کہہ دیا کرو۔"

دل میں ایسا بویا کہ اب وہ کوڑ کے دل میں بھی تباہ و برباد
 بن چکا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دونوں ماں بیٹی کوئی نا کوئی موقع
 ڈھونڈ کر اس کے خلاف محاذ کھول کر بیٹھ جاتیں۔ روتی کیا
 جوان ہوئی کہ رضیہ نے گھر کی تمام ذمے داری اس کے
 حوالے کر دی۔ وہ صبح سویرے اٹھتی، جھاڑو لگاتا، ناشتا تیار
 کر کے وہ کانچ جاتی اور کانچ سے واپسی پر وہ شام تک پھر گھر
 کے کاموں میں لگی رہتی۔ کانچ کی بڑھائی کا وقت صرف اس
 کورات میں ہی ملتا تھا۔ اس کی سوتیلی بہن کوڑ تو کسی کام کو
 ہاتھ لگانا گویا گناہ کبیرہ سمجھتی تھی۔ سارا دن ماں بیٹی چار پائی پر
 لیٹی ہوئی آرام کرتی تھیں اور نور دین کا زیادہ بس نہیں چلتا
 تھا کہ وہ اپنی بیوی کو سمجھا سکے پر رضیہ کب تکھنے والی تھی ماں
 لیے نور دین نے بھی لب اس معاملے پر خاموشی اختیار کر لی
 تھی۔ اب وہ اپنی پیاری بیٹی پر روتی کا زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔
 روتی کو بھی اپنے باپ کا بہت آسرا تھا اور پھر اپنے بچپن کے
 ساتھی وقار کا بھی ساتھ تھا۔ وقار بی کام کر چکا تھا اب وہ شہر
 میں نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اب دونوں کا روز ملنا تو
 ناممکن ہو گیا تھا۔ کیونکہ جوانی کی دیوار دونوں کے بیچ حائل
 ہو چکی تھی، مگر وقار روتی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بھی نا
 کبھی اس کے گھر کا چکر لگاتا تھا۔ بچپن گزارا تو اس کی نگاہیں
 کو بھی درگزر کر دیا گیا تھا، جو روتی کے پیار میں اس کے
 ہاتھوں میں بند ہوئی تھی، بلکہ اب تو رضیہ اس کے گھر آنے پر
 اس کی بلا میں لیتی نہیں سمجھتی تھی۔ وہ تو اس پر واپسی صدے
 جاتی تھی اور اوپر سے کوڑ بھی اس کے اور گرد منڈلاتی رہتی
 تھی۔ اس وقت تک جب تک وہ روتی کے گھر سے چلا نہ
 جاتا۔ وقار بھی اس وقت تک وہیں براہِ جان رہتا جب تک وہ
 روتی کی ایک جھلک نا دیکھ لیتا۔ بات کرنے کا آئینہ میں
 موقع تو شاذ و نادر ہی ملتا، مگر وقار کے لیے روتی کا دیدار ہی
 کچھ نہ کچھ قیمت تو ہوتا ہی تھا۔ ایک دن وقار روتی کے گھر آیا
 تو رضیہ اور کوڑ گھر پر موجود نہیں تھیں۔ نور دین کھن میں پڑی
 چار پائی پر لیٹا ہوا تھا۔

"اسلام علیکم خالو جان.....!" وہ نور دین کی طرف بڑھا۔
 "علیکم اسلام۔ ارے وقار بیٹا کیا حال ہے، بڑے
 دنوں بعد چکر لگایا۔" نور دین نے اسے اپنے ساتھ ہی
 چار پائی پر بٹھا لیا۔

"اور سنا حیرتی ماں کا حال کیا ہے؟ اس نے تو

روٹی اپنی سوتیلی ماں کی وقار پر بے تحاشا نچھاور
ہونے والی محبت اور اپنی سوتیلی بہن کوڑی آنکھوں میں
انجام چھپا پیغام جو وہ وقار کو پڑھانا چاہتی تھی۔ اس سے
بخولی آگاہ تھی۔ وہ اتنا تو سمجھ ہی گئی تھی کہ اس کی سوتیلی
ماں کوڑی شادی وقار سے کرنے کے حق میں ہے، مگر وہ
وقار کو آخر کس طرح سمجھائے۔

"تم کو تو روٹی کوئی وہم ہو گیا ہے۔۔۔۔"

اب تو شاید ہی مجھ سے محبت کرے کوئی
میری آنکھوں میں "تم" صاف نظر آتے ہو
وقار نے سوچ کی مناسبت سے شعر پڑھ کر اپنے
خیالات کا اظہار کیا۔

"تم سے تو کوئی بات کرنا فضول ہے وقار۔ آخر کسی
بات کو سنجیدہ بھی لے لیا کرو۔ تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ
خالہ کو ہمارے عیال کھربھج دو اور ہماری بات ہی ملے
ہو جائے، مگر تمہارے کان پر تو جوں تک نہیں رہتی۔"

روٹی نے شکوہ بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"روٹی تم کو تو پتا ہے کہ میں نوکری کی تلاش میں پھر
رہا ہوں۔ اماں کی بھی بڑی خواہش ہے میرے سر پر سہرا
دیکھنے کی۔ وہ تو کب کی تمہارے گھر آنا چاہتی ہیں،
میرے لیے تمہارا ہاتھ مانگنے مگر میں نے ان کو روک رکھا
ہے۔ روٹی میں چاہتا ہوں کہ میری نوکری لگ جائے اور
میں اپنے پردوں پر کھڑا ہو جاؤں، پھر میں تم کو اپنی دلہن
بنا کر ہمیشہ ہمیش کے لیے اپنے پاس لے آؤں گا۔" وقار
نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں آخر وہ وقت کب آئے گا۔" روٹی بے
دلی سے بولی۔

انشاء اللہ بہت جلد۔۔۔۔ تم نا امید نہ ہو۔
کل ایک جگہ استر دیو دینے جانا ہے۔ اچھی نوکری
ہے، دعا کرو کہ وہ مل جائے، پھر اماں کو بھیجتا ہوں
تمہارے گھر۔" وقار اس کو خوش کرنے کی غرض سے بولا۔

"میری تو دعا ہے کہ تم کو جلد از جلد کوئی نوکری مل
جائے۔ اچھا کیا سوچے؟ چائے بناؤں۔" روٹی چنگ
سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"چائے کیا تمہارے ہاتھ سے تو زہر تک پیئے کو تیار
ہوں۔" وقار جلد ہی شوخ ہو گیا۔

بڑوں کا ادب بھی کچھ ہوتا ہے نا۔"

روٹی کو پتا تھا کہ وقار اس کی سوتیلی ماں رضیہ اور بہن
کوڑی کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا اور پھر روٹی پر جتنا مانی تھی
ظلم و ستم کرتی تھیں، وقار اس سے باخبر تھا۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔۔ کیا ہوا تمہیں لے کر
بیٹھ گئی ہو تم بھی۔ چلو اپنی بات کرو۔ میری بات کرو میں تو
تم سے بات کرنے کو بھی ترس گیا تھا تم سے۔"

وہ روٹی کے سامنے آ کر چنگ پر بیٹھا۔ تو روٹی نے
اس کے ہاتھ سے کتاب لے لی۔

"ایک تم روٹی ہو کہ تمہیں میری کوئی فکر ہی نہیں ہے،
لکھ رہے تو صرف اپنی پڑھائی کی۔"

"وقار پڑھائی بھی تو کرتی ہے، میرے لیے پڑھائی
بہت اہمیت رکھتی ہے۔"

"اچھا تو میں۔۔۔۔؟" وقار نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں تم۔۔۔۔۔ تم بھی کچھ نا کچھ اہمیت رکھتے ہی
ہو، مگر۔۔۔۔۔!"

روٹی ہولے سے مسکرا دی۔ وہ اس کو چنگ کرنے
کے موڑ میں تھی۔

"اچھا یہ بات ہے تو آج کے بعد میں کبھی تمہارے
گھر نہیں آؤں گا۔"

ناراض ہو کر وقار چنگ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک دم
سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"ارے میں تو مذاق کر رہی تھی۔ تم میں تو اتنی بھی
برداشت نہیں ہے وقار۔" وہ زور سے فیس دلی۔

"ہاں۔۔۔۔۔ تمہارے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں
ہے۔ تم مجھ سے بے رنجی کرو میں یہ کبھی برداشت نہیں
کر سکتا روٹی، میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں، اپنی جان
سے بھی زیادہ۔ تمہارے بغیر میں ایک مل نہ جیوں۔"

"میں بھی تم سے بے انتہا پیار کرتی ہوں وقار۔ اپنی
ساری زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ مگر۔۔۔۔۔ مجھے
اکثر یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کوئی تم کو مجھ سے چھین نہ لے، مجھ سے
دور نہ کر دے۔ میں اکثر اسی بات پر پریشان ہو جاتی ہوں۔"

وقار نے روٹی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کیوں تم کو یہ خیال کیوں آتا ہے۔۔۔۔؟"

"بس ہر دم کوئی نہ کوئی دھڑکا لگا رہتا ہے۔"

”تم بھی نا پس..... بالکل ہی پاگل ہو پاگل۔“
روحی بھی ہنس پڑی۔

”ہاں پاگل تو ہوں، مگر صرف تمہارے پیار میں.....“ وقار اس کے قریب آیا تو روحی نے شرما کر اس کو دھکے سے پرے کیا اور کمرے سے بھاگ کھڑی ہوئی۔
وقار بھی اس کو اس طرح بھاگتے ہوئے دیکھ کر ہنس پڑا۔

دو تین دن تو خیر خیریت سے گزر گئے۔ وہ جمعہ کا دن تھا کہ روحی کا کالج سے جلدی لوٹ آئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو سامنے برآمدے میں اپنی سوتیلی ماں رضیہ کے ساتھ ادویز عمر سفید بالوں والی عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس عورت کا نام ثریا تھا۔ وہ رشتے وغیرہ کراہی تھی۔ روحی اس کو جانتی تھی۔ وہ عورت اس محلے میں دو ماہ قبل آئی تھی۔ وہ پہلے بھی اس کے گھر آ چکی تھی۔

روحی کے اندر آنے پر ادویز عمر عورت ثریا نے فوراً سے اسے دیکھا۔ روحی بس سلام کر کے اندر کمرے میں چلی گئی۔

”اچھا بہن رضیہ میں پھر آؤں گی، ایک دو جگہ اور بھی جاتا ہے۔“ ثریا اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جہاں ٹھیک ہے۔ رضیہ بولی، لیکن پھر آنا ہوگا، دیکھ بھول نہ جانا۔ آؤں گی۔ ضرور آؤں گی۔ تو بے فکر ہو۔“
اس کے جانے کے بعد رضیہ کمرے کی طرف بڑھی۔ روحی جو چھٹکن کی وجہ سے پلنگ پر لیٹی تھوڑا آرام کرنے کی کوشش میں تھی۔ اپنی سوتیلی ماں رضیہ کو آ جا دیکھ کر سنبھل کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

”اُدے روحی میں تیرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اچھا کیا کہ آج تو کالج سے جلدی آ گئی۔ روحی بیٹیا تجھ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ سوتیلی ماں کے منہ سے پہلی دفعہ بیٹی کا لفظ سن کر روحی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں رضیہ کے منہ میں اتنی متحاش اور شائستگی پہلی دفعہ دیکھی تھی۔ اس پر روتے کا حیران ہونا لازم تھا۔

”دیکھ روحی۔ تو مجھے بے شک اپنی ماں سمجھ یا سمجھ پر میں تجھے شروع دن سے ہی بیٹی کہتی نہیں بلکہ مانتی بھی ہوں۔ دنیا جو مرضی مجھے سوتیلی ماں جانے، مگر میں تیری ماں تو ہوں۔ اگرچہ سگی نہیں تو سوتیلی ہی تھی۔ میرے سینے میں بھی ماں کا دل ہے، کیوں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں

نا۔“ رضیہ نے بات ختم کر کے اس کی طرف دیکھا۔
”نہیں اماں! میں تجھے اپنی سگی ماں کی طرح ہی سمجھتی ہوں۔“ روحی آہستگی سے بولی۔ وہ یہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کی ماں رضیہ کہنا کیا چاہ رہی ہے۔
”دیکھ تیرے باپ کو تو تیری کوئی فکر ہے نہیں۔ صبح کا گیا شام کو لوٹتا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ بڑی بیٹی کی عمر کچھ جا رہی ہے۔ ماشاء اللہ اب تو 20 سال کی ہوئی ہے۔ اب ساری زندگی تجھے پڑھنا یا گھر بٹھانا تھوڑی سی ہے۔ تیرا یہ ادھی تو کرتا ہے۔

اب تیرے بارے میں میں نہ سوچوں گی تو بھلا اور کون سوچے گا۔ میں تیرا خیال نہیں کروں گی تو لوگ باتیں بنائیں گے کہ سوتیلی بھی اس لیے بیٹی کو گھر بٹھایا ہوا ہے۔ اب دنیا والوں کی زبان کو تھوڑی کوئی پکڑ سکتا ہے۔ تو سمجھ رہی ہے نا میں کیا کہہ رہی ہوں؟“

روحی تو اب تک سمجھ نہ سمجھ کی کیفیت میں تھی۔ بس اس نے تو سر ہلا دیا تھا۔

”وہ ابھی تو نے دیکھا ہے نا، رشتے کرانے والی ثریا آئی ہوئی تھی۔ تیرے لیے کافی دن پہلے اچھا رشتہ کا کہا تھا۔ آج وہ بتا رہی تھی کہ ایک رشتہ اس کی نظر میں ہے۔ لڑکا اگرچہ تھوڑا پڑھا لکھا ہے۔ مگر اس کا اپنا کاروبار ہے۔ کار کو بھی کیا نہیں ہے اس کے پاس۔ بس پہلے سے شادی شدہ تھا، لیکن بیوی کو مرے تین سال گزر چکے ہیں۔ عمر کا لڑا ہوا ہے، مگر مرد کی عمر کن دیکھے ہے۔ اس کا تو سہا دیکھے جاوے ہے۔“

رضیہ نے اپنا اصل مدعا بیان کیا کہ روحی کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کی سوتیلی ماں اس لیے اس سے پیار بھرے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ ایک عمر رسیدہ شادی شدہ مرد کے پلو سے اس کو باندھنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔

”کیوں تجھے اعتراض تو نہیں ہے۔ تیرے باپ سے میں بات خود کروں گی۔ رضیہ نے اس کی طرف دیکھا۔

”اماں..... میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ اتنی خود غرض اور بے حس بھی ہو سکتی ہیں۔ ظالم تو آپ پہلے بھی تھیں مگر اتنا برا ظالم..... خود کو ماں کہتی ہو، لیکن ماں بن کر نہیں سوچتی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک میں آپ کے ظلم و ستم سہتی رہی، مگر ابھی آف تک نہ کی، مگر اب..... نہیں اور نہیں۔ میں اپنی زندگی بے کسی کو کھینچنے نہیں دوں گی۔ سن

لوتم۔ میں وقار سے محبت کرتی ہوں اور شادی بھی اسی سے کروں گی۔" روجی جیسے جھج اٹھی تھی۔

رضیہ کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ روجی اس کے سامنے بھی کبھی بول سکتی ہے۔ اس نے غصے اور نفرت سے روجی کے منہ پر زوردار پھڑپھڑا دیا۔

"کھینٹی، بے حیا، بے غیرت میرے سامنے زبان چلاتی ہے۔ تیری زبان گدی سے کھینچ لوں گی۔" رضیہ اس کو پکڑ کر بالوں سے کھینچتے ہوئے زور زور سے مارنے لگی کہ شور سن کر کوثر بھی کمرے میں آن دھمکی۔

کیا ہوا اماں۔ کیا بات ہوئی ہے۔ اس طرح کیوں مار رہی ہو روجی کو؟ کوثر حیران تھی کجا چانک ہو کیا گیا ہے۔ "ارے یہ کھینٹی تیرے حق پر ڈاکہ ڈالنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے کہ وقار سے محبت کرتی ہوں۔ شادی بھی اس سے ہی کروں گی۔" رضیہ برابر اس کو مار رہی تھی۔ "ہائے میں مر گئی اماں۔" کوثر نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے تو اس کے کرتوتوں پر شروع دن سے ہی شک تھا اور بڑھائے لپا اس کو۔ کالج جانے کے پہانے نمبانے کیا گل کھلاتی پھر رہی ہوگی۔" کوثر کی بھی تپکی کی طرح زبان چلنے لگی۔

"ارے میں کب اس کی بڑھائی کے حق میں تھی۔" رضیہ نے زور کا دھکا دے کر روجی کو پلنگ پر گرادیا۔ "آج دے تیرے ابا کو تاتی ہوں۔ اس بدمعاش کے کرتوت کو سمجھتی ہوں، کیسے رشتے سے انکار کرتی ہے۔" رضیہ کمرے سے باہر نکلی تو کوثر بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔

"میں بتا رہی ہوں تجھے اماں۔ اگر میری شادی وقار سے نہ ہوئی تو میں خود کشی کر لوں گی، سن لے تو۔" "ارے مریں تیرے دشمن، تو کیوں ایسا سوچ رہی ہے۔ موت تو آئے اس ذلیل حرام زادی کو، جان چھوٹے ہماری اس سے، تو فکر نہ کر کوثر، تیری شادی ہوگی تو صرف وقار سے۔"

"میری چاری اماں۔" کوثر نے مسکرا کر رضیہ کو گلے سے لگالیا لیکن دیکھ وقار والی بات تیرے باپ کو پتا نہیں گئی چاہیے نہیں تو وہ ہمارا نہیں اپنی بیٹی کا ہی ساتھ دے گا۔

شام کو نور دین تھا ہارا گھر لوٹا تو رضیہ کسی آنندھی طوفان کی طرح اس پر چڑھ دوڑی۔

"میں نا کہتی تھی کہ بیٹی کو زیادہ نہ پڑھا لکھا نور دین، تو اس کا دماغ خراب کر دے گا۔ پر تو میری کب مانا۔"

"ہوا کیا ہے آخر، پھر اس بے چاری نے کیا کر دیا، جو تو اتنا سچ پا ہو رہی ہے رضیہ۔" نور دین ریڑھی کو ایک سائیڈ پر کھڑا کرتے ہوئے بولا۔

"تو تو ہاتھ دھو کر میری پیٹی کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ خدا سے ڈر رضیہ خدا سے ڈر، بن ماں کی پیٹی ہے، تجھے ترس نہیں آتا اس پر۔"

"ہائے ہائے میں خدا سے ڈروں، اس کلمہ کی کو کچھ نہیں سمجھاتے۔" رضیہ ہاتھ ملتے ہوئے تیزی سے بولی۔ "تو صاف صاف بتائے گی یا پونہ کی پھیلیاں بھجوائی رہے گی۔ میرے بھی آخر کچھ پلے پڑے کہ بات کیا ہے۔" نور دین جھنجھلا کر بولا۔

"غضب خدا کا..... میں تو ماں بن کر اس کے بھلے کا سوچ رہی تھی۔ وہ رشتے کرانے والی ثریا اتنا اچھا رشتہ لے کر آئی تھی، مگر تیری پڑھی لکھی نواب زادی نے جھٹ سے انکار کر دیا۔ زمین، چاند اور روپیہ، پیسہ سب کچھ تو ہے۔ کیا ہوا عمر رسیدہ اور رنڈوا ہے۔ ارے اس کے تو بھاگ کھل جاتے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" نور دین نے گہرا سانس لیا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ کوئی آفت آن پڑی ہے۔" تجھ سے رضیہ یہی اُمید تھی۔ سوتیلی ماں تھی، سوتیلی ہی رہی نا۔ میری پھول جیسی بیٹی کو اس بوڑھے رنڈو سے کے حوالے کر دینا چاہتی ہے۔ یہ سب کرتے ہوئے تیرا دل نہیں کانپا۔

پہ تو نے غلم کر لیے میری بیٹی پر۔ رضیہ آج آخری بار جیتائے دیتا ہوں، اب اور نہیں..... تو اس کی فکر کرنا چھوڑ دے، بس اپنی بیٹی کی فکر کر۔" نور دین اک دم غصے میں آ گیا۔

"تم دونوں باپ بیٹی جاؤ بھاڑ میں۔ مجھے کیا پڑی ہے۔" رضیہ بھی غصے سے ہونٹیں ہوئی باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ نور دین اندر کمرے میں گیا کہ اس کو اپنی بیٹی روجی پلنگ پر روتی ہوئی ملی۔ اس کی حالت دیکھ کر ہی نور دین کو

اس کو پکارا تو اس نے اپنی نم آنکھوں سے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ وہ کالج کا چہرہ اسی تھا۔

"اوہو..... وہ ایک دم چونک اٹھی۔ اپنے آپ میں وہ ایسی کھوئی کہ اس کو ارد گرد کی خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ وہ جلدی سے بیچ سے اٹھی اور بیگ کا دھبے پر ڈالے کالج کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ واقعی کالج کی سب لڑکیاں جا چکی تھیں۔ اکاؤنٹنٹ کی کھڑی تھی، جو اپنے گھر سے کسی لینے والے کی منتظر تھیں۔ روتی گیٹ سے باہر نکلے تو سامنے سڑک کے پاس اس کو وقار سونر سائیکل پر سوار کھڑا ہوا نظر آیا وقار نے بھی اس کو دیکھ لیا تھا۔ تو وہ اس کی طرف بڑھا۔ روتی سیاہ برقعے میں ملیں تھی۔

"روتی میں کب سے کھڑا تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔ میں تو اب جانے کو تھا۔ میں تو سمجھا کہ تم آج کالج آئی ہی نہیں ہو۔" وہ اس کی طرف مسکرا کر بولا۔ مگر روتی کچھ نہ بولی، بس چپ چاپ وقار کی طرف دیکھتی رہی۔

"خیریت تو ہے روتی..... تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا۔ اس کی اجڑی حالت کو دیکھ کر وقار کو تشویش ہی ہونے لگی تھی۔ اس کی نم روتی سوتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

"تم کو میری کوئی پروا ہے وقار یا نہیں.....؟" روتی نے سوالیہ نظروں سے وقار کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب؟" وہ بولا۔ میں سمجھا نہیں۔ وقار واقعی ہی نہیں سمجھا تھا۔

"تم اس وقت سمجھو گے جب میں کسی اور کی ہوجاؤں گی۔ تم ہا پھر بس تماشا دیکھتے رہنا۔" روتی رو ہنسی ہو گئی۔

"کیوں ہوا کیا ہے؟ صاف صاف بتاؤ روتی پلیز مجھے پریشان مت کرو۔ مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھ نہیں جاتی۔"

"میں جو کل رات سے پریشان ہوں۔ ایک ایک پل جینا مشکل ہے وقار اس کا کیا کرو گے۔" روتی نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور ساری بات اس کے گوش گزار کر دی۔ ساری بات سن کر وقار کو شدید حیرانگی ہوئی۔

"ارے میں نے کوثر کے متعلق ایسا کبھی سوچا بھی نہیں۔ کوثر کو تو میں اپنی منہ بولی بہن سمجھتا ہوں۔"

لیکن وہ تو شادی کا پلان بنا چکی ہے تمہاری ساتھ۔ تم جو کچھ مرضی سمجھتے رہو۔ میری سوتلی ماں مجھے تمہارا کبھی

اندازہ ہو گیا کہ رضیہ نے اس کو بڑی بے دردی سے مارا ہے۔

"نہ..... نہ..... میری بیٹی نہ رہو۔" اس نے آگے بڑھ کر اپنی بیٹی روتی کو گلے سے لگالیا۔

"مجھے پتا چل گیا ہے کہ رضیہ نے تجھ پر ظلم کیا ہے۔ بڑی ظالم و جاہر عورت ہے۔ پتا نہیں کس منی کی بیٹی ہوئی ہے۔ پھر کا دل ہے اس کے سینے میں..... کاش میں اس کے ساتھ شادی ہی نہ کرتا۔ لب بچھتا رہا ہوں۔ اس بد بخت عورت نے کوثر کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔" نور دین نے پیار سے روتی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"میر کر میری پیاری بیٹی۔ اللہ جروینے والا ہے۔"

اب..... میں اس بوڑھے سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ "روتی روتی ہوئی پٹکیاں لے کر بولی۔

"تو فکر نہ کرو روتی بیٹی۔ تیرا باپ ابھی زندہ ہے۔ تجھ پر یہ ظلم نہیں ہونے دے گا۔ تو نے ٹھیک کیا کہ رضیہ کے منہ پر انگار کر دیا۔

اب رضیہ نے تجھ پر انگلی بھی اٹھائی نہ تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ ہاتھ تو زردوں کا اس کے میں۔

نور دین کتنی دیر تک اس کو دلا سے اور تسلیاں دیتا رہا۔ روتی نے وہ رات جیسے کانٹوں پر گزاری۔ نیند تو جیسے اس کی آنکھوں سے کوسوں دور ہو چکی تھی۔ خوف اور ڈر جو شروع دن سے اس کے دل میں تھا۔ اب حقیقت بن کر اس پر جیسے آشکار ہو چکا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کی سوتیلی ماں رضیہ کسی طرح بھی اس کی شادی وقار سے نہیں ہونے دے گی، حالانکہ روتی کو اپنے باپ کا آسرا تو تھا، لیکن اگر اس کا باپ بھی سوتیلی ماں کے آگے بے بس و مجبور ہو گیا تو.....؟

اس کے آگے سوچنے کی روتی میں ہمت ہی نہیں تھی، پھر کوثر بھی تو اس کے باپ کی بیٹی تھی۔ شاید کوثر کے ساتھ وقار کی شادی پر اس کے باپ نور دین کو اعتراض ہی نہ ہو۔ ایسی کئی باتوں نے ساری رات روتی کے دل کو دہلائے رکھا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو وہ بغیر ناشتے کے علی کالج چلی گئی۔ نیند کی طرح بھوک بھی جیسے اس کی آڑ گئی تھی۔ کالج میں وہ اکیلے بیچ پریشانی اپنی ماضی کی راکھ کرید رہی تھی، پھر راکھ میں موجود مٹی یادوں کے انگاروں نے اب اس کے دل کو جلا نا شروع کر دیا تھا۔ وہ تو ویسے ہی خاموش چپ چپ بیٹھی ہوئی تھی کہ کسی نے

بات کہے یا سننے چپ چاپ اندر کمرے میں چلی گئی۔
گھر کے سارے کام اس کے خنجر پڑے تھے۔ اس
نے پہلے باورچی خانے میں پڑے سارے گندے برتنوں کو
دھوا اور پھر آٹا گوندھ کر سائن چڑھا دیا۔ وہ روٹیاں پکانے
لگی تھی کہ باہر کچن سے اس کی سوتیلی ماں رضیہ کی آواز آئی۔
"اے روجی..... ادھر آ میری بات سن۔" رضیہ اس
کو بلا رہی تھی۔

"آئی اماں....." وہ بولی۔
"یا اللہ خیر....." روجی کا دل زور زور سے دھڑکنے
لگا تھا۔ وہ ہاتھوں کو روپے سے پونچھ کر باہر کچن میں آئی۔
"مٹی اماں....." وہ ہولے سے بولی۔
رضیہ کچن میں چار پانی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ رشتے
کمرانے والی تریا جانے کب کی چلی گئی تھی۔

"اے روجی وہ کانٹھی صاحب نہیں ہیں، جس کی بیوی
ماہرانی ہے، اے وہ علی..... اس کی بڑی بیٹی کی آج مات
بھندی ہے۔ پکڑ گھر گھر پیغام دے رہی تھی۔ ہمیں بھی کہہ گئی
ہے تو ایسا کرنا کہ رات کو چلی جانا۔ کہا تو اس نے مجھے ہے، پر
کچھ گویا سے کہاں اٹھا بیٹھا جاوے ہے، پھر میں اتنی ساری
لڑکیوں میں بھلے اچھی لگوں گی۔ اس لیے تیرا کہہ دیا ہے کہ
روٹی آ جائے گی۔" رضیہ نے اسے سر پر دھپا سیدھا کیا۔
"پر اماں میں....." روجی گڑبڑاتی۔

"ہاں تو۔ اے کوڑ تو جانے سے رہی، بڑی تو تُو ہے۔"
روٹی شش و شش میں پڑ گئی۔ اس کا دل بالکل نہیں چاہ
رہا تھا، ویسے بھی اسے یہ ڈھونڈ اور بھندی والے فٹکشن پسند
نہیں تھے۔ رضیہ بھی اس کی حالت کو جیسے سمجھ گئی تھی۔
"اے روجی..... میں تمہیں بالکل نہ سمجھتی، مگر جانا بھی
ضروری ہے، آخر محلے دار کی ہے، سو آنا جانا ہوتا ہے۔"
"پر اماں..... میں اکیلی..... کیسے جاؤں گی۔ مجھے تو
گھر کا بھی پتا نہیں ہے۔"

"اے لو..... یہ کون سی بات ہوئی بھلا۔" رضیہ
بولی۔ تجھے اکیلی تھوڑی جانے دوں گی میں چھوڑ آؤں گی
اور ہاں راستے میں ہمارے ساتھ تریا بھی ہوگی۔ اس نے
کہا کہ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے وہ کچی سڑک پر ٹیکر کے
درخت پر ہمارا انتظار کرے گی۔ وہیں سے تھوڑی دور کو
کانٹھی صاحب کا گھر ہے۔ اور وہیں پر تریا تجھے گھر چھوڑ

نہیں ہونے دے گی وقار۔" روجی سسک پڑی۔
"ایسا بھی نہیں ہو سکتا روجی۔ بہت ہو گیا تم پر ظلم و ستم
اب اور نہیں اب ایک مہل بھی تمہیں اس گھر میں نہیں
رہنے دوں گا۔ اس ظالم عورت کے چنگل سے تمہیں ہمیشہ
ہمیشہ کے لیے نکال لاؤں گا۔" وقار کو فصر سا آ گیا۔
"روٹی نے اس کی طرف دیکھا۔" کیا واقعی.....؟"
"ہاں..... کل تم سے میں ایک جگہ انٹرویو دینے
کی بات کر رہا تھا۔ وہاں مجھے نوکری مل گئی ہے روجی۔
اب کل ہی اماں کو تمہارے گھر بھیجتا ہوں۔ تمہارا ہاتھ
مانگنے کے لیے۔ تو فکر نہ کر اب ہماری ساری
پریشانیاں ختم ہو چکی ہیں۔"

"کیا کچ وقار.....؟" روجی خوشی سے چلا اٹھی۔
"ہاں..... یہ خوشخبری دینے ہی تو میں یہاں کھڑا
تمہارا انتظار کر رہا تھا۔" روجی کو لگا جیسے یک دم ہی اس کی
ساری پریشانیاں ہی اُڑن چھو ہو گئی ہوں۔ اس نے اپنے
آپ کو بہت ہلکا اور پرسکون محسوس کیا تھا۔
"چل اس خوشی کے موقع پر کہیں آکس کریم
کھانے چلتے ہیں۔" وقار نے اس کو موٹر سائیکل پر
بیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"نہیں رہنے دو..... کوئی دیکھ لے گا تو پھر.....؟"
"لہے میں کوئی غیر تھوڑی ہوں۔ تمہارا اکڑن ہوں اور
اب ہونے والا شوہر....." وقار نے مسکرا کر اس کی طرف
دیکھا۔ "چل جلدی بیشہ۔ دیکھو موسم بھی کتنا چھا ہوا ہے۔"
اس کی بات پر روجی بھی ہنس پڑی۔ موٹر سائیکل پر
اس کے پیچھے بیٹھی وہ جھومتی ہوئی گئی اس کی خوشی کا
کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ آدھا گھنٹہ وہ ادھر ادھر پھرتے رہے۔
ٹھنڈی آکس کریم سے لطف اندوز ہوئے ایک دوسرے
سے پیار بھری باتیں کرتے رہے۔ واپسی پر وقار روجی کو
اس کے گھر کی کچی کے ٹکڑ پر اتار کر چلا گیا۔

روٹی گھر پہنچی تو آج پھر رشتے کرانے والی تریا کو اپنی
سوتیلی ماں کے ساتھ آہستہ آہستہ کچھ گھر پھر کرتے
پایا۔ وہ کوئی راز و نیاز کی باتوں میں مصروف تھیں۔ روجی کا
دل جیسے بیٹھ گیا کہ آج کوئی پھر رشتے والا معاملہ ہے۔
روٹی کے اندر آنے پر رضیہ نے حقارت و نفرت سے
اس کی طرف دیکھ کر برا سامنہ بنایا تھا، مگر روجی بغیر کوئی

"غضب ہو گیا نور دین۔ ہم لوٹ گئے جاہ ہو گئے۔"
رضیہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی تو ادھی آواز سے روتے ہوئے بولی۔

"کیا ہو گیا ہے تجھے رضیہ.....؟" نور دین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"تو اتنی رات کو آ کہاں سے رہی ہے؟" نور دین کی آنکھوں میں سوالیہ اثر تھا۔

"وہ..... وہ کانگی صاحب کی بیٹی کی مہندی تھی، میں روجی کو ساتھ لے گئی تھی۔ مگر..... وہ راستے میں اپنا سڑک پر دوغٹہ روٹی کو اٹھا کر کار میں لے گئے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہے تو رضیہ ہوش میں ہے۔"
نور دین زور سے دھاڑا۔

"میں بچ کہہ رہی ہوں نور دین۔ رضیہ اس کو یقین دلانا چاہ رہی تھی۔"

"تیرا داغ خراب ہو گیا۔ روجی تو اندر کمرے میں ہے۔ میں نے ابھی دیکھا ہے۔"

"یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے ارضیہ کے لیے یہ خبر مجھے کبھی ہم سے کم نہ تھی۔" وہ تیزی کے ساتھ اندر کمرے کی طرف دوڑی۔

داخلی روجی چنگ پر آنکھیں موندے پڑی ہوئی تھی۔ رضیہ نے جیسے اس کو جھنجھوڑ دیا۔

"تو..... تو یہاں کیسے.....؟ تو تو میرے ساتھ تھی۔ کیسے لوٹ آئی.....؟" رضیہ کی حالت دیدنی تھی۔

وہ حیرت کا مجسمہ بنی ہوئی تھی۔

"میں اماں گئی کب تھی۔ وہ تو کوثر زبردستی میرا برقع اوڑھ کر تیرے ساتھ چلی گئی تھی۔" روجی کے الفاظ تھے یا کوئی زہر میں ڈوبے تیز جس نے رضیہ کے دل کو جیسے چیر سادیا تھا۔

"ہائے میری بیٹی کوثر....." رضیہ زور سے چیخ اٹھی۔

اس کو لگا جیسے پورا آسمان اس پر ٹوٹ پڑا ہے۔ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر جا پڑی۔ رضیہ اپنے ہی دامن میں آپ آ گئی تھی۔ اس کو کہتے ہیں جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے تو خود ہی اس میں جا گرتا ہے اور اسی کا نام مکافات عمل ہے، جس کی گرفت میں رضیہ آ گئی تھی۔

☆.....☆

آدی تھے۔ کار میں ڈالا اور ملے گئے۔ رضیہ کے منہ سے بمشکل الفاظ ادا ہوئے۔ "تو اتنی گھبراہٹ اور پریشان کیوں ہے پاگل۔" ثریا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔
"تجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ تیرا کام ہو گیا۔ جس کی تجھے خواہش تھی۔ تو یہاں خوابوں پریشان ہو رہی ہے۔ ارے یہ وہی تو آدی تھے۔ جس کی دوپہر کو میں نے تم سے بات کی تھی۔ تو خود ہی تو اس بات پر راضی ہوئی تھی۔"
"ہاں..... کام تو ہو گیا ثریا۔" رضیہ نے چادر سے پینہ صاف کیا۔

"پر یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ میرے تو ہاتھوں کے طوطے تک اڑ گئے۔"

"اے کام تو اس طرح ہی ہوتے ہیں۔" ثریا مسکرائی۔
"مگر ثریا..... کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ میرا دل ابھی

تک ڈر رہا ہے۔" رضیہ ابھی تک پریشان تھی۔
"ارے کیسی گڑبڑ، ثریا نے کوئی مکی گولیاں نہیں

کھیلی ہیں۔ گھات گھات کا پالیا گیا ہے میں نے۔"
"مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ اتنی آسانی سے اتنا

کلمہ ہی سے میری اور میری بیٹی کی جان چھوٹ گئی، لیکن وہ کم بخت کہیں واپس ہی نہ آ جائے۔" رضیہ اب بھی شک و شبہ میں تھی۔

"اری تو تو جھلی ہے جھلی۔ میرے دھندے نے بھی کچھ اصول ہیں۔ اک بار چھو کر ہی جھلی گئی تو چلی گئی۔ کوئی

لاکھ چاہے پھر نہ لوٹ سکے ہے۔"

ثریا کے کہنے پر رضیہ کو جیسے اطمینان سا ہو گیا اور اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اے چل رضیہ مہندی میں چلتے ہیں۔ ذرا منتظر

میلہ کرتے ہیں۔ تو اپنی جیت کا جشن ہی سمجھ لینا۔" ثریا نے آکھ دہائی۔

"آج تو ڈھونگ کی تھاپ پر جی بھر کر ناچوں گی۔ رضیہ کے انگ انگ میں جیسے سرشاری ہی آئی۔

دو تین گھنٹے بعد وہ دونوں مہندی میں غل غپاڑو کرتے ہوئے واپس لوٹیں۔ ثریا نے گھر کی طرف چل دی اور رضیہ

تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی۔ اپنے شوہر نور دین کو باہر محن میں چار پائی پر بیٹھے ہوئے پایا۔ نور دین تھوڑی دیر پہلے دوسرے شہر سے اپنے گھر پہنچا تھا۔

مشہور مصنفین کے مقبول ترین ناول

400/-	—	اعجاز احمد نواب	—	آشیانہ
600/-	—	اعجاز احمد نواب	—	جزیرہ
300/-	—	شازیہ اعجاز شازی	—	تیری یادوں کے گلاب
500/-	—	غزالہ جلیل دراز	—	کالج کے پھول
300/-	—	محمد سلیم اختر	—	یہ دیا بھجنے نہ پائے
400/-	—	ایم اے راحت	—	دش کنیا
300/-	—	ایم اے راحت	—	درندہ
200/-	—	ایم اے راحت	—	تعلی
200/-	—	ایم اے راحت	—	بہرہ
400/-	—	خاقان ساجد	—	چہون
150/-	—	خاقان ساجد	—	دعوت
300/-	—	قاروق انجم	—	دعوت
300/-	—	قاروق انجم	—	دعوت
700/-	—	انوار صدیقی	—	درختاں

قریبی ایک اشال سے طلب فرمائیں

نواب سنز پبلی کیشنز

Ph: 051-5555275 1/192 کوچہ میاں حیات بخش، اقبال روڈ، کھلی چوک راولپنڈی

چھٹی سچ بیانی

مرد

محمد منزل

اضطراب سے پر ایک مرد کی روح میں اترتی داستان عجب

گود میں، ایک شیر خوار، نو مولود بچہ جس پر اس کے آنسو
پس کر تے چلے جاتے ہیں۔

"شاذ و کہاں چلی گئی تھی، ہائے! ہم لٹ گئے، ہم
بر باد ہو گئے، ہم بر باد ہو گئے، ارے تیرے کوزمین کھا گئی
یا آسمان نکل گیا تھی بتاتی کیوں نہیں۔ تیرا نام جائے
ہمارے ناک کت تھی، شاذ و بھاگ گئی۔"

"ارے انور کھان ٹو ہی شہر جا کر پتا کروا کر لے
آ، کسی چھو کرے کی بغل میں سو رہی ہوگی، مرد ہی ہوگی۔"
"اپنی بکواس بند کر ورنہ۔۔۔" انور خان کلہاڑا لیے
جام کے لیے آکھڑا ہوتا ہے۔ ہارے خوف کے اس کی
کھٹکھی بندھ جاتی ہے۔ پتھر دیر خاموش رہنے کے بعد

دوبارہ اس کے ہونٹ ملتے ہیں۔
"ارے میں نہ کہتی تھی کہ شاذ و کے رشتے کے لیے
ہاں کر دے، اب لے گیا نہ بھاگ کر۔۔۔" اپنی بکواس بند کر
ورنہ۔۔۔" اور وہ ایک بار پھر کلہاڑے کے زور پر اچھل
پڑتا ہے۔ اس چھو کرے نے تو ہماری لبت ہی اتروا کر رکھ
دی ہے۔"

☆.....☆

نالے کے اس پار جانے والے سڑک پر پر کی جوتا
دور رہا ہے شہر قریب پڑتے ہی اس کی رفتار دھیمی پڑ جاتی

رات کا گھٹا نوپ اندھیرا دھند کے جڑے چیر کر
اپنی چونچالی سے رقص کر رہا تھا۔ ایم جی سے ڈی جی روڈ
کی جانب جانے والی سڑک پر کسی سکوت کی سی کیفیت
طاری تھی غائب رات کا کوئی پہلا سپر اپنی مسافت کا آغاز
کر چکا تھا۔ سارا شہر میٹھی نیند سو کر کسی ہنر فوٹشاں کا سا
منظر پیش کر رہا تھا اور ایسا سکوت طاری تھا جیسے ہوا کے
دوش پر کوئی چیز پھڑ پھڑا کر پورے وجود میں سرایت کر
جاتی تھی۔ اس اندھیرے اور شدید جاڑے میں جب
چاند کروٹ بدل رہا ہوتا ہے، ستارے سوچکے ہوتے ہیں
تو میں تنہائی کے لمحات سے لطف اندوز ہونے لیے اکثر
اس سڑک پر چل نکلتا ہوں۔

سڑک پر جب نگاہ کسی ڈی روڈ کا ساہیجک نہیں تھا
اور میں خراماں خراماں رواں دواں تھا۔ یکبارگی اطراف
سے آہ و فغاں کا ایک اختلاقی سلسلہ اپنی طرف متوجہ کر لیتا
ہے جو رات کی اس ہال کھولتی تاریکی اور جاڑے میں
ایسے پھوٹ پھوٹ کر رہتا ہے۔ جیسے آنسوؤں کا ذخیرہ
اُس کے حلق میں پھنس پھنس جاتا ہو، میں مضطرب ہو جاتا
ہوں اطراف میں نگاہ دوڑانے کے بعد میں اسے جھنڈ
میں تلاش کرتا ہوں، کافی سنی کے بعد وہ میرے سامنے
آ موجود ہوتا ہے۔ دو چھوٹی چھوٹی مصوم بچیاں مٹا کی

ایک اور سے کہنے لگتا ہے۔ "میں نے شہر کے ایک ہوٹل میں کمرہ بک کر دیا ہے اور اس وقت اندھیرا تمہارے سامنے سسکیاں لے رہا ہے۔ عدالت کا روزہ کھٹکتا ہے گا کوئی وقت نہیں ہے۔"

بہار

دونوں ایک ہی دکانی میں کھانا کھا رہے ہیں اور پھر دیر خاموش رہنے کے بعد وہ چرب زبان اس سے گویا ہوتا ہے۔
"میرنی تو ہمیشہ یہی خواہش رہی تھی شاہد کو ہم ایک ہی دکانی میں کھانا کھا میں اور تو تو جانتی ہے تاکہ تمہاری قربت کے حصول کے لیے میں برسوں تہہ ناز رہا ہوں اور میری بات تمہاری تمہیں تو یہ بھی یقین نہیں آتا کہ آیا میں نے کوئی سیمینٹیں بھی چھپائیں ہیں یا نہیں۔"

اور وہ بات کات کر پھول جھڑتی ہے۔ "میں نے ایسا کب کیا؟ مجھے یہ یاد نہیں ہے۔" وہی طرح ہوتی مصیبت مول نہیں لی۔
"چھوڑو اب تم بھی ماں کی طرح پرانی یادوں کی بناریاں نہ کھول کر بیٹھ جانا کرو، کوئی نئی بات کرو، ہمیں عدالت چلنے کے لیے فوراً ہی اس شہر سے کنارہ کر لینا چاہیے۔" پھر وہ خاموش رہنے کے بعد وہ اپنے انداز میں تسوٹیں اٹھا کر کرتی ہے۔

"یہ نہیں گاؤں اور گھر والوں پر کیا مصیبت دیت رہی

ہے، بڑی عیاری سے کام لیتے ہوئے، دونوں اپنا سانس بھلی کرتے ہیں اور لڑکی گویا ہوتی ہے۔

"ہم کہاں جائیں گے۔ لاہور بھی؟" گاؤں میں ہمارے بچنے کی خبر سب کو ہو چکی ہوگی۔ پوری بستی اور گھر میں میرے انما ہونے کا وہ تاہینہ جاری ہوگا۔"

اور وہ قدرے تیزی سے اس کے سامنے لنگھوں کی پٹاری کھینچتی ہے۔ اس کی ڈنگائی سانسیں دھونکی کی طرح چلنے لگتی ہیں اور آنکھوں میں کسی انجانے غم سے سی سی لہر منڈا رہی ہے۔ وہ ہماری سٹارٹ میں ہی نکلے پھرتے ہوں گے، ڈر اور خوف جیسے اس کی پیشانی سے مٹیاں ہو رہا ہے۔

"آج میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔۔۔"
"ہوں، ہوں روز تمہارا پاؤں کے پاؤں کے تلوے چاٹتا تھا کہ شاید میری زندگی ہے۔ وہ نہیں عزت سے رخصت کر دے، مگر تمہارے پاؤں پر جوں تک نہیں رہتی۔" اور پھر وہ اس کی جانب مڑتا ہے، دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر ڈالتا ہے اور کہتا ہے۔ "شاید تم تو جانتی ہو تاکہ میں کتنی محبت کرتا ہوں اس روت کی تسلیں کے لیے میں روزانہ تجھ سے ملنے چلا آتا تھا اور تمہارے روزانہ نے خیلے بھائے ہوتے تھے اور ماں۔" پھر وہ



عدالت کے احاطے میں جا موجود ہوتے ہیں۔ احاطہ عدالت میں ہر ایک کا تانتا لگا ہوا ہے۔ دکھاوا اپنی فائلیں اٹھائے چار آدمیوں کے ساتھ آ اور جا رہے ہیں، ہر آنے والے اپنے وکیل کی خدمت بڑے زور و شور سے کر رہے ہیں اور یہی حال ان کا۔

☆.....☆

کورٹ میرج کرنے کے بعد اب وہ اپنے گاؤں سے ہزاروں میل دور کسی دوسرے شہر میں مقیم ہیں۔ دلاور خان ایک اعلیٰ فرم کا ملازم ہے۔ ہر دوسرے دن عیش و عشرت میں خوب بسر ہو رہے ہیں، کبھی کسی میزیم میں لے جایا جا رہا ہے، کبھی کسی پارک میں، تو کبھی کسی جگہ زندگی گھر رہی ہے، رنگ گھر رہا ہے، پھول گل رہے ہیں اور وہ چوبہ زبانی میں انہی مہارت رکھنے لگا ہے کہ بات، بات پر جگانے کا عادی ہے۔

”دیکھو! میں تمہارے لیے کیا کیا کر رہا ہوں۔ وہ جس کے لیے تم چنی گئی تھی۔ وہ وہ تمہیں کیا عطا کیا۔“ دلاور خان کی یہی حرکتیں اکثر اوقات اسے سخت غلجیان میں مبتلا کیے رکھتی ہیں اور وہ اکثر اس پر خاموش ہو رہتی، مگر دلاور خان بجائے اس کی خاموشی کا اعتراف کرنے کے اور بھی پھلنے لگتا ہے کہ شاید اس کے بڑے ہونے کا اعتراف کیا جا رہا ہے، مگر جب بات حد سے بڑھ جاتی تو وہ بھی آسانی سے خاموش نہ ہوتی۔

☆.....☆

زندگی کی گاڑی پھر سے رینگنے لگتی ہے۔ ”اچھا شاید بیٹی وہ تمہارے سپنوں کا راق کمار کون تھا اور کہاں کا رہنے والا تھا؟“ رات کا دوسرا پہر پہلو بدلنے کے لیے جیسے بے چین کھڑا ہوا اور اس کے گلے سے ہتھکڑیوں کی آوازیں بار بار خاموشی کو دھانسنے کے باوجود اٹھ رہی تھیں۔

”وہ تو قریشی وال کا تھا۔“ یکدم خاموش رہنے کے بعد اس کی آواز بھرا گئی، جو ہمارے گاؤں سے تین گلو میٹر دور پڑتا تھا، میں اس وقت ایک اسکول میں پڑھتی تھی، پونہ ایک دن اس نے سر راد ایسی نظریں ملائیں، میں ابھی ابھی کہ ابھی ہے میرا جیون سا بھی اور پھر جیسے کائنات کا راز طشت از بام ہو گیا، اس کی قربت بھی میرے ساتھ

ہوئی اور اسکول کو کیا ہر جگہ میرا وجود تلاش کیا جا رہا ہوگا۔“ دکھ کی ایک لمبی لہر اس کے چہرے کے اطراف سے پھونکتی ہوئی سبز اور نیلا ہٹ سے چورنگ سے عیاں ہو رہی ہے۔

اور وہ ایک بار پھر نکلا رہا تھا ہے، ”شاذ وہاں باتوں کو چھوڑ میری قربانیوں کو یاد کرو، کہ کیسے رات آنکھوں میں کاشا تھا اور ساری رات اس بیڑ میں چپ کر تمہاری راد دیکھتا، نہ سرد نہ گرم کا احساس اور اوپر سے تنہائی میں تمہاری یادوں کا خمار تھوڑے پر ساتا تھا۔“

☆.....☆

مگر پھر میں جب بھی تمہیں دیکھتا تو دل و دماغ کے سارے الجھاؤ کسی ہوا کے دوش پر دور جا پڑتے۔“ اور کچھ دیر گم صم رہ کر اس نے کہا۔ ”بناؤ شاذ کیا ایسا نہیں ہے۔“ اور وہ دھیرے سے منس دیتی۔ ایک اداس چہرے کو حرکت دیتی اور کہتی۔ ”ہاں، ہاں۔ ایسا ہی ہے۔“

”رات کافی ڈھل چکی ہے اور تمہارا سونے کے متعلق کیا خیال ہے۔“ اور وہ ادھر ادھر بے قراری سے جھانکنے کے بعد کہہ اٹھی۔ ”میرا کوئی خیال نہیں ہے، نیند اس سے کوسوں دور ہے۔“ کرب کا ٹکڑا سا بیولا اس کے اندر سے عیاں ہو رہا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ایک تو تمہاری کھجلی یادوں کا خیال چھن نہیں لینے دیتا اور دوسرا مجھے وکیل کی انجمن کھائے جا رہی ہے۔ پہلے تو کوئی وکیل تیار نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو معاوضہ زیادہ مانگتا ہے۔ دونوں مضطرب ہیں۔

رات تاریکی میں ڈھل رہی ہے، روشن دان کھڑکیاں دروازے بند اور پردے سرکا دیے جاتے ہیں اور دونوں ہاتھوں میں ہاتھیں ڈالنے کسی سوچ میں غرقاب ہیں اور اس رات تو کہیں دیر تک جا کر ان کی آنکھ لگتی ہے۔

☆.....☆

سردیوں کے سورج کی شفقت آہستہ آہستہ کھڑکیوں اور دروازے کے سوراخوں سے جھانکتی ہوئی چھن چھن کر اندر آ رہی ہے۔ سورج کی پہلی روشنی کی عجیب سا ہیئت کمرے میں پھیل رہی ہے اور وہ دونوں آنکھیں ملنے ہوئے بیدار ہوتے ہیں۔ چائے پانی سے فراغت کے بعد وہ کپڑوں کے حصول کے لیے مارکیٹ جاتے ہیں۔ لیکن کا آراستہ لباس خریدتے ہیں اور اب وہ

اچھن اور اس روز تو وہ نہال ہوئے جاتا تھا۔

☆.....☆

دلاور نے ایک ہفتے کی بھانگ بھاگ میں ماں کو راضی کر کے شاذو کے ہاں رشتہ کہلوا بھیجا مگر انور خان نے صاف انکار کر دیا کہ شادی تو دود کی بات وہ اس کی بیٹی کا نام تک نہ لے اور پھر تو جیسے دلاور خان کو تازہ چڑھ گیا اور پھر ایک رات جب آدھی رات کا چاند ہمیں چوری چھپے اٹکاتا دیکھ رہا تھا اور پھر یونہی چلتے دوڑتے ہم نے دلاور کے بچا کے ہاں جا دم لیا اور پھر وہاں سے بھاگتے اور دوڑتے جیسے شام ڈھل گئی۔ ہم ایک ہوٹل پہنچے وہاں رات کو سوتے وقت اس نے مجھے چھوایا تک نہیں پرکھا تک نہیں اور صرف اور صرف اپنے زخموں اور دکھوں میں جی بھلاتا رہا۔ اور کرب اس کی۔ "بس، بس آگے بیان کیجیے پھر کیا ہوا۔" ہم شادی کے بعد آپ ایسی خوش رہ رہے تھے۔ دیکھیے بابو بیٹی آپ تو جانتے ہیں کہ شادی کے بعد وہ ذات انسان کو کھلونا بھی عطا کرتی ہے۔ جو ان کے درمیان مزید محبت کا ذریعہ ہوتی ہے۔" تم بھی بس نہ حد کرتی ہو اب آگے بھی کہو "میں نے قدرے نفادت سے کہا تو کیا ہوا یا بونتی ایک دن یونہی الٹرا ساؤنڈ کروانے پر بچے کی ننھیں میں بچی کا سن کر اس کا دماغ چکرانے لگا، ہوک چڑھ گئی اسے اٹھ آتے ہی بھڑک اٹھا۔ "کس ناگن کو جنم دے رہی ہو، بڑی ہووے گی تو کیا کیا گل کھلاوے گی۔ اور، اور ہمارا تو کوئی نام لیا بھی ہائی نہیں رہے گا۔ وہ بری طرح جلی بھن جاتا تھا۔ پیدائش پر جب میں اضطراری کیفیت سے گزر رہی تھی اس نے جو ظلم کے پہاڑ توڑے۔ وہ آج بھی پہلے دن کی طرح میری سنگین یادوں کی پردہ اسکرین پر موجود ہیں۔ بچی کے جنم لینے کے کئی کئی دن بعد وہ پھر سے محل مل جایا کرتا تھا، یہی نہیں کہ وہ بچیوں سے شفقت نہیں برتا تھا، بلکہ وہ یہی کہتا کہ بچیاں پرایا دھن ہیں اور....." اور پھر شاذو نے دوسری بچی کا بتانا شروع کر دیا کہ اس کی پیدائش پر بھی دلاور خان زمین میں گڑا جاتا تھا، اس کا بس چلتا تو وہ مجھے قتل کر کے رکھ دیتا۔"

ٹپ ٹپ گرم، گرم موتیوں کا سمندر جیسے اس کی آنکھوں سے بہ نکلا تھا۔ دونوں بچیاں سہی ہوئی تھیں

انتہا کو پہنچ رہی تھی۔ وہ بھی پہلی نظر پڑتے ہی مجھ پر فریفت ہو گیا تھا اور جب میں اس کے بحر میں گرفتار ہوئی اس وقت میں میٹرک کر رہی تھی۔ وہ روز راہ میں آکھڑا ہوتا، ہم دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے اور پھر اور پھر تو جیسے بے تکلفی بدستی ہی چلی گئی، جیسے پھول کی گلی نکلتی ہی چلی گئی۔ گاؤں والوں کو خبر ہوئی، اماں اور باوا کو پتا چل گیا اور پھر تو مجھے اسکول سے ہی اٹھوایا گیا۔ اپانے کڑی شرائط عائد کر دی تھیں کہ اس نے اگر اس کی غیر موجودگی میں گھر سے ایک قدم بھی باہر دکھا تو وہ اس کی باتیں کاٹ پھینکے گا۔

مگر..... مگر چودھری جی، آپ تو جانتے ہیں کہ دل کو بند کیسے سمجھائے اور پھر وہ رات کی تاریکی میں چھپتے چھپاتے آتا، دیوار پھانگتا اور ادھر میں بھی ہم تنہا سو جتے ہوتی اور پھر ہم حویلی کے چھوڑے میں گھنٹوں بند رہتے اور ایک دوسرے کے درد میں شریک ہوتے، قرابتیں بانٹتے اور کبھی تو وہ شام ڈھلتے ہی آ جاتا اور کسی خطرے کی نزاکت کے پیش نظر درختوں کی اوٹ میں ہو جاتا اور جب وہ میرے سامنے آتا تو کان سے، چور ہو کر ایسی باتیں کرتا کہ میرا دل پھٹل جاتا۔

یونہی روز کرتے کرتے جب وہ مجھ سے مطمئن نہ ہوا تو ایک شام آتے ہی زار زار کہنے لگا۔ "شاذو تو اب جلدی سے میری ہو جا، دیکھ اب تو دل تیرے بنا سوتا، سوتا رہنے لگا ہے۔ سارا دن دفتر میں کام کرنے کی بجائے اب تمہیں ہی سوچنے لگا ہوں۔ ہماری قرابت رات کے اس پہر میں ہوتی جب خاموشی کا ہر طرف پہرہ ہوتا اور پھر ایک روز تو حویلی پھلاکتے ہی دلاور خان نے مجھے زور سے بھیجنا شروع کر دیا اور کہا کہ اب وہ حریہ برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ اس سے شادی کرے اور میں ایک لدا سے بہتی۔ شادی کرنا ہمارے بس میں کہاں ہووے ہے، دلاور خان، تو ہی آخر اپنی اماں اور باوا کو بھجوا دے اور شاید کہ اپا ماں جائے۔ اور پھر دلاور خان نے اگلی صبح اٹھتے ہی اماں سے ذکر چھیڑنا شروع کر دیا کہ اس نے ایک چھوکری دیکھ لی ہے، بہت زوروں کی ہے۔ اونچا لمبا قد، گورے گال، شرقتی ہونٹ، نہ اتنی فربہ اور نہ سوکھا پن ساوگی میں بے مثال ایسے جیسے اپنی

دوش پر دباؤ ذات تو خوف کی لہر پر ہے وجود میں کرنٹ
دوڑا دیتی۔ ستارے آہستہ آہستہ سونے کی ناکام کوشش کر
رہے تھے۔

دلنشا اسے ایسا جوش چڑھا کہ میرے گریبان میں
ہاتھ ڈال دیا۔

”بولو..... تم مرد کیسے ہوتے ہو..... تم کس منہ کے
بنے ہوتے ہو۔ بولو لڑکیوں کو تو کہتے ہو تم میں وفا نہیں
ہوتی تمہاری وفا کہاں ہے؟ کیا یہی وفا ہے کہ شادی
سے پہلے جرب زبانی سے لڑکیوں کے دل لہاتے ہو
اور دون ان کے وجود سے حظ اٹھانے کے بعد انہیں
بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہو۔ بتاؤ..... تکلف اس کے
ہاتھوں کی گرفت مزید سخت ہوتی گئی اور میرا گریبان
سے نچلا دھڑا ایسے مفلوج ہو چلا، گویا ہوا کے دوڑ پر کہیں
دور جا پڑا ہوا اور خالی گریبان اور سر اس کے ہاتھوں میں
پھڑپھڑا رہا ہو۔“ کیا یہی تم مردوں کی مردانگی ہے، کیا
یہی تمہاری انسانیت ہے، ہم لوگ جسم کی پوجا کو محبت
کہتے ہو، خاصگی نے گویا خاموشی کو چوٹا دیا ہو۔ اور
نچلے دھڑ کے ساتھ ساتھ میرا پورا جسم مفلوج ہو گیا ہو اور
پھر ایک چہرہ مستحاشی نظروں سے حرکت کرتا ہوا دور ہی
سے چلا آ رہا تھا، یہی اس کا نام مردود شوہر ہوگا، میں نے
اپنے انداز میں تشویش ظاہر کی۔ اس سے پہلے کہ معاملہ
حرید طول پکڑتا میں نے چھوٹے ہی سر پٹ دوڑ لگا دی
..... اور، پھر جیسے کچھ دور چل پڑنے کے بعد خمیر نے
ملامت سے چور کرنا شروع کر دیا کہ کتنا پھوہڑ مرد ہوں
۔ ایک عورت کی زندگی کا معاملہ ہے اور میں چندا چھڑوا
کر بھاگ رہا ہوں، ہٹا ہر جیسے آگے چلتا جا رہا تھا لیکن
ذہن جیسے ندامت کی دلدل میں دھنسا چلا جا رہا تھا اور
پھر تو جیسے جیروں میں زنجیریں ہی بندھ گئی تھیں۔ ایک
قدم چلتا بھی محال ہو رہا تھا۔ ایک بار خمیر سے آواز
ابھری کہ زمین شق ہو جائے اور مجھ سمیت روئے زمین
پر موجود تمام مردوں کا وجود خاک کی اس میں سا جائے اور
رہتی دنیا تک عورتوں کا دامن تو داغ دار نہ ہو۔ اس کے
نعرے بار بار میری سماعت میں میرے ساتھ ساتھ چل
رہے تھے۔

☆.....☆

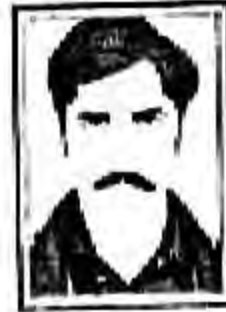
اور اس شدید سردی میں ان کے فاقہ پڑتے جسم اس
طوفانی جاڑے سے کانپ اٹھتے تھے تو پھر کیا ہوا ہا بوجی
میری تیسری بیٹی بھی پیدا ہوئی، مگر میری غیر موجودگی
میں ظالم نے اس کے اوپر ایسے وار کئے کہ اس کا جیسے
ہوش جاتا رہا، میں نے بہتر اعلیٰ چاہا مگر، کچھ نہ ہو سکا
اور میں تیسرے کھلونے کی یادوں کا سنگم سینے سے لپٹے رہ
گئی۔ پتا نہیں اللہ نے مجھ پر یہ عذاب سکنے کے لیے
کیوں ڈال دیا ہے کہ بجائے میں دلا اور خان کی قربت
حاصل کرنے کے اس کے طعنے اور جھڑکیاں سہہ رہی
ہوں، مگر میں نے حد سے زیادہ صبر کیا ہے اور پھر ایک
روز تو اس نے پوچھی کئی بات پر پوری گلی میں میری
عزت تار تار کر دی، مگر، میں نے اس کے آگے حرف
نیک نہیں نکالا، پتا نہیں میں نے بیٹیاں پیدا کر کے
کون سا گناہ سر لیا ہے کہ دون کی صحبت کے بعد اب
نیک عذاب میں چل رہی ہوں۔ اب وہ چھوٹی بیٹی کی
جانب اشارہ کرنے لگتی ہے، کہ اس کی پیدائش بھی پر
میرے نہانے کے سوا مینے سے بھی پہلے کسی بات پر
سخت ست کہا اور گھر سے نکال دیا ہے اور میری
آفرین دیکھیے کہ میں نے ایک لفظ بھی گستاخی کا نہیں
کہا، نہ جانے کیوں اسے معصوم بچیوں اور میرے
وجود سے نفرت ہو چلی ہے۔ سوچ سوچ کر شادی کے
آٹھویں سال ہی سے بالوں میں سفیدی آگئی ہے، تو
پھر کیا ہوا؟ میں نے پوچھا۔ ”وہ بات مردوڑتے ہی
کہنے لگی مجھے اور میرے بچوں کو باہر دھکے دے کر اندر
سے دروازہ لگا لیا۔ میری حالت اتنی نہیں تھی کہ ٹھک
طرح سے چل پھر سکتی، میں نے اس سے لاکھ سا جتن
کیں کہ معاف کر دے اس تاریکی اور کاٹ کھائی
سردی میں میرے بچے مر جائیں گے، مگر دیکھیے جی اس
وقت سے اس ذات کا نام لے کر چلی ہوں“ اس کے
الفاظ جیسے دتے چلے گئے۔

وقت جیسے گزرتا چلا جا رہا تھا، ہوائیں سرسراہتی چلی
جا رہیں تھیں، کسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس پتلا خانگی میں کیا
اضطراب اور دکھ کروٹ بدل رہا ہے۔ رات اور بھی
بھیا تک ہو چلی تھی، سارا شہر کسی کے غم سے بے نیاز بیٹھی
نیند سو رہا تھا۔ اور ایسا سکوت طاری تھا جب بھی ہوا کے

ساتویں سچ بیانی

زخموں کا مداوا

محمد عزیز مجھے



ماں باپ کی غیرت کو تیاگ کر گھر سے بھاگنے والی عورت کی کہانی

سے بہت محبت کرتا تھا، کہتا تھا۔ ”گلناز! اگر تم مجھے نہیں پسندیں تو میری زندگی گھٹی کرلوں گا۔“

ہیں نے جب اسی کو یہ بات بتائی اور انہوں نے ابو کا کہانی اور پھر میرے ذہنی قیصر کے متعلق ساری باتیں سنیں، معلوم ہو میں تو انہوں نے مجھے سمجھا یا کہ ہمارا اور ان کا کوئی جوڑ نہیں ہے اور وہ ہم سے کم تر لوگ تھے۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن اپنے والدین کو رضا مند نہ کر سکی۔ انہی دنوں ہم نے ایک نئی ملازمہ گھریلو کام کاج کے لیے رکھی۔ اس نے اپنا نام سلیمہ بتایا تھا اور اس کا ایک بچہ بھی تھا۔ وہ بڑی ضرورت مند تھی اور اسی وجہ سے ہم نے اسے رکھ لیا اور رہنے کو ایک کوارٹر بھی دے دیا۔

سلیمہ مہر کے لحاظ سے مجھ سے صرف چار سال بڑی تھی لیکن وہ زیادہ عمر کی دکھائی دیتی تھی۔ تھوڑی ہی دنوں میں میری اس سے دوستی ہو گئی۔ وہ ہمارا ہر کام بڑے سلیقے اور فحاش سے کرتی تھی۔

میں نے اسے کوارٹر میں اکٹرا دتے دیکھا تھا اور اس کی وجہ پوچھی تھی مگر وہ مال جاتی تھی۔ جب میری اس سے دوستی بڑھی (بشرطیکہ اسے دوستی کہا جاسکتا ہے) کیوں کہ وہ بہر حال ہماری ملازمہ تھی) میں اپنی ہر بات اسے بتاتی تھی۔ خصوصی طور پر قیصر سے متعلق جو بھی بات

”جی جاتی! آپ ضد نہ کریں اور میری بات مان لیں، کیوں کہ اس سے آپ ہی کا نقصان ہوگا۔ ذلت اور رسوائی و بربادی کو کیوں دعوت دے رہی ہیں آپ؟“ ہماری ملازمہ سلیمہ مسلسل میری منت سماجت کر رہی تھی اور میں حیرت اور پریشانی سے اسے تک رہی تھی۔ مجھ پر جھنجھلاہٹ بھی طاری ہو رہی تھی۔ آخر میں نے غصے سے اس سے پوچھا۔ ”آخر کیا وجہ ہے جو یہ تم مجھے ہمارے بار روکتی ہو، لیکن اصل بات تم بتاتی ہو؟“ اس نے افسردہ اور اُداس نگاہوں سے میری جانب دیکھی اور بولی۔ ”یہ بات پوچھتے بغیر آپ اس کام سے باز نہیں آئیں گی؟“

”ہاں“ میں نے دل ہی دل میں ایک منہ بولا دیا اور اسے شرط پیش کر دی۔

”اگر تم چاہتی ہو کہ میں اس کام سے باز آ جاؤں تو مجھے اپنی ساری کہانی سچ سچ سناؤ۔“

اس ساری بات چیت کا پس منظر یہ تھا کہ میں اپنے والدین کی اگلی اولاد تھی۔ خوب صورت اور جوان تھی اور میں قیصر سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ قیصر میرے ساتھ کاش میں پڑھتا تھا۔ ان کی مالی حالت تو ہم سے کم تر تھی، لیکن میں اس کی مردانہ وجاہت پر فدا تھی اور وہ بھی مجھ



بھی کر رہی تھی۔

پھر جب قیصر اور میں نے شہر سے بھاگنے کا پروگرام بنایا تو سلیمہ نے مجھے روکنا چاہا۔ اس وقت بھی یہی باتیں ہو رہی تھیں اور میں نے شرط عائد کر دی کہ اگر سلیمہ مجھے اسے تمام حالات سے آگاہ کر دے تو شاید میں شہر سے بھاگنے کا پروگرام پھینک کر دوں۔ میرے شدید اصرار پر سلیمہ نے اپنی کہانی سنانی شروع کر دی۔

میرا نام اصل میں کچھ اور ہے۔ یہاں اس شہر میں آنے میں نے نام بھی بدل دیا ہے۔ بات بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اس لیے سبھی کی ادا رہی تھی۔ میرے ماں باپ بھی مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے اور میری ہر خواہش اور ہر ضرورت میں مانگتے ہی پوری ہو جاتی تھی۔ میرا ہر بھائی دوسروں پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا اور میرے لیے بہت سی چیزیں لے آتے۔ میرے کمرے میں بہت سی چیزیں یعنی کپڑے، جوتے، ٹیک اپ وغیرہ

ہوتی تھی۔ وہ اسے میں بڑے عزت سے لے کر لاتی تو وہ کبھی کبھی افسردہ ہو جاتی اور کہیں کچھ جاتی۔ میرے ذہن میں یہ خیال پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا کہ سلیمہ محبت کے ناگ کی ڈی ہوئی ہے۔

گھر سے باہر قیصر سے میری ملاقاتیں جاری تھیں اور قیصر کا اصرار تھا کہ وہ اپنی والدہ کو ہمارے گھر بھیجنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ ذرا ٹھہر جاؤ، پہلے میں مکی اور پاپا سے بات کروں گی، پھر تم اپنی امی کو ہمارے گھر بھیجنا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ میرے والدین میری شادی قیصر سے کرنے پر رضامند نہ ہوئے اور مجھ پر غیر محسوس طریقے سے پابندی عائد کرنے لگے۔ اس وقت میں نے سلیمہ کو اپنا ہمراز بنایا اور اسی کے ذریعے میری قیصر سے بات چیت ہونے لگی۔ اس کام کے لیے مجھے سلیمہ کی بڑی منت سماجت کرنی پڑی تھی، لیکن میں نے قیصر اور اپنی محبت کی خاطر اپنی ملازمت کی منت سماجت

باہر بھی جانے لگی تھی۔ ایک دن مارکیٹ میں میری شفقت سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت میری ایک سہیلی بھی میرے ساتھ تھی۔ ہم ایک ہوٹل میں گئے اور چائے کا آرڈر دینے کے بعد باتیں کرنے لگے۔ میری سہیلی میری ہم راہ تھی اور اس لیے ہم بلا جھجک باتیں کرنے لگے۔ آخر کار ہم نے گھر سے بھاگنے کا منصوبہ بنالیا، کیوں کہ ہماری شادی میں میرے والدین اور بھائی نوالا دی دیوار کی مانند رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

منصوبہ کامیاب رہا اور میں اپنے ماں باپ اور بھائیوں کی عزت و غیرت کا جنازہ نکال کر گھر سے بھاگ کر شفقت کے ساتھ ایک گاؤں چلی گئی جہاں شفقت کا ایک دوست رہتا تھا۔ وہیں ہمارا نکاح ہوا تھا۔ چند روز ہم وہاں رہے اور جب میں نے محسوس کیا کہ شفقت کا دوست اور اس کی بیوی ہمیں بوجھ سمجھ رہے ہیں تو میں نے شفقت سے کہا اور ہم ایک دوسرے شہر آ گئے۔

ایک کالونی میں ہم نے مکان کرائے پر لے لیا۔ میں اپنے گھر سے بہت سے زیورات اور نقدی لائی تھی جو کہ آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی تھی کیوں کہ ضروریات زندگی تو پوری کرنی پڑتی ہیں اور شفقت کے پاس بالکل تھوڑی سی رقم تھی جو کہ کب کی ختم ہو چکی تھی۔

یہاں شفقت نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی مگر اسے کہیں سے بھی نوکری نہ مل سکی۔ اب اس کے حراج میں بھی چڑچڑاہٹ آ گیا تھا اور وہ اکثر مجھ سے شکوہ کرتا رہتا کہ میں اسے غلط راستے پر لے آئی ہوں۔ میں نے کہا۔ "شفقت! جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب آگے کی سوچو۔ یہ نقدی اور زیورات کب تک ہمارا ساتھ دیں گے؟" اس نے غصے سے کہا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تم تو امیر والدین کی بیٹی ہو، مگر میرے تو چھوٹے چھوٹے بہن بھائی اور ماں باپ ہیں۔ اب ان کا کیا ہوگا۔ یہ بھی سوچا ہے تم نے؟"

میں نے کہا۔ "دیکھو! جب تک یہ زیورات اور نقدی ہے، تم یوں کرو کہ ہر ماہ اپنے گھر کچھ رقم ہاتھ لگاتی رہو اور ملازمت بھی ڈھونڈتے رہو۔ خدا کرے گا اور تمہیں نہ کہیں تو ملازمت مل ہی جائے گی، پھر آپ اپنے

کام سامان بہت تعداد میں جمع تھے اور میں تھی کہ اتنی ڈھیر ساری محنتیں پا کر مضبور ہوئی جا رہی تھی۔ کمزوروں کا ایک جوڑا اور جوئے زیادہ سے زیادہ دس دن تک میرے پاس رہتے، پھر میں انہیں اپنی کسی ملازمت کو دے دیتی تھی۔

اسی غرور کی وجہ سے میرا کوئی دوست بھی نہیں بن پایا تھا، کیوں کہ میں کسی کو اپنا ہم پلہ سمجھتی ہی نہیں تھی اور نہ اس قابل کہ وہ میرا دوست بن سکے۔ ایسے میں شفقت میری زندگی میں بڑی آہستگی سے آ گیا۔ شفقت اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھا۔ اس سے چھوٹی دو بہنیں اور ایک بھائی تھا۔

وہ لوگ ہمارے پڑوس میں بطور کرایہ دار آئے تھے۔ پہلی دفعہ جب میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے شفقت کو دیکھا تھا تو مجھے لگا جیسے میرے خوابوں کا شہزادہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا ہو۔ اس کے بالوں کا اسٹائل، دل سوہ لینے والا جسم اور دیکھنے کا شوخ انداز مجھے گھائل کر گیا۔

ہمارے گھرانوں کے درمیان بڑی آہستگی سے رابطے بڑھ رہے تھے، مگر ہماری محبت کا پودا بڑی تیزی سے تناور درخت بننا جا رہا تھا۔ اس دن میں بہت خوش تھی جب شفقت نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ خوشی میرے آنکھ آنکھ سے ٹپک رہی تھی اور میں ہر نی کی مانند تھا نہیں بھرتی پھر رہی تھی۔ میری اس خوشی کو بھی نے محسوس کیا تھا اور میرے دو تین بھائیوں نے تو مجھ سے پوچھا بھی تھا، مگر میں اپنی سانگرہ کا بھانہ بنا کر انہیں ٹال گئی۔

کہتے ہیں تاکہ عشق اور شغف چھپائے نہیں چھپ سکتے، بالکل ہمارے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ ہماری محبت کا پتا بھی چل گیا اور میرے بھائی جو مجھ پر جان چڑھتے تھے۔ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے، لیکن میں شفقت کی محبت کے سمندر میں ڈوب چکی تھی اور اب اسے چھوڑنا میرے بس کی بات نہ رہی تھی۔

میرے بھائیوں کے ذہن سے وہ لوگ یعنی شفقت کے گھر والے وہ مکان چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے اور میں دن رات تڑپتی اور سسکتی تھی۔ آخر بھائیوں اور والدین کو دکھانے کے لیے میں شفقت کو بھول گئی تھی اور کبھی کبھار

سانحہ ارتحال

دھوم ٹی وی کے CEO اور روزنامہ قومی اخبار کے ایڈیٹر انچیف الیاس شاکر کے والد حاجی ابا عمر داؤد رضائے الہی سے انتقال کر گئے۔ ادارہ الیاس شاکر کے غم میں برابر کا شریک ہے اور ان کے خاندان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ درجات عطا کرے۔ (آمین)

چھوڑ دیا، کیوں کہ وہاں میری عزت محفوظ نہیں تھی اور یوں پھرتی پھرتی اب آپ کے پاس ہوں۔"

سلیمہ اپنی کہانی سنا کر خاموش ہو چکی تھی اور میں بھی کہ جسے مستقبل میں کھو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہی حالات میرے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔ اچانک سلیمہ بولی۔

"گناہ زبانی اب تو آپ گھر سے نہیں جائیں گی؟"

"نہیں جاؤں گی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو سلیمہ کے مردنی چہرے پر خوشی کے آثار پھیل گئے اور وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "اللہ تبارک و تعالیٰ ہے کہ تو نے گناہ زبانی کو میرے ذریعے سے ہدایت بخشی۔"

میں مسکرا دی تھی۔ آج میں تین بچوں کی ماں ہوں اور سلیمہ بھی میرے ساتھ ہی ہے۔ جی ہاں جہیز میں، میں نے امی ابو سے سلیمہ کو بھی مانگ لیا تھا اور اب وہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ اب وہ میری ملازمہ نہیں بلکہ بہن ہے۔ میرے شوہر شعیب ایک کنسٹرکشن کمپنی کے مالک ہیں اور اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہمارے پاس موجود ہے۔ میں آج بھی سلیمہ کی احسان مند ہوں اور مشکور ہوں کہ اس نے مجھے بھگنے سے بچالیا، کیوں کہ قیصر بھی کوئی اچھا انسان نہیں تھا۔ اس کی تصویر اخبار میں چھپی تھی جس میں لکھا تھا کہ وہ درپردہ اسمگلنگ کے کاروبار سے منسلک تھا۔ اس کا ایک خط میرے نام آیا تھا جس کی کچھ تحریریں تھیں۔۔۔۔۔

تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تم نے گھر سے قدم باہر نہیں نکالا، ورنہ تمہاری اور تمہارے والدین کی عزت کے ساتھ ساتھ ساری دولت و جائیداد بھی جانی، کیوں کہ قیصر کا منصوبہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔"

☆.....☆

والدین کو رقم بھیجتے رہتا۔"

شفقت رضامند ہو گیا اور یوں ہم ہر ماہ اس کے گھر والوں کو باقاعدگی سے رقم بھیجتے گئے، لیکن احتیاط کے طور پر کبھی اپنا پتا نہیں بھیجا۔ رقم اور زیورات کب تک ساتھ دے سکتے تھے۔ جلد ہی دونوں چیزیں ختم ہو گئیں۔ ادھر میرے پیٹ میں شفقت کی نشانی ملی رہی تھی۔ میں نے جب یہ بات شفقت کو بتائی تو وہ خوش ہونے کے بجائے الٹا ناراض ہونے لگا اور کہنے لگا۔ "اس مصیبت سے نجات حاصل کرو۔ ہم سے تو اپنا پیٹ نہیں بھرا چارہ اور اوپر سے یہ مصیبت بھی گلے بڑ رہی ہے۔"

میں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت مجھے اپنا پرانا وقت یاد آ رہا تھا جب میری ہر خواہش بن مانگے پوری ہو جاتی تھی اور میں ہر روز شادی اور دنیا جوتا پہنتی تھی اور آج یہ حالت تھی کہ اپنا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا ہر کام مجھے خود ہی کرنا پڑ رہا تھا۔ بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے زندہ سے ہوئے لہجے میں کہا۔ "شفقت! کیا ہو گیا ہے تمہیں! یہ تو ہماری محبت کی تحمیل اور نشانی ہے۔ تم اس قدر بد دل اور سنگ دل کیوں ہو گئے ہو؟"

اس نے مجھے جھڑک دیا اور سگریٹ بجھاتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ میں تنہا بیٹھی روتی ماضی کو یاد کرتی رہی اور پچھتائی رہی، مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ پھر جب میرا بیٹا سر پیدا ہوا تو اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد شفقت اچانک ہمیں غائب ہو گیا اور آج تک وہاں نہیں آیا۔ اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ پالنے کی خاطر تلف جگہوں پر کام کیا، مگر شاید یہاں مردوں کے روپ میں ورنہ سے چھپے ہیں۔ بہت سی جگہوں سے میں نے کام

آٹھویں سچ بیانی

سب جائز ہے

عبدالغفار عابد

دولت کی ہوس میں گھری ایک عورت کی عبرت خیز کہانی

”تو جانتا ہے زندگی بغیر مے کے نہیں گزرتی۔“
 باکیشری نے انگلی سے زمین پر مستقیم چا کر 1000 کا
 ہندسہ لکھا اور گہری نظروں سے جانو کو دیکھنے لگی۔
 جانو خاموشی سے اس کی بات سن سے سن رہا تھا۔
 ”کیا جانتی ہے ثواب“ اس نے میلے کپڑوں سے ہاتھ
 صاف کیے۔ اس کی بات سن کر وہ گھٹنے سیدھے کر کے
 اُن پر چہرہ دکانے دونوں ہاتھوں سے سر کاٹ کر بیٹھ گئی۔
 ”پیسہ..... نہیں بدست ہر طرف سے، بس اور
 کچھ نہیں۔“
 ”کیا پیسا چسلا لگائے رکھتی ہے تو ہر وقت.....
 تیرے کہنے پر میں یہاں شہر آیا ورنہ ہمیں گاؤں میں
 ڈیرے کی نوکری کیا بری تھی۔ کھانے، پینے، سینے کو تو
 سب کچھ مل ہی رہا تھا نا۔ تیری ہوس ہمیں مار دے گی۔“
 روزِ جمع ہو کر بولا۔
 ”بس یہی تو بات ہے تجھ میں۔ ہم دوسروں کو دیکھ کر
 نہیں سیکھتے۔ اندھے بن جاتے ہیں۔ تو ایسا کر مجھے کسی
 کوٹھی خانے پر لے چل۔ تجھ سے تو کچھ ہوگا نہیں۔ میں
 خود تجھے نوٹوں پر کھیل کر دکھاؤں گی۔“
 ”زبان سنجال باکیشری..... اپنے معصوم کے سامنے
 اتنی ٹنگی نہ ہو جا..... کہ.....“ فقط اس کے ہونٹوں پر آ کے

دھتور نے گھٹے۔
 ”اچھا بابا معاف کر دے۔“ باکیشری نے
 ہاتھ جوڑے۔
 ”ذرا خیال رکھنا ورنہ تیری چوٹی، ناک کاٹ کے
 پھینک دوں گا۔ بد معاش کہیں کی۔“
 ”رے بابا..... دے جا خلیا..... روپے دو روپے
 دے جا..... کھانا کھلا دے۔ تیرے بچے دیوس۔“ کسی
 سونڈ بونڈ آدی کو دیکھ کر وہ فوراً رہائی دے سکتا لے
 اس کے پیچھے پیچھے، تیز صدا میں دیتی چلنے لگی اور جانو بھی
 جان بوجھ کر لنگڑاتا ہوا۔ ”دے جا خلیا۔ دے جا خلیا۔“
 کرتا دیولی بھانے لگا۔

ہٹ..... ہٹ..... ہٹ.....
 باکیشری اور جانو گاؤں کے رہائشی تھے۔ دولت کی
 چمک ہمیشہ باکیشری کی آنکھوں میں تر ازور تھی اور یہی
 چمک اسے شہر تک جانو کو پلو سے باندھ کر لے آتی تھی۔ شہر
 آ کر اس نے کراچی جیسے بڑے شہر کو اپنی آنکھوں میں
 سمونے کی ناکام کوشش کی اور سوچ بچار کر کے محنت کے بغیر
 گداگری ہی کے پیشے میں چارم نظر آ یا تھا۔
 چند ہی روز میں وہ پورے پیشے اور بھکاریوں کے
 روپ میں ڈھل گئے تھے۔

اجازت چاہیے تھی۔ معاف کرو۔" ہائیشری نے

ہاتھ جوڑے۔
جانو کی شخصی بندھ گئی تھی۔

"ابے جا جا کر اسے چوک پر چھوڑ کر آ۔ یہ لونڈیا
بھگدار ہے۔ میں اس سے باتیں نہ کرتا ہوں باقی۔"

☆ ☆ ☆

"اوسے شرفو! جا جا کے اس نئی لونڈیا کو لے کر آ.....

نقڑے کے ساتھ جو چوک پر دھندل کر رہی ہے۔"

ہوکار یوں کاٹھیکیدار سیاہ کالا، موٹا، شیر آج اس نے
مال پر ہاتھ صاف کر دیا چاہتا تھا۔



شرفو جانو! چوک پر چھوڑنے کیا اور ادھر شیر نے
ہائیشری کے شہر سے وجود سے قطعہ و خچر کر خود کو
مست کر لیا۔

ہائیشری کے لیے یہ نیا تجربہ تھا۔

اس کے بعد ان نے پرمانہ سے نکالنا شروع کر دیا
اور ہائیشری سے تعلقات مزید گہرے کر لیے۔

"ایا پادشاہ؟"

چندویر بعد ہائیشری اور جانو ان کے سامنے تھے۔

"ہاں بھئی۔ اس کی اجازت سے کام چالو کیا تم

لوگوں نے۔" شیر اسے اپنی لال سرخ آنکھیں باہر نکال

دیا اشارہ کیا۔

"نہ کہ موافق اسے دے۔ ہم انہیں بنا تھا کہ اس کی

پارہ چھوڑا گیا 85

"ہائے افشا سردار کیسی ہاتھ کرتے ہو تم۔
میں..... جانو کہ..... کس طرح۔ نہیں سردار مجھ سے نہیں
ہوگا یہ سب۔"

"تو ہمت کرے گی تو سب کچھ ہو جائے گا۔
چل شاباش! ہمت کر۔ پھر سب کچھ تیری مرضی کے
مطابق ہوگا۔"

اور پھر رات آ گئی۔ ہائیکشری نے جانو کے سوتے
ہی کلوروفارم بھرا دیا جانو کی ناک پر رکھ دیا اپنی شلووار
میں اڑسا ہوا استراٹالا، کھولا اور اُس کے چمکتے پھل کو
دیکھا۔ جانو کا منہ کھولا اور زبان نکالی اور ایک ہی وار میں
زبان اُس کے ہاتھ میں تھکی۔

خون بہنا شروع ہوا اور وہ ایک ہاتھ میں زبان اور
ایک ہاتھ میں استراٹالے کر تیز تیز قدموں سے بیشرے
سردار کے حجرے کی طرف چل پڑی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ
کھل کسی ٹراکس کی کیفیت میں آگے بڑھتی چلی جا رہی
تھی۔ رات کے اندھیرے میں بھلا اُسے کون دیکھتا؟

☆.....☆.....☆

"اوائے حنیف رکھ وہاں اُس عورت کے ہاتھ میں
کیا چیز ہے۔" چاند کی چمکی چاندنی میں استرے کا پھل
چمک رہا تھا اور وہ بے خود آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی کہ
گشت پر موجود سپاہی حنیف اور رحیم نے اُسے جالیا۔

سردار بیشرہ اور ہائیکشری پولیس تحویل میں تھے۔
سردار تو ہر الزام سے بری الذمہ ہو گیا تھا، مگر ہائیکشری پر
الزام عائد ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

جانو کی بیوی جیل میں جاتے جاتے اُس کی زبان
بھی ہمیشہ کے لیے لے گئی تھی۔ ہائیکشری جیل کی آہنی
سلاخوں کے پیچھے بھری جوانی میں زندگی کے دن سیاہ
کر رہی ہے۔ سزا تو سزا ہے۔

بھلے خدا کسی بھی طور دے، مگر ہائیکشری کی آنکھوں
کی چمک ماند نہیں پڑی۔ اُن میں آج بھی شیطانی چمک
ہے۔ کیا عورت کا ایسا بھی روپ ہوتا ہے؟

یہ سوال آج بھی ہنوز تشنہ ہے۔ کیا اپنی ہوس کے
لیے سب کچھ جائز ہے؟

☆☆.....☆☆

☆.....☆.....☆

"تو ہر وقت کوٹھی خانے کی بات کرتی ہے۔ آج
میں تجھے تیا کھارہ دکھاؤں گا۔ بس ایک گھنٹے بعد صاف
ستھرے کپڑے پہن کر، نہادھو کر، پوڈر شوڈر لگا کر میرے
ڈیرے پر آ جائیو۔"

سردار بیشرے نے ہائیکشری کو آنکھ مار دے ہوئے کہا۔
سردار جانو بڑی چچی پلوں چکا پوتا ہے۔ اُس کو
ٹو سنہال لے گا۔ رڈنڈی وہ قسم ہے تیرا۔ چچی پلوں چچی
پلوں تو کرے گا۔ یار تھوڑی ہے تیرا وہ..... بات کر لی
ہے۔ دفع ہو۔" گھنٹے بھر بعد وہ صاف ستھری ڈیرے پر
موجود تھی۔

سردار سے رہا نہیں تو گیا اُسے اندر قلیے میں لے
گیا۔ ابھی کسی کارروائی کا آغاز ہوا ہی چاہتا تھا کہ پلوں
پلوں بچتے..... گاڑی کے پارن نے بھرے اُسے
انسان کے جالے میں آنے پر مجبور کر دیا۔ اُس کی کمر پر
چمکی کاٹ کر اُس نے ایک گنداسا اشارہ کیا اور ہائیکشری
کو باہر کھڑی بلیک شیرڈ میں سوار کر دیا۔

☆.....☆.....☆

ایک ہی جھکے میں دس ہزار کی خطیر رقم جب
ہائیکشری کے ہاتھ میں آئی تو وہ یہ سب بھول گئی کہ
اُس روشن کرے میں کتنے بندے اُس کی بوٹی بوٹی
لوچ رہے تھے۔

اُس رات جانو کا حوصلہ جواب دے گیا اور اُس نے
اُس کے درگیدے گھمے جسم پر اُسے چار چوٹ کی مار لگائی۔
سج تڑکے جانو باہر نکل گیا اور ہائیکشری بتار میں
پھنکنی چمک پر پڑی رہی۔

سردار بیشرے کے پاس آ کر اُس نے یہ خبر سنائی تو
وہ اُسے نئے رنگ دکھانے لگا۔

"میری جان..... یہ لے اسے۔ یہاں سنہال
لے۔" بیشرے نے ایک تیز دھار والا استراٹالا اُس کی شلووار
میں اڑسا۔

"ہائے سردار..... میں کیا کروں گی اس کا۔" وہ
ہکلائی۔

"تو نے کچھ نہیں کرنا چاہی۔ سب کچھ یہ خود کر لے
گا۔" سردار نے اُس کے کان میں کچھ کہا۔

نویں سچ بیانی

حیاتِ جاویداں

محمد علی سدوزی



دہشت گردی کا شکار ہونے والے ایک سپاہی کی زندہ کہانی

www.paksociety.com

www.paksociety.com

دیجاتے ہوئے بتایا کہ میرے والد نذیر احمد چوہان دو بھائیوں اور چار بہنوں میں سب سے بڑے اور انتہائی خوش اخلاق اور جاذبِ نظر شخصیت کے حامل تھے۔ وہ شینگ کہنی میں بطوری میں ملازم تھے اور اکٹر ملک سے باہر رہتے تھے۔ والد مقیم بھائی کو پیار سے گندو کہہ کر نکالا کرتے تھے۔ مقیم بھائی بچپن سے ہی والد صاحب کی طرح خوش اخلاق اور نرم مزاج تھے۔ ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ 14 اگست کے دن پورے گھر اور محلے کو دھن کی طرح سجادیا کرتے تھے اور اس روز ان کی سرشاری دیکھنے کے قابل ہوا کرتی تھی۔

مقیم احمد وطن کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے اسی لیے ان کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1995ء میں محکمہ پولیس سے وابستہ ہو گئے۔

شہید مقیم کے سب سے چھوٹے بھائی عظیم نے بتایا کہ والد صاحب کی وفات کے بعد مقیم بھائی نے چھوٹے ہونے کے باوجود بڑا بہن کرہم سب بہن بھائیوں کو سہارا دیا اور والد صاحب کی وفات کے بعد بننے والے خلا کو پُر کر دیا۔ مقیم بھائی نے کبھی کسی چیز کی ہمیں کی نہیں ہونے دی۔ اگر گھر میں سے کسی بھی فرد نے بھی کوئی بھی فرمائش کی تو اس کی فرمائش کو

اگر پاکستان کی سلامتی کو داؤ پر لگانے والے ملک دشمن عناصر ایک صرف کمر بستہ ہیں تو دوسری جانب پاک سرزمین کے تحفظ کے لیے ریاستی سطح پر لاگو کیے گئے قوانین کی رٹ کو یقینی بنانے کے لیے پولیس کے جوان بھی سینہ سپر ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ جرائم پیشہ ملک دشمن عناصر کے خلاف جاری آپریشن اور اس کے اہداف کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے مصروف عمل باصلاحیت اور فرض شناس پولیس افسران اور نوجوان سپاہی جام شہادت نوش کر رہے ہیں۔ ایسے کئی واقعات ہیں جو صفحہ قرطاس پر بھرے پڑے ہیں اور پولیس اہل کاروں کی شجاعت اور بہادری کی داستان سنا رہے ہیں۔ اس ہی طرح کا ایک واقعہ اورنگی ٹاؤن تھانے کی حدود ایم پی آر کالونی ہسپتال کے قریب پیش آیا۔ یعنی شاہدین کے مطابق موٹر سائیکل پر سوار دو مسلح دہشت گردوں نے جیسے مسکراتے خوش اخلاق اور فرض شناس پولیس اہلکار 40 سالہ مقیم احمد ولد نذیر احمد چوہان کو گولیاں مار کر قتل کر دیا۔ شہید پولیس اہلکار محکمہ پولیس کے شعبہ پرنسپل انسپل برانچ میں ہیڈ کانسٹیبل تعینات تھا۔ شہید پولیس اہلکار مقیم کے بھائی چھپیا کے رضا کار ویم احمد نے بھائی کے ساتھ گزرے دن کی یادیں



14 سالہ جینی بھائی نے کم زور اور دھمی الفاظ میں بتایا کہ ہمارے پاپا بہت اچھے انسان تھے۔ وہ ہر صبح ہم سب کو نماز کے لیے اٹھاتے تھے اور پھر نماز پڑھنے کے بعد ہم سب ایک ساتھ ناشتہ کرتے تھے۔ میرے پاپا کی خواہش تھی کہ دنیا ال احمد کو انجینئر، جب کہ سب سے چھوٹی جینی عائشہ کو ڈاکٹر بنائیں گا، وہ اکثر جھوٹے بھائی نذیر احمد کو حافظہ قرآن پڑھانے کی بات کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی خواہشات کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور سب بہن بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ملک و قوم کی خدمت کریں۔ ہم حکومت سے اہل کرتے ہیں کہ ہمارے پاپا کے قاتلوں کو جلد از جلد گرفتار کیا جائے اور ان کو جہریت تک سزا دی جائے۔ ہمارے چورے اہل خانہ کی دعا ہے کہ ہمارے پاپا کو اللہ تعالیٰ جنت میں بلند درجات عطا فرمائے۔ تم شہید کے 10 سالہ بیٹے نذیر احمد نے آنسوؤں سے تر آنکھوں اور مصیبت کے لہاوے میں لپٹے زوے الفاظ میں بتایا کہ ابو مجھے اکثر لہا کرتے تھے کہ آپ قرآن حفظ کریں اور میری شہادت کے بعد میرے جنازے میں نماز آپ نے پڑھائی ہے ابو جیوش دیوٹی سے آئے۔ بعد ہم سب بچوں

انہوں نے فوری طور پر پورا کیا۔ وہ بعض کام تو بغیر پولے ہوئے پورا کر دیتے تھے۔ وہ اپنی سنجیدگی اور وبردباری کی وجہ سے گھر اور خاندان کے لیے کیا کرتے تھے۔

ایم پی آر کا لونی میں وہ محلہ کے تمام افراد کے ساتھ مکمل مل کر رہے تھے اس کے باوجود محلہ کے اکثر افراد اس بات کو نہیں جانتے تھے کہ شہید محکمہ پولیس سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے بھی بھی محلے میں اپنے آپ کو پولیس اہلکار ظاہر نہیں کیا تھا۔ بھائی اپنا ہر کام کرنے سے پہلے ہی پر وگرام بنالیتے تھے اور وقت کی پابندی کیا کرتے تھے۔ محکمہ پولیس کے تمام افسران و اہلکار ان کے مسن اخلاق کی تعریف کیا کرتے تھے۔ محکمہ پولیس کے افسران و اہلکاروں نے ہمیں اکیلا ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا۔ بھائی کی شہادت کے بعد تمام دفتری معاملات ان کے ساتھ ایوینی کرنے والے اہلکاروں نے سنبھال لیے۔ گھر کے تمام بچے ان کا انتظار بے چینی سے کرتے تھے اور ان میٹر سائیکل کی آواز سننے ہی بچوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ مقیم بھائی کے گھر میں داخل ہوتے ہی بچے انہیں گھیر لیا کرتے اور وہ بچوں کو سیر و تفریح کے لیے باہر لے جایا کرتے تھے۔ مقیم بھائی اپنی سب سے بڑی بیٹی مہک کو پیار سے مہک باقی پکارا کرتے تھے۔ ہم اپنے بھائی کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے، ان کی زندگی کی خوب صورت یادیں ہمیں ہمیشہ یاد دیر لگی۔

شہید ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور ہمیں اس کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ ہیں۔ شہید مقیم کی



ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت عطا فرمائے اور ملک دشمن عناصر کی سازشوں اور ان کے ایجنٹوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی صلاحیت اور امت عظام فرمائے۔ مقیم شہید کے جسد خاکی کو گارڈن ہیڈ کوارٹر میں سلامی دی گئی، بعد ازاں علاقائی مسجد المنور میں نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد ایم پی آر کالونی کے قبرستان میں والدہ اور والدہ کے پہلو میں ان کی تدفین کی گئی۔

شہید مقیم کی بیوہ شدید غم کی کیفیت میں ہے اور یوں لوح کہیں ہے..... میں کس کے ہاتھ پاپے شوہر کا لبو تلاش کروں، ظالموں نے اس کے سر سے نہ صرف سہاگ کی چادر چھین لی ہے، بلکہ اس کے بچوں کے سر سے بھی ہاپ کی

شفقت کا سایہ چھین

لیا ہے۔ اس کی اشک

برساتی آنکھیں سراپا

سول اور انصاف کی

ملحوظ ہیں۔ شہید کے

محسوس بچے صہک،

علینہ، عائشہ، دانیال

اور نذیر اپنے والد کے

مختصر ہیں کہ وہ آئیں

گے اور ان کی فرمائشیں

پوری کریں گے ان

کے سر پر دست شفقت رکھیں گے اور ان کو اپنے سے لگا کر چھکیاں دیں گے لیکن.....

مقتول کے قتل کا مقدمہ 102/14 تعزیرات

پاکستان کی دفعہ 302/34 RW 7 ATA گواہان

کی پروٹیکشن کے آرڈیننس ISPPO کے تحت پہلی بار

لورڈ ناؤن تھانے میں ورج کیا گیا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ

مقتول کے اہل خانہ کو انصاف کی دلیلیز کب میسر آتی ہے

اور ان کی یہ امید کب پوری ہوتی ہے کہ شہید کے قاتل

قانون کے شکنجے میں جکڑے جائیں گے اور انہیں

سلاخوں کے پیچھے دیکھ کر ہی ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں

گی۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو پھر یہ کچھ لیجے کہ دہشت گرد

کسی بھی وقت کچھ بھی کرنے کو کھلے چھوڑ دیے گئے ہیں۔

☆.....☆

کو سیر کرانے کے بہانے باہر لے جاتے تھے اور وہاں ہمیں جوں اور انہیں بھی دلاتے تھے۔ ہماری مانی کی عمر 90 برس ہے۔ وہ جب بھی گھر آتے تھے تو سب سے پہلے مانی جان کے پاس جاتے اور ان کی طبیعت کے بارے میں پوچھتے تھے اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ شہید مقیم کے ساتھ پولیس کے محکمے میں ایک ساتھ ٹریننگ کرنے والے اہلکار نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے پر کہا کہ شہید نے آخری بار سب اسپیکر نیاز شہید کا جنازہ ادا کیا تو یہ الفاظ کہے کہ یہ شہید کتنا خوش قسمت انسان ہے کہ اس کا جنازہ اس کے بیٹے حافظ سید عدین احمد نے پڑھایا، کاش کہ میں بھی شہید ہو جاؤں اور میرا بیٹا بھی میرا جنازہ پڑھائے۔ اپنے دوست سے شہید

نے کہا کہ تم اگر شہید

ہو گئے تو میں تمہارا

جنازہ ضرور ادا کروں گا

اور میری شہادت پر پتا

نہیں تم کہاں ہو گے

شہید کے دوست نے

اپنی پرانی یادوں کے

جھروکیں میں جھانک

کر مقیم شہید کی

شرارت کا ایک یادگار

واقعہ سنایا کہ ہم سب

کی جب پہلی پوسٹنگ ہوئی تو ہم نے پٹنگ پر جانے کا

پروگرام بنایا اور ساحل سمندر پر پہنچ گئے۔ ہم نے آموں کی

پٹلی سمندر کے پانی میں رکھ دی اور نہانا شروع کر دیا۔

مقیم شہید کو آم بہت پسند تھے۔ اس نے سمندر میں

نہاتے ہوئے ایک ایک کر کے سارے آم کھا لیے اور ہم

نے جب بیٹی پانی سے باہر نکالی تو وہ آموں سے خالی تھی۔

مقیم شہید دور کھڑا مسکرا ہوا تھا۔ سب دوست اس کی شرارت کو

سمجھ گئے اور اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ ہم اپنے شہید بھائی

کے ساتھ گزارے ہوئے یادگار لمحات کو کسی صورت نہیں

بھول سکتے۔ یہ بات کرتے ہوئے ان کے ساتھیوں کی

آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ان دوستوں نے کہا کہ پٹنگ پر

جانے والے ہم 5 دوستوں میں سے تین دیرینہ دوست

وطن کی آمد پر شہید ہو چکے ہیں اور اب ہماری بھی خواہش

دسویں سچ بیانی



وہ باتیں تیر کی

عاشق و نسیم

کراچی سے اپنے مانا کی یاد میں، ایک محبت نامہ

نہ ہو۔ ایک خطرناک بیماری نے دیکھتے ہی دیکھتے ان کو کھالیا۔ میرے پیارے "مانا" جو چلے گئے! جانا تو ہم سب کو ہے، مگر اتنا اچانک 40 دنوں میں یہ رگی کا پتا پلٹنا، پھر آپریشن، پھر ٹھیک ہوتے ہوئے اچانک چلے جانا۔ آپریشن سے پہلے کافی تکلیف اٹھائی انہوں نے۔ گردے میں کیسٹر ہوا تھا جو کہ پیچھے دوس میں بھی تھوڑا پھیل گیا تھا، مگر گردے بدلوانے کے بعد مانا ابونے کہا تھا۔ "میں اب جینا چاہتا ہوں۔" مگر قسمت کو یہ منہ نہ دیا کیوں نہیں تھا؟ آخر کیوں۔ وہ بار بار بول رہے تھے کہ "میرا وقت آ گیا" مگر ہم دواؤں کا اثر سمجھتے رہے، ہم تو ان کو ٹھیک ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ہم کو کیا پتا تھا کہ ان کو اپنی موت کا علم ہو گیا تھا اور ان کی نہیں سنی، ظاہر ہے جو ہمارے دل کے بہت قریب ہوتے ہیں ان کی موت کا تو ہم دنیاویں میں بھی تصور نہیں کر سکتے تھے۔ کاش اس بیماری کا کوئی علاج ہوتا، کتنے لوگ اس بیماری کی نذر ہو چکے ہیں۔ کاش ہم ان سے بات کر پاتے جو اب ہمارے درمیان نہیں، جا چکے ہیں ہمیشہ کے لیے۔ بس یہی پوچھ پاتے۔ "ٹھیک ہیں نا آپ۔" ہمیشہ خوش رہے گا۔ اپنی دعاؤں وہاں سے بھی ہم کو دیتے رہے گا۔ اللہ آپ کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اونچا مقام عطا کرے۔ آپ جہاں بھی ہیں آپ کی ہمیں بہت یاد آتی ہے۔ قدم قدم پر آپ کی رائے کی اور آپ کی ضرورت ہے ہم کو۔ اللہ ہم کو بھی آپ جیسا اچھا انسان بنائے اور جس مقام پر آپ ہم سب کو دیکھنا چاہتے تھے، اللہ وہ مقام دلائے۔ (آمین)

ہم سب کو آج نہیں تو کل اس دنیا سے جانا ہی ہے۔ ہم سب تو مسافر ہیں اس چلتی دنیا کے، مگر افسوس ہوتا ہے ان لوگوں پر جو اپنی زندگی سے کچھ مل چر لینا چاہتے ہیں، مگر اس سے پہلے ہی وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے دور چلے جاتے ہیں، ان کی خواہشیں ان کی، ان کی رہ جاتی ہیں۔ میرے بھی کوئی تھے، میرے بہت اپنے، جنہوں نے بھی اپنے لیے نہیں سوچا، اپنے لیے نہیں بنے۔ اپنی خوشی کی پروا کیے بغیر ہمیشہ دوسروں کے لیے سوچا۔ چاہے جتنا بھی درد یا تکلیف میں کیوں نہ ہوں، کبھی کسی سے نہیں بانٹا۔ کیوں ایسے تھے اور اب مجھے لوگ اپنی جلدی چلے جاتے ہیں، کبھی واپس نہ آئے کے لیے، کیا ان کو جینے کا حق نہیں، مگر سنا ہے جو اللہ کو عرض ہوتے ہیں، اللہ ان کو جلدی اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ میرے "مانا" ابونے زندگی بھر محنت کرتے رہے۔ نوکری کرتے رہے تاکہ اپنے گھر کی خوشیاں دے سکیں۔ اس کے بعد قسمت نے ان کو موت نہیں دیا۔ بچپن سے محنت کرتے رہے۔ اپنے چار بچوں کو ان کے گھر کا کیا۔ ان کی خوشیاں اللہ پاک نے دکھائیں، مگر اپنی جیہتی اور دلاؤ بیٹی کی شادی کا ارمان دل میں لیے ہی چلے گئے۔ ان کی بہت خواہش تھی کہ جلد از جلد ان کی زندگی میں اس کو اپنے گھر کا کر دیں، مگر الحمد للہ، اللہ نے تمام فرائض ان کے پورے کرائے، بس ایک ہی رہ گیا۔ اللہ نے چاہا تو ہم ان کی یہ آخری خواہش جلد پوری کریں گے تاکہ ان کی رونا کو سکون ملے۔ کاش ہم ان کے لیے ان کی اس خواہش کے لیے کچھ کر پاتے، مگر ہم کچھ نہیں کر سکتے، جب تک اللہ کی رضا مندی

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ نمبر

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی ستائیسویں تقریب کے یادگار لمحات
ایوارڈ یافتگان کے تاثرات

مندوبین دوشیزہ کی ملن ساز گھڑیاں.....



وہ لمحات جو امر ہو گئے

تقریب بہر ملاقات کے خاص پل

بہت جلد دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ نمبر میں ملاحظہ کیجیے

آتشِ جنوں

سلیم نازکی



ایک خلافت نو جوان کی سرگزشت۔ وہ اپنے ملک سے نڈاؤں کا نام نشان دہا
دیہ چاہتا تھا۔ اس سفر کے میں اس نے اپنا سب کچھ باریک دیکھ کر حوصلہ نہیں ہارا

چمن چمن۔ سا حوصلہ رکھنے والے نو جوان کی زوداد، 28 ویں کتری

گوشتہ افساط کا خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے تھے یہاں پر عزت و احترام کے لیے زمانے سے بڑے
جائے والے۔ ارسلان کو کچھ لالچی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت کھمدار اور سوچ سمجھ کر لیٹے کرنے والا۔
عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سہمہ میں انہیں ملتی ہیں۔ عمران اور ارسلان ناشد کی لالچ پر سہمہ کی میر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر
کے دوران میں فن کا راشد کی لالچ پر کام کرنے والے ایک جرم پیشہ ملازم علی اور اس کے ساتھیوں سے ٹکراتا ہوتا ہے۔ فنی راشد کی اعلیٰ میں
اس کی لالچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر دیا جاتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس
دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فنی کی جڑ سے جرم پیشہ گروہ کا آلہ کار ہے۔ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق
ایک ایرانی ملی اکیر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی نیٹ ورک کا ڈال ہے۔ راشد کا حرا د ہو جاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدھی عمران اور
ارسلان کی بین شناخت کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو قحانے لے جا کر شدید تشدد کا نشانہ بناتی
ہے۔ قحانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری رہتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آ جاتا ہے۔
عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اس کے گھر والے خصوصاً چھوڑا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران میں
پولیس عمران کے گھر پر پڑھ کر پتے اور اس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی والدہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس کے والد
بھی اس فم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو جاتے ہیں۔ عمران اور ارسلان فم سے غصہ محال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی
عدنان پر تو سخت سزا جاری ہو گیا تھا۔ باپ سے محرومی کے بعد ان کی وابستہ گروہوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں
معلوم ہوتا ہے کہ عدالت میں ان کا کیس لڑنے والا ہیڑیڑی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شناخت نے خود کشی
کر لی ہے۔ عمران اور ارسلان اپنی بین کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بین شناخت کی ڈیل باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ عمران اور
تیوڑ شناخت کو تلاش کرتے کرتے حاکم خان کے پاس پہنچ جاتے ہیں مگر شناخت حاکم خان کے فٹنوں کو ڈنکی کر کے پیٹری فرار ہو جاتی
ہے۔ تیوڑ حاکم خان کو ہانک کر دیتا ہے۔ وہ دونوں حاکم خان کے سیف سے ضروری کاغذات لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ مشہدی
فون کر کے ان کا خدات میں سے ایک ڈیل فاکس کا قحانہ کرتا ہے مگر عمران اسے فاکس دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ فیل فون پر مشہدی اور
عمران کی سخت کٹائی ہوتی ہے۔ مشہدی اسے دھمکیاں دیتا ہے اور ملٹری اٹلی ٹینکس کو اس کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ اسی دوران میں عمران
کا ایک دشمن فنی لالچ عمران سے آتا ہے۔

جان محمد جو کہ شہیدی کا آدمی ہے لیکن اس میں وہ عمران کے لیے کام کر رہا ہے۔ معلومات فراہم کرتا ہے کہ ان کے خاتمے کے لیے شہیدی نے جن کرائے کے قاتلوں کو امریکا سے بلا یا ہے ان کی تعداد پانچ ہے جن میں سے دو کا تعلق امریکا سے ہے ایک ہندو ہے اور وہ بیرونی۔ بلوچ شہید کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ کسی زمانے میں چھوٹا موٹا دہشت گرد تھا جسے بعد میں شہیدی نے اپنے گینگ میں شامل کر لیا تھا۔ اس کا اصل نام شہاب ہے اور اس کی ایوی ایل پورٹ پر ہوتی ہے۔ شہیدی کے خاص آدمیوں میں سے ہے۔ تیورہ فیملی کے اسے آرٹھ کے مرد و جسم کو لے کر ہر جگہ جاتا ہے۔ ابھی تیورہ کو اگلے مشکل سے دس منٹ ہوئے تھے کہ عمران کے گھر کے نزدیک پولیس موہاں کے سائرن کی گرجت آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بلوچ شہید سے پوچھنا شروع کر دیتا ہے۔ شہید بتاتا ہے کہ ارسلان شہیدی کی قید سے طرہ ہو گیا تھا جاتے شہیدی کی خلیہ لاکھ لے گیا ہے۔ لاکھ یا اس اور راتوں کے اچھے چڑھ گیا اور اب تیار ڈنٹل دہلی میں ہے۔ اچانک سامنے سے کوسٹ گارڈز کی بوتل آتی ہے جسے دیکھ کر بلوچ اپنی بوتل کی اسپرنگ بھی بندھا دیتا ہے۔ کوسٹ گارڈز کی بوتل کی طرف سے فائرنگ شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے ہی شہاب مارا جاتا ہے۔ اخبار میں خبر نہجی ہے کہ "مرحوم سانی کا کن اور تاج محمد الہید راجہات کا ہوئی میں پر اسرار طور پر قتل کر دیا گیا ہے۔ عمران اس شہادت سے متاثر ہے کہ آئل ہونے والا دراصل "را" کا ایک سفاک اور غولی اکبر تھا جو تڑپتے نہیں برس سے پاکستان میں مقیم تھا۔ وہ یہ معلومات اخبار کو مرید کرنا چاہتے ہیں اور اس مسئلے میں ان کے ذہن میں معارف و افلاس، انکسائٹ کے ذریعہ اور کالم نگار و قلم نویس کا کام آتا ہے۔ عمران انہیں فون کر کے ملاقات کے لیے کہتا ہے اور اپنے ہمراہ شہید کو بھی لے جاتا ہے۔



دقار الحسن کے دفتر سے وہاں ہی پر انہیں جیک کی سرسٹ پر نظر آتی ہے۔ وہ لوگ جیک کی گاڑی کا چھچھا کرتے ہیں۔ ہوٹل کے کمرے میں ان لوگوں کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے اور ان میں سے ایک شخص ہلاک ہو جاتا ہے جب کہ جیک فرار ہو جاتا ہے۔ عمران اور ہاشم بڑے محفوظ طریقے سے ہوٹل سے نکلے ہیں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ان کے دو دو دقار الحسن سے ملنے ان کے آفس تک پہنچتے ہیں اور جیک کے بارے میں بتاتے ہیں تو وہ مگر مند ہو جاتے ہیں۔ عمران دقار الحسن کو اپنی فیملی لڑ بھڑکی کے بارے میں بتاتا ہے کہ کیسے ان لوگوں کی دشمنی مشہدی سے ہوئی اور وہ لوگ اور سلطان کو مردہ سمجھتے رہے، جب کہ وہ دہلی کی تہاڑ جیل میں ہے۔ تب دقار الحسن انہیں اپنے اظہار جانے اور "را" کی قید میں رہنے کے واقعات کی تفصیل بتاتے ہیں۔

بلوچ عمران کو بتاتا ہے کہ اس کی بہن شائستہ کا پتا مل گیا ہے اور وہ تفصیل بتانے لگا رہا ہے۔ بلوچ شائستہ کے متعلق بتاتا ہے کہ وہ آج کل میرپور خاص میں کسی دھڑ کی حفاظت میں ہے اور یہ بات بلوچ کے آدمی رمضان نے بتائی ہے، رمضان عمران کو بتاتا ہے کہ میرا نگہ دہ تھا جیسے وہ لڑکی اپنی مرضی سے نہیں رو رہی ہے، کیوں کہ وہ جس کمرے میں تھی وہاں سے بند تھا۔ پوچھتے ہیں کہ وہ بتاتا ہے کہ میر صاحب کا نام میر احسان الحق شاہ ہے عمران اپنے ساتھیوں کے میر شائستہ کی تلاش میں میرپور خاص کے لیے روانہ ہو جاتا ہے، میرپور خاص کے داخلی دروازے پر پنی پولیس چوکی پر انہیں روک لیا جاتا ہے۔

عمران پولیس آفیسر سے کہتا ہے کہ وہ لوگ، ڈیرے ممتاز سومرو کے مہمان ہیں یہ سن کر پولیس افسر کھنکھراتا ہے اور ان کی گاڑی کو آگے جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ ممتاز سومرو انتہائی خوش اتفاق طور پر چانکھا ڈیرہ ہے، جو بد حقیقت اور سلطان کا دوست ہے۔ عمران ممتاز سومرو کو ساری کہانی سناتا ہے اور شائستہ کے متعلق بتاتا ہے کہ وہ میر احسان الحق کی قید میں ہے ممتاز ان لوگوں کو تسلی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر اس دھڑ کی ہتھیاروں سے کسی سے بھی شائستہ کی رہائی میری ذمہ داری ہے، وہ لوگ ممتاز سومرو کے ہمراہ میر احسان الحق کی حویلی پہنچتے ہیں، ممتاز میر صاحب سے عمران کا تعارف کرواتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کی بہن کچھ لوگوں کی قید میں ہے اور یہ اس کی رہائی چاہتے ہیں اور جس شخص کی قید میں ان کی بہن ہے اس کا نام میر احسان الحق ہے نہ پتا نام ممتاز سومرو کے گھر سے سن کر میر احسان سخت غصے اور عیش میں آ جاتا ہے اور انہیں وہاں سے جانے کے لیے کہتا ہے جب تک میر احسان پر جھپٹ چڑتا ہے اور انہیں اس کے گلے پر کھ کر شائستہ کی بازیابی کا مطالبہ کرتا ہے، ممتاز سومرو اس سے کہتا ہے کہ ان لوگوں کا تعلق اللہ رولڈ سے ہے لہذا اپنے آدمیوں کو جاہلیت و کفر شائستہ کو نہیں لے آئیں جب میر احسان عقل کو فون کر کے شائستہ کو کولے گا کہتا ہے، کچھ ہی دیر بعد عقل شائستہ کو کمرے میں لے آتا ہے شائستہ عمران کو دیکھ کر اس سے لیت جاتی ہے۔ عمران ان کو تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تم نے بہت آفسوہا لیے اب آفسوہانے کی باری دشمنوں کا ہے، میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ عمران تیمور کو دہاں سے نکلنے کا کہتا ہے اور میر احسان کو بھی ساتھ لے جانے کا کہتا ہے اور وہ لوگ دہاں سے ممتاز کی شہر سے باہر دہلی حویلی پہنچ جاتے ہیں وہاں پہنچ کر وہ میر احسان سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے آدمیوں کو فون کر کے بتادے کہ وہ حیدر آباد ایک دفاتی دفتر سے ملے جا رہا ہے۔ ممتاز تیمور کو کہتا ہے کہ میں نے احسان سے پچھلے بہت سے حساب برابر کرنا ہیں۔ عمران تیمور سے کہتا ہے کہ اس ڈھانچہ گلیاں سے محروم کرو۔

(اب آگے ملاحظہ کیجیے)

ہم لوگ سکتے کی حالت میں اسے دیکھ رہے تھے اور احسن سردی کھائے ہوئے پتلے کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ کم بخت سرے سے مسلمان ہی نہیں تھا۔ یہی تو پولیس کا ایک حربہ آزمانے کو اسے بے لباس کیا تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میر احسان الحق شاہ جیسا آدمی پھر تو کیا، سرے سے مسلمان ہی نہیں ہے۔ اس وقت احسن کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا اور وہ بہت بے بسی اور بے چارگی سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" تیمور نے دھاڑ کر اس سنائے تو زرا۔ "اور تم کب سے یہاں کے ساوا لوگ حوام کو بے خوف بنارہے ہو؟"

"یہ تو پچھلے تین سال سے اس علاقے میں ہے۔" ممتاز نے کہا۔

"میں پوچھتا ہوں، تم ہو کون؟ اپنا اصل نام بتا۔ ورنہ میں تمہارے جسم کو اس خنجر سے ٹکڑوں میں تقسیم کر دوں گا۔"

"مم... مم... میرا..."

"کیا بکری کی طرح میا رہا ہے؟" ممتاز نے کہا۔ "سیدھی طرح بتا کہ تو کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"مم... میرا... اصل نام... بریش... ہے بریش چندا"

"اس کا مطلب ہے کہ تو بھارتی جاسوس ہے؟" ممتاز نے پھر کر کہا۔ "تو برسوں سے ہمارے سینوں پر مونگ دل رہا ہے۔"

"میں جاسوس نہیں ہوں۔" وہ نحیف آواز میں بولا۔ "ہاں بھارتی ضرور ہوں۔"

"تو بھارتی ہے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟" تیمور نے پوچھا۔

"میں برسوں پہلے بھارت سے یہاں آیا تھا۔ وہاں میں بہت مفلس اور نادار تھا اور بعض اوقات مجھے اور میری بیوی کو قاتل بھی کرتا پڑتے تھے، میں اپنے ایک عزیز سے ملنے نگر پار کر آیا تھا، اس نے مجھے ورغلا یا کہ اگر میں مسلمانوں کی طرح شرعی دائرہ بڑھاؤں اور عربی اور اردو پڑھنا سیکھ لوں تو میں چند ہی برس میں لکھ پتی بلکہ کروڑ پتی ہو جاؤں گا۔"

"اچھی کہانی ہے۔" میں نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

"تیرے اس عزیز نے اس مشورے پر خود عمل کیوں نہیں کیا؟"

"اس سے تو اب ایم آئی (ملٹری انٹیلیجنس) والے ہی نہیں گے۔" ممتاز نے کہا۔ "وہ خود اس سے انکوائری گے کہ یہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"نہیں ان لوگوں کے حوالے مت کرنا، میرے اکاؤنٹ میں اس وقت تقریباً چالیس کروڑ روپیہ ہے، زمینیں اور باغات ان کے علاوہ ہیں، میرا پورا خاص اور حیدر آباد میں دو بہت شاندار حویلیاں ہیں اور کراچی میں ڈیڑھ لاکھ کے علاقے میں دو ہزار گز پتہ بنا ہوا بنگلا ہے۔"

"تم مجھے اپنے بینک بیلنس اور جائیداد کی تفصیل بتا کر مرعوب کرنا چاہتے ہو؟" ممتاز نے رٹا لہجے میں کہا۔

"نہیں۔" وہ مری مری ہی آواز میں بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ یہ سب لے لو اور مجھے جانے دو۔"

تیمور نے آگے بڑھ کر پھر اس کے چہرے پر زبانی دبا پھنر سیدھا اور بولا۔ "الو کے پٹھے!" تو نے یہ دولت ہمارے



ہی ملک سے ہو رہی ہے اور ہمیں ہی اس کی رشوت دینا چاہتا ہے، تجھے چھوڑنے کا مطلب ہے کہ تو ایک مرتبہ بھر بھولے بھالے لوگوں کو لوٹنا شروع کر دے۔“

”نہیں، میں اب اس ملک میں نہیں رہوں گا۔“ زمیش چند نے کہا۔ ”میں واپس بھارت چلا جاؤں گا۔“

”تجھے اگر ایم آئی والے چھوڑ دیں تو تو بھارت جایا امریکہ۔“ میتاز نے کہا۔

”مجھے تو صرف یہ بتا کر تو نے میرے باپ کی کتنی زمین ہڑپ کی تھی؟“

”دو سو ایکڑ کے قریب زمین تھی۔“ زمیش چند نے بتایا۔ ”دیکھیں اس وقت وہ بالکل غیر آباد تھی، اسے آباد میں نے

کیا اس پندرہ رات محنت میں نے کی جب کہیں جا کر وہ زمین پیداوار کے قابل ہوئی۔“

”تیرا کیا خیال تھا کہ میرا باپ اس زمین کو یوں بھرا اور غیر آباد چھوڑ دیتا؟“

ممتاز نے کہا۔ ”پورا اگر اس نے اس زمین کو آباد نہیں کیا تھا تو کیا میں بھی اسے آباد نہ کرتا۔ تو نے تو اور بہت سے

زمینداروں کی زمینیں ہڑپ کی ہیں۔ تجھے ان سب کا حساب دینا پڑے گا۔“

”میں کہہ رہا ہوں کہ۔۔۔۔۔۔“

تیور کے پھڑکنے اسے خاموش کر دیا۔ ”ایک ہی بات کی رٹ بار بار مت لگا۔ یہ بتا کر تو نے شائستہ کو اپنی قید میں کیوں رکھا تھا؟“

”میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک لڑکی میرے پاکستانی دوست کی قید سے فرار ہو کر تمہارے علاقے

کی طرف گئی ہے۔ وہ خود بھی اسے پکڑ سکتا ہے لیکن وہی الٹا اس لڑکی کو اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا۔ وہ لڑکی کے لواحقین کو

یہ تاثر دیتا چاہتا ہے کہ لڑکی وہاں سے فرار ہو گئی ہے، تم اسے اپنا پاس رکھ لو، اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونا چاہیے، نہ اس

کے ساتھ وہ سلوک ہونا چاہیے جو دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔“

”کیوں؟“ تیور نے پوچھا۔

”میرے دوست کا خیال تھا کہ اس کا پاکستانی دوست اس لڑکی کے ذریعے اس کے لواحقین سے کوئی بہت اہم قسم کی

فائلیں لگانا چاہتا ہے، اگر لڑکی کو نقصان پہنچا تو ممکن ہے اس کے لواحقین ان فائلوں کو حکومت پاکستان کے حوالے کر دیں۔

اسے زیادہ خطرہ پاکستانی فوج سے تھا۔“

”اور تمہارے اس بھارتی دوست کا نام کیا ہے؟“

”اس کا نام۔۔۔۔۔۔ سریش بسواس ہے۔“ زمیش چند نے جواب دیا۔

”اور سریش بسواس کا پاکستانی دوست کون ہے جس نے شائستہ کو اغوا کیا تھا؟“ تیور نے پھر کر پوچھا۔

”میں اسے نہیں جانتا۔“ زمیش چند نے کہا۔

”دیکھو تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔“ ممتاز نے کہا۔

”جسہیں اگر میری بات پر یقین نہیں آ رہا ہے تو مجھے اس خنجر سے ذبح کر دو۔ یوں بھی ایم آئی والے مجھے سکا سکا

کر ماریں گے، اس خنجر سے تو تمہوں میں کام تمام ہو جائے گا۔“

”تمہارا اعلق ”را“ سے ہے؟“ میں نے اچانک پوچھا۔

زمیش کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

”دیکھو جھوٹ مت بولنا ورنہ ہم جسہیں ایم آئی کے حوالے کر دیں گے۔“

زمیش نے طویل سانس لیا اور بولا۔ ”ہاں، میرا اعلق ”را“ سے ہے۔ میں گزشتہ پینتیس برس سے یہاں کام کر رہا ہوں۔“

”تم نے اتنی صاف اردو بھینس سکی ہے یا وہیں سے سیکھ کر آئے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”اردو لکھنا بڑھنا تو میں نے یہاں آنے سے پہلے سیکھی تھی لیکن یہاں رہ کر میں بالکل یہاں والوں کی طرح اردو

بولنے لگا۔ مجھے تو قرآن کی بہت سی آیتیں بھی یاد ہیں۔“

"تیوہر" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "اسے کپڑے پہنا دو اور اس کے ہاتھ پاؤں سختی سے باندھ دو، ہاں اس کے کپڑوں کی اچھی طرح تلاش لے لینا، اس کی گھڑی بھی کھول لو اور انگوٹھی بھی ہاتھ سے اتار لو۔"

تیوہر نے اس کی گھڑی کھولنے کی کوشش کی تو اس نے اٹلی ہی مزاحمت کی اور بولا۔ "یہ گھڑی میرے لیے بہت یادگار ہے اور یہ انگوٹھی میری مرحوم بیوی کی نشانی ہے۔"

"اب تو تم خود اپنے ناموشان کی فکر کرو۔" میں نے کہا۔

جب تیوہر نے اس کی اٹلی سے انگوٹھی اتارنا چاہی تو اس نے اچھی خاصی مزاحمت کی لیکن تیوہر کے دو ہتھکڑوں میں سیدھا ہو گیا، پھر تیوہر نے اس کی جیبوں کی تلاش لی اور اس کی جیب سے پرس سمیت ایک ایک چیز جی کہ کاغذ کا ایک ایک پرزہ تک نکال لیا۔ اس نے آخر میں اس کی واسکٹ کا اسٹر او جیڑا، اس میں سے بھی ایک لفافہ نکل کر گر پڑا۔

ممتاز نے بڑھ کر وہ لفافہ اٹھایا اس میں ایک ہمارا ہی پاسپورٹ تھا، وہ پاسپورٹ ریٹش چند کا تھا، پاسپورٹ میں اس کی داڑھی سو گھنٹیں صاف تھیں۔ اس کے ساتھ ہی کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا جس پر ایک ٹیلی فون نمبر ایک اور نمبر اور ایک کروڑ روپے کی رقم لکھی ہوئی تھی۔

ریٹش کا چہرہ دھول دھول ہور ہوا تھا۔

تیوہر نے اس مرتبہ خاصی بے رحمی سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھے، اس کے پیراں پہلی مضبوطی سے باندھے اور اسے میز پر دھکا دے دیا۔

"غلام قادر!" ممتاز نے آواز لگائی۔ فوراً ہی ایک ملازم اندر آ گیا۔ "حکم سناؤ!"

"ہاں! تو اس قیدی کے ساتھ اس کمرے میں رہو، یہ اگر کوئی ایسی حرکت کرنے کی کوشش کرے تو اس کے ساتھ بالکل لحاظ مت کرنا۔"

"حاضر سائیں!" غلام قادر نے کہا اور جم کر وہیں کھڑا ہو گیا۔

ہم لوگ کمرے سے باہر نکلنے لگے تو ریٹش چیخ کر بولا۔ "دیکھو، تم لوگوں نے وعدہ کیا ہے کہ مجھے ایم آئی والوں کے حوالے نہیں کرو گے۔"

ہم میں سے کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور کمرے سے باہر آ کر دو بارہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" تیوہر نے پوچھا۔

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں بالکل وقار کو ٹیلی فون کر کے یہاں بلا لیتا ہوں، ان سے کہوں گا کہ وہ اپنے ساتھ پولیس کا کوئی دیانت دار افسر لے کر آئیں، پھر ان ہی کے ذریعے ہم ایم آئی والوں سے رابطہ کر سکیں گے۔"

"بات تو معقول ہے۔" ممتاز نے کہا۔ "ورنہ میں یہاں کی پولیس پر تو اعتبار نہیں کر سکتا۔ یہاں کا ایس ایس پی بھی انسان ہوگا۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ریٹش کا ذریعہ یہ ہے۔"

"انگل وٹار کی وجہ سے ہمیں بہت سیلپ ملے گی، اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم لوگ بیک گراؤڈ میں رہیں گے، اس کیس کا کریڈٹ اگر انگل وٹار اور ان کے کسی دوست اور دیانت دار پولیس افسر کو ملتا ہے تو مل جائے۔"

"تو پھر تم انہیں ابھی ٹیلی فون کر دو۔ انہیں یہاں پہنچتے ہوئے متا ہوا جائے گی۔"

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور انگل وٹار کا نمبر ڈائل کیا، دوسری طرف کھٹی جی رہی لیکن کسی نے کال نہ سنی تھی

کی، میں نے سوچا، ممکن ہے انگل کا سیل فون سائیکٹ پر ہو، میرے پاس ان کا لینڈ لائن نمبر بھی تھا، میں نے اس نمبر پر فون کیا۔ دوسری طرف کئی گھنٹیاں بھیس، پھر آٹھ کی غنودہ آواز سنائی دی۔ "ہیلو!"

"ہیلو آٹھ۔ میں کامران بول رہا ہوں۔"

"کامران! اچھا..... کامران، ہاں بولو۔"

"مجھے ابھی اور اسی وقت انکل سے بات کرنا ہے۔"

"لیکن بدلتا تو ابھی تھوڑی دیر پہلے سوئے ہیں۔"

"آپ انہیں اٹھا دیں پلیز!" میں نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ "بات بہت زیادہ اہم ہے۔"

"اچھا تم ہولڈ آن کرو، میں انہیں اٹھانے کی کوشش کر لی ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے ریسور رکھ دیا اور مجھے ان کی آواز سنائی دی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ تقریباً دو منٹ بعد انکل کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہاں کامران، ابھی کیا قیامت آگئی؟" ان کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

"ابھی ہی قیامت آئی ہے انکل! میں نے کہا۔" آپ نے بھی میرا احسان الحق کا نام سنا ہے؟"

"ہاں، وہ خاصا مشہور آدمی ہے۔" انکل نے اکتاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"وہ میرے سنا احسان الحق۔" میں نے کہا۔ "اس کا اصل نام ریشم چند ہے اور وہ "را" کا ایجنٹ ہے۔"

"تم ہوش میں تو ہو کامران؟" انکل نے جھنجھلا کر کہا۔

"میں بالکل ہوش میں ہوں اور اس وقت وہ ریشم چند ہمارے قبضے میں ہے، آپ اگر اپنے جینل کے لیے کوئی Exclusive بریکنگ نیوز چاہتے ہیں تو ابھی اور اسی وقت اپنی ٹیم کو لے کر میرے پورے خاص آ جائیں۔"

"ابھی اور اسی وقت؟" انہوں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں، ورنہ یہ خبر کسی دوسرے جینل کے ہاتھ لگ گئی تو آپ ہی کا نقصان ہوگا۔ ہاں، آتے ہوئے اپنے ساتھ پولیس کا کوئی دیانت دار بڑا انسپرار پولیس کی کچھ نفری بھی لیتے آئیے گا، اسی طرح آپ کے ساتھ ساتھ آپ کے اس دوست کو بھی کرپٹ مل جائے گا، بعد میں تو یہ کیس ایم آئی والے نوو ہی پیٹرل کریں گے۔" پھر وہ چونک کر بولے۔ "لیکن تم تو کراچی میں تھے، میرے پورے خاص میں کیا کر رہے ہو؟"

"میں اپنی بہن شائستہ کی بازیابی کے لیے یہاں آیا تھا، اب آپ باتوں میں وقت ضائع مت کریں انکل! آپ کی کیرئیرم کو بھی تیاری میں کچھ دیر لگے گی۔"

"میری کیرئیرم ہر وقت تیار رہتی ہے اور صرف پانچ منٹ کے نوٹس پر روانہ ہو جاتی ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"یار اس بھاگ دوڑ اور ہفت روزہ میں مجھے تو اچھی خاصی بھوک لگ گئی ہے۔" ممتاز نے کہا۔

"بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔" میں نے بھی خنس کر کہا۔ "یوں بھی انکل کے یہاں کچن میں ابھی وقت ہے، اس وقت تک ہم کچھ کھا لی لیں۔" پھر میں چونک کر بولا۔

"میں ایک نظر ذرا شائستہ کو دیکھتا ہوں، تم کھانے کا بندوبست کرو۔"

میں وہاں سے اٹھ کر لوہری منزل کی طرف گیا، شائستہ نے خبر سوہی تھی، اس کے چہرے پر مجھے وہی معصومیت نظر آئی جو اب سے دس سال پہلے تھی۔ بس اس کا دل کش چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا، سرخ و سفید رنگ کھلا گیا تھا اور رخساروں کی ہڈیاں کچھ ابھر گئی تھیں، اس عالم میں بھی وہ خوب صورت لگ رہی تھی، مجھے بے اختیار اس پہ پیار آ گیا اور میں نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔

اس وقت ہاتھ روم سے نادیر نکل آیا اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے میرے نزدیک آگئی اور بولی۔ "تمہیں فرصت مل گئی یہاں آنے کی؟"

"فرصت کہاں جان!" میں نے خنس کر کہا۔ "اب تو ایک نیا طوفان کھڑا ہونے والا ہے۔" اسی وقت شائستہ کسمائی تو نادیر نے کہا۔ "شائستہ کو ڈسٹرب مت کرو، باہر چلو۔"

میں اسے لے کر اپنے کمرے میں آ گیا، اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور تیمور بھی اندر آ گیا۔ "تمہیں

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں ”دم“



پاکستان کی اہم خاتون شخصیات کی زندگی اور جدوجہد سے مربوط ایک خاص سلسلہ جس میں آپ آج کی عورت کا اصل مقام اس کی اس معاشرے میں ثابت قدمی سے منزل کو پانے کی کہانی اور ملکی تاریخ میں اپنا لوہا منوانے کے عزم کو آپ کے لیے ان ہی کی کہانی پیش کیا جاتا ہے۔

ان مایہ ناز خواتین کی کہانی جن سے ہماری آج کی عورت بہت کچھ سیکھ رہی ہے۔

دو شیزوڈ انجسٹ کی روایات سے مربوط آج کی عورت کی عظمت کا آئینہ

”وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں ”دم“



بھی سکون نہیں ہے؟" نادیہ نے منہ بنا کر تیمور سے کہا۔
 "سکون اب تک تو تھا لیکن مجھے لگتا ہے کہ اب کافی عرصے تک ہم لوگ بے سکون رہیں گے۔"
 "اسی کیا بات ہے؟" نادیہ الجھ کر بولی۔ "کیا اس جھلی پیر نے کوئی اور چکر چلا دیا؟"
 "بات اصل میں یہ ہے کہ بھیا میرا مطلب ہے نادیہ! وہ بھائی کہتے کہتے رک گیا۔" وہ جھلی پیر سرے سے مسلمان ہی نہیں ہے۔"

"کیا؟" نادیہ الجھ پڑی۔ "لیکن کیسے؟"
 جواب میں تیمور نے اور میں نے اسے مختصر اندیش چند کے بارے میں بتا دیا۔
 "یہ کیسے ممکن ہے کامران؟" نادیہ نے سب کچھ سننے کے بعد کہا۔ "ہمارے ملک کی خفیہ ایجنسیاں کیا سو رہی ہیں؟"
 "جن لوگوں پر بڑے بڑے بارسوخ و ذراہ اور اعلیٰ سولی السراں کا ہاتھ ہوتا ہے، وہ اس طرح دندنا تے پھرتے ہیں۔"
 ان برسوں میں اس منحوس رہیش چند نے ہمارے ملک کی جڑوں کو کتنا کھوکھلا کیا ہوگا؟ کتنے اہم قومی راز ہمارے دشمن کو پہنچائے ہوں گے؟"

"اب اس کی حد سے ایم آئی جن جن کر پاکستان میں اس کے ساتھیوں کو ہتھم رسید کر دے گی۔"
 اس وقت دروازے پر پھر الجھی سی دستک ہوئی۔

میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ "کون ہے؟"
 "سائیں..... کھانا تیار ہے!" باہر سے ممتاز کے ملازم نے آہستگی سے کہا۔
 "اچھا تم چلو ہم آرہے ہیں۔"

"کھانا؟" نادیہ نے حیرت سے کہا۔ "کون سے وقت کا کھانا کھاؤ گے تم لوگ؟"
 "یار اس رہیش چند کے چکر میں مجھے پھر بھوک لگ گئی ہے، یوں بھی ہم نے ڈنر ساڑھے آٹھ بجے ہی کر لیا تھا، اگر تمہارا کچھ کھانے کا موڈ ہے تو آ جاؤ۔"
 "نہیں، میں اب برش کر چکی ہوں اور تم جانتے ہو کہ رات کو دانت برش کرنے کے بعد میں چائے اور کافی بھی نہیں پیتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، پھر تم یہاں بیٹھ کر خون جگر پی، ہم چلتے ہیں۔ مجھے واقعی بہت بھوک لگ رہی ہے۔"
 ممتاز نے ہلکے پھلکے اسٹیکس میں بھی اچھا خاصا اہتمام کر لیا تھا، کھانا کھاتے اور کافی پیتے ہوئے ہم نے تقریباً ایک گھنٹہ مزہ گزاریا۔

اب بھی صبح ہونے میں تقریباً دو گھنٹے باقی تھے، میں ٹھٹھا ہوا اہر لان میں آ گیا جہاں ایک سنگل بچہ پر بلوچ بیٹھا تھا، اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔

"کیا بات ہے بلوچ؟" میں نے پوچھا۔
 "کیا تم بھوک محسوس کر رہے ہو؟"

"ممتاز صاحب ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمیں بہت کچھ کھلا چکا ہے۔" اس نے کہا۔
 "پھر تم پریشان کیوں ہو؟"

واجب! اگر آپ برائے نام تو ایک بات بولیں۔

"ہاں ہاں بولو۔" میں نے کہا۔

"میں تمہاری کسی بات کا برا کیوں مانوں گا۔"

"وہیجہ..... اصل میں..... بات....."

"کھل کے بولو بلوچ! تم نے مجھے اپنا بھائی کہا ہے؟ تو پھر بھائی سے کیسی جھجک؟"

"میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں ایم آئی اور کرائم برانچ کا بہت سا افسر آ جائے گا، ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی مجھے یا میرے آدمیوں کو پھانسی لے سکے ضرور پہچان لے گا۔ کرائم برانچ سے تو ہم لوگ کی آنکھ مجھولی ہوتی رہتی ہے۔"

"تو اس میں اتنا سمجھنے کی کیا بات ہے بلوچ؟" میں نے کہا۔ "تم اگر جانا چاہتے ہو تو ابھی اپنے آدمیوں کے ساتھ نکل جاؤ۔"

"پر دل نہیں ہوتا دلچرا" اس نے دل گرفتگی سے کہا۔ "آپ کو اس حال میں کیسے چھوڑ جاؤں؟"

"ارے بھئی، اب مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے، یہاں میرے اپنے گارڈز ہیں، ممتاز کے بہت سے گارڈز ہیں، پھر کراچی سے دھار صاحب آرہے ہیں، ان کے ساتھ میں پولیس کا کوئی بڑا افسر ہوگا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہی ایم آئی کے کسی افسر کو لے آئیں، مجھے اب بالکل خطرہ نہیں ہے، جس کی طرف سے خطرہ ہو سکتا تھا وہ ہماری قید میں ہے، تم ابھی فوراً نکل جاؤ کیوں کہ دھار صاحب پہنچنے ہی والے ہوں گے۔"

"آپ ناراض تو نہیں ہو دلچرا؟" اس نے پوچھا۔

"کیسی غیروں والی باتیں کرتے ہو بلوچ؟"

میں نے کہا تو وہ بے اختیار میرے سینے سے لگ گیا اور بولا۔ "ہم ٹیلی فون پر آپ سے رابطہ رکھوں گا۔"

"ہاں، ضرور رکھنا۔" پھر میں مسکرا کر بولا۔ "یار بلوچ! تم نے اتنی نکل اردو کہاں سے سیکھی، دوسرے بلوچوں کے مقابلے میں تمہاری زبان بھی بہت صاف ہے۔"

"دلچرا! ہم بہت چھوٹے تھاجب ہمارے باپ نے ہم کو ایک گھر میں نوکر کرادیا تھا۔ وہ صاحب کسی کالج میں پروفیسر تھا، پیگم صاحب بھی کسی بڑے اسکول میں پڑھاتا تھا، ہم نے اردو ان ہی لوگوں کے ساتھ رہ کر سیکھی ہے، اردو بھی پورے تھوڑی بہت کام چلانے والی انگریزی بھی۔"

"اچھا اب دیر مت کرو، جاؤ اب کراچی میں ملاقات ہوگی۔"

بلوچ ایک مرتبہ پھر سینے سے لگا اور اپنی جھلی کی پشت سے اپنے آنسو پونچھتا ہوا چلا گیا۔

میں بوجھل قدموں سے برآمدے میں آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد بلوچ کی ڈبل کیمین پک اپ ممتاز سومرو کی حویلی کے آہنی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

اسی وقت تیمور باہر آ گیا اور بولا۔ "کیا وقار نکل آئے؟ میں نے ابھی کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنی تھی؟"

میں نے اسے بتایا کہ بلوچ واپس چلا گیا ہے۔ "یوں بھی اس کا یہاں رہنا مناسب نہیں تھا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" تیمور نے کہا۔

پچیس دہاں دیکھ کر یا ہماری آوازوں میں کرمناز بھی برآمدے میں آ گیا اور اپنی دست دایچ دیکھتے ہوئے بولا۔ "لوگ بس آنے ہی والے ہوں گے۔"

"ہاں اگر کراچی سے مان لٹاپ اور تیز رفتاری سے چلے ہوں گے تو اب پہنچنے ہی والے ہوں گے۔" تیمور نے کہا۔

"امجد چلو یا را" ممتاز نے کہا۔ "یہاں تو ابھی خاصی فٹلی ہے۔"

ہم اندر داخل ہوئے رہے تھے کہ میرے سیل فون کی بیل بج اٹھی۔ اسکرین پر بالکل دھار کا نام تھا۔

"السلام علیکم بالکل" میں نے کہا۔ "کیا آپ ابھی تک..."

"میں میرے پورے خاص پہنچ چکا ہوں لیکن تم اس وقت کہاں ہو، دوڑے ممتاز کی دو حویلیاں ہیں، تم کس حویلی میں ہو؟"

"ممتاز نے اپنی جیب میں دو آدمی پولیس چوکی پر بھیجے ہیں۔" میں نے کہا۔

اسی وقت مجھے کسی کی آواز آئی۔ "سائیں، آپ کو سائیں ممتاز کا حویلی جانا ہے؟ آئیں ہمارے پیچھے آ جائیں۔"

"کیا ہوا؟" ممتاز نے پوچھا۔

"بالکل وقار یہاں پہنچ گئے ہیں، وہ مشکل سے دس منٹ میں یہاں ہوں گے۔" پھر واقعی دس منٹ سے بھی کم عرصے

میں مجھے حویلی کے گیٹ پر کئی گاڑیاں آنے کی آواز سنائی دی۔ ممتاز کی مداخلت پر اس کے گاڑی نے فوراً ہی مین گیٹ کھول دیا اور آگے پیچھے چار گاڑیاں اور کئی جینٹل کی ایک بڑی دین اندر داخل ہوئی۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انکل وقار کی گاڑی کے پیچھے آرمی کی ایک ہارڈ ٹاپ جیپ بھی تھی اور پولیس کی ایک کروڑ لاکھ تھی۔

انکل وقار کی گاڑی کا دروازہ ممتاز کے ایک ملازم نے کھولا۔ دوسری گاڑیوں کے دروازے بھی مختلف ملازمین نے کھولے۔ انکل وقار سیدھے میری طرف آئے اور بولے۔ ”دیکھ لو کامران! میں تمہاری توقع سے پہلے ہی یہاں پہنچ گیا ہوں۔“ میں نے ممتاز کا تعارف کرایا۔ انکل وقار اس سے بھی بہت تپاک سے ملے۔ اس دوران میں دوسری گاڑیوں سے بھی مختلف افراد اتر کر بتا رہے تھے، ان سب نے باری باری ہم سے ہاتھ ملایا، انکل وقار ان سب کا تعارف کر رہے تھے، یہ ایس ایس لی علی شہزاد ہے، کرائم برانچ کا انتہائی سلاک اور دیانت دار آفیسر! جرائم پیشہ لوگ اس کے نام سے کانپتے ہیں، یہ میجر احتشام ہیں، ایم آئی کے ایک جدید افسر ہیں اور یہ میرے جینٹل کاغذ دار بے ہاک رپورٹر مسعود ہے، یہ کیرائین اسلم ہے اور دوسرے افراد بھی اس کی ٹیم سے تعلق رکھتے ہیں۔“

”مکرم کہاں ہے؟“ ایس ایس لی نے پوچھا۔ وہ خاصا دراز قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا، اس کا رنگ گندمی تھا، سیاہ بال تھے اور اس کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں اس کی ذہانت سے بھرپور آنکھیں تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ نظروں ہی نظروں میں مقابل کا افسر ہے کر رہا ہو۔

میجر احتشام اس وقت سوٹ میں تھا لیکن اپنی چال ڈھال اور گفتگو سے واقعی ایم آئی کا کوئی اہم عہدے دار لگ رہا تھا۔ ”ہم لوگ اکیلے نہیں ہیں۔“ ایس ایس لی علی نے کہا۔ ”میرے ساتھ پولیس کی ایک بڑی دین ہے اور میجر صاحب کے ساتھ بھی کماٹروں کا ایک پلانٹ ہے، وہ لوگ حویلی سے باہر ہیں۔“

”سر، آپ لوگ کراچی سے یہاں تک مسلسل سفر کرنے کے بعد تھک گئے ہوں گے، پہلے آپ لوگ ذرا تازہ دم ہو جائیں اور ہمارے ساتھ ایک کپ کافی پی لیں۔“

”ان گفتگوات میں نہ پڑیں ممتاز صاحب!“ احتشام نے کہا۔ ”اگر آپ کا بیان درست ہے تو ہمارا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، میں پہلے اس مکرم سے ملنا چاہوں گا۔“

”میجر صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ایس ایس لی علی نے کہا۔

”تو پھر آئیے، میرے ساتھ!“ ممتاز نے کہا اور ان لوگوں کو لے کر اس کمرے کے دروازے پر پہنچا جہاں ریٹش قید تھا، اس نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے اس کے گاڑی کی آواز آئی۔ ”کیرا؟ (کون)۔“

”دروازہ کھول دیا!“ ممتاز نے کہا۔

اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

بیڈ پر ریٹش چند گھنٹی بنا پڑا تھا، ہماری آہٹ سن کر اس نے آنکھیں کھول کر ہمیں دیکھا اور ہڈیانی انداز میں بولا۔ ”تم لوگوں نے میرے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے، تم نے تو کہا تھا کہ میری ساری دولت اور جائیداد لے کر تم مجھے چھوڑ دو گے؟“ وہ جنونی انداز میں اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

”ارے تو ہم نے ایسی کوئی بات کی ہی نہیں تھی۔“ ممتاز نے کہا۔ ”لوہاگر کی بھی تھی تو ہم نے وعدہ خلافی کی ہے۔ کم سے کم تو جیسے شیطان کو وعدہ خلافی کا لفظ زیب نہیں دیتا۔“

”یہ تو میرا احسان الحق ہے؟“ علی نے کہا۔

”ہاں، ایسا ہی بہرہ دہن میں ہے۔“ ممتاز نے کہا۔

”یہ ہے اس کا پاسپورٹ!“ میں نے اس کا پاسپورٹ نکال کر وقار انکل کو دیا۔ انہوں نے وہ دیکھے بغیر احتشام کے حوالے کر دیا۔

"ریش چند!" احتشام نے حیرت سے کہا۔ "ہم اس مردود کو پنجاب اور بھارت میں ڈھونڈ رہے تھے اور یہ یہاں پھر بنا بیٹھا تھا۔" پھر وہ ممتاز سے مخاطب ہوا۔ "ممتاز صاحب اس کی واڈھی اور سوچیں صاف کرنے کا بندوبست کریں۔" ممتاز کمرے سے باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک شخص اور تھا، اس نے چھوٹی سی ایک صندوقی اٹھارہ گھی تھی، اس نے صندوقی کھول کر اس میں سے شیونگ کریم، برش اور اسٹرائکاٹا تو علی نے کہا۔ "ایک منٹ سراسر پہلے موجودہ حالت میں اس کی ایک فلم بنالیں اور کچھ اسٹل فوٹو گراف لے لیں۔" وقار انکل نے فوراً اپنے سیل فون پر ایس ایم این اور دوسرے عملے کو طلب کر لیا۔

ریش چند کی تیز روشنی میں ریش چند کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ یوں بھی ان آنکھوں میں اب زندگی کی رقی نہیں تھی اور اس کا سرخ و سفید باوقار چہرہ اس وقت مجھے کسی مردے کا چہرہ لگ رہا تھا۔

کیمرو مین نے مختلف زاویوں سے اس کی فلم بنائی، فوٹو گرافر نے اس کے کئی فوٹو اٹارے، پھر انکل وقار مائیک لے کر اس کی طرف بڑھے اور بولے۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"ریش چند!" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا۔

"میں تمہارا وہ نام پوچھ رہا ہوں، تم جس گیت اپ میں ہو اور جس نام سے یہاں مشہور ہو؟"

"آپ جانتے تو ہیں پھر مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں؟" ریش چند نے کہا۔

انکل وقار کی جگہ اگر میں ہوتا تو شاید اس کے اس جواب پر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کرویتا۔

"میں تمہارے منہ سے سنا چاہتا ہوں۔" انکل وقار نے درشت لہجے میں کہا۔

"میرا نام پیر احسان الحق ہے۔" وہ مشی انداز میں بولا۔ "پیر احسان الحق تھا، میں برسوں سے اسی نام سے مشہور ہوں۔"

میر احتشام نے تائی کو اشارہ کیا، تائی نے آگے بڑھ کر اس کی واڈھی پہلے مشین سے کاٹی، پھر کریم لگا کر اسے استرے سے ہانک لیں شیو کر دیا، اس پورے عمل کی بھی وہ بولتی رہی۔

اس کا چہرہ صاف ہوتے ہی احتشام بے اختیار بولا۔ "تم ریش چند نہیں ہو۔"

"میں ریش چند ہی ہوں۔" ریش چند جھجکا کر بولا۔

"تم نرائن داس ہو، یہ بتاؤ تمہارے اور کتنے نام ہیں؟"

"میں ریش چند ہی ہوں۔"

وہ موت کو سامنے دیکھ کر اب شاید اپنی زندگی سے بے پروا ہو گیا تھا۔

"ایک منٹ!" تیمور نے کہا اور اپنا خبر نکال کر اس کی طرف بڑھا۔ "جو کچھ صاحب پوچھ رہے ہیں، سچ بتا دو۔"

میں تیری ریزہ کی ہڈی توڑ کر تجھے زندگی بھر کے لیے معذور کر دوں گا، پھر تیری بقیہ زندگی ایانج گاڑی پر گزرے گی۔"

تیمور نے اسے اٹھا کر بٹھایا اور پشت سے اس کے دونوں شانے پکڑ کر اپنا ٹھٹھا اس کی کمر پر رکھ دیا۔ "میں ایک جھٹکے میں تجھے ناکارہ کر دوں گا۔" تیمور کا لہجہ اتنا سناک تھا کہ میں بھی کانپ کر رہ گیا۔

"صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "میرا نام نرائن داس بھی ہے۔"

"تیرا پیدا کنی نام کیا ہے؟" تیمور نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"میرا اصل نام تو ریش چند ہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"سراستہ ابھی لے چلیں۔" علی نے کہا۔

"ہمیں پہلے اس کی حویلی کی تلاشی بھی لینا ہے۔ اس سے پوچھو تو بعد میں بھی ہوتی رہے گی۔"

"ایک مسئلہ اور ہے سر!" ممتاز نے کہا اور لیجر کو کمرے سے باہر لے گیا۔ "اس کی گرفتاری کی خبر سن کر اس کے

بزاروں مرید جمع ہو جائیں گے اور نقص امن کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔"

اس وقت علی بھی باہر آ گیا اور بولا۔ "ہم فوری طور پر اسے یہیں رکھیں گے، اس کے ملازمین اور گارڈز سے یہی کہیں

دوسرے ہی لمحے AK-47 کی آواز سنائی دی، اس کی آواز تمام رانکھوں سے منفرد تھی۔ پھر کچھ کرب تک انسانی آوازیں گونجیں اور خاموشی چھا گئی، مجھے سب سے زیادہ فکر تیمور کی تھی، میرے دل میں نہ سے نہ سے خیال آ رہے تھے کہ کہیں وہ کسی گولی سے زخمی تو نہیں ہو گیا یا پھر کسی گولی نے اس کا کام تمام تو نہیں کر دیا۔

میں نے ان خیالات کا اظہار ہاشم سے کیا تو اس نے کہا۔ "آپ اتنے زیادہ پریشان کیوں ہیں؟ میں ابھی سیل فون پر تیمور سے Contact کر لیتا ہوں۔"

"نہیں ہاشم؟" میں نے کہا۔ "ممکن ہے سیل فون کی تیل سے وہ دشمنوں کی نظروں میں آ جائے۔"

"کامران! تیمور اتنا بے خوف نہیں ہے کہ وہ اپنے سیل فون کو سائلنٹ کیے بغیر اس مشن پر نکل گیا ہو گا۔"

"پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

"بھیا! ہاشم بھائی ٹھیک اسی تو کہہ رہے ہیں، اگر ان کا سیل فون سائلنٹ پر نہ بھی ہوا تو قاترنگ کے اس شور میں ان پر کوئی دھیان دے گا۔"

اجانک اندر سے سیل فون پر میجر احتشام کی ہارم آواز آئی۔ "یہ حویلی چاروں طرف سے پولیس کے گھیرے میں ہے، جو بھی فرار ہونے کی کوشش کرے گا مارا جائے گا۔ حویلی کے اندر بھی جن لوگوں کے پاس ہتھیار ہیں، وہ ہتھیار پھینک کر اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیں ورنہ ان کے ساتھ بھی ان کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔"

تقریباً بیس منٹ بعد حویلی کے بلند دہلا چھانک سے میں پولیس کی ایک بکتر بند گاڑی اور این ایل سی کے دو فوجی کنشیز داخل ہوئے، اب اندر سے قاترنگ کی آواز پائل نہیں آرہی تھی، ہم لوگ بے تاباں سے آئندہ پیش آنے والی صورت حال کا انتظار کرتے رہے۔

مجھے اس وقت کسی بھی بات کا ہوش نہیں تھا البتہ ہاشم مسلسل اپنی دست و پاؤں دیکھ رہا تھا۔

اس نے کہا "پولیس کی گاڑی اور کنشیز زکو اندر آئے ہوتے تو اسے زیادہ ہو گیا ہے لیکن.... اس کا جملہ اوصد اورو گیا کیوں کہ اندر سے پھر ایک فائر ہوا تھا، یہ فائر سیدنا ایم ایم کا تھا، پھر اندر سے انسانی چیخ پکار اور بھاگ دوڑ کی آوازیں آئیں، مزید بیس منٹ بعد وہاں پھر سکوت چھا گیا۔"

پھر وہاں کسی بیوی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور حویلی سے ایک کنشیز برآمد ہوا اس کے پیچھے دوسرا کنشیز تھا، پھر پولیس کی تین موپاٹز تھیں، سب سے آخر میں میجر احتشام کی ہارم ٹاپ چپ برآمد ہوئی، اس کے آگے ایس ایس پی ایل کی کڑوا تھی۔

اس نے باہر نکل کر اپنے لوگوں کو کچھ ہدایات دیں، میجر بھی اپنی گاڑی سے باہر آ چکا تھا اور وہ بھی اپنے آدمیوں کو کچھ ہدایات دے رہا تھا حویلی کے آگے اپنی پھاٹک پر پولیس کے مستعد جوان کھڑے ہو گئے۔

ایس ایس پی ایل نے جیب سے سیل فون نکالا اور کسی کو کال کرنے لگا۔

دوسرے ہی لمحے ٹی وی چینل کی دین اور انکل وقار کی گاڑی حویلی کے گیٹ کی طرف بڑھی۔ نور اسی اندکاحصہ روشنی میں نہا گیا۔ ٹی وی چینل کی ٹیم نے اپنا کام شروع کر دیا تھا، میں جا رہا تھا کہ اس وقت انکل وقار بہت مصروف ہوں گے۔ ان سے بات کرنا اس وقت ممکن نہیں تھا، یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ حویلی سے دور رہ کر بھی اپنے چینل پر حویلی میں ہونے والی کارروائی کی Live کوریج دکھا رہے تھے۔

مجھے تیمور کی فکر تھی، وہ مجھے ابھی تک نظر نہیں آ پاتا تھا۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور تیمور کا نمبر ڈائل کر دیا، دوسری ہی تیل پر اس نے کال دے سیکر لی اور بولا۔ "ہی بھیا؟"

"تم کہاں ہو تیمور وہاں کیا ہوا ہے؟"

"آپ پریشان نہ ہوں، میں خیریت سے ہوں اور ابھی دس منٹ میں گھر پہنچ رہا ہوں۔"

"جلدی پہنچو، ہم بھی اس وقت حویلی کے باہر ہی ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور ہاشم سے کہا۔

”واپس گھر چلو۔“

ہاشم نے ہمیں دس منٹ سے بھی کم عرصے میں ممتاز کی حویلی پہنچا دیا۔ ہمارے پیچھے پیچھے ایس ایس پی علی، میجر احتشام، پولیس کے مزید کئی بڑے افسر اور ساؤہ لباس میں ملبوس اور انتہائی باوقار افراد وہاں موجود تھے۔ احتشام بھی ان لوگوں کو سرکہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ایم آئی کے کوئی بڑے عہدے دار تھے۔

ایس ایس پی علی نے ممتاز کا تفصیلی بیان لیا، لی وی کمرے اس وقت بھی آن تھے، حیرت انگیز طور پر کسی نے میرا یا تیمور کا بیان نہیں لیا، اس وقت تک دوسرے جھوٹوں کی کہیں بھی دہاں پہنچ چکی تھیں، ان میں سے ہر نیم ممتاز سے ملنا اور ریمیش کی نوٹس بنانا چاہتی تھی لیکن ایس ایس پی علی اور احتشام نے ان لوگوں کو نال دیا۔

مفتی کی لالی اُبھر چکی تھی اور میر پور خاص جیسا چھوٹا شہر اب پوری طرح جاگ اٹھا تھا۔

ایس ایس پی شرما اور میجر احتشام دونوں ہی تھکن سے چور تھے، ان کے افسران باہر جا چکے تھے وہ اپنے ساتھ ریمیش چند کو بھی لے گئے تھے۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس سمر کے میں منٹھل سمیت ریمیش چند کے سات گارڈز مارے گئے تھے اور تقریباً بارہ شدید زخمی تھے، علی نے زخمیوں اور ڈیڈ باڈیز کو حیدر آباد بھجوا دیا تھا، ریمیش چند کی حویلی سے بہت ہی اغوا شدہ لڑکیوں کے علاوہ کافی تعداد میں غیر قانونی اسلحہ اور منشیات بھی برآمد ہوئی تھی، اس کے علاوہ کچھ خفیہ نوعیت کے کاغذات بھی تھے جن کا علم ایم آئی اور علی کے علاوہ کسی کو نہیں تھا۔

مزید دو گھنٹے تک کارروائی چلتی رہی، پھر انکل وقار نے بے اختیار مجھے سینے سے لگاتے ہوئے کہا: ”کامران! تم نے وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ میں الفاظ میں نہیں بتا سکتا۔ اس کا کرئینٹ تم نے علی اور احتشام کو دے کر ان کا کیریئر بھی بنا دیا، اب علی دو چار دن میں نہ صرف ای آئی جی بن جائے گا بلکہ اسے پولیس کی طرف سے علی کارکردگی کی اسناد اور تحفے بھی ملیں گے۔ نقد انعام اس کے علاوہ ہوگا۔ احتشام بھی ترقی پا کر ایف بی سیٹ کرل ہو جائے گا۔“

”انکل! وہ سب تو ٹھیک ہے اس سے آپ کو بھی کچھ فائدہ ہوا ہے یا نہیں؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

”مجھے بھی فائدہ ہوگا۔“ انکل مسکرا کر بولے۔

”بس میری ایک ہی درخواست ہے۔“ میں نے کہا۔

”ریمیش چند سے بھارت اور پاکستان کے ”رہ“ کے ایجنٹوں کے جو نام پتے اور ٹیلی فون نمبرز معلوم ہوں، ان کی ایک کاپی آپ مجھے بھی دے دیں۔“

”تم اس کی گھرمت کرو کامران!“ انہوں نے کہا۔

”یہ ساری معلومات علی کے پاس ہوں گی۔ میں اس کی ایک سیٹ تمہیں بھی دلوادوں گا۔ یہ انتہائی کاغذ منٹھل قسم کی معلومات ہیں لیکن علی تمہیں دینے میں انکار نہیں کرے گا۔“

ممتاز اس وقت علی کے ساتھ رگی خانہ پری کے لیے پولیس اسٹیشن گیا ہوا تھا، اس کی واپسی صبح کے دس بجے تک ہوئی، وہ بھی بہت تھکا تھکا نظر آ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”اب تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟“ انکل نے پوچھا۔

”نی الحال تو ہم لوگ ناشتا کریں گے۔“ میں نے کہا۔

”ورنہ بھوک کی شدت سے میرا نہیں تو تیمور کا انتقال ضرور ہو جائے گا۔“

”آپ بھی ہمارے ساتھ ناشتا کر لیں۔“ ممتاز نے انکل سے کہا۔

”بھئی، اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ مجھے فوری طور پر اپنے اخبار اور جرنل کو تفصیلی رپورٹ دینا ہے۔“

ناشتے میں صرف دس منٹ لگیں گے، مجھے معلوم ہے کہ اب تک میرے ملازمین نے ناشتا بنا کر کر لیا ہوگا۔

ناشتے کے بعد انکل وقار اپنی ٹیم کے ساتھ کراچی روانہ ہو گئے مجھے شدید تھکن اور نیند کا احساس ہو رہا تھا لیکن مجھے

شائستہ کی فکر بھی تھی۔

میں اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ کل کے مقابلے میں خاصی تروتازہ اور کھری کھری لگ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں باب و وحشت بھی نہیں تھی، وہ بڑھ کر میرے سینے سے لگ گئی اور بولی۔ ”بھیا! آپ نے تو کمال کر دیا، آپ نے لی وی دیکھا۔“

”مجھے تو اب تک نادیہ کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے، تجھے نہیں دیکھا ہے تو لی وی کہاں سے دیکھتا۔“

”تو پھر دیکھیے۔“ اس نے کہا اور اپنے بیڈروم میں رکھے ہوئے لی وی کا دایوم بڑھا دیا۔

نیوز کا سٹر کہہ رہی تھی۔ ”ریمیش چند گزشتہ تین دہائیوں سے ہمارے ملک میں موجود تھا اور تخریبی سرگرمیوں میں مصروف تھا، پولیس اس کی شائد ہی پر مختلف ٹھکانوں پر چھاپے مار کے اس کے آدمیوں کو گرفتار کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں حکومت پاکستان نے اسلام آباد میں بھارتی ہائی کمشنر کو بلا کر اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا ہے، دیکھیے اس بہروپے نے گزشتہ تیس برس سے کیا رنگ دیا رکھا تھا۔“

پھر لی وی پر ریمیش چند کی وہ تصویر دکھائی گئی جس میں وہ بہت شاندار انداز میں اور بہترین لباس میں گاؤں کے ٹیکے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور ایک عقیدت مند اس کے قدم چوم رہا تھا۔

یہ تصویر شاید ممتاز یا اس کے کسی آدمی کے موبائل فون سے لی گئی تھی، ایک فوجی وہ تھی جب وہ ریٹروں میں جکڑا ہوا تھا، اس وقت بھی وہ بھرا احسان الحق کے روپ میں تھا، دوسری فوج اس کے کلین شیڈ ہونے کے بعد لی گئی تھی۔

مجھے میرے پورے خاص میں بیٹھ کر اندازہ نہیں تھا کہ پورے ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔ ریمیش چند کی نشان دہی پر کئی کرپٹ سیاست دانوں اور بیوروکریٹس کا نام ای سی ایل (انٹیکٹ کنٹرول لسٹ) میں شامل ہو چکا تھا اور پولیس ان سے پوچھ گچھ کر رہی تھی۔

بھارت اسے اپنا شہری ماننے سے انکار کر رہا تھا لیکن اس کا پاسپورٹ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت تھا کہ وہ بھارتی شہری ہے۔ میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ لی وی دیکھتے دیکھتے ہی سو گیا۔

میری آنکھ دو بارہ کھلی تو کمرے میں بس جل رہا تھا، وال کلاک میں ساڑھے آٹھ بج رہے تھے، اس کا مطلب یہ تھا کہ میں کئی گھنٹے تک گھوڑے بچ کر سو رہا تھا۔

اجانک مجھے اپنے بالوں میں کسی کی نرم و نازک انگلیوں کا احساس ہوا، میں نے سر گھما کر دیکھا۔ شائستہ میرے سر پر بیٹھی میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ بولی۔ ”بھیا! اب اٹھ جا بیٹے، آپ گزشتہ کئی گھنٹے سے میرے بیڈ پر سو رہے ہیں۔“

میں انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا، پھر پھر نیند کی وجہ سے اب مجھے تروتازگی کا احساس ہوا تھا، جہاں تک میرا خیال تھا میں جوتوں سمیت ہی سو گیا تھا۔ اس وقت میرے پیر میں جوتے نہیں تھے، اس کا مطلب یہ تھا کہ شائستہ یا نادیہ نے میرے جوتے بھی اتار دیے تھے اور مجھے کپڑے بھی لہوڑا دیے تھے۔

میں جنفر اور جیکٹ میں تھا، اور کوئی چیز میری بغل میں نہ تھی، طرح چہرہ ہی تھی، میں اٹھ کر اپنی بغل پر ہاتھ مارا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ رپا لہوڑا تھا۔

میں اسی حالت میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ہاتھ روٹھ شائستہ کے کمرے میں ہی تھا لیکن میری شیونگ کٹ، ٹوٹھ برش اور ہاتھنگ گاؤن میرے ہی ہاتھ روٹھ میں تھا۔

ہاتھ روٹھ میں میرا ایک صاف ستھرا ستری شدہ جوڑا لٹکا ہوا تھا۔ میں دیر تک گرم پانی سے نہا تا رہا۔

تیار ہو کر باہر نکلا تو کوری ڈور میں مجھے تھوڑا دکھائی دیا اور فیس کر بولا۔ ”واہ بھیا! آپ تو ایسے سوئے کہ لگتا تھا کہ اب کئی دن بعد جاگیں گے۔“

”لوہر اپنے ہارے میں کیا خیال ہے؟“ نادیہ نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

”تم بھی تو ابھی آدھا گھنٹا پہلے ہی اٹھے ہو۔“

"ایک تو یہ گھر کے بھیدی ہی لٹکا اڑھاتے ہیں، میں تو بھیا کے سامنے اپنے نمبر بٹھا رہا تھا، ویسے ممتاز بھی ابھی ابھی سوکر اٹھا ہے اور اس وقت داش روم میں ہے۔"

میں نے نادیدہ سے پوچھا۔ "کچھ کھانے کے لیے بھی ہے؟ بھوک کے مارے میرا دم لٹکا جا رہا ہے۔"

"میرا دم تو کل چکا ہے بھیا!" تیمور نے کہا۔ "تب تو میں ایک چپتی پھرتی لاش ہوں۔"

"چپتی پھرتی لاش صاحب!" نادیدہ نے ہنس کر کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ میں یہاں خود مہمان ہوں، مجھے نہیں پتا کہ ان کا بچن کہاں ہے اور اس میں کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔" پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "ویسے میں نے ممتاز صاحب کے ملازمین سے کھانا تیار کرا لیا ہے، ممتاز صاحب تیار ہو کر باہر آئیں گے تو کھانا بھی مل جائے گا۔"

"بھئی ممتاز صاحب تو کب کے تیار ہو کر باہر آ چکے ہیں بھابی!" ممتاز نے کوری ڈور کے نزدیک میز چیلوں سے ہانک لگائی۔

"تو پھر ڈانٹک روم میں چلیے۔" شائستہ نے کہا۔ "میں ابھی کھانا لگانے کو کہتی ہوں۔"

"آپ زحمت نہ کریں شائستہ، بہن! میرے ملازمین نے مجھے دیکھتے ہی کھانا لگانا شروع کر دیا ہوگا، انہیں معلوم ہے کہ اس سلسلے میں تاخیر میں برداشت نہیں کرتا۔"

پھر بہت خوش گوار انداز میں کھانا کھایا گیا۔

کھانے کے بعد کافی چتے ہوئے میں نے کہا۔ "ممتاز امیر اخیال ہے مگر اب ہم بھی کراچی کی طرف نکل جائیں۔"

"اب تو رات ہو گئی ہے بھیا!" ممتاز نے کہا۔

"آپ صبح سویرے کلکس گئے تو دوپہر تک آرام سے کراچی پہنچ جائیں گے۔"

میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی تو وہ خاموش ہو گیا، میں نے سیل فون نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی، وہ بلوچ کی کال تھی۔

میں نے فون دبا کر ٹیلی فون کان سے لگا لیا۔ "ہیلو واجہ!"

بلوچ نے کہا۔ "آپ خیریت سے تو ہو۔"

"ہاں، ہم لوگ بالکل خیریت سے ہیں اور کل کراچی پہنچ رہے ہیں۔"

"یہ آپ نے اچھا فیصلہ کیا ہے واجہ!" بلوچ نے کہا۔ "رات میں سفر کرنا ویسے بھی اچھا نہیں ہے، میں بھی میرا پورا خاص پہنچ رہا ہوں۔ صبح آپ کے ساتھ ہی کراچی کے لیے نکلوں گا۔"

"ارے بھئی، تم زحمت کیوں کر رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"آپ نہیں سمجھتا ہے واجہ!" بلوچ نے کہا۔ "اس حرام زادے مشہدی کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ آپ کی وجہ سے ہوا ہے، اس نے شائستہ کو اس ہندو کے حوالے کیا تھا اور یہ مشہور کر دیا کہ شائستہ یہاں سے فرار ہو گئی، پھر آپ کے لیے ایک اچھی خبر اور بھی ہے۔"

"وہ ابھی بتا ہی دو۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"وہ تو میں آپ کو ہیں آ کر سناؤں گا۔" بلوچ نے کہا۔

"میں ابھی راستے میں ہوں اور آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔"

بلوچ کی کال کے دوران ہی میں مجھے اگلی کال پر سنا دی تھی، اس کا مطلب تھا کہ اس وقت کوئی اور بھی مجھے کال کر رہا تھا۔

"اچھا بلوچ! تم یہاں پہنچو، پھر تفصیلی بات ہوگی، میری کال آرہی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس وقت دوبارہ سیل فون کی بیل بجی، اسکرین پر ہاشم کا نام تھا۔ میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو ہاشم!"

"کامران! تم خیریت سے تو ہو؟" اس نے بھی وہی سوال کیا جو بلوچ نے کیا تھا۔ "اب تک تو تمہیں کراچی پہنچنا چاہیے تھا۔"

مے کہ میرا صاحب حیدر آباد میں ہیں لیکن ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس کے پاس مسلمان کے روپ میں ایک بھارتی جاسوس آکر ٹھہرا تھا، ہم اس کی تلاش میں یہاں آئے ہیں، وہ اگر حویلی میں نہ بھی ہوا تو ہمیں اس کا سامان یا اسکی کوئی چیز ضرور مل جائے گی جس سے اسے گرفتار کرنے میں مدد ملے، میرا صاحب نے تلاشی کی اجازت دے دی ہے اور وہ خود بھی ایک گھنٹے میں یہاں پہنچ رہے ہیں۔

”مکمل اپنی جان دے دے گا لیکن آپ لوگوں کو میرے کمرے تک نہیں جانے دے گا۔“ رئیس چند نے کہا۔ ”وہ پکا مسلمان ہے اور مجھے بہت پہنچا ہوا ہے۔“

”اس سے بھی سنت لیں گے۔“ ایس ایس پی نے کہا۔ ”پھر وہ مجھ سے بولا۔“ آپ لوگ قیدی کا دھیان رکھیں، ہم اس کی حویلی کی تلاش لے کر آتے ہیں۔“

میجر احتشام نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”یہاں اس کے مریدوں میں خاصے بڑے بڑے بارسوخ زمین دار بھی ہیں، کوئی ایسا معتبر شخص نہیں ہے جو بغیر کسی خون خرابے کے ہمیں حویلی کے اندر لے جائے۔“

”ایسا کوئی شخص کم سے کم میرا پورا خاص میں نہیں ہے۔“ ممتاز نے جواب دیا۔ وہ حکومت سندھ کا کوئی اعلیٰ افسر ہوتا ہو یا پھر کوئی وفاقی یا صوبائی وزیر ہو ورنہ یہاں کے زمین داروں کو یہ منہ ہی نہیں لگاتا تھا، کچھ بڑے جاگیردار ہیں لیکن وہ اسے نہیں مانتے ہیں۔“

”اوکے۔“ میجر نے کہا۔ ”دیکھا جائے گا۔“ پھر وہ تیمور سے مخاطب ہوا۔ ”جوان تمہارا تعلق کس ایجنسی سے ہے؟“ ”میرا تعلق تو کسی بھی ایجنسی سے نہیں ہے سِر!“ تیمور نے کہا۔ ”میں کامران صاحب کا کزن ہوں اور اپنی بہن شائستہ کی بازیابی کے لیے یہاں آیا تھا۔ اسے ہم لوگ بہ خیریت اس کے چنگل سے بچھڑائے ہیں۔“

”اس سارے قصے میں اگر شائستہ کا نام نہ آئے تو میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔“ ”آپ فکر مت کریں کامران صاحب!“ میجر نے کہا۔ ”اس مردود یہ تو اتنے سنگین جرائم کے کیسز ہیں کہ آپ کی بہن کا کیس تو ان کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔“ پھر وہ تیمور سے بولا۔ ”اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو اس آپریشن میں تم بھی ہمارے ساتھ چلو، تم ہمارے لیے خاصے سو مندر بہت ہو گے۔ تمہارا چلانا جانتے ہو؟“

”میں بچپن سے فٹ بال کھیلتا آ رہا ہوں سِر!“ تیمور نے فوری طور پر ایک داستان گھڑی، ”مجھے مختلف قسم کے ہتھیار چلانے آتے ہیں۔ میرا نشانہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔“

”چلو، پھر دیر مت کرو۔“ پھر وہ علی سے بولا۔ ”ریش چند کی حویلی پہنچ کر آپ یہاں کی مقامی پولیس کو بھی انعام کرو دیجیے گا۔“

”میں انہیں انعام کروں گا لیکن اس وقت ان کے پاس فوری برائے نام ہوگی۔ ممکن ہے پولیس سوبانگ بھی ایک ہی ہو یا وہ بھی نہ ہو۔“

دو سب باہر نکل گئے، میجر کے کوٹ کے دونوں جانب کے ابھار بتا رہے تھے کہ اس نے کوٹ کے نیچے ڈبل ہو لستر لگا رکھا ہے۔

وہاں نکل بھی اپنی ٹیم کے ساتھ چلے گئے۔ ”میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں بھی اس آپریشن میں شریک ہو جاؤں، اب جب تک وہ لوگ بہ خیریت واپس نہ آ جاتے، میں ٹینشن میں مبتلا رہتا۔ مجھے سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ ریش چند کی وفاداری میں اس کے آدمی پولیس اور آرمی کمانڈرز کا راستہ روکیں گے اس کے نتیجے میں اچھی خاصی خون ریزی ہوگی، میں چاہتا تھا کہ تیمور کی بجائے ہاشم ان کے ساتھ جائے لیکن ہاشم تو مجھے اس وقت کہیں نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

ان لوگوں کی روانگی کے بعد ہاشم کمرے میں داخل ہوا۔

"تم کہاں تھے ہاشم؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں پولیس کی گاڑیاں آئیں، میڈیا کی دین آئی، اچھا خاصا شور مچا رہا لیکن تم مجھے نظر نہیں آئے۔"

"میں جان بوجھ کر ایس ایس پی علی کے سامنے نہیں آیا۔"

ہاشم نے جواب دیا۔

"اچھا میں سمجھ گیا۔" میں نے کہا۔ "تمہارا کیس بھی بلوچ کی طرح ہے۔ وہ بھی پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات تھی۔" ہاشم نے مسکرا کر کہا۔

میں بھی اضطراب کے عالم میں اٹھ کر ٹیبلٹ لیتا تھا، کبھی تھک کر بیٹھ جاتا تھا۔

"اچانک میرے کانوں میں فائبرنگ کی آوازیں آئیں، وہ آوازیں خاصی دور سے آرہی تھیں اور اگر غور سے سنانا

جانتا تو سنائی بھی نہیں دیتیں، میں نے متنازعہ سے کہا۔ "وہ لوگ آخر پولیس سے نکل رہے تھے۔"

"نکل رہے تو اپنا ہی نقصان کریں گے۔ میجر اور ایس ایس پی کے ساتھ جو لوگ ہیں، وہ پھول برسائے کو نہیں گئے

ہیں، پھر تیرے بھی ان کے ساتھ ہے جو یہ قول تمہارے میں آدمیوں پر بھاری ہے۔"

"یاد نہیں مذاق سوچ رہا ہے، مجھے ان بے گناہ لوگوں کی فکر ہے جو صرف اس جعلی دہری کی عقیدت میں مارے

جائیں گے۔" پھر میں متنازعہ سے بولا۔ "ہم اس آپریشن میں شریک نہیں ہیں لیکن وہاں جا کر صورت حال کو دیکھ ہی سکتے ہیں۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"

"تم اب تک اس کمرے میں کئی میل تو ٹہل ہی چکے ہو، چلو، ہم بھی وہاں کا ایک چکر لگا لیں، تم اپنی گاڑی نکالو۔"

متنازعہ نے کہا۔

"میری گاڑی کو سب پہچانتے ہیں۔"

میں نے ہاشم سے گاڑی نکالنے کو کہا۔ اس نے ڈبل کیبن پک اپ کی بجائے اپنی کروڑ لاکھ کی اور بولا۔

"اس موقع پر وہ ڈبل کیبن پک اپ بھی لوگوں کی نظروں میں آ سکتی ہے۔"

میں متنازعہ ہاشم اور ندیم کے ساتھ روانہ ہو گیا، جانے سے پہلے متنازعہ نے اپنے گاڑی کو ہدایت کر دی تھی کہ اگر کوئی

زبردستی اندر گھسنے کی کوشش کرے تو اسے ہلاک کر دیا، جو لوگ پست پر موجود ہیں انہیں بھی یہ پیغام دے دو اور اس

قیدی کی اپنی جان سے بڑھ کر حفاظت کرنا۔

میں نے ندیم اور تیرے دوسرے ساتھیوں کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ وہ قیدی کے کمرے کے آس پاس ہی رہیں اور

ہر طرف سے چوکنار ہیں۔ ہم لوگ ریٹش پینڈک حویلی کے نزدیک پہنچے تو وہاں لوگوں کا جم غفیر تھا، مقامی پولیس کے سپاہی

انہیں ایک خاص فاصلے سے آگے نہیں جانے دے رہے تھے کیوں کہ وہاں دونوں طرف سے زوردار فائبرنگ ہو رہی تھی،

حویلی کا گیٹ البتہ چوٹ کھلا ہوا تھا لیکن ابھی تک فیوٹی چھل والوں کو اندر داخل ہونے کا موقع نہیں ملا تھا، ان کی دین

وہاں سے خاصی دور کھڑی تھی لیکن کیرا مین ڈوم لینس کے ذریعے اس منظر کی فلم بھی بنا رہا تھا۔

اس وقت آری کی ٹین ٹروپ میں آگئیں، آری کی ٹروپ میں عام ٹرک کی طرح ہوتی ہیں، بس ان کا رنگ مختلف ہوتا

ہے اور ٹرک کے برعکس ان کے دونوں کناروں پر کھڑکی کے تختے لگے ہوتے ہیں تاکہ اس میں سوار افراد ان پر بیٹھ سکیں۔

ان کے رکے ہی اس میں سے اچھل اچھل کر کمانڈر اترے اور وہ چشم زدن میں ادھر ادھر بکھر گئے، پھر میں نے دو

جوانوں کو چھپکلی کی طرح گیٹ کی طرف بڑھتے دیکھا، حویلی میں اندر کی سمت خاصی پاور کا ایک بلب روشن تھا، اس کی وجہ

سے اندر والے مزاحمت کر رہے تھے، ان جوانوں میں سے ایک نے اس بلب کا نشانہ لیا، فاصلہ اچھا خاصا تھا لیکن دوسرے

نے لمبے پوری حویلی تاریکی میں ادب گئی، میں اس جوان کے نشانے پر غصہ مٹا کر اٹھا۔

میری آنکھیں جب اندر میرے سے کسی حد تک مانوس ہو گئیں تو میں نے کئی جوانوں کی چھپکلی کی طرح تیزی سے

حویلی کی طرف ریٹکتے دیکھا۔

”تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ یہاں کتنی خواری ہوئی، آج صبح دس بجے تک تو ہمیں ناشتا کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، پھر ناشتا کرنے کے بعد ہم لوگ سو گئے، رات بھر جاگنے کے بعد محسن اتنی بڑھ گئی تھی کہ آنکھیں ہی نہیں کھل رہی تھیں، پھر ہم تو دو راتوں سے مسلسل جاگ رہے تھے ہم تباہ و کوئی خاص بات؟“

”کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔“

”ہم لوگ کل صبح یہاں سے نکلیں گے۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر ایک کام کرو، تم میرے وہاں پہنچنے تک وہیں ٹھہراؤ، ابھی کراچی سے نکل رہا ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے بلوچ کا ٹیلی فون آیا تھا، وہ آدھے گھنٹے میں اپنے ساتھیوں سمیت یہاں پہنچ رہا ہے، پھر ہمارے ساتھ تیمور اور اس کے ساتھی بھی ہیں، پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”اچھا، بلوچ پہنچ رہا ہے؟“ ہاشم نے پوچھا۔

”ہاں، وہ ابھی کچھ دیر میں یہاں آ جائے گا، اس نے راستے سے ٹیلی فون کیا تھا۔“

دن بھر سونے کے بعد اب ہم میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آرہی تھی، البتہ تاویہ اور شائستہ کی بالکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ ”تم لوگ جا کر سو جاؤ، رات بھر بے آرام رہی ہو گی“ میں نے کہا۔

وہ دونوں شاید یہ ہی چاہتی تھیں، فوراً ہی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

میں اور تیمور ممتاز کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے، وہ اس وقت ڈرائنگ فروٹ سے برسرِ پیکار تھا، سیٹرن ٹیبل پر اخروٹ، بادام، تلی ہوئی موٹنگ پھلیاں، رکھے ہوئے تھے۔

وقت گزاری کو ہم ڈرائنگ فروٹ ٹوٹ گئے۔

بلوچ آدھے گھنٹے سے بھی پہلے پہنچ گیا، ممتاز کی حویلی پر موجود پولیس گارڈز نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن ممتاز کے گارڈز ان لوگوں کو پہچانتے تھے اس لیے وہ اپنی ڈبل کھن پک اپ سمیت اندر آ گیا۔

اس کے آدنی تو اپنے ان کمروں میں چلے گئے جن میں وہ اس سے پہلے مقیم تھے، بلوچ ڈرائنگ روم میں آ گیا اور مجھ سے ایسے ملا جیسے برسوں بعد ملا ہو۔

”تم پہلے یہ تباہی تم نے کھانا کھا لیا ہے؟“

”ہاں دلچا“ وہ ہنس کر بولا۔ ”بھئی ہائی دے پر پٹھانوں کی کٹی ہوئی ہیں وہاں کھانا بہت اچھا ملا ہے، میرے آدمیوں نے فرمائش کی آج ہم ہائی دے کے کسی ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔“

”آپ یہ تباہی کہ وہ کون سی خوش خبری تھی جو تم ہمیں دینے والے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”دلچا! پہلا خوش خبری تو یہ ہے کہ مشہدی کا دو بہت ہی خاص آدمی پولیس نے گرفتار کر لیے ہیں اور مشہدی خود انڈر گراؤٹ چلا گیا ہے۔ دوسری خبر یہ ہے کہ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ڈولی کہاں ہے۔“

”ڈولی؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”مشہدی کی بیٹی؟“

”ہاں، وہی وہ آج کل کراچی میں ہے۔“

”لیکن اب ہم اس کا کیا کریں گے بلوچ؟“ میں نے کہا۔

”اب تو شائستہ مجھے مل چکی ہے۔“

”پر دلچا! ہم ڈولی کے ذریعے مشہدی کو بیک سیل تو کر سکیں گے، اسے بھی تو وہی صدمہ پہنچے جو تم نے ایک سال برداشت کیا ہے۔“

☆.....☆

یہ بڑے تجسس، سنسنی خیز اور لہو رنگ آپ بیتی ابھی جاری ہے۔
بقیہ واقعات آئندہ ماہ کے ”گلی کہانیاں“ میں ملاحظہ فرمائیں

کار جہاں دراز ہے

میں کون ہوں؟

سدرہ انور علی



فقیرنی کے روپ میں تجھیں ایک خرم عورت کا کہانی، ہنسناک سے

خسرا ان کی طرح ظالم اور جاہل۔ اس کے منہ سے ہر وقت کالیوں کی بدعات جاری رہتی۔ اچھی، خود غرض، اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کسی کی جان تک اپنے سے گریز نہ کرتی تھی۔ تو بہ تو بہ میں بھی کیسا ناہنجار لڑکا ہوں، کیسا کفر بک رہا ہوں اپنی ماں کے خلاف، لیکن میں بھی کیا کروں۔ کہتے ہیں کہ ماں کی گود انسان کی پہلی درگاہ ہوتی ہے، لیکن میری ماں نے شاید ہی مجھے بھی پیار کیا ہو۔ ہر وقت گالم گلوچ کرنا، مجھ پر جسمانی تشدد کرنا تو گویا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ مجھے ہر طرح کی اذیت دیتی تھی۔ مجھے خور کی طرح جلتا دیکھ کر بھی اس کے کانوں پر جوں تک نہ رہتی تھی۔ میں نے تو سنا تھا کہ ماں رب کائنات کی عظیم مخلوق ہے، لیکن کیا میں ایسی ہوا کرتی ہیں۔

میری ماں جسے سب اذیت دیتے تھے۔ اس نے ایک تین پہیوں والی لکڑی کی ریڑھی بنوائی ہوئی تھی۔ اس طرح کی ریڑھی عموماً گداگر بھیک مانگنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس وقت میری عمر اندازاً آٹھ یا نو سال ہوگی۔ میری ماں مجھے منہ اندھیرے چگا دیتی اور دوپٹہ اس قدر زور سے مارتی کہ خالی پیٹ مجھے چکراتے

کیا آپ نے بھی کسی فقیر کی آپ بیتی سنی ہے؟ ضرور سنی ہوگی لیکن میری کہانی بہت ہی منفرد اور عجیب قسم کی ہے۔ مئی ماں فقیر ایک نچلے درجے کا جاہل سا انسان جو دوسروں کے مجھوتے کھانے کھا کر اور لوگوں کی فتنہ پہن کر اپنی زندگی میں کچھ رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن زندگی کی چادر پر لگی ہوئی غریب کی سیاہی کم ہونے میں نہیں آتی۔ خوشیوں کے پھول مٹے نہیں پاتے کہ غموں کی ہوا انہیں سرسرا کر رکھ دیتی ہے۔ جہاں بہت جھڑکا موسم سا لہا سال تک فاصل گل کو تپن میں قدم رکھنے نہیں دیتا، کسی نے جی کہا ہے کہ غربت کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔

میں نہیں جانتا میرا نام کیا ہے؟ شاید میرا نام کوئی تھا ہی نہیں، لیکن میری ماں مجھے ہر وقت حرام زادہ کہتی تھی۔ شاید یہی میرا نام تھا اور میری قسمت بھی میرے نام کی طرح تھی۔ ہر اچھی چیز، ہر اچھا کپڑا، ہر اچھا کھانا مجھ پر حرام تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی تو کہا ہے کہ نام انسان کی شخصیت پر اثر کرتا ہے۔ شاید اس لیے کہ میں ایک فقیر ہوں اور یہی تو فقیر کی زندگی ہوتی ہے۔

میری ماں جو کہنے کو تو میری ماں تھی، لیکن کسی



گاڑی رکوائی، کیوں کہ وہ جلدی اور زیادہ بھیک دیتے تھے۔ وہ نظریں بڑی حیر اور گھاگ رکھتی تھی۔ جس جگہ ایک بار جاتی پھر پورے پانچ دن بعد اس جگہ جاتی، تاکہ کوئی اس کے فراڈ کو پہچان نہ سکے۔ حالانکہ میرے مطابق اس کے پاس اتنی دولت اکٹھی ہو چکی تھی کہ وہ برسوں تک بیٹھ کر کھا سکتی تھی، لیکن دولت کی حرص انسان کو کہاں پہن لینے دیتی ہے۔

دن اسی معمول کے مطابق گزر رہے تھے۔ نہ اس کے میرے اوپر ظلم میں کوئی کمی آئی اور نہ ہی اس کے تشدد میں کوئی فرق آیا تھا۔ وہ دن رات میری ٹھکانی میں لگی رہتی تھی کہ کہیں میں اس سے بغاوت نہ کروں۔ حالانکہ میں ایسا کیسے کر سکتا تھا۔ میری ماں ہی تو میرا واحد سہارا تھی، وہ جیسی بھی تھی مگر میری ماں تھی، لیکن اس کا دن بدن خطرہ بڑھ رہا تھا۔ میری کچھ سے باہر تھا۔ ماں تو گھبٹوں کا سمندر ہوتی ہے۔ ایسا مہیب اور گہرا سمندر جس کی گہرائیوں کو آج تک کوئی ناپ نہیں سکا۔

☆.....☆.....☆

وہ بھی ایک عام سادہ تھا۔ معمول کے مطابق ماں نے مجھے چائے اور ساتھ ہی رات کی ہاسی روٹی کا ناشتا دیا اور خود دیسی گھی والا پراٹھا چائے کے ساتھ کھا کر اس زور سے طمانچے میرے منہ پر مارے کہ سوگی روٹی میرے حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی، پھر کہنے لگی۔

"ارے کتیا کی اولاد، حرام زادے۔۔۔ جلدی کرو ناشتا، آج ہمیں جلدی پہنچنا ہے۔"

میں سوچنے لگا کہ کیا یہ میری ماں ہے۔ مائیں تو اپنے بچوں سے بے اعتدال پیار کرتی ہیں، پھر میری ماں کیوں مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس نے میری پیٹھ پر اس زور سے دو مٹھرو مارے کہ میں منہ کے بل زمین پر گر پڑا، پھر کپڑوں سے پکڑ کر زور سے کھینچ کر اوپر اٹھایا اور بولی۔

"حرام زادے میں کہہ رہی ہوں کہ ہمیں جلدی پہنچنا ہے اور تمہیں سوچیں پڑ گئی ہیں۔" اور پھر وہ خود ریزمی میں سوار ہو گئی، پھر میں بھی اپنا ناشتا لودھورا چھوڑ کر جھوپڑی سے باہر نکل آیا اور ریزمی کا ڈنڈا پکڑ کے آگے بڑھنے لگا۔ ابھی ماں نے منہ سے کپڑا اٹھایا ہوا تھا، لیکن

گلتے، پھر وہ مجھے ایک پیالہ لال کالی چائے کا اور رات کی ہاسی سوگی روٹی دیتی اور پھر دو چائے مار کر کہتی۔

"جلدی سے کھاؤ اور میرے ساتھ کام پر چلو۔"

جس جگہ پر ہم رہتے تھے، وہ جگہ ساری ہی فقیروں کی تھی اور وہاں کبھی پرانی جھوپڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس جگہ کا نام پہلے تو اسلام نگر تھا، لیکن جب سے وہاں فقیر آ کر آباد ہوئے تھے، تب سے اس جگہ کا نام "فقیر نگر" پڑ گیا تھا۔

ماں مجھے سوگی روٹی اور کالی پتی چائے کا ناشتا دیتی تھی، لیکن خود دیسی گھی والے پرائے کھاتی تھی، جب تک میں ناشتا کرتا، ماں جس کا وزن بھی دو سین کے قریب تھا، وہ تب تک ریزمی میں بیٹھ چکی ہوتی تھی۔ وہ گاڑی میں ایک پاؤں بر سفید رنگ کا کوئی سٹوف مل کر اور پاؤں ٹھوڑا ٹھوڑا حاکر کے تھنکتی، تاکہ دیکھنے والے اسے واقعی معذور سمجھیں اور پھر میں گلی کی اس کی گاڑی کو چلاتا تھا۔

فقیر نگر سے باہر نکلتے ہی وہ دیسی دردناک آوازیں نکالتی اور بھیک مانگتی کہ دیکھنے اور سننے والوں کے آنسو نکل آتے وہ بہت بڑا موقع اڑھ کر بیٹھتی تھی، تاکہ زمانہ اس کی عیاری اور مکاری کو نہ جان سکتے۔ میں تو بالکل بچہ تھا اور آدھا گھنٹہ پیدل چلتے ہی میرے پاؤں دیکھنے لگتے تھے۔ مجھے جوتا پہننے کی بھی اجازت نہ تھی۔ میرے اور ماں کے کپڑے بھی پٹھے پرانے ہوتے تھے۔ میں سارا دن ننگے پاؤں ریزمی چلاتا اور ماں مجھے سارا دن گالیاں اور کوسے دیتی تھی۔ کبھی کہتی کہ تیز چلاؤ، کبھی کہتی آہستہ کرو۔ جس وقت ریزمی رکوائی، بس وہی وقت میرے لیے کچھ سکون کا ہوتا تھا۔ سارا دن ننگے پاؤں چل چل کر میرے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ دوپہر میں کسی ہوٹل کے سامنے رکوائی اور کبھی کھانا مانگ کر لاتا۔ کبھی کبھار کوئی کھانا دے دیتا اور کبھی جھڑک دیتا اور جھوٹے برتن اٹھا کر دے دیتا۔ ماں دور سے ہی دیکھ کر کہتی "اے منہوس حرام زادے، یہ کھانا خود ہی کھاؤ۔" کسی کا بچا ہوا کھانا بھی نہ کھاتی تھی۔ ضدی اور ڈھیٹ اس قدر تھی کہ اگر کبھی کوئی کچھ نہ دیتا تو ایک جگہ جی راتنی اور کچھ نہ کچھ لے کر ہی لگتی۔ بڑی بڑی اور امیر دکانوں کے آگے جا کر

اب اچانک ماں کے پاس موبائل کیسے آ گیا۔ اچانک ہی سامنے والا دروازہ کھلا اور 40 سال تک کی عمر کا ایک کالا چھوٹا سا آدمی باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں کالے رنگ کا ایک شاپر تھا جو اس نے ماں کی گود میں گرا دیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

”ڈھڈو مالی حساب شام کو مل جائے گا بے فکر رہنا اور ہاں حفاظت سے تم جانتی ہو۔“

”بس بس میں سمجھ گئی، تم بھی بے فکر ہو جاؤ۔“
ان کی گفتگو میری سمجھ سے باہر تھی۔ اس شاپر میں کیا تھا یہ مجھے پتا نہ چلا۔

”اب گاڑی کو دلو بس موڑو منٹوں۔“

ماں نے مجھے تیزی آواز میں کہا تو گلی سے نکل کر روڈ پر آتے ہوئے میں نے گلی پار کوشش کی کہ میں دیکھ سکوں کہ اس شاپر میں کیا ہے، لیکن ماں نے میری ہر کوشش نامکام بنا دی اور شاپر کو برقعے کے اندر چھپا لیا اور وہ دوبارہ بھیک مانگنے کے لیے آوازیں نکالنے لگی۔

اب بچے، بڑے سب اپنی اپنی منزلوں کو جا چکے تھے اور روڈ پر رش ختم ہو چکا تھا، صرف ٹریک اور اس کا شور تھا۔ میری ماں نے مجھے مارکیٹ کی طرف چلنے کو کہا۔ حیران کن طور پر اس کے لیے میں تیزی لگی اور کچھ وقت تھا کہ میں اس شاپر کے بارے میں پوچھ سکتا تھا، اب میں اس بارے میں دل میں ترکیبیں سوچنے لگا۔

”ماں مئی..... وہ جو آدمی نے گلی میں تمہیں شاپر دیا تھا اس میں.....“

”جب کرو منٹوں..... حرام زادے تجھے اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ تو مجھ سے سوال کرے۔ ڈھڈو صرف سوال کرتی ہے، کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ ڈھڈو سے سوال کرے۔“

ماں نے بیٹھے بیٹھے ہی میری ٹانگ پر اس زور سے اٹکا ہاتھ مارا کہ میں منہ کے بل سڑک پر جا گرا۔ اس سے پہلے کہ سامنے سے آئی ہوئی کار مجھے چل کر گزر جاتی، میں تیرگی سی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بڑھی آگے کو بڑھا دی۔

سارا دن مختلف بازاروں میں بھیک مانگنے کے بعد ہم ایک ہوائی کالج کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ لوگ تو ہمیں نظر انداز کرتے ہوئے گزر گئے اور کچھ نے بھیک دی۔

آہادی شروع ہوتے ہی اس نے کپڑا منہ پر گرا دیا اور معمول کی آوازیں لگانے لگی۔

ماں کی آواز میں اتنا سوز ہوتا کہ شدت کرب سے میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ وہ اب بھی وہی آوازیں نکالتے لگی اور میرا دل شدت درد سے کلبلا اٹھا اور قدم آگے بڑھانا مشکل ہو گیا۔

لوگ ہاں آکھن کھنکھی داس ڈاڈھے سوکھے
ہونداد کھنکھی دساں لوں ڈاڈھا
سارا دن جھولی نے کنگول پھر بندے
کوئی نہ کرے اندازہ

کوئی نہ پڑھے نمازایاں دی
نہ کوئی پڑھے جنازہ

لوگ ہاں آکھن کھنکھی داس ڈاڈھے سوکھے
ہونداد کھنکھی دساں لوں ڈاڈھا

.....

آج ہماری منزل کوئی اور تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے آفس کے لیے اور بچوں نے اسکولوں کی دہا لی ہوئی تھی۔

آہستہ آہستہ ہمارا برتن پیسوں سے بھرنا جا رہا تھا۔ جب برتن بھر جاتا تو ماں آہستہ سے مجھے کہتی کہ یہ تھیلے میں ڈال دو۔ کچھ معصوم بچے جو اپنا جیب خرچ لیے جا رہے تھے، ان معصوم بچوں نے بھی اپنا جیب خرچ برتن میں ڈال دیا تھا۔

میں آگے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا اور اب ماں کا دھیان بھی بھیک مانگنے کی طرف نہیں تھا، بلکہ اب وہ ہر بار ادھر ادھر دیکھ رہی تھی، جیسے کسی کی تلاش ہو، لیکن ایسا لگتا تھا جیسے اسے اپنی مطلوبہ چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔

پھر ماں نے مجھے ایک گلی میں داخل ہونے کے لیے کہا اور میں گلی میں داخل ہو گیا۔

میں تو آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جا رہا تھا، لیکن ماں کا اضطراب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اچانک ماں نے مجھے ایک گھر کے سامنے رکنے کے لیے کہا اور خود برقعے کے اندر سے ہی آہستہ آواز میں کہنے لگی، کسی سے جو کہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔

”آ جاؤ میں باہر گھر کے سامنے ہوں۔“

لگتا تھا کہ ماں کے پاس موبائل تھا، لیکن میں نے تو آج تک نہیں دیکھا تھا کہ ماں کے پاس موبائل ہے۔

شاہر کا تبادلہ کیا، جو کہ ایک یا ڈیڑھ گلو دہائی تھا۔ اس دن میری حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ سارا دن چل چل کر میری ٹانگیں ٹٹل ہو گئی اور سر الگ درد کر رہا تھا۔ میں نے صبح سے کچھ زیادہ کھایا بھی نہ تھا، لیکن میری ماں کو مجھ پر ڈرا بھی ترس نہ آیا تھا کہ مجھے کچھ کھلا پلا دیتی، اُلٹا مجھے مارا بھی تھا اس نے۔

گھر آ کر میں تھکن اور بھوک سے بڑھال ہوندھے منہ گر گیا۔ ماں نے راستے سے ہی کھانے کا سامان لے لیا تھا، لیکن اس نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور خود کھانے کے لیے بیٹھ گئی۔ اسے میں دوا دی جھونپڑی کا پردہ اٹھاتے ہوئے اندر آ گئے اور ماں کے ساتھ ہی نیچے بیٹھ گئے۔ ایک لے ہزار ہزار کے کچھ ٹوٹ ٹکال کر ماں کو دیے جسے اس نے جھپٹے کے سے انداز میں کچل لیے۔ ان میں سے ایک ہٹنے لگا اور کہا۔

”اخذ دیتی! اگر تم ہمارے ساتھ اسی طرح قلعے رہی تو ہم خیری بیسوں کی بھوک مٹا دیں گے۔“

”آپ فکر نہ کریں، مجھے صرف بیسوں سے مطلب ہے، میں آپ کے کاروبار میں بھی بیروں سے نہیں کروں گی۔“

”اچھا یہ چھو کر اکون ہے؟“

”یہ ہمارا بچہ ہے۔“

”اچھا تو اس کو کھانا نہیں دیا تم نے۔“

”ارے اس نے ابھی کھایا ہے۔“

میں ماں کے اس خال خال جھوٹ پر حیران رہ گیا۔ ٹھیک ہے، ہم پھر چلتے ہیں اور کل اسی نام پر آ جانا، دھیان سے، کسی کو شک تک نہ ہونے پائے، یہ کہہ کر وہ لوگ چلے گئے۔

نیند نے مجھے کسی مہربان ماں کی طرح اپنی آغوش میں لے لیا۔ آدھی رات کے بعد کا وقت ہوگا، جب سخت بھوک کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ اس قدر شدید بھوک کہ میرا جی چاہا کہ دھڑکیں مار کر روؤں۔ اچانک میری نظریں ماں کے ساتھ پڑے ہوئے برتنوں پر گئی۔ وہاں وہی ماں کا بچا ہوا کھانا رکھا ہوا تھا۔ شاید ماں نے میرے لیے رکھا ہو، اس لیے میری ماں مجھے بڑی مہربان لگی اور میں کھانے پر ٹوٹ پڑا، ایسے جیسے صدیوں بعد کھا

میرے اندازے کے مطابق آج کی دیہاڑی بہت زیادہ لگ گئی تھی اور ماں اسے ایک ہفتے تک بیٹھ کر کھا سکتی تھی، لیکن اس نے اسی پر بس نہیں کی۔ اس وقت پانچ بجے کا نام ہوگا جب ماں نے کہا کہ مجھے فوراً چوک لے کر چلو۔ اس وقت وہاں بہت زیادہ رش ہوتا تھا اور بھوک بھی زیادہ ملتی تھی۔ فوراً چوک پر آئے ہوئے ہمیں ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک بس وہاں آ کر رکی اور اس میں سے ایک آدمی باہر نکلا۔ وہ بہت مختلط انداز میں ادھر ادھر دیکھ کر چل رہا تھا۔ اس کے کانوں سے سوپاٹل نکلا ہوا تھا۔ اسی وقت مجھے ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”آ جاؤ۔۔۔ آ جاؤ۔۔۔ جلدی آؤ اس وقت کوئی خطر نہیں ہے۔“

ہمارے قریب آ کر اس نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور نیچے جھک کر برتن میں رکھنے لگا تھا کہ ماں نے وہ شاہر نکال کر اس کو پکڑا دیا اور وہ لے کر جلدی سے چلنے لگا، دھڑا دو پولیس اہلکاروں کی نظر اس پر پڑ گئی، وہ ٹریفک پولیس کے آدمی تھے۔ وہ دونوں اس آدمی کی طرف بھاگے، لیکن جب تک وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ واپس ہماری طرف آئے۔ ماں نے مجھ سے کہا اب ہماری خیر نہیں، لیکن اچانک ماں نے اس قدر چیخ پکار شروع کر دی۔

”وہ میری ساری دیہاڑی لے کر بھاگ گئے۔ اس آدمی نے ہمیں لوٹ لیا۔“

ایک پولیس والا کہنے لگا۔

”مائی اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ کتنے پیسے تھے تمہارے۔“

خیر جی وہ میری ساری پونگی لے کر چلا گیا۔ یہ سن کر پولیس والے سائیڈ پر ہو گئے۔

یہ ہے ہمارے ملک کا قانون کہ دو اہلکار ایک آدمی کو نہ پکڑ سکے۔ میں ماں کے اتنے بڑے ڈرامے اور فراڈ پر حیران تھا اور دل میں اس کی اداکاری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا، لیکن یہ سب معاملہ میری سمجھ سے بالکل باہر تھا۔ وہ مونا آدمی اس شاہر کو دوسرے آدمی کو خود بھی تو دے سکتا تھا، لیکن انہوں نے یہ طریقہ کیوں نہیں اپنایا۔ ایک بھکاری کے ذریعے انہوں نے ایک

رہا ہوں۔

صبح ہوئی تو پھر وہی ماں کے دو تھپڑ، سوکھی روٹی اور کالی چائے اور پھر ماں کو برہمگی میں بٹھا کر بٹل پڑا۔ لیکن ایک بات جو مجھے مسلسل پریشان کر رہی تھی اور وہ جو ایک آدمی کا لاشارہاں کو پکڑا تا اور ماں شام کو دوسرے آدمی کو دے آئی تھی، لیکن ایک دن یہ معما بھی حل ہو گیا۔ وہ یوں کے ایک دن ماں لود میں اسی گھر کے سامنے کھڑے تھے کہ ایک لڑکا آیا اور کہنے لگا۔

”ماں جی تم روز یہاں کیا کرنے آتی ہو۔ یہ لوگ تو اشتہاری ملزم ہیں۔ سیرکن اور ایم کا کاروبار کرتے ہیں۔ یہ تو بہت بڑے ڈکیت ہیں اور پولیس ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ سارا محلہ ان سے ڈرتا ہے۔ تم یہاں نہ آیا کرو۔“

اب مجھے ساری بات سمجھ میں آ چکی تھی کہ وہ لوگ ماں کو شاپر میں کیا چھپا کر دیتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

اسی معمول میں تین سال گزر گئے اور اب تو میں نے بھی ماں کو ہٹ دھرمی دکھانی شروع کر دی تھی۔ جب وہ مجھے مارنے لگتی تو میں ہاتھ آگے کر لیتا اور ماں کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ جس پر اسے اور زیادہ طیش آتا اور مجھے اور زیادہ شدت سے مارنے لگتی۔ اب تو اس کے ظلم میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ ایک دن صبح کا ٹم تھا اور ماں مجھے مار رہی تھی کہ وہی آدمی آ گیا۔ جو صبح کے وقت ماں کو شاپر دیتا تھا۔ اسے دیکھ کر بھی ماں کے ہاتھ نہیں رکے تھے، وہ بہت حیران نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا اور کہا ”تم اپنے بیٹے پر اتنا ظلم کیوں کر رہی ہو۔“

”یہ میرے آگے بکواس کرتا ہے جو بھی کام کہوں، اس میں میرا پھیر کرنا ہے۔ بہت ڈھیت بنتا جا رہا ہے۔“

”تو ڈھڈھتی تم اسے پیار سے سمجھاؤ۔ اس طرح تو یہ مر جائے گا۔“

”ارے نہیں مرے گا یہ پکا حرامی ہے۔“ بلکہ مجھے تو ڈر ہے کہ کسی دن یہ مجھے نہ مار دے۔ اس لیے تو اس کتے کو نہیں پالا تھا کہ یہ مجھ پر ہی بھونکے۔ کتے تو پھر بھی اپنے

مالک کے وفادار ہوتے ہیں۔“

ماں نے نجانے کون سا اشارہ اسے کیا کہ وہ کہنے لگا۔

”اچھا، بس کل آؤں گا پھر مجھے بتانا، دیکھتے ہیں یہ کیسے سیدھا نہیں ہوتا۔“

میں اس کا انتظار ہی کرتا رہ گیا، لیکن وہ تین دن کے بعد آیا اور وہ بھی اس وقت جب میں سو گیا تھا، لیکن ابھی میں گہری نیند میں نہیں تھا، بس آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ اچانک جھونپڑے کا پردہ سرکا اور ایک سایہ سا اندر داخل ہوا، اندر مکمل اندھیرا تھا۔ میں نے اس کی آواز سے اسے پہچانا۔ اس نے آتے ہی میرے پارے میں پوچھا۔ ماں نے کہا۔

”سو گیا حرامی۔“

”اچھا سنی دیر ہوئی اسے سوئے ہوئے۔“

”یہی کوئی ایک گھنٹہ۔“

”اچھا پھر یہی بات کرتے ہیں، باہر تو سخت سردی ہے۔“

”ہاں، ہاں..... تم کہو، تمہیں اس سے کیا ڈر ہے۔“

”اگر میں بھی لے تو کچھ نہیں ہوگا۔“

”نہیں ڈھڈھتی، سمجھا کر وہ بات ہی کھائی ہے۔“

”اچھا اب تم کہہ بھی دو۔“

”تم اسے سیدھا کرنا چاہتی ہو نا تو تمہیں سمجھ جانا چاہیے کہ یہ اب سیدھا نہیں ہوگا۔ جیسے جیسے یہ بڑا ہوتا جائے گا، تمہارے ہاتھ سے لگا جائے گا۔ اچھا تم یہ تو پہلے بتاؤ کہ یہ تمہاری سگی اولاد ہے۔“

”ارے نہیں سگی اولاد ہوتی تو میں اسے یوں مارتی، گھنٹگی کے ڈھیر سے اٹھایا تھا اسے میں نے۔ یہ حرامی ہے۔“

”چلو پھر تو میرا اور تمہارا پلان کامیاب ہو جائے گا۔“ آدمی نے کہا۔

”اچھا وہ کون سا؟“

”تم نے یہ کرنا ہے کہ اب یہ سیدھا تو ہوگا نہیں، کل کو یہ تمہیں مارے گا بھی اور شاید بھاگ بھی جائے۔ اگر تم اسے قابو کرنا چاہتی ہو نا تو اس کے دونوں بازو لوہر ایک

مالک کو مارو۔“

کرنا تھا۔ میرے پاس صرف آج کا دن تھا۔ سارا دن سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہو گیا، لیکن آج میں نے مجھے باہر جانے ہی نہیں دیا۔ مجھے کوئی موقع نہیں مل رہا تھا کہ باہر جا سکوں۔

مجھے اپنی جان خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی۔ رات کا کھانا کھا کر ڈھڈھنے لگا۔ مجھے کہا کہ اب سو جاؤ اور خود بھی میرے سامنے ہی سوتی بن گئی، لیکن وہ سو نہیں رہی تھی۔ میں بھی اس کے سامنے ایسے لیٹ گیا جیسے گہری تیند میں ہوں۔ بارہ بجے کے بعد کا وقت ہوگا جب میں بہت آہستہ سے بغیر آواز نکالے نہایت آرام سے اٹھا۔ ڈھڈھنے ہوئی سو رہی تھی۔ میرا ہاتھ اس ڈھڈھے کو تلاش کرنے لگا جو ڈھڈھنے اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہوا تھا اور اب وہی ڈھڈھا مجھے اپنی حفاظت کے لیے چاہیے تھا اور پھر ڈھڈھا مجھے مل گیا۔ اب میرے ہاتھ اس ڈھڈھے کو تلاش کرنے لگے جہاں ڈھڈھنے پیسے رکھتی تھی۔ وہ نین کے دوڑنے تھے، ایک میں سکے تھے اور دوسرے میں کاغذ کے نوٹ، لیکن میری بدقسمتی تھی کہ میرا ہاتھ سکوں والے ڈھڈھے سے ٹکرایا تو آواز پیدا ہونے کی وجہ سے ڈھڈھ بھٹکا سا کسمپاشی اور پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں آرام سے اپنی جگہ لیٹ گیا ڈھڈھا میں نے پاس رکھ دیا تھا۔ ڈھڈھنے بلب جلا دیا اور پھر اس نے ہر طرف نظر دوڑائی ہوگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ لائٹ بند کر کے پھر سو گئی۔ آدھا گھنٹہ میں اسی پوزیشن میں لیٹا رہا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ میں نے نین کے ڈھڈھے کو آہستہ سے لیٹنے ہی باہر دھکیلنا شروع کر دیا، پھر میں نے پیٹ کے بل زمین پر رینگنا شروع کر دیا۔ ڈھڈھا میرے ہاتھ میں تھا۔ ابھی میرا ایک پاؤں اندر اور دوسرا باہر نکلا ہی تھا کہ ڈھڈھنے میرا اندر والا پاؤں زور سے پکڑ کر اندر کھینچا اور کھڑی ہونے ہی لگی تھی کہ میرا ڈھڈھے والا ہاتھ فضا میں لہرایا اور اس کے سر پر لگا اس زور سے کہ ڈھڈھ دھچکرائی ہوئی نیچے گری۔ مجھے تو قلع بھی کہ یہ سب ہوگا یعنی میں پکڑا جاؤں گا لیکن ڈھڈھ کو یہ توقع نہیں تھی کہ ڈھڈھا اس کے سر پر پڑے گا، پھر میں نے اندھا

آف میرے منہ سے ہلکی سی سسکی نکلی اور میں پسینے میں نہا چکا تھا۔ اگر ذرا سی بھی روشنی ہوتی تا تو انہوں نے مجھے دیکھ لیتا تھا اور کچھ شک نہ تھا کہ مجھے اسی وقت مار دیا جاتا۔

"اب میں اسے ماں کیسے کہتا۔ میں تو حرامی تھا اور وہ میری ماں نہیں تھی۔"

اچانک ڈھڈھ کی آواز آئی۔ "اوکا لیا تم تو میری روزی بند کرنا چاہتے ہو، یہ میری روزی روٹی کا وسیلہ ہے۔"

"پھر تم اسے مار لی کیوں ہو؟ اسے کھانے لہڑھنے کو اچھا کیوں نہیں دیتی۔ اگر تم اس کے بازو اور ٹانگے کٹو اور تو تمہارا رزق بھی بڑھ جائے گا اور تمہارا کاروبار وسیع ہو جائے گا۔"

"وی کیسے؟" اسے ڈھڈھ اس نے منہ آگے کر کے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"جب تم اسے ریڑھی میں لاد کر باہر جاؤ گی تو لوگ اسے معذور سمجھ کر تمہیں زیادہ سے زیادہ بھیک دیں گے اور تمہارا کاروبار بڑھ جائے گا۔"

"لیکن میں اسے کیسے کھینچوں گی۔ مجھ سے دو قدم تک نہیں چلا جاتا۔"

اس کے لیے میں تمہیں ایک لاکا دوں گا وہ ریڑھی کھینچنے کا اور تم اس کے ساتھ ساتھ چلنا۔ اور پھر چلتے ہی تو نہیں رہنا، کتنا بھی تو بے جگہ جگہ۔

پکدم ڈھڈھ کی آنکھیں چمکے لگیں، اور اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں بتا رہی ہوں۔" اب ڈھڈھ مجھے کیا کرتا ہے۔

"تمہیں کچھ نہیں کرنا جو بھی کرنا ہے مجھے کرنا ہے۔ اب آگے میرا کام شروع ہوتا ہے۔"

"یہ سن کر میں جہاں تھا وہیں ساکت رہ گیا۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا اور میری سانسیں بھی رک رہی تھیں۔ کوئی انسان اتنا سفاک اور ظالم کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک زندہ سالم انسان کے اعضا کاٹ دے۔ اچانک پھر کالے کی آواز آئی اور اس نے کہا۔ "ڈھڈھ میں پرسوں آؤں گا۔ پہلے اس کو فٹے کا ٹیکا لگا دوں گا تا کہ یہ ہمارے آگے پھڑک بھی نہ سکے۔"

اب تو میری اور بھی جان نکلنے لگی، پھر ساری رات مجھے خیند نہیں آئی، مجھے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کچھ

سے انہوں نے پانچ لڑکوں کو نیچے اتارا اور مجھے بھی ساتھ ملا لیا اور وہاں لے گئے جہاں اور بھی بہت سارے ہم عمر لڑکے کام کر رہے تھے۔ کچھ پتھر اٹھا کر ٹرک میں لوڈ کر رہے ہیں اور کچھ لکڑیاں کاٹ رہے تھے تو کچھ لوہے کے بڑے بڑے پائوں کو کاٹ رہے تھے پھر دو آدمی اور آئے اور انہوں نے ہم کو مارنا شروع کر دیا اور اتنا مارا کہ ہم بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ جب مجھے ہوش آیا تو وہ ہی آدمی میرے پاس بیٹھا تھا جس نے مجھے ٹرک پر بٹھایا تھا۔ اُس نے کہا کہ میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے انہیں روکا تھا کہ تمہیں نہ ماریں وہ شاید بھول گئے لیکن ان کا کام ہی یہی ہے۔ اب میں جہاں رہ رہا تھا یہ جہنم اس جہنم سے بھی بدتر تھی۔ صبح سے شام تک کام کرتا اور رات کو قید خانے میں سوتا۔ میں یہاں بھی خوار کے منصوبے سوچنے لگا، لیکن کوئی ترکیب میرے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ وہاں پہرے کا انتظام بہت وسیع تھا اور وہاں سے نکلنا اتنا آسان بھی نہ تھا۔ بچوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ بچوں کو مار پیٹ کر انہیں بیرون ممالک میں بھجوا دیا جاتا یا ان کے جسمانی اعضا نکالی کر فروخت کیے جاتے تھے۔ کچھ بھی ہو مجھے جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا۔

وہاں پردو لڑکے تھے جو میرے دوست تھے یعنی ان سے اچھی دعا سلام تھی۔ ان میں ایک لڑکا جس کا نام عثمان تھا وہ ہر وقت روتا رہتا تھا اسے اپنے والدین کی بہت یاد ستاتی تھی اور اس پر تشدد بھی زیادہ کیا جاتا تھا۔ ایک دن میں نے اپنی ترکیب اس کے گوش گزار کی۔ اسے میری ترکیب بہت پسند آئی اور ہم نے اس ترکیب پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کر لیا، گوکہ یہ بہت بڑا ریسک تھا لیکن ریسک نہیں تو زندگی بھی نہیں۔ جس جگہ ہم رہے تھے مین گیٹ وہاں سے دس منٹ کی دوری پر تھا اور یہی ریسک تھا کیوں کہ وہاں پر چار سنتری (پہرے دار) ہوتے تھے۔ ان کو پھلانگنا آسان نہ تھا۔ (اس دن آدمی رات کے بعد ہم نے نکلنا تھا۔ ہم تین تھے۔ رات کو ہمیں کھانے کے لیے باہر لایا گیا تو ہم تینوں کھانے والی جگہ پر دیر تک بیٹھے رہے، باقی سب لڑکے چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ برتن اٹھانے والا آتا، ہم تینوں اٹھ کر

دھند بھاگنا شروع کر دیا۔ فقیر مگر سے باہر آ کر بھی میں نہیں رکا، بلکہ بھاگتا رہا۔ میری سانسیں پھول گئی تھیں۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ میں رات کے گھور اندھیرے میں اکیلا تھا۔ میرا دل خوف سے لرز رہا تھا۔ لیکن ڈھڈکا خوف اس پر بھی حاوی تھا۔

میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ بھی تھا میں نے اس کا ٹمک کھایا تھا۔ میں حرامی ضرور تھا، لیکن ٹمک حرام نہیں تھا، لیکن وہ تو میری جان کے درپے تھی۔

بھاگتے بھاگتے مجھے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ میں نے اب پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شکر تھا کہ میرے پیچھے کوئی نہیں تھا یہ کوئی ویران و سنان علاقہ تھا۔ دور دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اب بھی چلتا رہا۔ یہ میری زندگی کی پہلی رات تھی جو میں اپنی مرضی سے جی رہا تھا۔ اب دور دور سے اذانیں سنائی دینے لگی تھیں۔ کچھ دیر بعد دن کے آثار دکھائی دینے لگے۔ میں اب ایک روڈ پر آ چکا تھا جو بالکل سنان تھا۔ ابھی رات کا اندھیرا چھٹا نہیں تھا۔ دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دی۔ اس سے پہلے کہ میں ادھر ادھر چھپتا۔ وہ ٹرک تھا اور میرے بالکل قریب آ کر رک گیا۔ دو آدمی باہر نکلے اور پوچھا۔

”تم کون ہو لوٹو۔“ میں چپ ہی رہا لان میں سے ایک نے خوشخوار نظروں سے میری طرف دیکھا اور ڈبا لے کر میرا زور پکڑ کر مجھے اندر بٹھا دیا۔ وہ کل تین آدمی تھے۔ اندر لائٹ روشن تھی ان کے چہرے گورے تھے اور آنکھیں لال۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ ٹرک لب پھر پوری رفتار سے چلنے لگا تھا کہ اچانک ایک آدمی نے دو ڈبا بھول کر دیکھا تو میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

”یہ تم کسی کی چوری کر کے نکلے ہو۔“ پھر اس نے میرے منہ پر ایک زوردار پتھر مارا، تو میں نے اسے شروع سے اب تک اپنی ساری کہانی سنائی۔

میری کہانی سننے کے بعد انہوں نے کہا کہ ”ہماری بہت بڑی فیکٹری ہے اب تم ہمارے ساتھ رہنا اور وہیں کام کرنا۔ پھر وہ مجھے لے کر چلے گئے یہ کوئی پہاڑی علاقہ تھا۔ جب انہوں نے مجھے ٹرک سے اتارا تو دو آدمی آئے اور ٹرک کے کچھلی طرف چلے گئے اور وہاں

آج میں پورے تین برس بعد اسی شہر جا رہا تھا۔ جہاں میں نے جنم لیا تھا اور جہاں مجھے حرامی کا لقب دیا گیا تھا۔ میں امام غزالی روڈ جھنگ پر جا رہا تھا تو مجھے دور سے ہی ایک ریڑھی نظر آئی۔ جیسے جیسے وہ قریب آتی جا رہی تھی، میرے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ میں ایک اوٹ میں ہو گیا اور پھر میں نے اسے اپنے بالکل قریب سے گزرتے دیکھا تو دھک سے رو گیا۔ جی ہاں وہ کوئی اور نہیں ڈھڈو ہی تھی۔ اس کے دونوں بازو کہیں تک کئے ہوئے تھے اور اس ریڑھی کو ایک دس سالہ بچہ دھکیل رہا تھا۔ زمانے بھر کا کرب اور درد ڈھڈو کے چہرے پر تھا اور آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات تھی۔ شاید اسے میری خوشبو محسوس ہو گئی تھی، جو آنسوؤں کی جھریاں لگ گئی تھیں۔ یہ مہینہ یہ قدرت کا انتقام تھا جو اس نے میرے ساتھ کیا تھا، آج خود پایا تھا۔

کہتے ہیں وقت اپنے آپ کو ضرور دہراتا ہے۔ کل جب میں ریڑھی چلاتا تھا تو وہ مجھے بات بات پر ہارنی اور حرامی ہونے کے طعنے دیتی تھی، لیکن آج اس کے ہاتھ تھے اور شد بان، جو رب نے لگ کر دی تھی۔

میں نے یہ بھی سنا تھا کہ مظلوم اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ میرا آج سارے زمانے سے ہی سوال ہے کہ کیا حرامی ہونا کوئی جرم ہے، یا حرامی خود آتے ہیں اس دنیا میں۔ انہیں اللہ نہیں بناتا۔ حرامی بھی اپنی مرضی سے اس دنیا میں نہیں آتے۔ یہ معاشرہ صاف اور پاکیزہ ہو جائے تو کوئی حرامی نہ ہو، لیکن اگر ہو بھی جائے تو بھی کبھی حرامی اس دنیا میں وہ کارنامے کرتے ہیں جو کوئی نہیں کر سکتا۔

ڈھڈو شاید مجھ سے معافی مانگنا چاہتی تھی، تو اس کے چہرے پر غم کی شدت تھی۔ میں نے اس کا ہنک کھایا تھا۔ اس نے چودہ سال تک مجھے پالا تھا، مجھے بڑا کیا تھا۔ معاف کرنے والوں کا ظرف بہت بڑا ہوتا ہے اور یہی اللہ کو بھی پسند ہے، اس لیے میں نے ڈھڈو جی کو معاف کر دیا ہے، شاید اللہ بھی اسے معاف کر دے۔

☆.....☆.....☆

پتھروں کی آڑ میں ہو گئے اور وہیں بیٹھ گئے۔ آدمی رات کا وقت ہو گا ہم نے سب کے سونے کا یقین کر لیا تھا۔ ہم تینوں پیٹ کے بل ریختے ہوئے جا رہے تھے۔ دو ستر یوں کو ہم نے پار کر لیا تھا۔ جو گیت کے اندر تھے اور ان کے خزانوں کی آواز گونج رہی تھی۔ اب گیت پھلانگنے کا مرحلہ تھا۔ جو بہت اونچا تھا، لیکن ہم پار کر سکتے تھے۔ اگر آواز پیدا نہ ہوتی۔

پہلے امجد گیت پر چڑھا اس کے قد تو ڈالسا تھا، وہ جلد ہی اوپر پہنچ کر نیچے اتر گیا، پھر عثمان اور میں اوپر چڑھ گئے۔ اوپر پہنچ کر میں نے ان کے سونے کا یقین کر کے نیچے کی طرف اترنا شروع کر دیا۔ گیت کا سا ہوا، کیونکہ ہم دو تھے۔ گیت بردائیں جانب والا ستری بالکا سا کسسا یا، جبکہ دوسرا اٹھ رہا تھا، لیکن انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا تھا کیوں کہ وہاں مکمل اندھیرا تھا۔ ہم کامیابی سے نیچے اتر گئے اور پیٹ کے بل چلتے ہوئے تقریباً پانچ منٹ کا سفر کیا اور اس کے بعد ہم بھاگنے لگے، ہمیں نہیں معلوم ہم کس دیر بھاگے۔ جب اندھیرا چھٹنے لگا اور صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی تو ہمیں اپنے سے کچھ قاصلے پر ایک چوکی نظر آئی۔ دو پولیس والوں نے ہمیں روک لیا اور کہا۔

”تم اتنی صبح کجاں سے آئے ہو۔“ میرے دوستوں نے مجھے روکا لیکن میں نے سادہ بات ان کو بتا دی۔ میری بات سن کر وہ حیران رہ گئے، کیونکہ کئی سال سے بچے غائب ہو رہے تھے، لیکن ان کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ ہم نے ان کو جگہ بتا کر ان لوگوں کو پکڑوا کر سارے بچے بازیاں کروالے۔ جب بچے اپنے والدین سے ملے تو وہ منظر اتنا غم ناک تھا کہ دیکھنے والی ہر آنکھ اٹکھار تھی۔ کچھ بچوں کے والدین ان کے غم میں یہ دنیا ہی چھوڑ کر جا چکے تھے۔ ہر کوئی ہمارے حوصلوں کی داد دے رہا تھا اور ہمیں محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کیا تھا جو میں حرامی تھا، لیکن آج میرے کارنامے پر ہر کوئی خوش تھا۔ ہر کوئی مجھے اپنی سرپرستی میں لینے کی کوشش میں تھا اور پھر میرے دوست عثمان نے مجھے اپنا بھائی بنا لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

میں کس جگہ سچی کہانیاں

کے چہ نہیں

آپ سچی کہانیاں کے خریدار بن کر ملک کو

نرم و دلاور بنائیے

اندرون ملک = 720 روپے

ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

55 امریکی ڈالرز	55 امریکی ڈالرز	ایران	کویت
55 امریکی ڈالرز	55 امریکی ڈالرز	سری لنکا	سعودی عرب
55 امریکی ڈالرز	55 امریکی ڈالرز	جاپان	یو۔ اے۔ ای
55 امریکی ڈالرز	55 امریکی ڈالرز	لیبیا	مصر
55 امریکی ڈالرز	55 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	یونان
55 امریکی ڈالرز	55 امریکی ڈالرز	جرمنی	فرانس
55 امریکی ڈالرز	55 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	برطانیہ
55 امریکی ڈالرز	55 امریکی ڈالرز	پولینڈ	ٹاروے
65 امریکی ڈالرز	65 امریکی ڈالرز	کینیڈا	امریکہ
65 امریکی ڈالرز	65 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	افریقہ

زور سالانہ

110 آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ - کراچی

آج ہی رابطہ کیجیے

فون نمبر: 021-34935023, 34930470



www.paksociety.com

اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہی ہے جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ ہا سلسلہ "ناگن"۔ آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کر دے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلے زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر 8

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پروادا کو اس کے گروہ نے مرتے سے شیش نامک کا جوڑا ہون کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور انھیں میں منبری روشنی۔ آنکھوں کی منبری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں۔ اگر یہ سوسل نامک زندہ رہ گئے تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آجائیں گے، بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں پیچھے خزانے ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے ماتم ہوں گے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر سال میں انہیں کی رات نامک دیوتا کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جان جو رکھوں میں ادا کران کے پر رکھوں نے ات ناگوں کو تازہ دم سے پاتا تھا اور کھپائی کا یہ ٹکڑی اب جوگی مہاراج کے ہاتھ میں آ چکا تھا۔

اور رات بھی انہیں کی رات تھی اور ان ناگوں کی شہر کے سوسال مکمل ہونے جا رہے تھے۔ جوگی مہاراج نے یہ کہانی میں سال سے ساتھ رہنے والے چیلے صاحب کو طاقی تو اس کی نصیحت میں گھونٹ آئے گا۔ مگر مہاراج باتھو میں نظر تھا ہے ناگ منتر کا جاپ کر رہے تھے اور صاحب انہیں نظر یہ نظروں سے لکچھ کر ذرا عجیب منکر باتھا۔ جاپ مکمل کر کے جوگی مہاراج نے بی کا مکمل مکمل کیا۔ وہاں ناگ اور ناگن انسانی لٹون میں اشیان کر رہے تھے اور سرخ زبانی نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر غور سے دیکھ رہے تھے، یہ بی وہ لکھ تھا جس کا صاحب کو انتظار تھا اس نے پک بھینکے میں ٹھکر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج چھرائی آنکھوں سے اپنے چیلے کو دیکھتے رہ گئے۔ صاحب اداں ٹھکانے لگا کر جب کمرے میں آتا ہے تو پٹاری والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور ست واٹھار سال لڑکی موجود تھے۔ صاحب انہیں کہتا ہے کہ تم میرے تمام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شنتا تجو پڑھتا ہے۔ جب ارجن اور شنتا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صاحب ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلے ہے۔ تب صاحب کے خون سے شیش نامک کا یہ جوڑا پٹی پٹاں بچھا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔

ناگ سے دیکھ لیتے ہیں اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شنتا غصے میں آ جاتی ہے اور کہتی ہے۔ "ارجن کے قاتلوں! تم نے میرے ناگ کی تھمیا کر کے بڑا اٹھائے کیا تم ناگن کی حالت اور انتقام سے واقف نہیں، شنتا تمہاری زندگیوں میں زہر رکھ دے گی۔ میں اس گاؤں کی اعلیٰ سے اعلیٰ بھادوں کی تم موت، ناگوں کے لیکن موت بھی تم سے دھنڈ جائے گی۔ ایک ایک کوڑا پڑا کر مار دوں گی میں پھر اس گاؤں کی اعلیٰ تمہارے لیے قیامت بنی کر آؤں گی۔"



گھنٹلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگتی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تاپانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک پہنچتی ہے۔ مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رو جاتے ہیں اور اسے اپنی کینز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

سامری جاوہر گراہنے گرو شنداد جاوہر گرو سے ملاقات کرتا ہے جو اسے کہتا ہے کہ وہ آگن ہے اور "توسب" کچھ چھوڑنا گن سے ۲۲ جوڑ "سامری" یہ سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔ سامری گھنٹلا سے ملاقات کرتا ہے اور اسے ساپ ڈاولی کہہ کر غلط کرتا ہے مہارانی گھنٹلا یہ سن کر سمجھ جاتی ہے کہ سامری اس کے راز کو جان گیا ہے۔ گھنٹلا کہتی ہے کہ "آؤ سامری ہم ایک ہو جائیں اور دونوں ملی کر اس وسیع ریاست پر اپنی حکمرانی قائم کریں، میں سانپوں کی ملکہ ہوں اور تم جاوہر گروں کے بادشاہ ہم دونوں بادشاہ اور ملکہ بن جاتے ہیں۔ سامری اسے کچھ دن بعد جواب دینے کا کہتا ہے۔ گھنٹلا اپنی ملازمہ خاص پر یہ کو بھی اپنی چالی کے بارے میں بتاتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ آج کے بعد میرے لیے نوجوان انسانی خون کی فراہمی تمہاری اسے داری ہوگی۔ پر یہ سن کر بہت خوف زدہ ہوتی ہے۔ گھنٹلا اس سے کہتی ہے کہ اگر یہ بات کسی کو پہنچا چلی تو وہ پر یہ کا خون کر دے گی، دوسری صورت میں اسے تاپانہ کی حکومت میں بٹلی مہر دیا جائے گا۔ پر یہ مہارانی کے حکم کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔

مہارانی ماریہ مہاراجہ رام ناتھ کو بتاتی ہے کہ گھنٹلا آگن ہے اور انسانی روپ میں نہیں ہے خوف ہار رہی ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی چنڈت گرو نرائن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ مہاراجہ اس سے کہتے ہیں کہ اگر گھنٹلا آگن ہوئی تو اس کو آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو مار پیہ کو ہی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک حکم گھنٹلا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے۔ مہارانی ماریہ اپنے لباس میں چھپا کر لایا جانے والا آئینہ چاک گھنٹلا کے سامنے کر دیتی ہے جس میں ایک بڑی سی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ سپہ سالار بلگرام گھنٹلا کے بجائے مہاراجہ رام ناتھ کو گرتا کر لیتا ہے۔ گھنٹلا سامری جاوہر گرو کو یاد کرتی ہے جو سامری جاوہر گرو فری حاضر ہو جاتا ہے۔ گرو نرائن بھی سامری سے خوف زدہ ہو کر فرار ہو جاتا ہے اور گھنٹلا میں کھل کے صدمہ جاتا ہے۔ اب سامری اور گھنٹلا سے مقابلے کے لیے اسے کافی کے مندر، میں ایک کنیا کا بلیڈ ان کر کے حیرت جاپ ڈالے دن کرنا تھا اور اس جاپ کے لیے نوجوان لڑکی کو کھال کے چٹوں میں تھپان کرنا ضروری تھا۔

بیدان کا عمل مکمل کر کے وہ ناگن گھنٹلا کو ہاتھوں میں لے کر اپنے مندر سے باہر شمشان گھاٹ میں جا پہنچتا ہے اور تیرتھ جاپ شروع کر دیتا ہے۔

سامری گھنٹلا، بلگرام اور پریتا پانہ کی حکومت چھاپی گزشتہ مضمون کے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ظلم کا راج تھا۔ گھنٹلا جاپ کے ذریعے کالی ناتھ کی مہاتن شکتی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گھنٹلا اب صرف آگن نہ تھی بلکہ جاوہر گرو کی بیٹی بھی تھی۔ پر یہ اس کے لیے ہر دوز ایکہ خوب صورت نوجوان مہیا کرتی۔

گھنٹلا سبز آنکھوں اور ہنسنے والے بالوں والے نوجوان کو دیکھ کر بہت رو جاتی ہے۔ وہ گھنٹلا کو بتاتا ہے کہ وہ جنات کے بادشاہ شکران کا بیٹا شکران ہے اور تمہارا کوئی جاوہر گرو نہیں ہوگا۔

گھنٹلا شکران کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ وہ بھی اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سامری گرو نرائن کو منزل جاپ سے باز رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گرو شنداد کی درج سے مدد طلب کرتا ہے۔ سامری جاوہر گرو کی ملاقات شکران سے ہوتی ہے۔ گھنٹلا شکران اور سامری تین گرو نرائن کے منزل کے پاس جا پہنچتے ہیں لیکن گرو نرائن اپنا جاپ مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ شکران دونوں کو لے کر گھنٹلا سے دور لے جاتا ہے اور ان دونوں سے کہتا ہے کہ میں اپنی سلطنت واپس جا کر اپنے باپ اور دوسرے جھنڈوں سے اس بارے میں مشورہ کرنا ہوں۔ سامری بھی اپنے گرو شنداد جاوہر گرو سے رابطہ کرنے کے لیے گھنٹلا کو اکیلا چھوڑ جاتا ہے۔ گھنٹلا اپنے ہر چھکار کو حاصل کرتی ہے اور اس سے انسانی خون طلب کرتی ہے۔ چھکار دیتا ہے کہ جس گھر میں آپ موجود ہیں اس گھر میں زندہ انسان موجود ہیں جس گھر کے مالک ہیں اور شکران نے انہیں قید کر رکھا ہے۔ گرو نرائن کو گھنٹلا کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ مہا چنڈت لکشمی ناتھ سے اس مسئلے میں مدد طلب کرتا ہے۔ مہا چنڈت گھنٹلا سے قائدہ اٹھانے کے بعد اسے پر اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ گھنٹلا گھر میں بی قید نوجوان مسلمان کے خون سے اپنی بیوک مٹاتی ہے اور اس کی بہن رقیہ اور بیوی کثیر قافلہ پر تشدد کرتی ہے۔ گرو نرائن اور لکشمی ناتھ گھنٹلا کی بیوی تک پہنچ جاتے ہیں۔ گرو نرائن گھنٹلا کو کہتا ہے کہ وہ اپنے مہاجرین کو حکم دے کہ وہ ہم سب کو ریاست لکھنؤ کالی ناتھ کے استھان کے اندر لکشمی ناتھ کے گرو خاص میں لے چلیں۔

گھنٹلا کی سامری کے گھال میں جھپکی جھپکی جھپکی اب وہ بالکل ایک عام سی خور ہے بس لڑکی تھی۔ گرو نرائن گھنٹلا سے کہتا ہے کہ چھکار سے بڑھ کر آئندہ جھپکی، گھنٹلا نہ کہے بلکہ یہ ریاست میرا حکم مالے۔ اور سامری جب واپس وادی والے مکان میں پہنچا تو

گھٹلا موجود تھی۔ رقیہ، کنیرہ خاں اور اسد اللہ اس بیٹھے سلیمان کی دردناک موت کا ماتم کر رہے تھے۔ سامری بھتا ہے کہ کسی طرح سے گروڑاؤں کے آنے کی اطلاع پا کر گھٹلا کہیں روپوش ہو گئی ہے، وہ کلک کالی کے مندر پہنچنے کا فیصلہ کرتا ہے جیسے ہی وہ مندر کی میز صیال چڑھتا ہے ایک بھاری جسم اس کے دل پر آگرتا ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔

ادھر پہ یہ حیران تھی کہ کی دن گزر گئے نہ گھٹلا واپس آئی اور نہ سامری کیا خشکران۔ پر یہ کو چتا تھا کہ گروڑاؤں گھٹلا کو قتل کرنا چاہ رہا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ گھٹلا کا قتل عام میں جانا اس کے حق میں بہتر ہے تاکہ وہ حکومت پر قبضہ کر کے ملک میں جائے تب اپنا تک خشکران آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ گروڑاؤں تیرے چاہ میں کامیاب ہو کر گھٹلا کے جسم و جان اور اس کی تمام خلیجوں پر قابض ہو گیا ہے اور سامری بھی اس کے پاس قید ہو گیا ہے، یہ سن کر وہ خوش ہو جاتی ہے۔ سامری کو ہوش آتا ہے تو سامنے گروڑاؤں اور شمشیر ہاتھ موجود تھے۔ تب وہ اپنے دیوتا کا رب کا کوئی سہارا کے لیے پکارتا ہے، مگر گروڑاؤں منتر پڑھتا ہے اور نیل آگ کے شعلے سامری اور گھٹلا کو گھیر لیتے ہیں۔ گھٹلا گروڑاؤں کو بھی اس آگ میں کھینچ لیتی ہے اور ان کے جسم جلتا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب گھٹلا کی آگ کھٹکتی ہے تو وہ ایک دیرین اور بھرپور موجود تھی۔ اس کا جسم بری طرح جلا ہوا تھا اور زلموں میں وہ پڑ چکی تھی، اسی حالت میں گھٹلا تڑپتی سکتی آبادی تک پہنچتی ہے جہاں اس پر کئے حملہ کر رہے ہیں اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب اس کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک گھر میں موجود ہوتی ہے ایک نوجوان لڑکا، لڑکی اور ادویہ مرعورہ اور مرد موجود تھے۔ علاقہ ابھی خوراک اور کھل آرام سے اس کے ذمہ بھرنے شروع ہو چکے تھے۔ لڑکی سندری گھٹلا کی دوست بنی گئی ہے۔ گھٹلا دیکھتی ہے کہ سندری کا بھائی سنگھ رات گئے چپکے سے روزانہ ہر نکل جاتا ہے۔ گھٹلا کو خود میں خون کی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ ہلکا ہلکا دھڑکتا ہے۔ وہ اس دلت حیرت زدہ رہ جاتی ہے جب ہلکا ہلکا پٹے سامنے کھڑا دیکھتی ہے کہ وہ سوچتی ہے کہ اس کو کوئی بھلی کھلیاں واپس مل گئی ہیں۔

آپ آپ کے لاکھ کیجیے

”آپ کو سامری جی گروڑاؤں سے ہزاروں کوس دور سانپوں کو بوجھنے والے اس علاقے میں چھوڑ گئے تھے، لہذا آپ کی خلیاں تو بحال ہو چکی تھیں! آپ نے خود ہی استعمال نہیں کیل تو کسی کا کیا قصور؟“



چٹکار کی باتیں سن کر شکستہا کھل دھکی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔
 معطل خلتیوں سے اس کا وجود بکھرنے لگا تھا۔ جیون اسے کانٹوں کی باز نظر آنے لگا تھا۔ جب آگ سے جلے وجود کے ساتھ اس کی آنکھ دیرانے میں کھلی تھی تو یہ اس نے سوچا ہی نہ تھا کہ چٹکار کو آواز دے کر دیکھتی یا اپنی خلتیوں کو آزماتی اس وقت تو اس کا ذہن کام نہ کر رہا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ جیون کا آخری دور شروع ہو چکا ہے! لیکن اب چٹکار کو دیکھ کر اس کی باتیں سن کر خواہشات کی چٹک اس کی آنکھوں میں ابھر آئی۔ وہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھی۔ چٹکار کمرے کو اندر سے بند کر دیا۔ اس نے حکم دیا تو کھٹک پیدا ہوئی اور چٹکی کمرے کے اندر سے خود ہی چڑھ گئی۔ اب شکستہا نے زوردار چٹکار مادی اسے اپنا جسم سکڑتے ہوئے محسوس ہوا اور اگلے ہی لمحے وہ شیش ٹاگن بن چکی تھی۔ شیش ٹاگن بننے ہی مارے خوشی کے وہ کمرے میں گھومنے لگی اور پھر دوسری بار چٹکار کے ساتھ ہی وہ چند لمحوں پہلے والے عام سے لباس کی شکستہا بن گئی لیکن اس کا جسم اب ٹھیک ہو چکا تھا اور وہ جل پھر سکتی تھی۔ شکستہا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔
 "اوئے بد شکلے۔" شکستہا چپک کر بولی۔ "جی مالکن! چٹکار کی مستانی آواز ابھری۔"

"تو تو بڑے کام کی چیز ہے۔ آج تو نے میرے جیون میں پھر سے خوشیاں بھری ہیں رے!" شکستہا نے آگے بڑھ کر چٹکار کے کراہت آمیز وجود کو ہانپوں میں سینٹنا چاہا، لیکن یہ کیا؟ شکستہا کی باتیں ہوا میں لہرا کر رہ گئیں اور چٹکار کے جسم سے آ رہا ہونے لگیں! ہائیں..... "شکستہا! حیران رہ گئی۔
 "بد شکلے تو تو ہوا کا بنا ہوا ہے۔ تیرا تو کوئی شرعی نہیں" اور چٹکار ایسے ہنسنے لگا جیسے کسی دیکھی میں پتھر کے ٹکڑے ڈال کر ہلائے جائیں تو لن کی کھڑکڑاہٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔
 "شکستہا جی! ہم تو صرف آپ کو ہی نظر آتے ہیں اور ہمارا شرعی تو کالی کی خلتیوں کے ماننے والوں کے پاپ کی سزا سے جہنم لیتا ہے۔"

"اچھا اچھا۔" کو اس نے بد شکل۔ "شکستہا شوخی سے بولی۔ وہ اپنی خلتیوں کے دوبارہ حصول سے کھلی جا رہی تھی۔ اس کا سہا سا خوفزدہ چہرہ جو مسلسل ناکامیوں سے کھلا چکا تھا پھر خوشیوں کی آماجگاہ بننے لگا۔ پھر اچانک سنجیدہ ہو کر بولی۔
 "چٹکار یہ تو بتا کہ گرو زائن اس وقت کہاں ہوگا؟" یہ کہتے ہوئے اس کی زبان میں لرزش نمایاں تھی اگلے وقتوں کے قہس اس کے دل و دماغ پر لہرانے لگے۔

"گرو زائن وہیں ٹھکتے میں ہے، بس اس سے زیادہ مجھے بتانے کی اجازت نہیں ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ ابھی آپ کچھ عرصہ اس علاقے سے باہر جانے کا دھارمن ہے کھر بیج دیں!"

"سامری جی کے بارے میں کچھ بتا سکتا ہے؟" شکستہا کا دل ابھی تک دھک دھک کر رہا تھا۔
 "سے کے گرو اب میں پھنس کر منٹس تمسن گھیری بن جاتا ہے مالکن، وقت کی لہریں ہو سکتا ہے کبھی سامری کو آپ کے ساحل پر لایا بیٹھیں آپ کے لیے سینی کافی ہے کہ آپ کی خلتیاں آپ کو دلہن مل چکی ہیں۔"
 "ٹھک ٹھک۔" باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکایا۔ شکستہا چٹک گئی اور چٹکار کو دیکھنے لگی۔ تو چٹکار مسکراتے ہوئے ہوا۔
 "مالکن فکر نہ کریں آپ کے سوانہ تو میں کسی کو نظر آتا ہوں اور نہ کوئی میری آواز سن سکتا ہے، زور سے بولیں کہ دروازہ کھلا ہے۔"

"کون ہے بھئی آ جاؤ دروازہ تو کھلا ہے!"

ان الفاظ کے ساتھ ہی دروازے کی کنڈی خود بخود بغیر کسی آواز کے کھل گئی اور باہر سے کسی نے ہلکا سا زور دیا تو دروازہ کھل گیا۔ آنے والی سندری تھی!

"تم کس سے باتیں کر رہی تھیں دیدی؟" سندری حیرانگی سے بولی۔

"اے آپ سے۔" شکستہا نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

شکستہا نے سندری اور اس کے گھر والوں کو اپنی فریضی آپ بیتی سنائی ہوئی تھی کہ وہ اپنے پتی کے ساتھ کہیں جا رہی تھی

کہ راہزنوں نے انہیں لوٹ لیا اور پھر اس کی عزت لوٹنے کی کوشش کی مزاحمت پر اسے آگ لگا دی اور فرار ہو گئے اور اس نے بڑی مشکل سے آگ بجھائی اور اب تم لوگوں کی سہانگیا سے کچھ ملنے پھرنے کے قابل ہو رہی ہوں!

"کیوں ہر وقت جیتی یادوں کو یاد کر کے اپنا جی جلاتی ہو دیدی تم کوئی فیر تھوڑی ہیں۔ اب تم یہیں رہ جاؤ میں نے تمہارے لیے ایک رشتہ دیکھ رکھا ہے۔" سندری مسکراتے ہوئے بولی

"نہیں سندری اب مجھے وداع نہیں کرنا۔ اگر تم لوگوں کو بوجھ لگی تو کسی سندری داسی بن کر جیون تھادوں گی۔" گلستا سر ہلا کر رہ گئی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں بوجھ کیوں لگی ہو دیدی۔" سندری نے آگے بڑھ کر گلستا کو بانہوں کی دادی میں قید کر لیا۔

☆.....☆

رات آدمی سے زیادہ بھیگ چکی تھی! چاروں طرف اندھیرے کا راج تھا۔ سندری بھی نیند کے طرے لوٹ رہی تھی۔ گلستا کھلی آنکھوں سے بلی چست کی کڑیاں گن رہی تھی!

"مالکین آئے چلیں۔" اچانک چٹکاری آواز ابھری تو گلستا نے گردن موڑی۔

"کہاں؟"

آپ کئی دنوں سے چاسی ہیں چٹکار پر اسرار انداز میں مسکرا رہی ہیں۔" میں نے سوچا کہ آپ کے تن اور من کو میرا ب کر دوں۔" گلستا مسکراتے لگی اور پھر سندری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ اس کو بے ہوش کر دیتے ہیں تاکہ اس کی آنکھ نہ کھلے۔" اور پھر تھوڑی دیر بعد سندری بے ہوش ہو گئی۔ چٹکار اور گلستا باہر نکل گئے۔

☆.....☆

"دیدی۔ دیدی۔" سندری دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور روپ سے گلستا کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گئی! اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور سینہ دھڑکنے کی مانند پھول جھلک رہا تھا۔

"کچھ سنا تم نے دیدی آج گاؤں کے کھیتوں سے ٹیکسٹر کی لاش ملی ہے۔ اس کا خون کسی چڑیل نے پی لیا ہے؟" سندری خوف زدہ تھی اس کی بات سن کر گلستا نے احتجاجی مصحوبیت سے بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

"کون ٹیکسٹر؟ کیا ہوا اس کو مجھے بھی بتاؤ؟"

"چوڑا چٹکا جوان تھا شہر میں پڑھ رہا تھا رات کو وہ گاؤں چھٹی پر آ رہا تھا کہ زمیندار کلیان کے کھیتوں کے قریب کسی پھسل چیری نے اس کی شہد گ کاٹ کر اس کا خون پی لیا۔"

"اچھا.....؟" گلستا نے آنکھوں کو پھیلا کر مصحوبی حیرت سے کہا اور پھر وہ خاصی دیر تک چڑیلوں اور بھوتوں کی باتیں کرتی رہیں۔

☆.....☆

"میرا نام کروڈیا ہے اسانپ کے بل پرناک رکھ کر سانس کھینچوں تو سانپ باہر آ جائے سارا جیون سانپوں سے کھیتے گزارا ہے! شیش ناگ کے منکے جمع کرنا، کروڈیا ناگ کو کچا کھا جانا اور سو سال کی عمر کو بچھ کر انسانی روپ اختیار کر لینے والے کسی سانپ کی تلاش میرے من بھاتے کھا جے ہیں۔"

یہ ایک چھوٹے قد کا کنزور اور جی سا سپیراجو کی تھا۔ زرد رنگ کا چھٹلے میں حنوا شدہ سانپوں کی مالا اور ماتھے پر کنڈل ناگ کا چھوٹا سا نشان کانوں میں سانپوں کی شکل کی بالیاں پہنے اور لٹے ہاتھ میں شیش ناگ کی شبہت والا عصا جس کے سہارے وہ چلتا تھا۔ تمام دکھا تھا سر کے بال کھنڈ اور چاندی کی طرح سفید عمر صدی سے اوپر لیکن آواز کڑک دار اور جال میں جستی نوجوانوں جیسی۔۔۔۔۔

"جوگی بابا تم تو انسانی روپ میں آ جانے والے کسی سانپ کی تلاش میں بھری بن کر جنگلوں میں جانے والے تھے لیکن کنزور ماڈل میں ہی ڈیرے ڈال لیے ہیں ابھی تو پہلا ہی پڑاؤ ہے۔ لیکن آج کئی دن ہو گئے ہیں تم کس سے کس نہیں ہو رہے ہو۔" کروڈیا کا چیلہ جو سولہ سترہ سال کا خوب صورت لونڈا تھا! کروڈیا کی منگی چالی کرتے ہوئے گویا ہوا۔

”کروٹیا جو دیکھ سکتا ہے عام آنکھ نہیں دیکھ سکتی، لوٹڈے بچ تم وہ محسوس نہیں کر سکتے جو کروٹیا سوگند رہا ہے اچھے اپنے آس پاس دائیں بائیں ناگوں کی ملک کی بو آ رہی ہے امیری منزل تو یہی گاؤں ملتا ہے!“

دونوں اس وقت قصب کی اکلوتی سرائے رام چند کے ایک بوسیدہ کمرے میں بیٹھے تھے اور چپلا گردے سر کی مالش کر رہا تھا۔ دونوں سات دن پہلے اپنے سفر پر نکلے تھے اور ایک قافلے کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ قافلہ ایک دن کھڑا ڈنڈ میں قیام کے بعد آگے چل پڑا لیکن کروٹیا استاد اپنے چیلے کے ساتھ یہیں ٹھہر گیا تھا۔ کروٹیا غضب کا سہیرا تھا۔ سارا جیون سانپوں سے کھیلتے گزارا، زہریلے سے زہریلا سانپ بھی اس کے ہاتھوں میں آتے ہی رہی بن جاتا تھا۔ اس وقت بھی کمرے کے ایک کونے میں دھکی بین پٹاریوں سے سانپوں کے شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

”جالوٹڈے سرائے کی رسولی سے قبوہ بنوا کے لا۔“ کروٹیا استاد نے اپنے لوٹڈے کو حکم دیا اور لوٹڈا اس کے سر پر مالش کے تیز تیز دو چار ہاتھ مار کے بوسیدہ سے کپڑے کے ساتھ ہاتھ پونچھتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا! تھوڑی ہی دیر میں لوٹڈا قبوہ کی چٹنگ اور دو پیالیاں اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ کروٹیا استاد اپنی تھوٹھنی اٹھائے چاروں طرف گھوم گھوم کر کچھ سوگند کی کوشش میں مصروف تھا۔

”کیا ہوا استاد۔“ لوٹڈے نے چٹنگ اور پیالیاں زمین پر رکھتے ہوئے پوچھا۔
 کروٹیا اپنی منزل کے بہت قریب آ پہنچا ہے پتر کروٹیا مشرق کی طرف سے کچھ سوگندتے ہوئے بولا۔

”چل آ میرے ساتھ۔“ وہ اپنی بین اور چٹاری اٹھاتے ہوئے بولا۔
 ”استاد قبوہ تو لی لے۔“ لوٹڈے نے قبوہ پیالی میں اٹھ بیچے ہوئے کہا۔

”بھائو میں کیا قبوہ.....“ کروٹیا نے ات مار کر چٹنگ زمین پر گراتے ہوئے کہا! ”جلدی کر گیا وقت ہاتھ نہیں آتا سانپ نکل گیا تو لیکر پینے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ شیش ناگ کی بوسے سے پھری ناگ جلنا شروع ہوگئی ہے اگر کروٹیا نے کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر قدم بڑھائے!“

لوٹڈے نے بھی اپنی بین اور چٹاری اٹھائی اور تیزی سے استاد کے پیچھے لے لے ڈگ بھرتا ہوا پکا۔

.....

کھیا کے ہاں رہتے ہوئے دلاور کو ایک ماہ بیت چکا تھا۔ دلاور کے لیے سید روپ نہایت اذیت ناک تھا۔ کھیا اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ مگر تو وہ اس کی زرخیز لوٹڈی مگر کھیا کی داشتہ خاص ہونے کی بناء پر اسے کوئی کام نہ کرنا پڑتا۔ ذرق برق لباس میں وہ تمام دن حویلی میں بھرتا اور سر شام کھیا اس کو اپنی خواب گاہ میں لے جاتا اور پھر اس کا جان لیوا سفر شروع ہو جاتا۔ دلاور نے کئی بار خود کشی کر لینے کا سوچا لیکن حرام موت مرنے کو وہ تیار نہ تھا اور اسے قدرت کی آزمائش جان کر دل مسوس کر رہ جاتا۔

اس نے جان لیا تھا کہ ساواھو کوٹھاری اس کی سوچوں سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ اس عرصے میں دلاور کی ساری اکڑنوں نکل گئی اور وہ دعا کرنے لگا کہ کوٹھاری کہیں سے آ جائے اور وہ اس کی بات مان لے تاکہ اس جان لیوا بیماری سے جان چھوٹے۔ ایک رات جانے کون سا وقت تھا کہ کمرے میں ٹگنے والی ایک ضرب سے ہلبلا کر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔ اتنی دیر میں ایک اور ضرب اس کے پہلو پر پڑی اور اسے اپنے اور گرد چند سیاحی نظر آئے جنہوں نے کمر میں تلواریں لٹکا رکھی تھیں اور ہاتھوں میں ڈنڈے تمام رکھے تھے۔ یہ سب دلاور کے گردوائے میں گھڑے تھے اور دلاور کی سرنگ کے کنارے راہ گزر پر سو یا ہوا تھا۔

”اجیت سنگھ ڈاکو.....“ ایک لہکا رجوان کا افسر معلوم ہوتا تھا۔ مونچھوں کو ناؤ دیتے ہوئے بولا۔ ”میلے میلے روپ میں رہ کر لور داڑھی بڑھا کر تم کیا سمجھتے ہو کہ سرکار کو دھوکہ دے سکو گے! امیت راج نے تجھے پاتال سے نکال کر کوٹوال کے سامنے پیش کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔

”چل لاؤ اٹھ.....“ امیت راج ہاتھ میں پکڑی لٹھی زور سے اس کی ناگوں پر مارتے ہوئے بولا۔ جس سے دلاور بھر بھلا اٹھا۔ ایک لمحے میں اسے ساری صورتحال سمجھ میں آ گئی کہ کوٹھاری نے اسے پھر ایک نیا روپ دے دیا ہے اور اس

بارہ سے کسی مشہور ڈاکو کی شکل دے کر سینا کے ہاتھوں گرفتار بھی کر دیا ہے۔
 سپاہیوں نے پل بھر میں اسے کھڑا کر کے اس کے ہاتھ پشت پر لے جا کر مضبوطی سے کس دیے اور گلے میں چڑے گا
 پٹے ڈال دیا جس کے ساتھ مضبوط دسی بندی بھی ایک سپاہی نے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کی رسی تمام لی اور پانی اپنے
 گھوڑوں پر اس کے پیچھے چل پڑے۔ افسر ڈاکو کو گرفتار کرنے پر بڑا خوش تھا اور بار بار طنز یہ مسکراہٹ کے ساتھ مونچھوں کو
 بل دے رہا تھا اور ہاتھ میں کچڑی چھڑی وقفے وقفے سے غلیظ گالی دے کر دلاور کی پشت پر برساتا رہا۔
 دلاور اس اجانک انقلاب سے خوفزدہ ہو چکا تھا ان سرکاری اہلکاروں نے سے یقیناً کسی ڈاکو کی غلط فہمی میں گرفتار کیا تھا اس نے
 بہت منت مہجرت کی کہ میں امت سنگھ نہیں ہوں بلکہ نہ ہی ڈاکو ہوں مگر اس کی فریاد بھار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہو رہی تھی۔
 امت راج اس کو کوتوال لے گیا اور ایک اندھیری کوٹھڑی میں لے جا کر ستون کے ساتھ باندھ دیا اور سلاخوں والے
 دروازوں پر تالا ڈال کر تمام سپاہیوں سمیت باہر نکل گیا۔ دلاور کی خوف سے منگی بندھ چکی تھی اسے پورا یقین تھا کہ کوٹھاری
 اسے ذلالت کی حد تک زنج لاور ڈال دخوا کرنا چاہتا ہے۔ ایک عرصہ اس نے دلاور کو خوب صورت داشتہ کے روپ میں
 شرمسار کیا اور اب ایک ڈاکو کے روپ میں گرفتار کر دیا اس کی چھڑی بوجھنا چاہتا تھا تاکہ دلاور کو اپنی شکستوں سے مرعوب
 کر سکے۔ دلاور ابھی انہی سوچوں میں گم تھا کہ اسے بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی اور پھر بھلا کھنسنے کی آواز آئی۔
 ”دیکھیں جناب عالی علاقے کا مشہور ڈاکو امت سنگھ جس نے عوام ہمارے حکومت کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں کو امت
 راج نے کس طرح بے بس کر رکھا ہے۔“

امت راج کچھ بڑے افسران کے ساتھ آیا تھا تاکہ اپنی فرض شہری اور بھادوی کا سکے جاسکے۔
 ”اے ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے بتا دو تاکہ ہم ہاتھ نرم رکھیں۔ ورنہ میں کوئی لحاظ کیے بغیر ہڈیوں پر سے
 کھال علیحدہ کر دوں گا۔“

”ایک بار جب افسر نے دلاور کی گردن تاپتے ہوئے کہا تو دلاور کا دل اچھل کر مطلق میں آ گیا۔ وہ بھلا کس کا
 نام اور ٹھکانہ بتاتا، لہذا اسے اپنی کھال اترنے کا یقین ہو گیا اور وہ دل ہی دل میں اللہ سے دعا کرنے لگا کہ اب کوئی
 مجھ نہ ہی اسے بچا سکتا تھا، لیکن مجھ نہ ہوا اور تھوڑی سی پوچھ گچھ کے بعد اس افسر نے ایک سپاہی کو خدمت کرنے کا
 اشارہ کیا اور ستون سے بندھے دلاور پر پتلی چھڑی بوجھنا شروع ہو گئی۔ دلاور کی چھٹیں کوٹھڑی میں گونجنے لگیں۔ وہ
 مرغ بھل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ خاصی ٹھکانی کے بعد افسر نے سپاہی کو کہنے کا اشارہ کیا اور پھر حکم دیا کہ اس کی
 رسیاں کھول دی جائیں اور پھر اس نے ایک قد آدم بنجرہ منگوا دیا اور دلاور کو اس میں قید کر کے باہر موٹا تالا لگا دیا
 گیا۔ اب چند سپاہیوں کی مدد سے بنجرہ کوتوالی نے کھن میں پانی کے حوض کے اندر رکھ دیا۔ پانی جیسے ہی دلاور کے
 جسم تک پہنچا تو سردی کی ایک جان لیوا اس کے جسم میں سرایت کر گئی، کیوں کہ پانی بے حد خشک تھا۔

حوض کے باہر چند سپاہیوں کا پہرہ لگا دیا گیا اور پھر تمام افراد اور امت راج وہاں سے دور ایک کمرے میں
 آ کر بیٹھ گئے اور دلاور کو یوں محسوس ہوا تھا کہ اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے، کیوں کہ پانی رگوں میں اس کا
 خون جمائے جا رہا تھا۔ دلاور سردی سے نیلا پڑنا شروع ہو گیا اور پھر وہ ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔

☆.....☆

جسم کو گرمی پہنچی تو دلاور کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ دیر وہ خالی ذہن اور خالی نظروں سے چمت کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کو
 تمام واقعات یاد آنے لگے تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا دیکھتا ہے کہ نہ پانی ہے اور نہ زنداں بلکہ وہ ایک کشادہ کمرے میں
 چنگ پر لیٹا ہے کمرہ نیم تاریک اور خوشگوار صحت دے رہا تھا۔ دلاور نے سر گھما کر دیکھا تو کمرے میں ایک طرف آتشدان
 تھا جس میں آگ جل رہی تھی۔ لکڑیاں چٹختے کی آواز کمرے کے نیم تاریک ماحول کو پراسرار بنا رہی تھی۔ اچانک دلاور کو
 احساس ہوا کہ کمرے میں اس کے علاوہ بھی کوئی ذی روح موجود ہے۔ اس نے تیزی سے ادھر ادھر دیکھا تو اسے ایک
 آرام کر سی دکھائی دی جس پر آدمی نیم دراز ہو کر جھولے لیٹا رہتا ہے۔ یہ کرسی آہستہ آہستہ آگے پیچھے ہل رہی تھی۔ پھر

اسے کسی کے سانسوں کی آواز محسوس ہوئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کرسی پر کوئی نادیدہ انسان بیٹھا ہوا ہے، یہ احساس ابھرتے ہی دلاور کا دروازہ کھڑا ہو گیا اور وہ خوف سے ہولے ہولے لرزنے لگا۔

"کون ہے۔۔۔۔۔" دلاور کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔

"گھبراؤ نہیں پت۔ میں ہوں کوٹھاری۔" اور پھر کوٹھاری کا منہ دوسری طرف پڑا۔

سے ظہور میں آنے کا یہ پراسرار منظر دلاور کے ماتھے پر قطرے لے آیا۔

"شکر کر۔۔۔۔۔ تجھے شہدے پانی سے نکال کر لے آیا ہوں اور شاب تک تو جم چکا ہوتا۔"

"کیوں لے آئے ہو مجھے کسی نئی بریٹانی سے دو چار کرنے کے لیے۔۔۔۔۔ مر جانے دیا ہوتا مجھے۔" دلاور پھٹ پڑا۔

تو خوشی کی تلاش میں ڈکھ کے صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے پاگل ہو جاؤں گا۔ مجھے موت کی پانہوں میں ایک ہی پارہا جانے دو

کوٹھاری میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں دلاور رو پڑا۔ اس کا تو نا جسم حالات کی بھٹی میں کونکے بنا شروع ہو گیا تھا۔

کوٹھاری نہ چاہے تو موت بھی تجھے نہ آئے گی اور کوٹھاری کی مرضی ہو تو خوشیاں خود تجھے تلاش کریں گی!

"نت۔۔۔۔۔ تم کیا چاہتے ہو؟" دلاور لگا ہنس بھکا کر بے بسی سے ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے بولا۔

"کام میں نے تجھے بتایا ہوا ہے۔ کوٹھاری آنکھیں دلاور کے چہرے پر گاڑ کر معنی خیز انداز میں بولا۔

"پراس سے تجھے کیا فائدہ ہوگا؟"

"مجھے" کوٹھاری ہنسنے ہوئے بولا۔ ایک جن میرے قبضے میں آ جائے گا اور میرے تمام کام پل بھر میں کر دیا کرے گا اور وہی

جن میرے قبضے میں آئے گا جو میرے محل کے وقت میرے قریب ترین ہوگا اور تو بھی پھر کوٹھاری کا چیلہ بن کر پیش کرے گا۔

☆.....☆

پر یہ رات کے وقت اپنی بگاہ میں موجود تھی کہ ایک کینئر نے داخل ہو کر حشر ان کی آمد کی اطلاع دی۔ تھوڑی ہی دیر میں

حشر ان مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا اور تمام غلاموں کینئروں کو نظر انداز کرتے ہوئے پر یہ نے گلے کر اس کا استقبال کیا۔

"آؤ حشر ان بیٹھو۔ شکستہ جی کے بعد تم ہی میرا واحد سہارا ہو۔"

"شکستہ کے بارے میں ہی ایک خبر لایا ہوں پر یہ رانی۔"

"تخلیہ۔۔۔۔۔" پر یہ نے تالی بجا کر کہا تو تمام غلام بھر کینئریں تیزی سے باہر نکلی چلی گئیں۔

"اب بتاؤ۔۔۔۔۔" پر یہ سرک کر حشر ان کے قریب ہو کر اس کا ہاتھ پیار سے ہاتھوں میں لے کر مٹی ہوئی بولی۔

"شکستہ دیوی یہاں سے ہزاروں گونس دور، پنجاب کے شہر لکھیلا کے ایک گاؤں کھڑاؤنڈ میں ہے! اسے ناگ دیوتا

کی جانب سے سند نہیں ہے کہ وہ کچھ عرصہ گاؤں کی حدود سے باہر نکلی تو اس کے جیون کو سخت خطرہ ہوگا۔"

"تم اس سے ملے ہو۔" پر یہ کواٹی حشر ان کا خطرہ تھا۔

"میں اس گاؤں تک گیا ہوں۔ مگر باوجود اپنی شکستوں کے میں گاؤں کی حدود کے اندر داخل نہیں ہو سکتا ہوں۔ وہاں

جا کر میں بے بس ہو گیا تھا اور اس بات کی کوئی وجہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہے البتہ ہمارے قلعہ داروں نے بتایا ہے کہ لکھیلا ناگوں

کو پوجنے والی سرزمین ہے وہاں نادیدہ مخلوق نہیں جاسکتی۔

"تو پھر انتظار کرنا ہے۔ حشر ان ہمیں انہی کسی شہ گھڑی کا۔" پر یہ اپنی مسرت چھپاتے ہوئے بولی۔

☆.....☆

پر یہ حشر ان اور بلگرام دونوں کی حد سے حکومت کر رہی تھی اور دونوں کو خوش رکھتی تھی! شکستہ پر مصائب کی خبریں اس

کے لیے خوشی کا پیغام تھیں اسے یقین ہو گیا تھا کہ بری طرح پھنس چکی ہے اور اس کے لیے جلدی جلدی تاپنا ناہی کے

امکانات نہیں ہیں لہذا پر یہ اقتدار پر اپنی گرفت روز بروز مضبوط سے مضبوط کرتی جا رہی تھی!

اپنی مرضی کے سچے آدنی مختلف عہدوں پر مقرر کر رہی تھی جو اس سے ڈرتے ہوں اور اس کے وقار بھی ہوں۔

سرکاری عہدوں پر جلدی جلدی تاج لے کر نکلتی بھرتیاں کرتی تاکہ کوئی شخص زیادہ اختیار والا نہ ہو۔ محل کے اندر تمام سپاہی اور

فوجی بلکاروں کو نکال کر نئے تعینات کئے گئے۔ نئی منڈیوں اور تاجروں سے سوکے قریب کینٹریں اور محل کی ضرورت کے مطابق غلام خرید کر محل کے ایک بہت بڑے اور الگ تھلگ کمرے میں جمع کر لیے گئے۔ انہیں دو دن تک مکمل بھوکا پیاسا رکھا گیا جس سے کئی کنزور بھوک پیاس سے مر گئے۔

پھر ایک دن ان سے کہنے لگی۔ "سنو آج سے تم لوگوں کو میں معاف کرتی ہوں اور تم سب کو لب شادی محل میں رہنا ہوگا اچھے کپڑے اور کھانے کو بہترین چیزیں ملیں گی۔ لیکن اگر کوئی غداری کی یا محل کی کوئی خیر باہر لے جائے گی تو سزا موت ہوگی اور موت بھی تمہیں آہستہ آہستہ تڑپ تڑپ کر ملے گی لہذا محل کے باہر سے آنے والے تمام سرکاری اہلکاروں، مہمانوں یا کسی بھی شخص کے سامنے تم نے زبان نہیں کھولنی اور ہمیشہ سات فرشی سلام اور قدموں کو چھو کر حاضر ہوگا ورنہ تم مجھ سے واقف تو ہو گئے ہو میں جتنی خوب صورت اور معصوم نظر آتی ہوں فطرتاً اس سے بالکل مختلف ہوں تڑپتے انسانی جسم خون کے اڑتے چھپٹے اور موت کی کرناک چھنیں میرے من بھاتے کھاتے ہیں انسانی جان میرے سامنے نالی کے کیڑے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی میرے ہر حکم پر کتے کی طرح دم بلانا ہوگی میرے نزدیک تمہاری وقعت اس سے زیادہ ہے بھی نہیں۔"

☆.....☆

اب پر یہ مکمل طور پر تابانہ کی مطلق العنان ملک بن چکی تھی!

خسکران گھنٹلا کی یاد میں بے حال ہو کر اس کی چلاش میں ایک دن اٹھا تو پھر واپس نہ آیا۔

اس بات کو بھی خاصا وقت ہو گیا تھا۔ پر یہ اب خسکران کو بھی بھولنے لگی تھی!!

خسکران کی عدم موجودگی میں پر یہ جانتی تھی کہ اب کوئی برا سربراہ شکی اس کے ہاتھ میں نہیں۔ لہذا اب تمام تر دام و مدار اس کی اپنی عیاری و چالاکی پر ہے اور اس سلسلے میں دنیا کے کسی شخص و عورت کو قابل اعتبار نہ سمجھتی تھی۔ تابانہ کو اس نے چھوٹی چھوٹی انتظامی تفصیلات میں بانٹ دیا تھا اور ہر حصے پر اپنے نائب کے طور پر ایک ایک عورت مقرر کر دی تھی، جو راجہ کاری کہلاتی تھی! کیوں کہ اس کے خیال میں مرد تعلقات عقل اور جسمانی طاقت میں عورت سے بہتر ہوتے ہیں۔ لہذا اس نے اپنی ریاست میں مردوں کو کپلے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اسے پتا تھا کہ یہ کام آہستہ آہستہ کرنا ہے انا کہ مردوں کو ہوش آئے تو وہ دوسرے درجے کی مخلوق بن چکے ہیں۔

اس مقصد کے لیے اس نے شاہی دربار کے ساتھ ساتھ دیگر محکموں میں بھی ایک ایک کر کے مردوں کو ہٹا کر عورتیں آگے لانا شروع کر دیں، پھر کچھ عرصے بعد ہر لڑکی کے لیے فوجی تربیت لازمی کر دی اس سے یہ فائدہ ہوا کہ حرب و ضرب کے شعبہ میں بھی خواتین کو عہدے ملنے لگے۔ آہستہ آہستہ پوری ریاست تابانہ میں، ہر کلیدی عہدے پر بوڑھی جوالن اور نو عمر خواتین کا قبضہ ہو چکا تھا شاہی دربار میں بھی مرد خال خال ہی رہ گئے تھے، جن میں بلگرام نمایاں تھا۔ بلگرام بھی اس تبدیلی پر چونکے بغیر نہ رہ سکا اور ایک دن ملکہ عالیہ کے کمرہ خاص میں آیا تو بولا۔

"ملکہ عالیہ..... دربار میں عورتیں بہت زیادہ ہیں، کیا یہ مناسب ہے؟" اس کا یہ سوال پر یہ کوچھتا ہوا محسوس ہوا۔

"بلگرام جب تک گھنٹلا جی نہیں آجاتیں میں ملکہ ہوں اور یہ بات میرے دائرہ اختیار میں آتی ہے۔" پر یہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

"جی بہتر....." بلگرام مزید کچھ نہ بول سکا۔

لیکن پر یہ نے سوچ لیا کہ بلگرام کسی بھی وقت خطرہ بن سکتا ہے اس کو اب راستے سے ہٹائی دینا چاہیے اور اس بات میں دیر کرنا پر یہ نے مناسب نہ جانا اور اسی رات کو اپنے لہارے پر عمل کر ڈالا۔

رات کو خفیہ طور پر بلگرام کو خواب گاہ میں بلا بھیجا۔ بلگرام خوش خوشی چلا آیا۔ پر یہ نے اسے بے ہوشی ملی دوا پلا کر اس کو بے ہوش کر دیا۔ بلگرام پر دھان مستری کے ساتھ سہ سالہ لڑکی بھی تھا۔ لہذا پر یہ نے فوجی بغاوت کے خوف سے فوجیوں کے بجائے ایک کثیر اور غلام کی عدد سے اس کی مشکلیں کسوا کر ایک تہہ خانے میں جبر سے کے اندر بند کر دیا۔

اور دوسرے دن بلگرام کی گمشدگی کا اعلان کر دیا گیا جبکہ صبح سویرے غلام اور کنیز کو بلا کر ایک بٹے کے جیٹی جلاو کے ہاتھوں ان کا گلا گھونٹ کر مروا دیا۔

اور اسی دو سہرے دو بار میں جیٹی غلام پر عظیم الزام عائد کر کے فوری طور پر اس کا سر قلم کروا دیا تمام درباری ایسی سزائیں روزانہ دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے! اگلی دنوں تک بلگرام کا کسی کو کچھ پتا نہ چلا جبکہ پریدہ روزانہ دربار میں آ کر پہلا سوال ہی یہ کرتی کہ بلگرام کا کچھ پتا چلا؟ اور پھر گرد و لوح میں اس کی تلاش کے لیے ہر کارے دوڑاتی، اس سے وہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ بلگرام کے لیے نفی پریشان ہے! اس دوران بلگرام تہہ خانے میں بھوک اور پیاس کی شدت سے ایڑیاں دگر دگر کر رہی تھی کی موت مارا گیا۔ اس دوران پریتہ خانے میں جا کر بلگرام کی بوجھوڑی لاش دیکھ کر اس کی موت کی تسلی کرتی تھی اور لاش کے اوپر چونا ڈلوایا اور اس کے اوپر والے کمرے کو مضبوط تالے لگا دیے گئے تاکہ وہ اندر ہی گل سر کر قلم ہو جائے اور لاش نکالی بھی جائے تو شناخت ممکن نہ ہو۔

اس تمام عمل پر پریتہ مطمئن اور مسرور تھی۔ اب یہ نسلاً کنیز ایک مضبوط حکمران بن چکی تھی۔ سہ سالہ کا عہدہ اس نے عارضی طور پر اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ تاہم تابانہ کے دس حصوں کے لیے اس نے دس علیحدہ علیحدہ فوجی کمان دار مقرر کر دیے اور یہ تمام برلہ راست پریتہ کے ماتحت تھے! اس کے علاوہ ہر تحصیل میں شاہی فوج کے دستے بھی تھے۔ جو مقامی راجکاری اور فوجی کمانداروں کو جوابدہ نہ تھے۔ بلکہ ان کی راسخیں پریتہ کے ہاتھ میں تھیں! اب پریتہ تابانہ پر اپنے ابلیسی پنجے عمل طور پر گاڑ رہی تھی! ہر تحصیل کو اس طرح بنایا گیا تھا کہ اس کا کچھ حصہ دارالحکومت کو لگتا تھا۔ ان اقدامات کے بعد پریتہ نے ہر تحصیل کا دورہ کرنا شروع کیا اور سبکی تحصیل کی طرف پورے لاؤٹلک کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

☆.....☆

ریت خاصی جا چکی تھی۔ شکستہ چار پائی پریشانی ماضی حال اور مستقبل کے تالے ہانے بین رہی تھی سندری پاس ہی بے خبر سو رہی تھی۔ یہ لڑکی شکستہ کو پسند آتی تھی کیوں کہ یہ شکستہ کی بے غرض خدمت داری کر رہی تھی! شکستہ سوچ رہی تھی کہ یہاں سے جب بھی جاؤں گی۔ سندری کو کوئی ایسا تحفہ دے جاؤں گی، جو اسے مالا مال بھی کر دے اور شکستہ کی یاد بھی دلاتا رہے!

اچانک اسے باہر کھٹکا محسوس ہوا۔

”چنگار۔“ شکستہ نے ہولے سے پکارا۔

”جی مالکین.....؟“

”دیکھو باہر کیا ہے؟“

مالکین چند ساعت روپوشی کے بعد چنگار نے حاضر ہو کر کہا!

سندری کا بھائی سمگن دے پاؤں باہر جا رہا تھا کہ پانی کے گڑے کو اس کے پاؤں کی ٹھوکر لگی ہے۔

”سمگن.....“ شکستہ ازیر لب بولی۔ ”چنگار آؤ دیکھیں یہ کہاں جاتا ہے!“

یہ بدھا کے سٹوپے کی طرف جائے گا۔ جہاں ایک چڑیل خوب صورت لڑکی بن کر اس کو اپنے حسن کے جال میں قید کر چکی ہے اور ہر رات۔ اس سے اپنے جسمانی تقاضے بھی پوری کرتی ہے اور تھوڑا تھوڑا کر کے روز لٹاس کا خون چیتی ہے۔

”لیکن چڑیلیں تو پھسل جی رہی ہوتی ہیں چنگار دیکھا سمگن اس کے پاؤں دیکھ کر بھی ہوشیار نہیں ہوتا۔“

”نہیں، لیکن اس چڑیل نے انتہائی خوب صورت اور بھاری بھر کم دھرتی چھوٹا لباس پہن رکھا ہوتا ہے اور خلوت کے وقت مکمل اندھیرا کر دیتی ہے! جس کی وجہ سے سمگن کچھ سمجھ نہیں پاتا اور وہ اس کی صورت کا غلام بن کر اپنا آپ موت کے حوالے کر رہا ہے۔“

یہ اچھا نہیں اور ہاتھ اس کو چڑیل کے شکنجے سے بچاؤ۔

”نہیں مالکین۔ طاغوتی حکمتوں سے مدد بھیڑ کرنے سے پرہیز کیا کر۔ یہ تمہارے اپنے ہیں۔“

”مگن کے گھر والوں کا مجھ پر بہت احسان ہے چکار۔“ گلستا نے زور دیا۔
 ”لیکن تم تو سانپ ہو، مگن اور سانپ کو جتنا بھی دودھ پلایا جائے چاہے آستین میں پالا جائے وہ تو پھر ڈستا ہے۔“

”تمہیں سندری اور مگن سے ہمدردی کیوں ہے۔“
 ”زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں چکار، میں تمہیں وضاحت پیش کرنے کی پابند نہیں بلکہ تو میرا غلام ہے بدھلے۔“

”پھر تم اکیلے ہی چلی جاؤ مگن تمہاری ہلکیاں اس چڑیل کے لیے کافی ہیں۔“

”ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں۔“ گلستا فیصلہ کن لہجہ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آؤ میں تمہیں بدھا کے سٹوپے تک لے چلوں۔“ یہ کہہ کر چکار نے اُچھل کر گلستا کا ہاتھ پکڑا تو پلک جھپکنے میں منظر تبدیل ہو گیا۔۔۔۔۔ مگن اپنے سے کچھ دور گلستا کو ایک کندھ نما عمارت کی سیڑھیاں چڑھتا دکھائی دیا۔ ”چکار غائب ہو چکا تھا۔“

گلستا گہری سانس لے کر مگن کے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگی! عمارت تک آ کر اس نے چاروں طرف دیکھا تو گھب اندھیرا چھایا تھا۔ تاکن ہونے کے ناطے اسے اندھیرے میں ہر چیز دکھائی دے رہی تھی۔ گواندھیرا اسے بھی محسوس ہوتا تھا

لیکن اتنا نہیں کہ کچھ دکھائی نہ دے۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ مہاتما اور بدھا کے چھوٹے چھوٹے بت دیواروں کی حالت میں بنے تھے کہیں شیر اور کہیں عقاب کی صورتیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ ایک کشادہ راہ راہی تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ انتہائی

خست تھی، جا بجا کڑیوں کے جالے اور گردوغبار سے آبی تھی، گلستا کو مگن کی نظر نہ آئی یا گلستا اس وقت ایک عام سی دیہاتی عورت کے روپ میں تھی۔ درباریوں میں تیزی سے چلتے گی۔ دائیں بائیں کمرے سے بٹے بٹے وہ ہر کمرے میں جھانکتی

لیکن دیرانی اور اندھیرے کے سوا اسے کچھ نظر نہ آتا۔ اچانک ایک کمرے سے اسے لڑکی کی ہلکی سی سنائی دی وہ ٹھٹھک مٹی کمرے کا چونکہ دروازہ نہ تھا۔ لہذا گلستا جیسے ہی دروازے والی جگہ پر آئی حیران رہ گئی۔ یہ کمرہ انتہائی آراستہ و سراسر

تھا۔ قالین، چنگ، کرسیاں سامان اور حد درجہ صفائی دکھائی دی۔ سامنے ہی چنگ پر اسے رو جسم کچا دکھائی دیے۔ چھپا ایک چڑیل اور دوسرا مگن ہے۔ گلستا نے سوچا اور آہستہ سے دروازے سے اندر داخل ہو کر ایک طرف کھڑی ہو گئی!

چڑیل لڑکی کے روپ میں مگن سے معروف تھی۔ اس لیے اس کی نظر گلستا کو نہ دیکھ پائی گلستا کے لیے ایک ایک دلچسپی سے بھرپور منظر تھا۔ اس کے جذبات کا ناگ بھن اٹھانے لگا۔ اس کے جسم کے اندر بے چینی شروع ہوئی لیکن یہ

وقت ہوش کا تھا جوش کا نہیں۔ یہ سوچتے ہی گلستا پر سکون ہوتا چلی گئی۔
 تھوڑی دیر میں مگن بے سدھ ہو گیا اور پھر نیند اس پر چھا گئی تو لڑکی نے سراٹھایا تو گلستا نے دیکھا کہ یہ ایک متناسب

جسم والی خوب صورت دوشیزا کا روپ تھا۔ جو سر ہاتھ پھولوں کا شجر تھی، مگن کو دیوانہ ہوتا ہی چاہیے تھا۔ لیکن جلد ہی اس کا حسن خوفناکیت میں ڈھلنے لگا۔ لڑکی کے ماتھن باہر نکلتے تھے! اس کی خوب صورت سلیقے سے بندھی بالوں کی چوٹی کی گریں

خود بخود کھٹکے لگیں اور تمام بال آسمان کی طرف کھڑے ہو گئے اور ان سے بدبودار محلول گرنے شروع ہو گیا!
 حسین عارض سیاہ سلوٹ دار ہو گئے۔

موتیوں جیسے دانت پلے پڑ گئے اور دو بڑے دانت آگے کو نکل آئے۔ قد بڑھنے لگا اور وہ خون پینے کی نیت سے مگن کی گردن پر جھپکنے لگی۔ گلستا پر اس کی نظرس نہیں پڑی تھیں اور لہذا گلستا کو بھی شاید اسی لمحے کا انتظار تھا۔ کوئی عام عورت

ہوتی تو مارے خوف کے دم توڑ جاتی لیکن گلستا کے لیے یہ سب کچھ ایک معمولی بات تک سے زیادہ نہ تھا۔ اس سے قبل کہ چڑیل اپنے ڈر ٹیکولا نما دانت مگن کی گردن کی آگ پر رکھ دیتی۔ گلستا نے مداخلت کر دی۔

”اس خون میں میرا حصہ بھی تو ہونا چاہیے“ مگن بھری دیدی۔“ گلستا نے خود کو پر سکون دساکت رکھتے ہوئے کہا تو چڑیل بری طرح چوکی اور پھر جیسے ہی اس کی نظر گلستا پر پڑی تو اس نے ایک ٹلک شکاف چھ بلند کی اور پھر اس کے پاؤں

زمین سے اٹھ گئے اور وہ اڑتی ہوئی گلستا کی طرف آئی تو گلستا نے کالی دیوی کا شبہ جاپ پڑھ کر فوراً اس کی طرف پھوٹک ماری تو چڑیل کو آگ لگ گئی اور وہ بری طرح ترے گئی۔ اس کے ترے پنے سے ایک ڈنڈل برپا ہو گیا لیکن یہ سب کچھ عارضی لمحات تھے اور تھوڑی ہی دیر بعد فرش پر چڑیل کے جلتے ہوئے اعضاء سے دھواں نکلتے کے سوا کچھ نہ بچا۔

شکستہ کا من جھوم رہا تھا سوچنے لگی کہ ابھی میرا دور ختم نہیں ہوا ابھی میری ہلکیاں لامحدود ہیں، ناگ دیوتا اور کالی دیوی مجھے پھر عروج دیں گے۔ کیا ہوا جو میں عارضی طور پر روپوش ہونے پر مجبور ہوئی ہوں یہ سوچتے سوچتے اس کی نظر سنگن پر پڑی جو کسمسا رہا تھا جنرل کی چیخوں سے اس کی آنکھ نہ کھلی تھی۔ وہ چیخیں شاید صرف شکستہ نے سنی تھیں! شکستہ کا جی خون کے لیے پھر لپکانے لگا لیکن یہ مجھ پر احسان کرنے والے کنبہ کا فرد ہے اس کے اندر آواز ابھری لیکن سنگن کی شہ رگ اور موتی گردن کے اندر خون کا سمندر بھی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ خون انسانی خون، خون کا خیال آتے ہی شکستہ کی انسانیت ناگن کا لہا وہ اڑھنے لگی، جواں مرد کی قربت کا لذت آمیز تصور اور انسانی خون سے پیاس بجھانے کا مسود کن خیال دل میں سجائے شکستہ کے قدم بے خودی سے فرش پر آڑے ترچھے پڑتے ہوئے۔ سنگن کی سمت بڑھنے لگے کہ رات کے اس سٹائے میں شکستہ کو کہیں دور سے بین کی سریلی آواز سنائی دی آواز سن کر وہ ایک لمحے کو ہلکی لیکن پھر سنگن کی طرف بڑھنے لگی سنگن کی کسمساٹ اب تیز ہو چکی تھی شکستہ چنگ کے قریب پہنچ کر رک گئی اور سنگن کو شہوت انگیز لگا ہوں سے ٹکٹنے لگی بین کی آواز قہر سے نمایاں ہو گئی، جسے سن کر شکستہ کا خیال پھر بڑکا لیکن اب بھی اس نے زیادہ توجہ نہ دی اور اپنا لہا وہ الگ کرنے لگی تھوڑی سی دیر میں وہ کیف و سرور کی وادیوں میں اٹھکیاں کھینے لگی، سنگن اب پوری طرح ہوش میں آ کر شکستہ کو پہچان چکا تھا تھوڑا جھجکا لیکن شکستہ کے حسن اور شیب و فرازا اور وارسی نے اس کے سوچنے بکھینے کی صلاحیت مفلوج کر دی اور وہ ٹھٹھٹے کھلتے کھلتا گیا۔ اب شکستہ کو وہ حیرانی سے تھے جا رہا تھا، لیکن شکستہ اب آہستگی سے اس کی شہ رگ کی طرف جھٹکے جا رہی تھی کہ اچانک شکستہ پر بد ہوشی چھانے لگی اس کے حواس کم ہورہے تھے اس نے زور سے سر جھٹکا لیکن بین کی حیرت آواز اور سریلی لے اس کے حواس کم کر رہی تھی اب شکستہ کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی تیزی سے بج اٹھی وہ سنگن کی شہ رگ کو بھول گئی اسے احساس ہو گیا کہ کوئی بے پناہ مہارت رکھنے والا سپر ایمن بجا کر اس کے ہوش گنوا دینا چاہتا ہے وہ تیزی سے کھڑی ہو گئی۔

”تم فوراً گھر چلے جاؤ سنگن، شکستہ سیٹ لےجے میں بولی۔“
 ”پرنتو تم یہاں کیسے چنچیں شکستہ!“ سنگن کو اب یاد آیا کہ یہ گھر سے اس جگہ کیسے آ گئی؟
 ”کی الجال اس طرف دیکھو“ شکستہ نے پڑیل کا جلا ہوا ڈھانچا سے دکھایا۔ ”یہ کیا ہے۔“ سنگن حیرانی سے بولا۔
 ”یہ وہ ٹھٹھٹے پیری ہے جو تمہارا خون چوس رہی تھی اور تم نو جوان حسینہ مجھ کر ہر شب ان کھنڈروں میں اس سے خلوت کرتے تھے۔“

”ہیں؟ لیکن؟ مگر؟“
 ”اگر مگر لیکن لیکن چونکہ چنانچہ کی باتیں چھوڑو اور فوراً یہاں سے گھر چلے جاؤ۔ باتیں میں تمہیں وہیں بتاؤں گی۔“
 ”تم بھی میرے ساتھ چلو، ایسا کیسے آدمی رات کو گھر جاؤ گی!“
 ”جیسے یہاں پہنچ گئی ہوں ویسے ہی گھر بھی آ جاؤں گی۔“
 یہ کہہ کر شکستہ دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل کر کھنڈرات کی بھول بھلیوں میں کھو گئی۔

☆...☆

کروٹیا مسلسل بین بجا رہا تھا اور چیل اپنی بین کی مدد سے اس کی سنگت میں مصروف تھا وہ پہرے سے آدمی رات کا مکمل شروع ہو چکا تھا اور ان ویران پہاڑیوں کے آس پاس اسے شیش ناگن کی بو محسوس ہو رہی تھی، لیکن اب اس کی بو کی شدت میں زبردست اضافہ ہو چکا تھا۔ کروٹیا کا جوش بھی کامیابی کے ان دیکھے تصور کے سامنے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔
 اب یہ بولے کہیں قریب سے محسوس ہونے لگی اسی اثناء میں کروٹیا کو اپنے دائیں طرف تھوڑی سی دور پہاڑی چوٹی پر بنی کسی عمارت کے کھنڈرات دکھائی دیے اور اس وقت وہ بری طرح چونک پڑا جب اس نے دیکھا کہ سینکڑوں چھوٹے موٹے مختلف نسل کے سانپ ان میڑ میڑوں سے نیچے اتر رہے تھے یہ منظر دیکھ کر کروٹیا کی بین بجا بند ہو گئی جبکہ چیل بدستور دھیس بھیر رہا۔ لیکن گرد کی کسی خاص نکتے پر غوریت کو محسوس کر کے چیل نے گرد کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو اس کے ہاتھوں

کے طوطے اڑ گئے!!

سانپوں کا ایک جم غفیر تھا کہ پہاڑی پر بنی عمارت سے نکل نکل کر نیچے کی طرف آ رہا تھا۔ تو گرد چیلہ کی بولتی بند ہو گئی دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں، دونوں کو ایک دوسرے کی نظروں میں خوف نظر آ گیا، گردن دیا نے ایک دفعہ پھر پہاڑی کی طرف دیکھا تو اسے ان گنت سانپوں کا جلوس پہاڑی پر پھانسی گئی میڑھیوں سے اتر کر اپنی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ اور پھر..... دونوں آہادی کی طرف منہ کر کے سر پٹ بھاگنے لگے۔

☆.....☆

شکستہ کھنڈرات کی بھول بھلیوں میں بدحواس ہو کر بھاگے جا رہی تھی۔ بین کی آواز اس کے اعصاب کو شل کرنے کے درپے تھی۔ وہ بار بار سر کو جھٹک کر اپنے ہوش قائم رکھ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ چٹکار چٹکار کی صدا میں لگا رہی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ کوئی طاقت پھر اس کو زیر کرنا چاہتی ہے! چٹکار ہی وہ واحد شکتی شکستہ کے پاس تھی جو اس مصیبت سے اس کی خلاصی کراتی۔ لیکن چٹکار تو ایسے عائب تھا جیسے برے وقتوں میں دوست غائب ہوتے ہیں۔ اب شکستہ اٹھک چکی تھی۔ وہ ایک جگہ کھڑی ہو گئی ہے۔ یہاں اسے ایک کونے میں مہاتما بدھ کا بت نظر آیا جس کی ناف کی جگہ پر سوراخ تھا۔ قریب ہی سنسکرت میں کوئی مختصر تحریر لکھی تھی۔ شکستہ نے جیسے ہی تحریر پر غائرانہ نگاہ ڈالی تو اپہل پڑی۔ کیوں کہ یہ اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ حالانکہ شکستہ سنسکرت نہ جانتی تھی لکھا تھا کہ اگر آپ من کی مراد پانا چاہتے ہیں تو مہاتما بدھ کے پایٹ پر بیٹے ہوئے سوراخ میں درمیانی انگلی ڈال کر بین کی آواز اور مکتہ مصیبت سے چٹکارے کا خیال من میں لائی تو اسے فوراً ہی اپنے پیروں میں مانوس سرسراہٹ محسوس ہوئی، دیکھا تو یہ ایک بالکل سفید سانپ تھا جو اپنی زبان میں اس سے قاطب تھا۔ شکستہ کے دماغ نے سانپ سے نکلنے والی لہریں وصول کیں وہ کہہ رہا تھا۔

”اے سانپوں کی ملکہ، اے ناگن دیوی..... تو اوش چھانہ کر، یہ کیسیا کی ہستی کھڑاؤ ہے! یہاں ناگوں کو پوجا جاتا ہے تو ناگوں کی دیوی کو کوئی پیاکل کیسے کرے گا تو شانت ہو جا اور عمارت سے نکل کر پہاڑی کی چوٹی تک آنے والی میڑھیوں پر پہنچ کر ناگن دیکھ۔“

شکستہ جب بدھا کے کھنڈرات کی ان میڑھیوں تک پہنچی جو چوٹی سے نیچے تک جا رہی تھیں تو اسے ان میڑھیوں پر ہزاروں سانپ چٹکاریں مارتے نیچے جاتے دکھائی دیے جو پتا نہیں کہاں کہاں سے نکل کر آ رہے تھے۔ جہاں شکستہ کھڑی تھی اس کے پیروں کے دائیں بائیں اور درمیان سے بھی بے حساب سانپ نیچے اتر رہے تھے۔ ادھر شکستہ کو دو پیرے اندھا دھند بھاگتے ہوئے دکھائی دیے!! یہ منظر دیکھ کر شکستہ کے ہونٹوں سے سکراہٹ رینگ گئی۔

☆.....☆

گردن دیا اور اس کا چیلہ شرما باپتے کا بچے سرانے رام چند پنچ گئے اور اپنی کونٹری میں مچھتے ہی فرش پر لیٹ کر تیز تیز سانپیں لینے لگے۔

”شرما پترا! اٹھ کر تمام درزیں اور سوراخ بند کر دو کیس سانپ پیچھے ہی نہ آ جائیں۔“ گردن دیا کی آواز میں لرزش تھی۔

”جوگی بابا تم پیروں کے مہاتما ہو، پھر یہ خوف کیسا۔“ شرما نے لہجہ لہجہ میں کہا۔

”پتر لوئے۔“ گردن دیا جو اپنے حواس پر کافی حد تک قابو پا چکا تھا۔ ”یہ عام سانپ نہیں سانپوں کا بادشاہ ہے۔ جسے میں غلام بنانے جا رہا ہوں گردن دیا کی تپسیا اپنی جگہ لیکن ناگ بادشاہ کی شکتی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ وہ چیز نہیں جسے ہم اگلیوں سے اٹھا کر پٹاری میں بند کر لیں گے! اور ایک بات اوش یاد رکھنا۔ اس ناگ کو قابو کرنے کی کوشش میں جان بھی جاسکتی ہے۔ اگر تم میرا ساتھ چھوڑنا چاہو تو اب بھی سے ہے کہ لوٹ جاؤ۔“

”نہیں جوگی بابا! شرما اس کے چرن چھوتے ہوئے ہوا۔“

"شراب بھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑے گا چاہے اس کوشش میں میری ارتھی اٹھ جائے۔ لیکن بابا ناگ ہارشا کو قابو کرنے کا کیا فائدہ ہے؟"

"فائدہ..... بابا بابا..... ارے پاؤ لے..... انسانی روپ اختیار کرنے والے ناگ عام سانپ نہیں ہوتے، یہ شیش ناگ کی ایک نایاب نسل ہے۔ یہ سانپ ہی ہزاروں کا ہوتا ہے اور اس کا منکا آدمی کو لاکھ بتا ہوا سکتا ہے اور انسانی روپ اختیار کر لینے والا شیش ناگ کروڑوں سانپوں میں کوئی ایک ہوتا ہے جو ہزاروں سال میں ایک آدمی بنتا ہے۔ یہ روپ دھارن ہوتا ہے۔ ہر جاندار کی شکل اختیار کر سکتا ہے! یہ دھرتی کی تہوں میں چھپے خزانوں کا پتہ بتا کر اپنے مالک کو دھرتی کا سب سے امیر آدمی بنا دیتا ہے اور تمام سانپ بھی اس کے غلام ہوتے ہیں۔"

"لیکن گرجی کیا شیش ناگ کے علاوہ کوئی سانپ روپ دھارن نہیں ہو سکتا؟"

"ہاں ایک اور سانپوں کی نسل اچھیا دھاری ناگ کی ہوتی ہے! یہ بھی سو سال کی تپسیا کے بعد روپ دھارن بن جاتا ہے اس نسل کو..... چھتن چھراپ کہا جاتا ہے۔"

"پرنتو آپ کی دھار کے مطابق جس روپ دھارن سانپ کی بو آپ نے محسوس کی ہے یہ شیش ناگ ہے یا اچھیا دھاری؟"

"یہ تو بالکل شیش ناگ کی بو ہے۔ لیکن بزرگوں سے سنا ہے کہ گھڑاؤ ڈھکے کے آس پاس ایک اچھیا دھاری ناگوں کا جوڑا بھی روپ دھارن ہوتا ہے!"

"لیکن جوگی بابا کیا بھی کوئی سپیر ایسے کسی ناگ کو پٹاری کے اندر بند کرنے میں سہمیل ہوا ہے؟"

"ہاں....." کروڈھیا نے اپنی پٹاری سے ایک اچھیا دھاری سانپ جو پتلا اور لمبا تھا کو نکال کر اس پر آنکھیں جم کر کہا۔

"سینہ بہ سینہ سنتے آئے ہیں لیکن ایسا کوئی شخص مجھے نہیں ملا اور نہ ہی ایسے شخص کا قصہ سنانے والے نے کسی ایسے آدمی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ پرنتو..... کروڈھیا نے یہ کام کرنے کی سونگھ کھا رکھی ہے!"

"کروڈھیا استاد شراب تمہارا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔" چیلے نے کوٹھڑی کے کچے فرش پر ناخوش پھرتے ہوئے کہا۔

"پرنتو اب بات آگے کیسے بڑھے گی۔ اچھیا دھاری اور شیش ناگ کے روپ دھارن سانپوں کو کیسے دیکھا جاسکتا ہے اور قابو کرنے کا کوئی خاص نسل بھی ہے جبکہ آج ہماری کوشش میں ہی ہمیں اپنی جان بچانا مشکل ہو گیا ہے۔"

"آج کی بات چھوڑ دو پاؤ لے! اب اماؤں اور پورن ماشی کی بات کرو۔"

"کیوں کہ پورن ماشی کی رات ساچھیا دھاری روپ دھارن سانپوں کی جوڑی انسانی روپ دھار کر چاندنی رات میں اگھیلیاں اور ناگ دیوتا کی پوجا پاٹ کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح شیش ناگ کی کوئی جوڑی اگر روپ دھارن بن چکی ہے تو وہ بھی اماؤں کی کالی رات کسی سانپوں بھرے جنگل کی گلی جگہ پر آ جاتی ہے اور شیش ناگ اپنی مٹی (منکا) اپنے منہ سے نکال کر باہر رکھ دیتا ہے اور اس کی چٹا چوندرونی میں شیش ناگوں کا جوڑا مست ہو کر رقص کرتا ہے۔ صرف یہی دو سہ ہوتے ہیں کہ کوئی ایسا شخص انہیں دیکھ سکتا ہے جس پر سانپ کا زہر اثر نہ کر رہا ہو!!"

"کیوں کہ روپ دھارن کے رقص کے وقت ہزاروں سانپ ان کی رکھشا کر رہے ہوتے ہیں اور وہ ان کے گرد دور دور تک گھیرا ڈال لیتے ہیں۔"

"لیکن کروڈھیا استاد یہ کیونکر ممکن ہے کوئی انسان ان ہزاروں زہریلے سانپوں کے زہر سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو۔"

"ممکن ہے..... لوڈھ ہے..... کروڈھیا کے لیے ممکن ہے۔"

"ہمارے پاس نسل در نسل بزرگوں کا ایک ایسا خزانہ ہے جو ہمیں ہر سانپ اور اس کے زہر سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔"

"خزانہ.....؟" شراب منہ کھول کر بولا۔

"ہاں اسے خزانہ ہی سمجھ لو۔" کروڈھیا معنی خیز انداز میں سر ہلا کر بولا۔

"مختلف نسلوں کے ایک ہزار ایک سانپوں کو مار کر اور پھر انہیں سکھا کر چیں لیا جاتا ہے اور پھر سب سانپوں کا برادہ اچھی طرح ملا کر مٹی کے ایک ٹکے میں ڈال کر..... کسی سیم و تھور و لہلی دھرتی میں گڑھا کھود کر دیا جاتا ہے اور دس سال تک

وہ مٹکا دبا رہے۔ اس عمل سے ایک ایسا سٹوف تیار ہوتا ہے جس میں اگر سمندری مانی ڈال کر کسی ایسے شخص کو دیا جائے جسے زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو تو وہ بندہ بھلا چکا ہو جاتا ہے اور اگر اس میں صحرائی گدھوں کا خون شامل کر کے سٹوف کو جسم پر مل لیا جائے تو ایسی بو انسانی جسم سے نکلتی ہے کہ ہر قسم کا سانپ اس سے دور بھاگتا ہے۔ یہ ایک خزانہ ہی ہے جو ہمارے پاس بزرگوں کی قیسا کا تختہ ہے۔۔۔۔۔

”اس کو کیا کہتے ہیں؟ میرا مطلب ہے اس سٹوف کا نام کیا ہے۔“ شربا جواب اپنے استاد سے خاصا مرعوب ہو چکا تھا ادب سے بولا۔

”اس کو ہم تریاق کہتے ہیں۔“ کر دھڑیا سرسراہی آواز میں بولا اور پھر یکدم چونک پڑا اور بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے چین کی طرف بڑھا۔

☆.....☆

سپیدوں کو بھاگتے دیکھ کر ٹکٹنلا کے دل میں سہائی کہ دیکھوں تو کسی کہ یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے تھے۔ سانپوں کی فوج کو اپنے ساتھ دیکھ کر ٹکٹنلا کا حوصلہ بڑھ چکا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ بے سہارا نہیں جہاں اسے مشکل پیش آئے گی کسی بھی قسم کا سانپ سے مدد حاصل کر لے گی۔ یہ تو علاقہ ہی سانپوں کا تھا۔ یہ سوچتے ہی اس نے ایک عقاب کا روپ دھار اور تیزی سے پرواز کرتی ہوئی مناسب قاصلے سے سپیدوں کا تعاقب کرنے لگی۔ سرائے رام چند میں جب وہ سپیرے داخل ہو گئے تو ٹکٹنلا سانپ بن کر ان کا پیچھا کرتے ہوئے ان کے کمرے کے در و شندان پر جا کر چھپ گئی۔ اس نے دونوں کی پوری گفتگو سنی اور پھر جیسے ہی کر دھڑیا نے چونک کر چین کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ٹکٹنلا سمجھ گئی کہ کر دھڑیا کو اس کی بو آگئی ہے لہذا وہ پھر پانی سے باہر کی طرف اتر گئی اور سیدھی ٹکٹنلا کے گھر پہنچ کر انسانی روپ میں آ گئی۔ گھر میں جب وہ داخل ہوئی تو نوپو پھٹ چکی تھی تمام لوگ ابھی سوئے پڑے تھے لیکن محسن میں چار پائی پر لیٹا جاگ رہا تھا۔ ٹکٹنلا کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک اُبھر آئی۔

ٹکٹنلا پر محسن طاری تھی، وہ محسن سے کوئی بات کہے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ محسن کی خواہش تھی کہ رات کے واقعہ کے بارے میں ٹکٹنلا سے کوئی بات کی جائے۔ لیکن ٹکٹنلا نے اس کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا اور اس کا یہ رویہ دیکھ کر محسن کو بات کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ اچانک ایک خیال محسن کے ذہن میں جھپاکے کی طرح اُبھر آکر۔۔۔۔۔

☆.....☆

دلاور ایک کدال شانے پر رکھے قبرستان کے اندر پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا۔ آدھی رات کا وقت اور چاروں طرف گھورانہ حیر اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شدید بارش ابھی ابھی دکی تھی۔ اس صیب سناٹے میں درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں سے ٹپ ٹپ کر کے گرتا پانی خوف میں اضافہ کا سبب تھا۔ قبرستان میں بارش کے سبب سخت کچھڑ تھی جس سے دلاور کے کپڑے اور جوتے لت پت ہو چکے تھے وہ قبروں اور ٹہنیوں سے بچتا بچتا اس طرف بڑھ رہا تھا جہاں گزشتہ شام ایک نوجوان عودت رفتاری گئی تھی۔

کوٹھاری قبرستان کے حدود سے پرے ہی رک کر اس کا انتظار کر رہا تھا دلاور نہ چاہتے ہوئے بھی آج کوٹھاری کا حکم ماننے پر مجبور ہو چکا تھا۔ کوٹھاری کی شکلیوں نے اسے لاچار اور بے بس کر دیا تھا۔

اچانک سامنے درختوں کے جھنڈ سے ایک بہت بڑا پرندہ برآمد ہوا اور انتہائی نیچی پرواز کرتا ہوا دلاور کے چہرے کی طرف بڑھا۔ دلاور رک کر فوراً ہی اپنے آپ کو نیچے گر لیا تو پرندے نے اس کے سر لودھ کو بری طرح ڈنکی کر دینا تھا۔

کچھ ہی دیر میں دلاور کو مطلوبہ قبر مل گئی جس کو وہ دن کی روشنی میں دیکھ کر گیا تھا۔ دلاور نے لائین ایک جگہ رکھ دی اور پھر اس نے کدال بند کی اور قبر کی مٹی گھر پنے لگا۔ قبر تازہ ہونے کے سبب دلاور کو زیادہ پریشانی نہ ہوئی اور چند ہی لمحوں میں اس نے تمام مٹی پٹا دی اور اب پھر کی مٹی اٹھانے لگا۔ ذرا سی دیر میں سفید کفنائی میت اس کی آنکھوں کے سامنے گئی۔ دلاور جلدی جلدی کفن کے بندھن لگے لگا۔ ایک جوں سال عورت تھی۔ جس کا بے جان چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ کسی ایسے گھر

کی گئی تھی، پتا نہیں اس کو کیا بیماری آپڑی تھی کہ مر گئی۔ اب دلاور نے زیر جامہ میں سے پینچی نکالی اور عورت کے بالوں کو پینچی سے کاٹنے لگا۔ تھوڑی سی دیر میں بال کاٹ کر اس نے اپنے پاس پہلے سے موجود تھیلے میں ڈالے۔ یہ عمل مکمل کر کے وہ اٹھا تو مارے خوف اور احساس گناہ سے اس کا رواں رواں پیسے میں بھیگ چکا تھا۔ کام مکمل کر کے اس نے لائین ہو کر کدال دیں چھوڑیں اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا قبرستان سے باہر آنے والے راستے پر چل دیا۔ کوٹھاری قبرستان سے باہر ایک درخت تلے دلاور کا انتظار کر رہا تھا۔ دلاور کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں مکاری اور غمست ابھر آئی۔

"آگیا پت" کوٹھاری نے جھپٹ کر تھیلہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا!! "چل اب تجھے وہ گھر دکھاؤں جہاں سے تو نے کوٹھاری کنیا کو ہار لانا ہے؟"

"کوٹھاری" دلاور لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔

"دو کام مجھ سے نہ کرو کہ میرا دلپسہ کا راستہ ہی بند ہو جائے، میں پہلے ہی بہت گناہ گار ہوں۔"

"راستے تو اب سارے مکمل جائیں گے تمہارے جو سب کے سب خوشحالیوں کی طرف جاتے ہیں اور پاپ اور پین کے چکروں میں پڑنا چھوڑ دے نہیں تو باؤلا ہو جائے گا، چل آ میرے ساتھ۔"

☆...☆

خسکران نے اتنا بے بس اپنے آپ کو کبھی نہیں پایا تھا۔ جب سے شکستہ گزرائی کے قلعے میں مٹی تھی خسکران کو کسی مل اور کسی محل چھین نہ تھا۔ اب اسے احساس ہوا تھا کہ وہ تو شکستہ بربری طرح فریخت ہو چکا ہے۔ شکستہ کا قیامت خیز حسن اور توہم شکن جوانی خسکران کے اعصاب پر چھا چکی تھی۔ سامری کا بھی کچھ پتا نہ تھا۔ پر یہ بھی خوب صورت تھی لیکن شکستہ کی بات ہی کچھ اور تھی۔

اس بات کا علم تو خسکران کو تھا کہ شکستہ ٹیکسیلا کے علاقے میں ہے، اور خسکران وہاں گیا بھی تھا لیکن کچھ ان دیکھی قلعوں نے اسے شکستہ تک پہنچنے ہی نہ دیا تھا اور وہ ٹیکسیلا کے علاقے میں داخل ہی نہ ہو سکا تھا جیسے ہی وہ ایک خاص جگہ تک پہنچا اس کے وجود کو ایک خطرناک جھٹکا لگا اور وہ واپس چلنے کی طرف مگر جاتا حالانکہ اس نے راستے اور زاویے بدل بدل کر جانے کی کوشش کی لیکن ہر بار ناکامی ہی اس کا مقصد ٹھہری۔ اب خسکران حد درجہ پریشان ہو چکا تھا۔

شکستہ کی جدائی اس سے برداشت نہ ہو رہی تھی اس کا کوئل وجود اور لکڑی مسکراہٹ خسکران کی نظروں کے سامنے اور خیالوں میں گھومتی رہتی اور خسکران کے جسم میں انگارے بکھر جاتے اس وقت خسکران پوری رفتار سے آڑا جا رہا تھا، آج اس نے اپنی سلطنت آستان پہنچ کر محسوس دانوں سے مشاورت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کا باپ لشکران جنوں کا بادشاہ اور مجلس عاقلان کا چچا تھا۔

اس وقت خسکران جس علاقے پر سے گزر رہا تھا یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ سرنگی بھر بھری اور بنجر پہاڑیاں تاحہ نظر دیران ٹنڈ منڈ پہاڑی علاقہ تھا۔ تاہم کہیں کہیں اکا دکا درخت بھی نظر آرہے تھے۔ آسمان گہرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بادلوں کی تیز رفتار نقل و حرکت گزراہٹ پیدا کر رہی تھی۔ رات دم توڑ رہی تھی اور صبح کا سپید آہستہ آہستہ اس کی جگہ لینے کی کوشش میں تھا۔

اسی اثناء میں بارش شروع ہو گئی اور کچھ ہی دیر میں بارش زور پکڑ کر موسلا دھار ہونے لگی۔ خسکران خاصی دیر بارش کا مزہ لینے کے بعد اپنی بلندی زیادہ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ بادلوں کے پتھوں سے آگیا پھر تھوڑا سا حریہ بلند ہوا تو اچانک اس کے چاروں طرف چمکیلی دھوپ نکل آئی۔ کیوں کہ اب خسکران بادلوں سے بلند ہو چکا تھا۔

چاندی جیسے بادلوں پر سورج کی کرنیں منعکس ہو کر نورانی منظر پیش کر رہی تھیں۔ تاجہ لگاؤ سفید بادلوں کی دبیز تہ خسکران کے دل میں گدگدی کرنے لگی وہ اپنے آپ کو نکل کے اوپر تیرتا محسوس کر رہا تھا۔ عجیب رومانویت سے بھرپور نظارہ آنکھوں کے سامنے پانچ خسکران کو پھر شکستہ یاد آ گئی۔ شکستہ اور اس کی قربت میں گزرے ہوئے لطیف لمحات اس کے گداز وجود کی بے باکیاں، شکستہ اس وقت کیا کر رہی ہوگی۔ کہاں ہوگی، کس حال میں، شکستہ کی یاد اس کے دل و دماغ پر

نشہ بن کر چھا، شروع ہوئی کہ اچانک خسران کو ایک انتہائی زبردست خوفناک قسم کا جھٹکا لگا جس سے اس کا انچر بھرنا
 گیا۔ خسران نے چونک کر سمجھنے کی کوشش کی لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنے ہی جسم پر اس کی گرفت ختم ہو گئی ہو وہ
 ڈانواں ڈول ہو گیا جیسے چنگ کی ایک کٹی ٹوٹ گئی ہو۔ خسران ایک دم مستعد ہو گیا۔ اس نے اپنے تمام حواس اندر سر نہایت
 کیے اور سیدھی پرواز کرنے کی کوشش شروع کر دی لیکن بے سوراہے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا جسم بے وزن اور خالی خالی
 ہو گیا ہے اور آہستہ آہستہ اس نے اپنے آپ کو سیدھا اڑتے اڑتے نیچے آتا محسوس کرنا شروع کیا جیسے کسی طیارہ میں
 ایندھن ختم ہو چکا ہو اور وہ گلا تیز کر رہا ہو۔

اور پھر اسے ایک دوسرا پہلے سے بھی خطرناک جھٹکا لگا جس سے اس کا سر زمین اور تھیں آسمان کی طرف ہو گئیں اور
 خسران عمودی کرنے لگا۔ نیچے سے زمین اس کو تیزی سے اپنی جانب بڑھتی محسوس ہوئی اور پھر خسران کو یوں لگا جیسے اس
 کے وجود کی ہیئت بدل رہی ہے وہ دھوئیں کی شکل اختیار کر رہا تھا اسے اپنے گرد گرد نیلے رنگ کا حصار نظر آنے لگا تھا۔
 تھوڑی سی دیر میں اس کا جسم دھوئیں کی سفید نیکر میں تحلیل ہو کر زمین کے بالکل قریب آ گیا۔ یہ ساری باتیں اور حواصل
 خسران خود بھی محسوس کر رہا تھا اور وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اب اس نے دیکھا کہ ایک ٹنڈ منڈ لیکن بہت بڑے درخت کے
 نیچے ایک سادھو آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے اور اس کے پاس ایک نوجوان ہاتھ پاؤں پر اٹھائے کھڑا ہے۔ اس کے بعد خسران
 کے چراغوں میں روشنی بند ہوئی۔

☆.....☆

نوحہ بے ہوش دو شیرہ دلا اور ہاتھوں پر اٹھا کر تیز تیز قدموں سے کوٹھاری کے پیچھے چل رہا تھا۔
 دلاور کی نظریں لڑکی کے خوف سے پہلے بڑے چہرے پر تھیں۔ کوٹھاری نے دلاور کو ایک الگ تھلک مکان کے
 سامنے کھڑا کرتے وقت ایک تیز دھار کشادہ کرخت لہجے میں کہا تھا کہ سن ہو نے والی ہے اور مجھے پوچھنے سے بل اپنا
 عمل شروع کرو دینا ہوگا اس مکان کے اندر کوٹھاری کے علم کے مطابق صرف میاں بیوی اور ایک جواں سال بیٹی ہے۔
 بوڑھے کو باہر بلا کر میں ابھی مل کر رہا ہوں جبکہ لڑکی کو تو وہی ملائے گا، پھر ہاتھ لگا منع ہے اور اگر بوڑھی عورت مزاحمت کرے
 تو کٹمار اس کی چھاتی میں اُتار دیتا۔ اگر تو نے دیر کر دی اور صبح ہو گئی تو کوٹھاری تیرے نصیبوں کی مستقل رات کر دے گا۔
 اس کے بعد دلاور نے آگے بڑھ کر زور سے گواڑ بجا دیا۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا تو تھوڑی دیر
 بعد دروازہ کھٹکا اور ایک اوجیز عمر شخص آٹھویں ملتا ہوا نظر آیا۔ دلاور نے پھرئی سے اسے گریبان سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا تو
 کوٹھاری نے ٹپک کر اس کی گردن اپنے استخوانی ہاتھوں میں دبو چلی۔ اس شخص کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور اس کے
 بعد تکلیف ابھرائی اور سہا اختیار اس نے اپنے دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لیے اور کسمسانے لگا لیکن کوٹھاری کی آہنی گرفت
 کے آگے اس کی ایک نہ چل سکی۔ ابھی ان دونوں کی کشمکش جاری تھی کہ دلاور تیزی سے مکان کے اندر گھس گیا!
 ڈیوڑھی میں دائیں طرف ایک چھوٹا سا بیٹھک کا دروازہ تھا جس پر تالا پڑا تھا۔ آگے گھن تھا جس کے بائیں طرف
 رسوئی اور غسافانہ تھا جبکہ سامنے ایک برآمدہ اور چھوٹے چھوٹے کمرے دیکھ کر دلاور سیدھا ایک کمرے میں گھس گیا جہاں
 ایک نوجوان دو شیرہ نیم غنودگی میں بیٹھی تھی شاید دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سے اس کی بھی آنکھ کھلی تھی لیکن ابھی نیند کے خمار
 میں تھی۔ ایک غیر مرد کو دیکھتے اندر آتے دیکھ کر ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔

”دیکھو لڑکی“ دلاور نے کٹمار کال کر لہراتے ہوئے کہا۔

تمہارا باپ مارا جا چکا ہے اور تمہیں میں ساتھ لے کر جاؤں گا۔

”نہیں۔“ لڑکی نے چیختے ہوئے کہا۔ خوف اس کی آنکھوں میں لہرانے لگا اور وہ بستر پر ایک جانب سینٹے گی۔

☆.....☆

(حیرت کے سحر رنگوں سے آباد اس سلسلے دار ناول
 کی اگلی قسط ماہ جولائی میں ملاحظہ کیجیے)

تعلیم کی باتیں

CONCLUSIONS

جس میں مرد و عورتوں کی خواہشوں کے درمیان کے جوش و اضطراب ہیں
وہ سب سامعہ پیش آئے والے واقعات ہمارے ہیں اور ان کی کئی ہیں

ممتاز احمد

ایک کھنڈرے مرد کی داستانِ غیرت ہمرگودھات

موصول ہوا۔
 ”مگر آپ کون...؟“ تو جواب میں نے پیغام بھیجا
 کہ ”آپ کیوں پوچھ رہی ہیں کہ میں کون ہوں۔“ اس پر
 جواب آیا۔

زیرِ نظر کہانی کی شروعات اُس وقت ہوئی، جب میری عمر اڑتیس سال تھی، مگر میری اچھی صحت، عمدہ خوراک اور روزانہ ورزش کے نتیجے میں میری عمر تیس بہتیس سال کی ہی لگتی تھی۔

”ہی آپ کے نمبر سے مجھے گڈ مائنٹ کا میسج آیا ہے، مگر میں آپ کو نہیں جانتی کہ آپ کون ہیں اور آپ نے مجھے میسج کیوں بھیجا ہے؟“ جب میں نے اپنا پیغام بھیجے والا فولڈر چیک کیا تو واقعی غلطی سے یا کسی طرح اس نمبر پر میرا میسج گیا تھا۔ اس پر میں نے سواری ٹکڑ کر معدودت کا پیغام بھیج دیا تو اس کے جواب میں مجھے یہ میسج آیا کہ ”کوئی بات نہیں جی بہر حال آپ کا میسج بہت اچھا تھا، مجھے بہت پسند آیا۔ باقی داد ہے، ویسے آپ کون ہیں اور آپ کا کیا نام ہے؟“ پھر میں نے اپنا نام و اپنی جاب اور شہر کا نام بتایا۔ جس پر اس نے مجھے میسج بھیجا کہ ”میں ایک ذوق والا بندہ لگتا ہوں۔“ پھر میں نے اس کا نام اور شہر پوچھا تو اس نے اپنا نام نسرین بتایا اور وہ میرے شہر میں ہی رہتی تھی۔ اس طرح ہماری روزانہ میسج کے ذریعے بات چیت ہونے لگی، مزید تعارف پر میں نے اسے بتایا کہ ”میں شادی شدہ ہوں اور میرے دو

میرا نام عدنان ہے اور میری شادی ہو چکی تھی، ایک ایسی عورت سے جو اچھی، نیک اور پیار کرنے والی بیوی تھی۔ اللہ نے مجھے ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی نعمت سے نوازا تھا۔ مکان میرا اپنا نہیں تھا، مہر مقبول اور مناسب کرائے کے عوض بہترین مکان تھا، جسے میری بیوی نے اپنے سکھڑ پان اور خاصہ دھنی توجہ سے جنت بنایا ہوا تھا۔ میں واپڈا میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھا، جس کی وجہ سے میرا حلقہ انتداب بہت وسیع تھا۔ میں اپنے موبائل فون پر ہفتہ وار پہنچنے لے لیا کرتا تھا اور روزانہ صبح سویرے گڈ مارننگ اور رات کو گڈ نائٹ کا پیغام، اسی مفکر کے قول کسی اچھی بات یا اقوال زریں کے ساتھ اپنے دوستوں، عزیز واقارب اور ملنے جلنے والوں کو باقاعدگی کے ساتھ بھیجا کرتا تھا۔

ایک دن میرا گڈ ٹائمٹ کا پیغام کسی غلط نمبر پر چلا گیا تو تھوڑی دیر کے بعد اسی نمبر سے نئے یہ پیغام

سچی کہانیاں 138

0304 5195562

اچھا اور بقول اُس کے زندہ دل دوست مل گیا تھا، چونکہ میری کسی اور لڑکی یا عورت سے دوستی نہ تھی، لہذا میں نے اُس کو بھرپور توجہ اور خلوص دیا۔ جب وہ بھی Call Me کا سچا دوست بن گئی تو میں سارے کام چھوڑ کر اُس سے بات کرتا تھا اور اُس کو اگر کبھی پینلنٹس کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی میں فوراً بھیج دیتا تھا، اس پر وہ بہت خوش ہوتی اور میرا شکریہ ادا کرتی تو جو اب میں اس سے کہتا۔

"نسرین جی دوستوں کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔" ہم دونوں کی یہ خواہش تھی کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھیں۔ اب میں اُس سے ملنے اور ملاقات کرنے پر اصرار کرنے لگا۔ جس پر وہ کہتی کہ "وہ خود مجھ سے ملنے کے لیے بے چین ہے، مگر بہت جلد مناسب وقت پر مل لیں گے۔" تو میں اس سے بے تاب ہو کر کہتا کہ "وہ مناسب وقت کب آئے گا۔" اس پر وہ

بچے بھی ہیں اور فلاں علاقے میں میری رہائش ہے۔" پھر اُس نے بتایا کہ "وہ بھی شادی شدہ ہے اور اُس کا خاوند بیرون ملک ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے سرال میں ہی رہتی ہے۔" پھر میں نے اُس سے کال کر کے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اُس نے مسیج بھیجا کہ جب کچھ ماحول سازگار ہوگا تو وہ مجھ سے بات بھی کرے گی۔

کوئی دو تین روز کے بعد اُس نے مجھے Call Me کا مسیج بھیجا تو میں نے فوراً اُس کو کال کی، اس طرح ہماری پندرہ بیس منٹ بات ہوئی۔ اب اکثر ہماری فون پر بات ہونے لگی، مگر زیادہ تر ہم رات کو میسج کرتے۔ اس طرح ایک مہینے میں ہم گہرے دوست بن گئے۔

وہ تباہی کا شکار تھی اور اُسے میری صورت میں ایک



بس پڑتی اور کہتی۔

”میرا گھر کا پھل بیٹھا ہوتا ہے۔“

ایک دن اُس نے مجھے مسیج بھیجا کہ وہ اپنی ساس کے ساتھ کچھ ضروری خریداری کے لیے شہر کے مشہور جنرل اسٹور پر جا رہی ہے اور پندرہ بیس منٹ تک وہ وہاں بیٹھا جائیگی، پھر اُس نے اپنا حلیہ، کپڑوں کا رنگ اور نشانی وغیرہ مجھے بتا دی، جواب میں نے بھی اسے اپنے کپڑوں کا رنگ وغیرہ اُسے بتا دیا۔ اُس نے مجھے سختی سے منع کر دیا کہ اس وقت چونکہ اُس کی ساس اُس کے ساتھ ہوگی، اس لیے صرف دور سے ایک دوسرے کو دیکھ لیں گے، اس دوران نہ تو کوئی بات کریں گے اور نہ ہی کوئی اشارہ۔

میں اپنے آئس سے اٹھا اور اپنا ہانڈ بیک پر دس منٹ کے اندر اندر اُس جنرل اسٹور پر پہنچ گیا اور چھوٹی موٹی چیزوں کی شاپنگ کرنے لگا۔ کوئی پانچ دس منٹ کے بعد وہ بھی اپنی ساس کے ہمراہ آئی۔ ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ وہ ایک خوبصورت اور پُرکشش سراپے کی گوری چنی، اچھے نین نقوش والی تیس سال کی بھرپور عورت تھی۔ جب تک وہ خریداری کرتی رہیں، میں بھی اسٹور میں موجود رہا، مگر اُس کی ہدایت کے مطابق کوئی حرکت، اشارہ یا بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح ہماری یہ پہلی خاموش ملاقات صرف ایک دوسرے کو دیکھنے کی حد تک تھی، واپس پر جاتے ہوئے اُس نے مجھے غور سے ایک دلکش مسکراہٹ سے دیکھا اور رکشے میں بیٹھ کر چلی گئی۔ شام کو جب ہماری فون پر بات ہوئی تو ہم دونوں بہت خوش تھے کیوں کہ ہم ایک دوسرے کو پسند آئے تھے۔

اب میرا اصرار دن بدن بڑھنے لگا کہ وہ تنہائی میں مجھ سے ملے اُس کا کہنا تھا کہ اکیلے اُس کا گھر سے لگانا بہت مشکل ہے، بہر حال وہ کوئی نہ کوئی صورت نکالے گی، لہذا اس نے مجھے کچھ روز انتظار کرنے کا کہا۔ کوئی ایک ہفتے کے بعد اُس نے کہا کہ سب گھر والے ایک شادی میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں اور اُس نے اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ

دیا کہ شادی پر جانے سے انکار کر دیا ہے۔ جب تمام گھر والے ملے جائیں گے تو وہ مجھے فون کر کے اپنے گھر پر بلا لے گی۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد اُس کی کال آئی۔ اُس نے بتایا کہ سب لوگ ملے گئے ہیں اور وہ گھر میں اکیلی ہے، پھر اُس نے مجھے اپنے گھر کا ایڈریس سمجھایا، ساتھ ہی اُس نے تاکید بھی کی کہ میں موٹر سائیکل کی بجائے رکشے پر آؤں۔ میں فوراً اس کے گھر کے قریب رکشے سے اتر گیا۔ وہ ایک پوش اور مہنگے علاقے میں رہتی تھی۔ اُس علاقے میں گھروں کے آگے بہت کشادہ سڑک تھی۔ اور گھر کی پچھلی جانب بھی ایک کھلی تھی، جو اکثر سنیان رہتی تھی۔ زیادہ تر آمد و رفت سڑک پر ہی ہوتی تھی۔ اُس کی ہدایت کے مطابق میں گھر والے دروازے سے اُس کے گھر میں داخل ہوا، پھر ہم دونوں ایک کمرے میں بند ہو گئے۔ پہلے تو ہم دس منٹ تک ایک دوسرے سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر ایک تو تنہائی اور دوسرے اُس کی دل موہ لینے والی ادائیں اور اُس کی خوبصورتی، اس کے بعد ہم دونوں بہک گئے۔

اُس کے شوہر کو دوسرے ملک گئے دو سال ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے وہ بہت تنہا تھی۔ اس نے بڑے جوش اور دلہانہ پن سے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا تھا۔ ہم پورے دو گھنٹے گناہ کی وادیوں میں گھومتے رہے اور خوب جی بھر کے ایک دوسرے کو بھرپور تسکین دی، پھر میں اُسی کمرے کے راستے سے واپس اپنے گھر آ گیا۔ اب ہمارے درمیان کوئی پردہ نہ رہا تھا، کیوں کہ تمام اخلاقی اور شرم وحیا کی دیواریں گر چکی تھیں۔ اب ہم پھر ایک دوسرے سے ملنے کو بہت بے تاب رہنے لگے تھے۔ کوئی ہفتہ دس دن کے بعد میری بیوی ایک دن کے لیے اپنے میکے گئی تو پھر میرا گھر خالی تھا۔ میں نے سرین کو فون کیا اسے بتایا کہ یہ سنہری موقع ہے، تم کسی طریقے سے گھر سے نکلو اور میرے پاس آ جاؤ، پھر وہ کوئی بہانہ بنا کر کسی نہ کسی طرح میرے گھر پہنچ گئی۔ جہاں ہم نے ایک بار پھر شیطانی گناہ کا کھیل خوب جم کر کھیلا۔ اب ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے دیوانے ہو گئے تھے اور ملنے کے

جھ سو سے زیادہ نہ آتا تھا۔ ریمانہ میری اس کارگزاری سے بہت خوش ہوئی اور پھر وہ بھی میری اچھی دوست بن گئی۔ اب بدلے میں وہ بھی مجھے اپنے جسم کی رشوت دینے لگی تھی۔

اب میرے بیک وقت تین انتہائی خوبصورت عورتوں سے ناجائز تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ یہ تینوں ہی مجھے مختلف انداز میں لذت و سرور سے ہمکنار کرتی تھیں۔ اب مجھے اپنی بیوی میں ذرا بھی کشش نہ لگتی تھی اور میں اُس سے غافل سا رہنے لگا تھا۔

جس پرائیویٹ اسکول میں میرے دونوں بچے پڑھتے تھے، وہاں ایک لیڈی ٹیچر کی آسامی خالی ہوئی، تو میری بیوی نے مجھ سے اُس اسکول میں نوکری کی اجازت مانگی، چونکہ میری بیوی نے ایم اے کیا ہوا تھا اور وہ لوگ اسے آٹھ ہزار تنخواہ دے رہے تھے۔

میری بیوی کی خواہش تھی کہ وہ اپنی تنخواہ کی کچھ ڈال لے گی اور اس طرح ہم دو تین سال میں بچت کر کے پیسے اکٹھے کر کے کوئی پلاٹ لے لیں گے اور پھر ہاؤس بنڈنگ سے قرضہ لے کر اپنا مکان بنوائیں گے۔ میری بیوی کو اپنے ذاتی گھر کی بہت تنہا حسرت اور خواہش تھی۔ وہ اپنے گھر کے حصول کے لیے اپنا زیادہ بھی بچنے کو تیار تھی اور شام کو بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھانا چاہ رہی تھی، تاکہ ہم جلد از جلد اپنا گھر بنانے کے قابل ہو سکیں۔ بہر حال میں نے کچھ سوچ کر اور اُس کے مکان کے شوق کو دیکھتے ہوئے اسے جاب کی اجازت دے دی۔ اب ہم دونوں مہینے سویرے اٹھ کر تیار ہوتے، ناشتا وغیرہ کر کے میری بیوی بچوں کو لے کر اسکول چل جاتی اور میں اپنے آفس چلا جاتا۔ وہ اسکول سے دو بجے واپس گھر آ جاتی تھی اور میں تین ساڑھے تین بجے تک واپس گھر آتا تھا۔ میری بیوی اسکول سے واپس آ کر فوراً دو پہر کا کھانا بناتی اور چار بجے مختلف بچے ٹیوشن پڑھانے کے لیے ہمارے گھر آ جاتے اور پھر رات گئے تک وہ بچوں کو ٹیوشن پڑھانے میں مصروف رہتی۔ اتوار کو چھٹی ہوئی، اس لیے وہ اتوار کا سارا دن کپڑے دھونے، استری کرنے

لیے بہت بے چین رہنے لگے تھے۔ اس کے بعد نسرین نے ملنے کی صورت یہ نکالی کہ اُس کی ایک جاننے والی ایک بیوی پارلر چلاتی تھی۔ نسرین نے بیوٹیشن کا کورس کرنے کے بہانے اپنے سسرال والوں سے اجازت لے کر اُس بیوی پارلر پر آنا شروع کر دیا۔ بیوی پارلر کی مالکین مہوش ایک خوب صورت، طرح دار انٹیمس سال کی مطلقہ عورت تھی۔ نسرین نے مہوش کو اپورٹنڈ گفت و غیرہ دے کر اعتماد میں لے کر مجھے وہاں بلانا شروع کر دیا۔ نسرین کو اُس کا سسر مونس سائیکل پر پارلر چھوڑ کر جاتا تھا۔ جب مہوش کو پتا چلا کہ میں واچا میں ایک اچھے مہرے پر فائز ہوں، تو اُس نے مجھ سے کہا کہ "میرے پارلر کا بل بہت زیادہ آتا ہے میں اس کے لیے کچھ کروں۔" میں نے اُس کے پارلر کا میٹر بجلی کا میٹر کمرشل سے گھریلو کر دیا اور میٹر میں بھی کچھ گڑبڑ کرادی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کا بجلی کا بل بہت کم آنے لگا، اس پر وہ بہت خوش ہوئی۔ اس طرح ہم اُس پارلر میں بیٹھے تھے دو تین بار گناہ کبیرہ کے مرتکب ہونے لگے۔

اب میری مہوش سے بھی کافی اچھی مگ شب ہو گئی تھی اور وہ مجھ سے اور بھی مختلف نوعیت کے کام کروانے لگی، جو میں خوشی سے کر دیتا تھا۔ اس کے عوض وہ ہمیں بے سکون جگہ اور تنہا ماحول فراہم کرتی تھی۔ اب میں نے مہوش سے بھی ناجائز تعلقات قائم کر لیے تھے اور جب مجھے موقع ملتا میں اُس کے پاس جا کر اپنی ہوس کی تکمیل کرتا۔

مہوش کے پارلر میں ایک ریمانہ نامی عورت اکثر آیا کرتی تھی۔ مہوش کی معرفت میرا اُس سے بھی تعارف ہو گیا، اُس نے مجھے اپنا کزن ظاہر کیا۔ اتفاق سے ریمانہ کے گھر کا بجلی کا بل بہت زیادہ آ گیا تھا۔ جب مہوش نے ریمانہ کو بتایا کہ میں واچا میں ملازم ہوں، تو ریمانہ نے اپنے بجلی کے بل کے بارے میں مجھے بتایا، تو میں نے اس کا بل کم کروانے کا وعدہ کر لیا اور اگلے روز اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کا بھی بل صرف بل کم کر دیا، بلکہ اُس کے میٹر میں ٹھیک ٹھاک گڑبڑ کرادی۔ اب ریمانہ کے گھر کا بل پانچ

اور دیگر کاموں میں گزار دیتی تھی۔ میری بیوی سب سے لے کر رات تک محنت کرتی، بچوں کو بھی پڑھاتی، کھاتا، پاتی اور گھر کی صفائی بھی خود کرتی تھی، نتیجتاً وہ اتنی تھک جاتی تھی کہ بستر پر لیٹتے ہی اسے گہری نیند آ جاتی تھی۔

جب وہ گہری نیند سو جاتی تو میں موبائل پر نسرین سے خوب باتیں کرتا اور ہماری خوب مسیبتیں ہوتی،

جبکہ میری بیوی میرے کڑو توں سے بے خبر اپنا گھر بنانے کی دشمنی میں اسکول کی ملازمت کر رہی تھی اور

بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھا رہی تھی۔ ایک دن اچانک میرے ذہن میں ایک شیطانی منصوبہ آیا۔ چونکہ میری

بیوی کی واپسی دو پہر دو بجے ہوتی تھی اور اس وقت تک میرا گھر بالکل خالی ہوتا تھا، لہذا میں نے نسرین کو

یہ ساری صورت حال بتا دی وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ اس طرح اب نسرین بیوی پارلر سے میرے گھر

آ جاتی اور میں بھی آفس سے کسی بہانے کھٹک جاتا۔ چونکہ ہمارا پروگرام پہلے ہی فون پر طے ہو جاتا تھا، لہذا

میں نسرین کو اپنے ساتھ موٹر سائیکل پر بٹھا کر اپنے گھر لے آتا تھا، جہاں ہم خوب گناہ کا کھیل کھیلتے تھے۔ اس

کے علاوہ اب میں ریحانہ کو بھی اپنے گھر ہی لے آتا تھا اور خوب رقص اٹھیں کرتا تھا، جبکہ مہوشی کے ساتھ اس کے پارلر میں رنگ رلیاں مٹاتا تھا۔

ان تینوں عورتوں سے میری مختلف اوقات میں فون پر لمبی لمبی بات بھی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں موبائل فون پر چیکیج اتنے زیادہ نہ تھے، جس کی وجہ سے میرا

روزانہ بائیس سو روپے کا کریڈٹ خرچ ہو جاتا تھا، بلکہ بھی نہیں مہوش کو بھی ہر دوسرے تیسرے دن تین سو کے کارڈ کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ مختلف حیلوں

بہانوں سے بھی مجھ سے پیسے ہٹا رہی تھی، لہذا میں نے اپنے ان ناجائز اخراجات کو پورا کرنے کے لیے

رشوت بھی لگنی شروع کر دی تھی۔ کہتے ہیں کہ حرام کی کمائی اور بدکاری میں بڑی

سکشش اور لذت ہوتی ہے۔ میں ان دونوں افعال بد کا خوب خوب مرتکب ہو رہا تھا اور گناہوں کی دلدل

میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ میرا خمیر مرچکا تھا، گناہ اور ثواب کا تصور میرے نزدیک مٹ چکا تھا، میں ایک

لحاظ سے بے حس ہو چکا تھا۔ ایک مسلمان ہونے کے باوجود اللہ اور اس کے پاک نبی حضرت محمد کے

احکامات کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہا تھا۔ میں اپنی بیوی کی امانت میں خیانت کر رہا تھا۔ زنا جیسے فسق

اقل اور گناہ کبیرہ کرتے ہوئے مجھے ذرا بھی خدا کا خوف نہ آتا تھا اور دوزخ میں جانے والے ان

سارے کاموں کے ساتھ رشوت بھی میں خوب لے رہا تھا۔ نماز، روزے اور نیک اعمال کا میری زندگی

میں اب دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔ میں اپنی بدکاری کے قصے خوب مریج مسالا لگا کر

اپنے دوستوں کو بڑے فخر سے سنا تا تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ اللہ پاک ایک مجرم کی رہتی کو دراز ضرور کرتا ہے، مگر

جب اس کی پکڑ آتی ہے تو وہ بڑی سخت ہوتی ہے، پھر تو یہ کادقت گزر چکا ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ جس گھر میں زنا ہوتا ہے وہاں سے برکت اٹھ جاتی ہے اور پھر بیماری، بھوک، فاقہ اور تنگدستی

اس گھر میں ڈیرے ڈالیں جاتی ہے اور ذلت و رسوائی اس انسان کا مقدر بن جاتی ہے۔ انسان اپنی ہی بد اعمالیوں

اور گناہوں کی وجہ سے رب کی پکڑ میں آتا ہے۔ اب خدا کی پکڑ سے میں بھی دور نہیں تھا۔

ہوا کچھ یوں کہ ہمارے گھر کے سامنے رہنے والی خاتون کو تاک جھانک کی بہت عادت تھی۔ اسے

معلوم تھا کہ صبح میری بیوی اسکول پڑھانے کے لیے چلی جاتی ہے اور گھر میرا خالی ہوتا ہے۔ چونکہ میں ہر

دوسرے تیسرے دن بھی نسرین کو لے کر آتا تو کبھی ریحانہ کو لے آتا، اس طرح وہ عورت خاموشی سے یہ

کچھ دیکھتی رہتی تھی، پھر ایک دن اس نے میری بیوی کو یہ ساری صورت حال بتا دی۔ یہ سب سن کر میری بیوی

حیران و پریشان ہو گئی، پھر ان دونوں نے مل کر کوئی پروگرام بنایا اور کوئی تین چار دن بعد جب میں نسرین

کو لے کر اپنے گھر آیا، تو ہمارے محلے کی عورت نے میری بیوی کو فون کر کے بتا دیا، جس پر میری بیوی فوراً

اسکول سے چھٹی لے کر آ گئی۔ گیت کی ایک چابی اس کے پاس بھی رہتی تھی اور گھر کے مین دروازے کی بھی

ایک چابی وہ اپنے پاس رکھتی تھی۔ وہ انتہائی خاموشی

اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گا تو میں جا کر اسے منالوں گا، تقریباً ایک ہفتے کے بعد میں اپنے سرسرا ل گیا تو کسی نے بھی میرے ساتھ سیدھے منہ بات نہ کی اور میری بیوی نے تو مجھ سے ملنے سے بھی انکار کر دیا۔ میں ناکام و نامراد واپس اپنے گھر آ گیا۔ میری بیوی نے مزید یہ کیا کہ اپنے بھائی اور اپنی ماں کے ساتھ نسرین کے گھر جا کر اس کے ساس اور سسر کو بھی میری اور نسرین کی رنگ رلیوں کی داستان سنا دی۔ جس کے نتیجے میں انہوں نے اسے گھر سے بے عزت اور ذلیل کر کے نکال دیا۔ نسرین نے اپنے میکے جا کر خودکشی کی نیت سے نیند کی بہت ساری گولیاں کھا لیں۔ جب اس کی حالت بہت بگڑ گئی تو اس کے میکے والے اسے اسپتال لے گئے۔ جہاں بڑی وقت طبی امداد ملنے کی وجہ سے اس کی جان تو بچ گئی، لیکن وہیں پر ایڈمی ڈاکٹر نے یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ ماں بننے والی ہے، مگر گولیاں کھانے کی وجہ سے اس کے حمل کو بہت نقصان پہنچا ہے، پھر جب نسرین ہوش میں آئی تو اس کا اپرٹن کر دیا گیا۔ اب سب لوگ اس صورت حال کو اچھی طرح سے سمجھ گئے کہ وہ ناجائز بچہ تھا، جس پر اس کے میکے والے اپنی عزت کی خاطر خاموش ہو گئے اور نسرین کے خاوند نے اسے طلاق بھیج دی۔ ادھر میری بیوی نے گھر واپس آنے سے صاف انکار کر دیا اور مجھ سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ میں نے اپنے سرسرا ل جا کر اپنی بیوی کو بہت منانے کی کوشش کی۔ اس کی بھرپور منتیں کیں، بڑی معافیاں مانگیں، مگر اس کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ مجھ جیسے بدکار اور راشی شخص کے ساتھ ہرگز زندگی نہیں گزارے گی۔

جب میں نے اسے طلاق دینے سے انکار کیا تو اس نے عدالت میں میرے خلاف خلع کا کیس دائر کر دیا اور پھر کچھ دن بعد مجھے عدالت سے پیشی کا حکم آ گیا۔ اب مجھے عدالت میں حاضر ہونا پڑا جہاں پر اس کے وکیل نے میرے کردار کی دجیاں اڑا دیں، نتیجتاً دو تین پیشیوں کے بعد نہ صرف میری بیوی کے حق میں فیصلہ ہو گیا، بلکہ دونوں بچے بھی میری بیوی کی تحویل میں دے دیے گئے، کیونکہ بقول میری بیوی کے وہ مجھ جیسے بدکار اور درشت خور انسان کا سایہ بھی اپنے بچوں پر نہیں پڑنے دے گی۔

سے آئی اور چپکے سے گیٹ کھول کر میں دروازے سے اندر آ گئی۔ اس وقت میں اور نسرین بے لباس رنگ رلیوں میں مشغول تھے اور میری بیوی نے ہمیں دنگے ہاتھوں اس تازیبا اور قابل اعتراض حالت میں پکڑ لیا تھا۔ ہماری حالت یہ تھی کہ کاٹو تو جسم میں لہو نہیں اور ہم شرم سے پانی پانی ہو گئے۔

میری بیوی نے فوراً نسرین کے کپڑے پکڑ کر اپنے قبضے میں کر لیے اور اس کو حکم دیا کہ "اسی طرح بے لباس واپس اپنے گھر جاؤ۔" نسرین میری بیوی کے قدموں میں گر گئی اور پاؤں پکڑ کر رو کر معافی مانگنے لگی۔ میری بیوی نے کہا کہ "معافی مانگنے سے تو اللہ سے مانگو، مجھ سے کہوں مانگ رہی ہو۔" اب نسرین بے لباس زمین پر جھکی رہی تھی اور تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میری بیوی نے دھمکی دی کہ وہ ابھی پولیس کو بلا کر ہم دونوں کو کمان کے حوالے کرنے والی ہے۔ اس پر نسرین اور زیادہ گڑ گڑا کر رونے لگی اور میری بیوی کی منتیں کرنے لگی۔ میں نے فوراً اپنے کپڑے پہن لیے اور اپنی بیوی کی منتیں کرنے لگا اور معافیاں بھی مانگنے لگا۔ میری بیوی نے مجھ سے پوچھا۔ "کب سے یہ شیطانی فعل کر رہے ہو تم؟"

میں نے کہا "ایک دو بار ہی کیا ہے۔" بہر حال میں نے بھی اپنی بیوی کے پیر پکڑ لیے اور منت سماجت کرنے لگا۔ پھر اس نے بڑی مشکل سے اس شرط پر نسرین کو کپڑے دے دیے کہ وہ اپنا نام ایئر لیس بتائے، ورنہ وہ ابھی شور مچا کر پورے محلے اور پوئیس کو بلا لے گی، تو مجبوراً اسے اپنا نام اور ایئر لیس بتانا پڑا، پھر میری بیوی نے اس کے کپڑے اسے واپس کر دیے، جو اس نے جلدی جلدی پہن لیے اور وہ فوراً ہمارے گھر سے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میری بیوی نے مجھے خوب خوب سنا کیں اور غصے کی حالت میں مجھ سے لڑ کر اسکول سے دونوں بچوں کو لے کر اپنے میکے چلی گئی۔ میں نے اسے بہت روکنے کی کوشش کی، مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں بہت پریشان سا ہو گیا۔ میں نے دو چار دن اپنی بیوی سے کوئی رابطہ نہ کیا کہ جب

لی فنڈ اکاؤنٹ میں تقریباً دو لاکھ روپے موجود ہیں، جو میں نے اپنے اسی دوست کی معرفت اٹکوائے اور بڑی مشکل سے ڈیڑھ لاکھ روپے اپنی سابقہ بیوی کو ادا کیے، پھر میں نے عدالت میں اپنی موجودہ حالت اور نوکری چلے جانے کا بتایا۔ آخر کار کافی تک دو دروہے دھونے اور واپس کرنا پڑا، مزید عدالت نے مجھے یہ حکم دیا کہ میں بچوں کا خرچہ تقریباً دس ہزار روپے ماہانہ ادا کرنے کا پابند ہوں گا، مزید ستم یہ ہوا کہ ایک دن ٹھگہ واپڈا کے اسمبلی جس انسپکٹر نے چیکنگ پارٹی کے ہزار روپے گھر کے بجلی کے میٹر اور میوٹ کے بیوی پارلر کے میٹر کی گڑبڑ کی چوری پکڑی۔ ان کے بجلی میٹر اتار لیے گئے اور بجلی کی چوری کے جرم میں بھاری جرمانے کے تل ان پر ڈال دیے۔

دریخانہ اور میوٹ نے اسٹیپ جیپر پر بیان حلفی لکھ کر دیا اور یہ بھی لکھ کر دیا کہ میٹروں میں گڑبڑ میں نے کروائی تھی۔ جس کے بدلے میں ان سے میں رشوت لیتا رہا ہوں، مزید برآں ٹھگے کو میری بد عنوانیوں اور رشوت خوردی کے اور بھی کافی شواہد مل گئے تھے۔ اب میں شرم ساری کے باعث دفتر سے بھی اکثر غیر حاضر رہنے لگا تھا، اس لیے مجھے معطل کر کے میرے خلاف انکوائری کمیٹی بنادی گئی۔

انکوائری کمیٹی نے بڑی باریک بینی سے ہر معاملے کی چھان بین کی اور میرے خلاف انہیں کے ثبوت مل گئے اور میرا تمام جرم ثابت ہو گیا۔ جن کی پاداش میں مجھے نوکری سے نکال دیا گیا۔ میں نے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی، بہت بھاگ دوڑ اور سفارشیں کروائیں، مگر میری اپیل نامظور کرتے ہوئے اعلیٰ حکام نے خارج کر دی۔

اب میں عرش سے فرش پر آ گیا تھا۔ ادھر جب میرے تمام رشتے داروں دوستوں اور عزیز واقارب کو میرے کالے کرتوتوں کا علم ہوا تو سب مجھ پر تھوکتھوکنے لگے اور سب نے مجھ سے ناتا توڑ لیا۔ اب نہ تو کوئی مجھ سے ملتا تھا اور نہ ہی مجھے اپنے پاس بیٹھنے دیتا تھا۔ سب کی نگاہوں میں میرے لیے نفرت اور حقارت بھر گئی تھی۔ اب میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ ادھر جب میں نے اپنے بچوں کا خرچہ ادا نہ کیا، تو مجھے عدالت کے حکم سے جیل بھیج دیا گیا۔ جہاں میں نے ایک سال بڑی ذلت اور کس پیری میں گزارا، پھر اپنے ایک دوست کی وساطت سے میں نے اپنی سابقہ بیوی سے بچوں کا خرچہ معاف کرانے کی کوشش کی، پھر مجھے یاد آیا کہ میرے جی

میں سب سے بدلت گئے ہوئے میں برتن دھوتا ہوں اور رات کو ہوئی کے ایک کونے میں سو جاتا ہوں۔ میں اپنے کپے پر بہت روتا ہوں، پانچ دلت کی نماز بھی پڑھتا ہوں اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔

کارمین کرام سوہاگل فون سے چلنے والی دوستی کا بہت بھیا تک انجام نکلا۔ میرا گھر بار آجڑ گیا۔ میرے بچے میری نظروں سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گئے۔ اس کارن میری نوکری بھی چلی گئی اور ساتھ ہی عزت بھی گئی۔ مجھے بھرپور ذلت، رسوائی ملی پھر مجھے جیل بھی کانا پڑی۔ کاش نسرین سے میری دوستی نہ ہوئی ہوتی تو میں اس انجام تک نہ پہنچتا، مگر یہ حقیقت ہے کہ میں نے اپنا پاکباز بیوی کی قدر نہ کی اور اس کو مسلسل دھوکہ دیتا رہا۔ اس کی امانت میں براہ خیانت کرتا رہا بہر حال میں قصور وار تھا اور ہوں، جو لوگ بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری عورتوں کے ساتھ مت کالاکرتے ہیں، ان کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔ جلد یا بدیر انسان رب کی پکڑ میں آ جاتا ہے۔

کارمین کرام یہ یاد رکھیں کہ مرد اور عورت کی دوستی سے ہمیشہ برائی اور گناہ جنم لیتا ہے، لہذا ایسی دوستی سے پرہیز کریں اور میرے حق میں دعا کریں کہ اللہ پاک میرے گناہ معاف فرمائے اور مجھے سکون عطا فرمائے۔

☆☆.....☆☆

1987ء سے خدمت میں مشغول

LEUCODERMA-VITILIGO

سفید دماغ قابل علاج مرض ہے

جملی

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ملتی ایوارڈ ہولڈر



ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD BEST ACHIEVEMENT



AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9- اپریل 30: مئی
9- اگست 30: ستمبر
9- دسمبر 30: جنوری
فون: 2255888 - 2854888 (0861)
موبائل: 0300-8566188

لاہور

14- فروری تا 27 فروری
14- جون تا 27 جون
14- اکتوبر تا 27 اکتوبر
فون: 0300-8566188

پشاور

11 فروری تا 11 فروری
11 جون تا 11 جون
11 اکتوبر تا 11 اکتوبر
فون: 2218215-9 (091)
موبائل: 0300-8566188

ملتان

28- مارچ تا 6- اپریل
28- جون تا 6- اگست
28- دسمبر تا 7- جنوری
فون: 4518081-82 (0861)
موبائل: 0300-8566188 (0300-852803)

کراچی

13- مارچ تا 27 فروری
13- جون تا 27 جون
13- دسمبر تا 27 نومبر
فون: 37012068-9 (021)
موبائل: 0300-8566188

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syeda.majzaidi@yahoo.co.uk

دوسری مرد کہانی

عشق آتش

محمد کاشف مغل



کراچی سے ایک نوجوان کی اشکوں میں ڈوبی حسرت بھری کہانی

ہر طرف سے مختلف قسم کی آوازیں آتی تھیں۔
"میرا دل لے جاؤ۔"

"اماں بچوں کے سوٹ سے لگا دیے۔"

پران دنوں پچو کو کوئی آواز نہ سنائی دیتی۔ کان تو بس
انہی پری وٹس کے جام چھلکاتے ہونٹوں سے نکلنے امرت
سے ہی زندہ ہوتے۔ نکلیں اس طرف کتنی راتیں جہاں
سے دونوں والا برقع پہنی نمودار ہوتی۔

ان کی پہلی ملاقات تو مشکل بازار میں ہوئی اور یہ پہلی
ملاقات ہی انہیں ایک نئی پگھلائی پر لے گئی جس پر
صدیوں سے لوگ چلتے رہے جہاں نہ راہ پرانی ہوتی نہ
ہذبات میں کمی آتی ہے۔

پچو تو اس دن اس کا دیوانہ ہوا جب اس نے سارہ
نقاب میں چھپا سوات کا حسن چھلکا کر دو شیرازہ کو دیکھا۔
تب پچو نے جانا کاروبار کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے جہاں
کاروباری باتیں نہیں دل کی باتیں ہوتی ہیں۔ پر وہ بے
چارہ ہرگز نہ جانتا تھا کہ اب جو کاروبار کرنے چاہے اس
میں صرف نقصان ہی ہوتا ہے۔

آمنہ اکثر کہتی تھی۔ "اے پچو تیرے سے ملنے کو مجھے پورا
ہفت انتظار کرنا پڑتا ہے۔ تیرے کو کوڑھینے کو ترس جاتی ہوں۔
کوئی حل نکال نہ تاکہ ہم ہفتے میں دو سے تین بار ملا کریں۔"

آج میرا ایک ملٹی ٹیکسٹل کمپنی میں اسٹریو تھا جہاں
بڑی منتوں مرادوں کے بعد مجھے یہ بلاوا آیا تھا سو میں
سب سے پہلے عبداللہ شاہ خاڑی کے حزار پر چادر
پڑھانے چلا گیا۔

فاتحہ پڑھ کر نیچے اترا تو میرے قدم ریزہ ریزہ ہیں میں
پھٹنے لگے۔ وہ..... وہی تھا یا پھر میرا گمان۔ میں نے اسے
خود سے باتیں کرتے دیکھا۔ اپنے ہاتھوں کی ٹیکسٹس دیکھا
اور انہیں مٹانے کی کوشش کرتا۔ گردوغبار سے اس کے پاؤں
سے ڈھکا ہوا چہرہ بس آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ نہ صوب کا
احساس نہ دنیا کی فکر گہرے حلقوں میں جھنسی پھیلی
آنکھیں۔ جیسے کسی اجڑے حزار پر جلتا آس کا دیا۔ میں ابلیس کر
رہ گیا۔ پتا نہیں وہ کس سوچ میں ڈوبا تھا؟ میں لپک کر اس
کے قریب گیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آس کے دے میں
شامسالی کی کو بھڑکی اور محدود ہو گئی، پھر اپنے ہاتھوں کی
لکیروں میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ مجھے پانچ سال پہلے کا وقت
پاؤ آیا۔ جب اندرون شہر میری کیونٹیلیٹن کی دکان پر پچو آیا
تو گرجا تھا۔ سخت گرمی کے دن، یونٹیلیٹن بلز کی آخری مار تھیں،
کسٹمرز کی ایک لمبی قطار اور ایک طرف پچو کی راما لیا۔

وہ مشکل بازار میں کت جیس کا اسٹال لگایا کرتا تھا۔



آواز میں کوئی راز چھپا تھا۔ بچوں نے جلدی سے پوچھا۔
 ”یہ کیا ہے۔ فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھی۔ تین دن
 سے تیرا نمبر بند ہے۔ حیدر آباد سے چوڑیاں منگوائی ہیں
 تیرے لیے۔ دیکھو تیرا نام بھی لکھوایا ہے۔ یمن کرو کچھ ذرا
 اور سندھ ہو جائے گی تو۔“

آمنہ نے چوڑیوں کو کافی نظر سے دیکھا اور درد
 بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ سب بیٹھیں رہ جائے گا اور میں
 کہیں دور چلی جاؤں گی۔ پو۔“

”آمنہ یہ تو ایسی باتیں کر رہی ہے۔“ پو تیرت سے بولا۔
 آمنہ نے بے چارگی سے کہا۔ ”میں جا رہی ہوں۔“

”میں تو جمعہ اور اتوار بازار میں بھی اسٹال لگاتا
 ہوں۔ اگر تیرے لیے آسانی ہو تو خرید ادنیٰ کے بہانے
 آ جایا کرتا۔“ یہ کہہ کر پو نے محبت سے اسے دیکھا تھا۔
 اب علاقہ میں بڑھ گئیں اور ان کی محبت میں
 روحانیت نے جنم لے لیا تھا۔

ہذا..... ہذا

ہمیشہ کی طرح اس دن بھی پو نے کاندھے سے کپڑا تار
 کر اسٹول پر جمی وچول جھانکراچی طرف تھمیں اور شدت سے
 انتظار کرنے لگا۔ وہ چھپاگ سے آئی اور بیٹھنے کا اٹکھ بھی نہ
 کیا۔ کہنے لگی۔ ”پو میرے پاس وقت کم ہے۔“ اس کی کپکپلی

پو نے فوراً کہا۔ "ماں مجھے ایک لڑکی پسند ہے۔
شادی کرنا چاہتا ہوں اس سے۔"

"کیا... سادی!!!" (شادی) سادی کرنا چاہتا ہے
ٹو۔ ارے پگلا گیا ہے رے ٹو۔ وئے سے میں دی ہم نے
تھادی بہن۔ سادی (شادی) کرنی ہے تو ہانو سے اور کچھ
نہ سننا ہمیں۔ "دوڑتے ہوئے ماں نے وہائی دی۔" "ج
بولیں ہیں گاؤں کے لوگ سہر (شہر) جا کر بہت خراب
ہوت ہیں۔ ہو گیا رے ٹو خراب ہو گیا۔"

☆...☆

پو تو مٹی کا تودا بین چکا تھا۔ ندوہ پیچھے ہٹ سکا تھا۔
آگے بڑھنے کی بہت مٹی اس میں۔ شاید اندر ہی اندر
فیصلہ کر چکا تھا کہ زندگی کو گلے لگاتا ہے یا اس سے بھاگنا
ہے۔ ایک دن مجھے اس کی کال آئی۔ کہنے لگا۔ "فیاض
میری کشتی کے پیچھے لے کر پہنچ رہی ہے اسٹیشن پر۔ میں
جار ہوں۔" میرے پو مجھے پر اس نے صرف یہی کہا۔
"ناٹم کم ہے جلدی پہنچ۔"

میں اس کی امانت لیے اسٹیشن پر پہنچا، دیکھ کر حیران
رہ گیا۔ برقع کے اوپر ایک بڑی چادر لپیٹے آئے تھے پو کے
ساتھ تھی۔ میں نے کہا۔ "پو کہاں جا رہے ہو؟"

پو نے محبت سے آواز کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم دور
جا رہے ہیں۔ ایک نئی دنیا بسانے۔"

ان کے چہرے پر محبت کی جیت پر زمانے کا ڈر تھا۔
درحقیقت وہ جیت چکے تھے۔

ٹرین آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی۔ آواز نے پو کا ہاتھ
مضبوطی سے تھام لیا۔ مجھ سے ملنے کے بعد دونوں نے ہم
آواز ہو کر کہا۔ "ہمارے لیے دعا کرنا۔ ہم واپس نہیں آئیں
گے کبھی۔" وہ دونوں چلتی ٹرین کی طرف تیزی سے بڑھے
اور پو مجھے ہاتھ ہلاتا رہا اور دور ہوتا چلا گیا۔ میری آنکھوں
میں آنسوؤں کی اک تجم گئی۔ وہ آنسو جدائی کے تھے یا پھر
خوشی کے۔ لیکن میرے دل سے ان کی کامیابی کی دعا تھی۔
اس کے بعد کیا ہوا کچھ پتا نہ چلا پھر پو مجھے ٹالا اور آج ملا تو
وہ پو نہیں رہا تھا۔ چہرے پر دھول تھی اور پٹے پرانے لباس
میں بیٹھا پو نہیں کوئی سا دھوا رنگ لگ رہا تھا۔

"تم پو ہونا۔" میں نے جرأت کی۔ "جا پاپا تنگ نہ کر۔"
اس نے دے لفظ میں کہا، لیکن اس کے ہاتھ کی

رات میں فون کرتی ہوں۔"

پو بیک کر بولا۔ "آمنہ... آمنہ... آمنہ۔" مگر
رو جا چکی تھی۔

☆...☆

انتظار اب بے چینی میں بدل گیا تھا۔ وقت کیسے
گزرے، نظر بھی ڈھلتے سورج کی طرف اور بھی اپنے
موبائل کی اسکرین پر، لیکن کوئی کال نہ آئی، کئی بار خود
کوشش کی، پر جواب موصول نہ ہوا۔ ایک ایک لمحہ گزرنا
سال کے برابر تھا اب۔ بازار بند ہوا، وہ گھر کیسے پہنچا،
اسے کچھ پتا نہ چلا۔ بے چینی مزید بڑھ گئی۔ عجیب و غریب
خیالات اس کے دماغ میں جنم لیتے رہے۔ بس اسے فون
کا انتظار تھا۔ رات دو بجے کے قریب موبائل کی گھنٹی بجی۔
"آمنہ کیا ہوا پتا نہ کچھ اب تک کھانا نہیں کھایا قسم
سے۔" آمنہ روتے ہوئے۔

"میں تیری نہیں ہو سکتی، پو۔ اگلے ہفتے میں میری
شادی طے ہو گئی ہے۔ ماں کو جب میں نے تیرا پتا تو مجھے
بہت مارا پیارا اور موبائل بھی لے لیا۔ بڑی مشکلوں سے تجھے
فون کیا۔ کچھ کر پو، تیرے بغیر میں رہ نہیں پاؤں گی۔"

اس نے آمنہ کو تسلیم دیتے ہوئے کہا۔ "تو پریشان
مت ہو، صبح پتا ہوں کیا کرنا ہے۔ بالکل فکر نہ کر۔" یہاں تک
میں آمنہ کو تسلیم دے رہا تھا یا پھر خود کو۔ رات کشمکش میں گزر
دی۔ نیند تو آمنہ کے کھو جانے کے ذریعے لڑائی لگی۔

☆...☆

صبح ہوتے ہی اس نے ماں کو فون کر دیا۔
"ماں تجھ سے ضروری بات کرنی ہے۔" ماں اس کی
بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"ارے ماں پو ماری سن پہلے۔ لڑکے والوں نے کہا
ہے، چنگی کو بیاہ کے دو جلدی۔ ٹو تو جانے ہیں تھادی بہن
کشتی پگلا ہے۔ اب اس کی بیماری کا کچھ پتا نہیں۔ کہتی ہے
مارے کوئی وی لازمی چاہیے۔ کچھ مٹی آرڈر کر دے۔" پو
نے ماں کی بات سن کر دھیرے سے احتجاج کیا۔

"ماں پچھلے مہینے 20,000 پیسے میں نے تمہارے کو۔"
ماں نے اس کا جواب سن کر فوراً حال کہا۔ "اے پاگل
تمہارے لباس کا علاج بھی تو سہر (شہر) کے بڑے اسپتال
میں ہو رہا ہے۔ کبیر (خیر) ٹو بتا کیا بول رہا تھا ٹو۔"

میں گویا ہوا۔ "آمنہ کہاں ہے؟" مجھے تو جیسے چین میں نہ رہا تھا اور پھر جب میں باپوسی کی انتہاؤں میں پہنچ رہا تھا وہ اچانک بول پڑا اور اس کی بے ربط باتوں سے میں اس کی پوری کہانی کو کسی حد تک سمجھ چکا تھا، جو کچھ یوں تھی۔ جب ہیرو آمنہ کو لے کر اپنے گھر پہنچا تو اس کی ماں نے اپنی چھالی پیٹ دالی اور آمنہ پر طرح طرح کے الزام لگا کر پوچھت گچھت کر کے نکال دیا۔

پہا آمنہ کو لے کر کرائے کے مکان میں آ گیا۔ نگلی بندھی روزی چھوڑ کر نئے سرے سے کام ڈھونڈنا خود ایک آزمائش ہوتا ہے۔ چو بھی بھنور میں پھنس گیا۔ روزی صبح کام کے لیے نکلتا، سخت حرور کی کرتا اور گزر بسر کے لیے تھوڑا بہت آسرا ہو جاتا۔ آمنہ کا حسن دنوں میں گہنا گیا تھا۔ مصیبت اور دکھ پریشانی انسان کو دیکھ کی طرح کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ آمنہ اور چو بھی کھن کی کھڑی کی طرح ہو چکے تھے۔

وہ دن اپنے دامن میں چو کی زندگی میں تاریکیاں لیے ہوئے نمودار ہوا۔ چو آمنہ کو گھر چھوڑ کر کام دھند سے اٹھ کر لیے نکلا۔ شام کو جب گھر آیا تو دروازے پر لوگوں کا جم غفیر لگا ہوا تھا۔ چو دیوانہ وار اندر بھاگا۔ دیکھا تو اس کی چیخوں سے آسمان گونج اٹھا۔ آمنہ کی بے حرمت لاش خون میں نہائی پڑی تھی۔ چو کا دماغ الٹ گیا تھا، وہ پاگوں کی طرح تپشہ نگار رہا تھا۔

☆.....☆

قبرستان میں چو کے قہقہے ہر پہلی سناؤ دیتے تھے۔ آمنہ کی قبر سے لپٹا اور دوتا یا ہنستا رہتا تھا اور پھر ایک بھار اسے قبرستان سے ایک درگاہ کی ओڑ لے گیا۔ چو کو سکون پھر آ گیا تھا اور پھر ہوتے ہوئے یہ فقیری حالت میں عبداللہ شاہ غازی پہنچ گیا تھا اور کانی عرصے سے سینگا پیرا کیے ہوئے تھا اور پھر وہ مجھ سے ملا تھا۔

اس کی گدلی آنکھوں سے مونے مونے آنسو پھرے پر جمی دھول سے راستہ بناتے خشک واڑھی میں جذب ہوئے۔ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھا اور آمنہ آمنہ کا روتا گھر سے باہر چلا گیا۔ چو مجھ سے اک بار پھر جدا ہوا اور انسانوں کے بھرے جنگل میں کہیں کھو گیا اور پھر اس کے بعد وہ مجھے کبھی نہ ملا۔

☆.....☆

کانی پر کھدا آمنہ کا نام خود گواہی دے رہا تھا کہ آمنہ کو چو سے زیادہ کوئی نہیں چاہ سکتا۔ میں بے اختیار بول اٹھا۔ "آمنہ کہاں ہے اور تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ادھر سے وہ۔ کسی کو مت بتانا ورنہ اسے پھر لے جائیں گے وہ لوگ۔" اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔ وہ پھر سے چلانے لگا۔

"مادر میں گے اسے، میرے ساتھ رہتی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بھلا محبت کو بھی کوئی مار سکا۔ نا..... نا..... نا۔" اب بھی وہ میرے ساتھ ہے، صبر بلاتا ہوں میں۔ اس کی فرزانگی نے مجھے بھونچکا کر دیا اور میں اس کی یہ حالت دیکھ کر یہ بھی بھول گیا کہ مجھے آج انٹرویو کے لیے جانا ہے۔ میں نے چو کو کسی طرح اپنے ساتھ لے جانے پر راضی کیا اور جیسے تیسے گھر لے آیا۔

☆.....☆

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ میں نے چو کو غسل خانے میں لے جا کر اچھی طرح منہ ہاتھ دھلایا اور اسے ایک حد تک صاف ستھرا کر کے باہر لایا اور اس کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرنے لگا۔ اسے زبردستی کھلا کر میں گھر سے باہر لاک کر کے انٹرویو کے لیے لے گیا۔

☆.....☆

آج شاید میری قسمت میرے ساتھ تھی۔ انٹرویو سے کامیاب لوٹنے کے بعد میں الکر گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پہلے آمنہ کی محبت کیا ہوگی؟ یہ سوال میرے ذہن میں چکرانا پھر رہا تھا۔ جیسے تیسے میں گھر پہنچا اور تالا کھول کر اندر آیا۔ دل کو سکون سا مل گیا کیوں کہ چو گہری خیند میں سو رہا تھا۔ میں نے اسے سونے دیا۔ جانے کتنے عرصے بعد اسے خیند آئی ہوگی۔

☆.....☆

رات کے دس بجے کے قریب چو کی آنکھ کھلی۔ بٹاشت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ میں نے اسے کھانا کھلایا اور پھر چائے پینے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ چو شاید کچھ کھانا چاہ رہا ہے۔

"چو یا تم بتاؤ نا تمہاری یہ حالت....." میں شدید غم

تیسری مرد کہانی

تایا

خلیل احمد اعظم

تھلا تایا کی روح میں اترتی داستانِ عجب و عجرات سے

تھا۔ پھر چوہا، مگر نوکیلا تھا، جس نے نکتے ہی اس کا ٹنڈ
ڈھکی کر دیا تھا۔

اس کی ضعیف ہڈیوں میں ایسی چوڑوں کو سنبھالنے کی ہرگز
قوت نہ تھی، مگر وہ حالات و دوراں کی شوریدہ لہروں کے
آگے بے بس تھا۔ اس کا بڑا چاہا ان لہروں کی شوریدہ سری
کھلی کمزور آنکھوں سے دیکھ تو سکتا تھا، مگر ان سے خبر
آزما نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ یکتا و تنہا تھا اور عمر ب سری بھی کر چکا
تھا، بھلا وہ ایسی صورت حال میں کس طرح ان چالاک و
مکار، تیز و طرز اور لڑکوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

وقت کا سیلاب تھمتا نہیں، جانے کب سے رواں
ہے اور کب تلک رہے گا اور رفت رفت اپنے تیز رفتار دلیے
میں ہر ذی روح اور بے جان کو بہاتا چلا جائے گا۔
سیکھ، منٹوں میں اور گھنٹوں کو ارتقا دیں گے اور گھنٹے
روز و شب میں ذہل کر سال، مہینوں کی مدت پوری
کرتے رہیں گے اور وقت کا سیلاب اپنی مقررہ رفتار سے
بہتا رہے گا۔ وہ بھی وقت کے سیلاب میں پوری طرح
غرقاب بہتا چلا جا رہا تھا۔

وہ کچھ دیر کے لیے وہیں ساکن کمزرا ہوا، پھر کسی نتیجے پر
نہ پہنچتے ہوئے آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا دل نہایت
برق رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ دل کی آواز کو وہ اپنی ڈولیدہ

شاہراہ کے اختتام پر پہنچ کر وہ چند ساعتوں کے
لیے ٹھہر سا گیا۔ اس کے ٹھہرتے ہی فضا کا ارتعاش بھی ختم
گیا اور اس کے ارد گرد منڈلائی ہوئی ٹھیکوں کی جھلجھل
بھی، گویا وہ زکا تو اس کی کائنات بھی رک گئی۔ ایک
آزادہ کائنات.....!

اسے علم تھا کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی غم سے چند
فرلانگ آگے، بائیں طرف مڑنے والی پارکسنگ میں
موجود آسودہ حال گھرانوں کے شریروں کے اس کے
پر تپاک شرارتی استقبال کے لیے موجود ہوں گے اور
گھروں کے بیرونی قد بچوں پر پیٹھے نہایت بے تابی سے
محو انتظار ہوں گے، لیکن جو بھی اس کا شک و جود ان کی
نگاہوں کے زاویے پر سرکڑ ہوگا۔ وہ خوشی سے ٹکڑیاں
بھرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں گے اور اسے ستائیں
گے..... ہانکل بے وجہ، بے مقصد..... تنگ کریں گے۔

"عین ممکن ہے کہ آج پھر کوئی پتھر مار دے۔" اس
کے ذہن کے گوشوں میں تحریک پیدا ہوئی اور چہرے
کے رنگ میں تغیر بھی نمایاں ہو گیا، اس کا وہ زخم ابھی
ٹھیک طرح سے مندمل نہیں ہوا تھا۔ جو چاروں ٹپک است
انہی شریروں کی تھج حرکات کے توسط سے تھا۔ کسی نے
اسے پہنچ کر پتھر مارا تھا جو اس کے نیچے ٹپکنے پر آ کر لگا

کے بالکل سامنے اختتام پر اس کے گھر کا بیورونگ کا گیت
تھا کم از کم اتنا دور!

اس کو یہ بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی اسے پتھر نہ پھینچ
مارے، مگر اس دھڑکے کے باوجود بھی وہ اپنی اسی جگہ میں
مشغول تھا کہ وہ گھر پہنچ جائے۔ نیلے رنگ کے دروازے
والے گھر جس سے اس کی زندگی کی تمام یادیں خشک
تھیں۔ فضا لڑکوں کی شرارتی آوازوں سے مسلسل
گونجتی جا رہی تھی، وہ سب کے سب نہایت غلط الفاظ میں

سانسوں کے باوجود بھی سن سکتا تھا۔ بائیں طرف مڑنے
والی باریک گلی نزدیک آتی جا رہی تھی اور ایک انجانے خوف
سے اس کی دھڑکن بھی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ پاگل نہیں تھا مگر شرارتی لڑکے اسے پاگل سمجھ کر
ستاتے تھے۔ اگر وہ پاگل ہے تو وہ کیونکر روزانہ اس
طرح اپنے گھر آ جاتا ہے۔ بھلا پاگلوں کا کوئی گھر ہوتا
ہے، پاگل تو پتھر مارتا ہے کھاتا تو نہیں۔ اس نے خیال
آرائی کی۔ اس کی اذکار کن بتدریج بڑھتی جا رہی تھی اور پھر



انسانیت کی عزت و عظمت کے پتھرے اُڑا رہے تھے اور
ان کی یہ باتیں اس کے کمزور دل پر اشک ٹپراں کی
صورت تیز و حاد نشتر مگرارتی تھیں۔

”لو بھئی آ گیا۔ ارے بھئی آ گیا، تھلا تھلا آ گیا۔
تھلا تھلا ہے۔ تھلا تھلا ہے۔ تھلا تھلا ہے۔ تھلا تھلا ہے۔“
رہتا ہے، گند چھپاتا رہتا ہے۔ ”وہ طرح طرز اور۔“
مخلقات بک بک کر اس کے کمزور دل کو چھلنی کر رہے تھے
اور وہ چپ دہم سادھے ان سے دامن چھڑانے کا خواہاں

بائیں طرف مڑنے والی باریک گلی بھی آئی اور ایک
ساعت کے پردے چاک کر دینے والی صدا نے فضا کو
ہیزا کر کے رکھ دیا۔

”لو بھئی۔۔۔ آ گیا ارے بھئی آ گیا، تھلا تھلا آ گیا۔“
اس کے قدم پوری قوت سے کھینچے گئے۔ وہ اس
کوشش میں تھا کہ جلد از جلد ان شرارتی لڑکوں سے اپنے
آپ کو دور لے چلے۔ دور۔۔۔ لگ بھگ ایک مربع میل
آگے دائیں طرف مڑتی ہوئی چھوٹی سی گلی میں۔ جس

پرکالوں کے پیچھے دوڑ پڑا۔ "بہت تمہاری خالہ کی.....! بے غیر تو! بزرگوں کو ستاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔" اظہر بٹ کے اس جارحانہ قدم پر وہ ہلکا کر پیچھے کی طرف دوڑ پڑے اور ان کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ اظہر بٹ دوڑتے ہوئے زکا، پاؤں جھار کر چپل پہن لی اور پیچھے سے ہانک لگائی۔

"ذرا آنا سودا سلف لینے..... ملتا ہوں تمہیں۔" اظہر بٹ کی بات بھی سچ پر مبنی تھی، کیوں کہ ان کے والدین نے اظہر بٹ کی دکان پر ہی ادھار کا کھانا کھلوا دیا تھا اور جو ادھار دے سکتا ہے وہ خود بخود بھی ہوتا ہے۔ وہ منمن لگا ہوں سے اظہر بٹ کو کھنے لگا جو اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"نویں نہ خود تھاپا! ان کو ڈھیل دی ہوئی ہے، بھلا ایسے چپ چاپ یہ غیر مہذب قوم جان چھوڑ لی ہے..... ایک مونا سا ڈنڈا رکھا ہے پاس..... پھر دیکھ کون آتا ہے تیرے پاس، بے قیمت، بے غیرتی سے ہی باز آتے ہیں۔"

اس نے اظہر بٹ کی باتیں چپ چاپ سن لیں، جس طرح چپ چاپ اس نے شری لڑکوں کے مفاہات بھرے الفاظ سنے تھے، وہ اس گہری چپ کے ساتھ ہی خوش تھا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ مجبوروں کی صدا بے فیض ہی رہتی ہے، پھر اس نے اظہر بٹ سے ایک سفید دھاکے والی ٹی خریدی اور دس کا وہ پرانا سالوٹ بھی بھنا لیا، جسے وہ گزشتہ ہفتے سے سنبھال رہا تھا، ٹی اسے تین روپے کی ٹی تھی، جبکہ سات روپے دو سکوں کی صورت میں اسے اظہر بٹ نے پکڑا دیے تھے۔

وہ جب پاؤں کو گھسٹا ہوا اپنے گھر کی گلی کے سامنے پہنچا تو ایک ریڑھی بردار کھجے کے ساتھ کھڑا بیٹھے تریوز..... تازے تریوز کی صدا انہیں بلند کر رہا تھا۔ سیکے ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے حسرت بھری نگاہ سے ایک نظر تریوز بھری ریڑھی کو دیکھا اور دوسری نظر ان دو سکوں پر ڈالی جو اس وقت اس کا کل اثاثہ تھے۔ اس کی زندگی کا کل اثاثہ.....!

اس کی نگاہوں میں اپنے چھوٹے بھائی لطیف حسین کے جگر گوشے گھوم گئے، جو اس کے ہاتھوں میں کھیل کر جوان ہوئے تھے۔ تین بیٹے اور پانچ

تھوہ جانتا تھا کہ وہ زکا یا اس نے انہیں اوقات میں رہنے کے لیے کچھ کہا تو وہ حد سے بڑھنے میں بھی دریغ نہیں کریں گے۔ وہ یا تو اسے پتھر ماریں گے یا..... تالیوں کا گھن آلود پانی اس پر اچھالنا شروع کر دیں گے۔

اس کا دماغ کھانا ان کا دل پسند مشغلہ تھا اور یہ مشغلہ اس کے لیے سوختہ جاں تھا، اس کا بس چلتا تو وہ ان بد کردار لڑکوں کے ہونٹوں کو موہنی کی آرتی دیتا تاکہ وہ مفاہات بکنے کے لائق ہی نہ رہتے، مگر وہ بے بس تھا۔ وہ نہ تو موہنی تھا اور نہ ہی موہنی کا اوزار اس کے پاس تھا، وہ ان گستاخ لڑکوں کی حرکتوں کا تذکرہ بار بار ان کے سر پرستوں سے بھی کر چکا تھا مگر وہ نہایت مہذب انداز میں اسے مطمئن ضرور کر دیتے تھے، مگر اپنے جگر گوشوں کو ان بیچ حرکت سے منع نہیں کرتے تھے۔ ان پر نہ تو پابندی عائد تھی اور نہ ہی کسی قسم کی روک ٹوک..... وہ ہر قسم کی باتوں سے بے نیاز اسے ستاتے تھے اور ستاتے ہی چلے جاتے تھے..... اس کی آمد پر اس کی داہلی پر اور اس وقت بھی جب وہ دھاکہ لانے کی غرض سے "اظہر بٹ" کر یا نہ اسٹوڈ پڑا تا تھا۔

"لو بھئی آگیا، ارے بھئی آگیا، تھلا تھلا آگیا۔" اور وہ ان کی باتوں پر تھلا کر رہ جاتا تھا۔ اور اندر ہی اندر دل مسوس کرنا سو بہا لیتا..... بالکل خشک آنسو.....!

اشیم و خاٹی، لڑکیوں کا ٹولہ اس کے تعاقب میں تھا اور وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پاؤں کو گھسیٹتا ہوا اپنے گھر کی طرف گامزن سفر تھا۔ اس کے چہرے پر کرب و ملال کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بہت تکلیف میں تھا، کیوں کہ وہ پاؤں کی سوجن کے عارضے میں مبتلا تھا۔ یہ عارضہ عارضہ اسے ساہتہ ایک سال سے زیر کیے ہوئے تھے اس کے پاس مناسب دوا نہ ہونے کی بنا پر ڈاکٹر نے اس کا بغور معائنہ کیا تھا، بلکہ اسے معمولی سوجن قرار دے کر چلنا کیا تھا۔ تاہم وہ خود بھی جانتا تھا کہ وہ کسی غیر معمولی عارضے میں مبتلا ہو چکا ہے تاکہ معمولی میں.....!

وہ کرب و اذیت میں مستغرق منزل کی طرف رواں دواں تھا اور اپنے پھولے ہوئے پاؤں اور کانٹا بنے جسم کو تھپتھپاتا رہا تھا۔ جب "اظہر کر یا نہ اسٹوڈ" سے اظہر بٹ نمودار ہوا اور پاؤں کی چپل اتار کر ان آفت کے

ریڑھی کے کونے میں رکھے اور ریشہ زد ہاتھوں سے لپک کر تربوز پکڑنا چاہا، مگر اس کے کپکپاہٹ زدہ ہاتھوں سے وہ پھسلا اور نیچے پختہ گلی کی اینٹوں سے جا کھرایا اور شق ہو گیا، قبل اس کے کہ وہ تالی کے کہن آلود پانی میں شامل ہوتا وہ نرمی طرح اس کے اوپر گر پڑا، ایک گہرا کرب اس کے پڑ مسرت چہرے پر در آیا۔ اس کے عجول ہاتھوں نے تربوز پکڑ لیا تھا مگر اس کے پاؤں میں درد کی ٹیسس اٹھنے لگی تھیں۔

وہ بڑی مشکوں سے تربوز کو منہا لے ہوئے اٹھا اور پاؤں کو خشکے لگا۔ نضام میں ایک مرتبہ پھر ارتعاش اور ٹکھیوں کی جھنجھٹاہٹ حاوی کر آئی تھی، لیکن وہ ان سب سے بے نیاز نیلے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

ہلے..... ہلے.....

حالات کی بساط پر بھڑے ہوئے متحرک چہرے کب بٹنی کھاتے ہیں، اس کا ادراک مقدر اور تقدیر کے علاوہ کسی کو بھی نہیں ہو سکتا۔ اسے بھی بساط حالات پر ایک مہرے کی حیثیت حاصل تھی، مگر بٹنی کھانے کے متعلق چنناں ادراک نہ تھا۔

وہ شریف حسین سے "تاہا" کس طرح بتا.....! یہ تمام کارستانی تقدیر و مقدر کی ملی جلت تھی۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ وہ ایک بہت ہی پڑ مسرت گزرتے دھیر کی شام تھی، جب لطیف حسین کی اہلیہ و رفیقہ بن کر صغریٰ اسی نیلے رنگ کے دروازے والے گھر میں وارد ہوئی تھی، وہ نیچے نقوش والی ایک نہایت ہی تیز و طرار لڑکی تھی، جس نے آتے ہی اس کی بیوی رخشداں پر صدارت کرنی شروع کر دی تھی۔ رخشداں اس وقت اس کے ایک بیٹے اصغر اور بیٹی نسرین کی ماں تھی۔ اسے اپنی بیٹی نسرین سے بہت پیار تھا۔ بیٹیوں سے پیار کس کو نہیں ہوتا، گو کہ انہیں پرانے گھر کی زینت بننا پڑتا ہے، مگر ہوتی تو اپنا ہی خون ہیں تا.....!

صغریٰ بیگم گو کہ اس کی بھالی تھی، لیکن وہ اس کے چپے ہوئے الفاظ اکثر محسوس کرتا تھا مگر کہتا کچھ نہیں تھا اسے تھوڑا تھوڑا سا شک ضرور تھا، لیکن اس کا شک اس وقت حقیقت کے روپ میں ڈھل گیا جب اس کی بیوی نے علی الاعلان یہ کہا کہ "یا تو وہ اس گھر میں رہے گی یا پھر

بیٹیاں..... دو بیٹیاں اور وہ بیٹے تو شادی شدہ، اپنی خانہ داری میں مشغول تھے، جبکہ ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ابھی گھر میں ہی تھیں۔ خدا نے انہیں بہت زیادہ حسن و فراست سے نوازا تھا۔ وہ ہمیشہ اور بھائی تو زیر تعلیم تھے، جبکہ ایک امور خانہ داری کے لیے مختص تھی۔ اگر نصیب کہا جائے تو اسے علم سے رغبت ہی نہ تھی۔ اسے رغبت تھی تو ٹی وی سے اور بس..... ٹی وی سے۔"

اس کی کمزور لگا ہوں میں جب اپنی اولاد جیسی بچیوں اور بیٹیوں سے جھگڑا تو معالے اپنا اصغر اور نسرین بھی یاد آ گئے لیکن جلد ہی اس نے انہیں ذہن کے گوشوں سے جھٹکا اور ریڑھی والے سے قاطب ہوا۔ وہ ایک نوجوان آدمی تھا۔

"بیٹا! یہ تربوز کس بھاؤ میں دے رہے ہو؟" اس کے لہجے میں استغہام تھا۔

"ہا ہا! تو بھاؤ کو چھوڑ..... بول کتنے لے گا....." نوجوان تیزی سے بولا پھر ہانک لگائی۔ "ٹھیکے تربوز لے لو..... تازے تربوز..... سرخ تربوز..... آ رہا کے لو جی..... کھا کے لو۔" پھر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "ہا ہا اٹھا کتنے چاہیے؟ ایک..... دو..... تین؟"

"چاہیے تو ایک ہی..... مگر!" اس نے دائیں ہتھیلی اس کے سامنے کر دی، جس پر دو سٹے سودج کی روٹنی میں جھللا رہے تھے۔

"او چاہا.....! یہ بھی کوئی سکوں کا ذات ہے۔" نوجوان سخت آمیز لہجے میں بولا۔ "نہرا چھوٹا خرچ اسکول جاتے ہوئے دس کے نوٹ سے کم نہیں لیتا۔ اور تو....."

"بیٹا! میں نے بھی اپنی بیٹیوں کے لیے ہی لیا ہے۔" اس کے لہجے میں یاسیت تھی۔ "میں نے کون سا خود کھانا ہے؟"

نوجوان نے اس کے گہرے متوجہ چہرے پر نگاہ دوڑائی اور ٹھوڑی رگڑنے لگا۔ وہ کھشکش میں جھٹا ہو گیا تھا، پھر وہ قدرے فحش سے بولا۔

"تو پہلا گاہک ہے اور پہلے گاہک کو خالی نہیں موڑنا چاہیے، یہ فروخت کاری کا اصول ہے۔" پھر اس نے قدرے ہلکا سا تربوز تلاش کر کے اس کی طرف بڑھا دیا، اس کے چہرے پر مسرت کی رمت لہر اگئی۔ اس نے سکتے

صغریٰ۔۔۔

وقت کا چٹھی اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ گھوڑاؤں اور ہا
اور لطیف حسین کے ہاں کیے بعد دیگرے پانچ بچے پیدا
ہو گئے۔ دو بیٹے اور تین بیٹیاں، بعد ازاں ایک بیٹا اور دو
بیٹیاں مزید پیدا ہوئی تھیں۔

قدرت نے انہیں خوب صورت دو چہرہ شکل اور فہم و
فراست میں بھی نمایاں بنایا تھا۔ اب وہ وقت کے ساتھ
ساتھ بڑھا ہونے لگا تھا اور لطیف حسین کے بچے جوانی
کی دہلیز پر قدم رکھنے لگے تھے اور صغریٰ و لطیف کی کن
بیٹیاں بھی جب سفید ہونے لگیں تو ایک دن یکدم ہی
اسے رخشداں کے انتقال کی خبر ملی۔ وہ بنا کسی ہنگامہ
کے وہاں گیا اور اس کے جنازے میں شریک ہوا اور
بہیں اس نے قریباً اٹھارہ سال بعد اپنے بیٹے اور بیٹی کا
دیدار کیا۔ خدا نے لطیف حسین کے بچوں کی طرح اس
کے جگر گوشوں کو بھی بہت خوش شکل اور ذہین بنایا تھا بار بار
اس کا من چاہا کہ وہ اپنے اصغر اور نسرین کو سینے سے
لگا لے، مگر پھر اس نے اپنی اس خواہش کو اپنے اندر ہی
چل ڈالا اور ہزاروں حسرتوں کو سینے میں دفن کیے
ہوئے اسی غمے رنگ کے دروازے والے گھر میں
آ گیا، جہاں پر بھی اس کا اصغر اور نسرین کلکاریاں بھرا
مکرتے تھے، ہنستے تھے مسکراتے تھے اور ہلکھلاتے تھے
بالکل تروتازہ گلاب کی طرح۔۔۔۔۔

اس کے بھائی لطیف حسین اور علی بھٹے کے تمام بچے
اسے "ٹایا" کہہ کر پکارتے تھے اور ہمدردی دیکھتے وہ
سب کا "ٹایا" بن گیا۔ سب اسے "ٹایا" ہی کہہ کر
پکارنے لگے، حتیٰ کہ لطیف حسین اور صغریٰ بیگم بھی۔۔۔۔۔

بساط حالات پر بکھرتے ہوئے مہروں نے اسے
"ٹایا" سے منسوب کر دیا تھا اور وہ اس پر معترض بھی نہیں
تھا۔ اسے جب صغریٰ بیگم کی باتیں بہت زیادہ تنگ
کرنے لگیں تو اس نے راتیں گھر میں گزارنا ترک
کر دیں، بلکہ وہ راتیں شہر جا کر بتانے لگا۔

لوگوں نے اسے کئی بار سینما کا گیت عبور کرتے ہوئے
دیکھا تھا، مگر وہ فلموں کا رسیا نہیں تھا کہ رات بھر فلمیں دیکھتا
رہتا۔۔۔۔۔ لیکن کسی نے بھی یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ وہ
فلمیں دیکھتا ہے یا نہیں۔۔۔۔۔ البتہ وہ بنا کسی عذر کے گھر بھی
نہیں رہتا تھا اور دن گھر سے باہر بھی نہیں جاتا تھا۔

اس نے اپنی بیوی کے علاوہ صغریٰ بیگم کو بھی سمجھایا
کہ "حالات سے سمجھوتا کرنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔" مگر
اس وقت اسے منہ کی کھانی پڑی جب اسے اپنی بیوی
رخشداں نے ہی کھرے اور صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ
"وہ کسی سمجھوتے کی قائل نہیں ہے، وہ اسے علیحدہ کرے
یا لطیف حسین کی بیوی صغریٰ کو۔۔۔۔۔"

بساط حالات پر مہرے تھرک رہے تھے اور اپنی
کھانے کی منہ توڑ کوشش میں مصروف عمل تھے، وہ بے
بس تھا، کیوں کہ نہ تو اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی گھر
تھا اور نہ ہی مقررہ رقم جس سے وہ کوئی علیحدگی اختیار
کر کے سر اُٹا سکتا، نتیجتاً وہی ہوا جس کا اسے خدشہ
تھا، مہرے چٹکی کھا گئے۔

رخشداں اپنے دونوں بچوں سمیت میکے چلی گئی،
ستم یہ ہوا کہ اس نے دو ماہ بعد خلع کی اپیل دائر کر دی،
عدالتی چارہ جوئی ہوئی۔ وہ عدالت کی طرف سے دیے
گئے احکامات کو برسرِ پکار نہیں لاسکتا تھا، مجبوراً اسے
طلاق نامے پر دستخط کرنے ہی پڑے، جب ان
کا عدالت پر اس نے قلم چلایا تھا تو اسے محسوس ہوا تھا کہ
جیسے وہ اپنے دل کو چھید رہا ہے۔

اب وہ تنہا و یکبارہ گیا تھا۔ اس کی عمر اس حد تک نہیں
گزری تھی کہ وہ دوبارہ شادی کے پندھن میں نہ بندھ
سکتا، لیکن وہ دوبارہ شادی کرتا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے
تو رخشداں کی یادوں سے شادی کر لی تھی، جس میں اس کا
اصغر بھی اسے میسر تھا اور پیادہ اور چھوٹا نسرین بھی۔۔۔۔۔
وہ ایک ورزی تھا اور لوگوں کے تن کو ڈھانچتا اس کا
کاروبار حیات تھا۔ وہ گھر میں ہی ٹیلرنگ کا کام کرتا تھا۔
رخشداں کے ہوتے ہوئے وہ بہت محنت کیا کرتا تھا، مگر
جونہی وہ گئی، سلائی مشین سے اس کا دل چڑنے لگا، کام
سے دل چڑ رہا تھا تو عمر کا جوش بھی ڈھل رہا تھا۔ مزید اس
پر سوخت جاں صغریٰ کی باتیں ہوتی تھیں، جو وہ اس بر طعن
و تشیع کے ساتھ مارتی تھی۔ وہ گھر کے ماحول کو مزید اگھاتا
نہیں چاہتا تھا، اس لیے چپ پر ہی قائم رہتا، ورنہ وہ تو
سر پرست خانہ تھا، کوئی بھی فیصلہ شادی یا توبہ کے لیے
مشتز کہ غلاب کا بیابان بن جاتا۔

اس کی کڑورنگا ہوں نے پڑھو سے انداز میں اپنے ہاتھ میں موجود شق تربوز کو دیکھا، پھر اسی سے پڑھو لہجے میں بول پڑا۔

”لو بھئی..... تجھے تو..... کوئی کھانے کو ہی تیار نہیں۔“

اب بتا کیا کریں؟“
آصف اس کی اندرونی کیفیات سے بخوبی واقف تھی، لہذا بلا کسی توقف کے اس کے ہاتھوں سے تربوز پیچھے ہوئے گویا ہوئی۔

”نایا، ایسا کرتے ہیں کہ اسے کاٹ کر لاتی ہوں، پھر ہم دونوں اسے کھاتے ہیں، ویسے بھی مجھے بھوک لگی ہوئی ہے آپ کو بھی لگی ہوگی۔ اور..... اور.....“ وہ بات بتانے لگی۔

”ہیضہ کا کیا ہے؟ ہو گیا تو ہو گیا!“
”مگر.....“ نکل اس کے کہ وہ مزید کچھ کہتا اس کی بیٹی تکی کی طرح اڑ گئی اور اس کی زبان بہت کچھ کہنے کی آمد میں کچھ بھی نہ بہ سکی۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ اپنے لیے تو ہرگز تربوز نہیں لایا تھا۔ وہ تو اپنے بچوں جیسے لطیف کے بچوں کے لیے یہ لایا تھا..... اور وہ بچے تھے کہ بس.....!

وہ ایک پل کے لیے ٹھنکا پھر آگے بڑھ گیا۔ اس کی شناسائی کی ہر ہرجے اسے خاموش لفظوں میں خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ پھر حیاں، برآمدہ، ستون اور اس کا تین کمرے کے درمیان تھا کمرہ جس میں اس کی سلائی مشین، ویڈیو ریکارڈر، جس پر وہ استری اور مزید مطلوبہ سامان بڑی نفاست سے سجا تھا اور سب سے بڑھ کر اس کی ٹولی ہوئی اور این والی شکستہ چادر پائی، جو اس کے بڑھاپے کی واحد روشنی تھی، مگر صرف دن کے چند مخصوص پہلوں کے لیے.....!

وہ اپنے سوچن زدہ پاؤں کو گھسٹتا ہوا آگے بڑھا اور ازار بند سے بندھی ہوئی چابی کھول کر ہاتھ میں کر لی۔ صغریٰ کے سامنے آصف بھی کئی گھڑی تھی۔ ہاتھ میں وہی توشہ تھا جو اس نے اسے سونپا تھا۔ اسے افسوس ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ تربوز لا کر بیٹی کو جھاڑ پھولی، صغریٰ بیگم کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور آصف اس کے سامنے چڑیان گھڑی تھی اور اس کی کڑوی سی باتیں سہہ رہی تھی۔

”ابا..... اس مردود کا کچھ پتا ہے کہ کس کچرا گھر سے یہ ہراٹھا لایا ہے، اس کی حالت نہیں دیکھتی۔ ایسا لگتا

☆.....☆

وہ اپنے سوچن زدہ پاؤں کو گھسٹتا ہوا اپنے بیوی گھر میٹ والے گھر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہی، شناسائی کی ایک تیز مہک اس کے نعتوں سے کرائی توہیں بھر کے لیے وہ وہی کی سی کیفیت میں مستغرق ہو گیا۔ مرحومہ رشتہ اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی یادیں، بیٹی اور بیٹے کے قہقہوں سے مزین ساتوں کی شناسائی اور دکھ و دکالیف اور عذاب مسلسل سے عبارت ہر پل موت و حیات کی کشش میں غرقاب زندگی کی آشنائی.....!

اس کا دل چاہا کہ وہ بلک بلک کر رو پڑے، مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا اس نے گو کہ جبر مسلسل میں زندگانی گزار دی تھی، مگر بھی اپنی خودداری پر آنچ نہیں آنے دی تھی۔ کسی کو گرو دیا کچھ نہیں تھا تو کسی سے کچھ لینے کے لیے ہاتھ بھی نہیں پھیلا یا تھا، لیکن پھر بھی اسے دنیا نے غموں، تکلیفوں اور ٹھوکروں کے علاوہ کچھ نہیں دیا تھا۔ اسے ہمیشہ بے صبر گردانا تھا اور ہمیشہ اسے جاں نسل ڈنک مار کر اذیت ناک لمحات سے نوازا تھا۔ وہ اپنی قسمت کی غیر جانبدارانہ روش پر بیچ و تاب تو کھا سکتا تھا مگر اسے حربہ غلط کی طرح جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ یہی قسمت ہی تو اس کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی۔ ایک عذاب ناک حقیقت..... جس کے پاؤں کے درمیان وہ ٹھکی طرح پس کر رہ گیا تھا۔

اس نے حسرت زدہ انداز میں نیلگوں دروازے پر ہاتھ پھیرا، جیسے وہ اسے بے حد عزیز ہو، حد درجہ عزیز اور پھر معافی اس کے حسرت زدہ ہاتھوں نے اپنے عزیز کو تھپتھا دیا۔ نضا میں اس کی تھپتھاہٹ کی مخصوص آواز گونجی اور پھر ہمیشہ کی طرح اندر سے آصف نے کنڈی کھول دی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور پھر محبتوں سے لبریز آواز میں اپنا اٹل جانا اس کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ..... میں..... تمہارے لیے لایا ہوں۔“ اس کے گتے میں گہری محبت مفسر تھی۔

”مگر..... نایا.....!“ وہ دانتوں میں انگلی دباتے ہوئے بولی۔ ”یہ..... یہ..... میں تو نہیں کھاتی مجھے تو.....“

”مجھے تو.....“ وہ نظریں چرانے لگی، پھر یکدم ہی محل اٹھی۔ ”ہاں..... مجھے تو اس سے ہیضہ ہو جاتا ہے۔“

کمرے میں الیکٹریکل سرکٹ موجود تھا مگر بلب فیوز ہو گیا تھا، اس لیے روشنی کا انتظام نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ چار پائی پر لیٹ گیا، اس نے زندگی کے تمام کرب و ملال بڑی خوش اسلوبی سے جھیلے تھے۔ اس لیے اب وہ پاؤں کے درد سے بھی بالکل بے پروا تھا۔ اسے اپنے پاؤں کے مارنے کے متعلق سب کچھ صاف صاف اور اک تھا، مگر وہ دوسروں کو اس کے متعلق کچھ بھی بتانے کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے تمام کرب تنہا جھیلے تھے اور یہ بھی وہ تنہا ہی برداشت کرنا چاہتا تھا، اسے معالج نے سب کچھ سمجھا دیا تھا اور وہ سمجھ بھی گیا تھا۔

وہ چار پائی پر لیٹا ہوا تھا اور کھلی آنکھوں سے ماضی کے حقیقی سنے دیکھ رہا تھا۔ جس میں اسے درخشاں کا پیار بھی میسر تھا اور بچوں کی دعاؤں بھی۔ مگر حقیقت حال میں ایسا ہرگز نہ تھا، وہی اکیلا، تکیا، بالکل اکیلا۔ اپنے اکیلے کمرے میں۔

وہ دن گزر گیا۔ اس سے اگلا بھی گزر گیا، مگر اس نے اگلے دن۔

"نایا مر گیا، نایا مر گیا" تمام گلیوں میں یہ خبر آمدنی کی طرح پھیلتی چلی گئی، نیلا دروازہ چوہٹ کھلا ہوا تھا اور محو میں اس کی لاش کے ارد گرد جھنگھٹا بنائے بیٹھی ہوئی تھیں اور صغریٰ بیگم انہیں تمام حالات سے مطلع فرما رہی تھیں۔

"ارے برسوں آیا تھا۔ اچھا بھلا تھا، لڑکی کو بڑے پیار سے تربوز بھی لاکر دیا تھا، مگر خود کمرے میں چلا گیا۔ ہم نے سمجھا چلا گیا ہے، مگر۔" وہ پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔ پھر محو میں آپس میں چوگوئیاں کرنے لگیں۔

"ارے۔۔۔ وہ تو بیمار تھا۔ ایسے ہی کبہ رہی ہے کہ اچھا بھلا تھا۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔" ایک اور بولی۔ "بے چارے کے پاؤں خراب تھے، بڑی مشکلوں سے چلتا تھا۔"

"ہاں بالکل۔۔۔۔۔ تم ٹھیک کہتی ہو، میں نے بھی اسے دیکھا تھا۔" ایک اور آواز ابھری اور پھر نجانے کتنی ہی آوازیں ابھرنی اور معدوم پڑتی رہیں۔

ان سب سے بے نیاز آصف تپائے کے کمرے کے سامنے بنے ستونوں سے ٹیک لگائے ٹنگی ہاندھے ایک ہی چیز کو تکیے جا رہی تھی، اس کی آنکھوں سے نہ جھمنے والا

ہے جیسے پانچ سالوں سے مسلسل ہی نہیں کیا ہے، جا پھینک اسے پھرے کی نوکری میں۔ بڑی آئی ہے تاپا کا پیار سرائے والی۔"

یہ سن کر اس کے دل پر جیسے چھریوں کے گہرے وار ہوئے مگر وہ پھر بھی کچھ نہ بولا۔ وہ اس وقت بھی کچھ نہیں بولا تھا جب وہ بولنے کا اہل تھا اور ابھی تو وہ اس کا اہل بھی نہیں رہا تھا۔ ابھی تو وہ ایک پرایا تھا اور پرانیوں سے اپنوں کا سلوک یقیناً یہی ہونا چاہیے تھا، اس نے سوچا۔

صغریٰ بیگم کی کزواہٹ آہیں باتیں ابھی جاری تھیں اور وہ مسلسل اول فؤل کے جا رہی تھیں۔

"رات بھر نکلیں دیکھ کر ہوتا ہے اور صبح ہوتے ہی کمر یاد آ جاتا ہے، ارے۔۔۔۔۔ یہ تو آج کل کی نئی نسل سے بھی گیا گزرا ہے۔ وہ آدمی رات کو پلٹ تو آتے ہیں اور یہ۔۔۔۔۔ یہ تو قف ہے۔ تو بہ تو بہ"

اس نے خاموشی سے تالے میں چابی تھمائی اور دروازہ کھول دیا۔ وہ صغریٰ کے منہ لگتا ہی نہیں چاہتا تھا، کیوں کہ اس کی تو عادت ہی یہی تھی اکڑی، کڑوی کسلی باتیں کرنا۔

اس کا سامان حیات اسی طرح بے ترتیب انداز میں بکھرا ہوا پڑا تھا، جس طرح وہ بے ترتیب چھوڑ کر چلا جاتا تھا اور جس طرح بے ترتیب اس کی درخشاں چھوڑ کر چلا گئی تھی، اس نے یاسیت بھری نگاہ سے کمرے کے دروازے کو گھورا، جا بے جا سے اکھڑا ہوا پلستر جہاں موقع نصیحت جان کر کا کر وچوں نے اپنے مسکن بنا لیے تھے۔ چھت کے علاوہ کونوں میں بے تحاشا ٹنگے ہوئے کڑیوں کے جالے اور کمرے کی خم آلود فضا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ جب اس کمرے میں اس کی شریک حیات ہوئی تھی تو کمرہ کیسے جگمگا تا تھا۔ مسکراتا تھا اور ابھی اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سلائی مشین اور دینا دی پٹنے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے چار پائی پر جا بیٹھا۔ چند ساعت کے لیے وہ کھلے دروازے کو گھورتا رہا، پھر اٹھ کر دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی۔

اس روز خلاف معمول اس کے پاؤں میں درد کی شدید عیسیں اٹھ رہی تھیں، دروازہ اور کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی تھی۔ اس کے

ہے، مگر انہوں نے میری باتیں سنی بھی اُن سنی کر دیں اور انہی وہ اسی عارضے کے باعث۔ "ڈاکٹر رشاد فاروقی صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور خاموش ہو گئے۔

"مگر ڈاکٹر صاحب، تایا جی بذاتِ خود یعنی میرا مطلب ہے کہ بطور پیشہ آپ کے پاس جاتے تھے۔"

لطیف حسین کے صاحبزادے ثاقب نے استفسار کیا۔ اس کے لہجے میں استغیابی گیسر تھی۔

"ارے نہیں جیٹا، وہ اس حق میں کہاں تھے۔" ڈاکٹر رشاد فاروقی صاحب گویا ہوئے۔

"انہیں تو جس طرح امیرا" میں ڈاکٹر افتخار مسعود کے پاس لے کر جاتا تھا اپنا نام کر کے وہ تو میں ہی جاتا ہوں۔ کہتے تھے کہ خدا نے گرو دیے ہیں تو وہی درو سینے گا بھی۔ معاف کے پاس جاتا تو اپنی توہین سمجھتے تھے۔" وہ بڑے اور پھر لگاؤ میں چرا کر بولے۔ "لیکن حقیقتاً وہ کسی کا احسان لینا ہی نہیں چاہتے تھے۔"

"کیا آپ انہیں سینما ہاؤس سے اپنے ساتھ لے کر جاتے تھے؟" ثاقب نے تیزی سے پوچھا۔

ڈاکٹر رشاد فاروقی صاحب نے بہت ہی عجیب نگاہوں سے ثاقب کو گھورا، وہ جھپٹ سا گیا، مگر بولا کچھ نہیں۔

"ارے نہیں بر خوردارا" ڈاکٹر رشاد فاروقی صاحب نہایت سادہ آسٹ آ میز لہجے میں بولے۔

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا وہ تو "مسجد نور" میں نماز پڑھتے تھے اور وہاں اس نائے خدا کی عبادت میں ہی تمام رات گزار دیتے تھے کہ کافی عرصے سے مسجد میں کوئی واپسات قسم کے لوگ چوریاں کرنے لگ پڑے تھے، وہ تو اللہ کے گھر میں ایسی قبیح حرکات کی روک تھام کے لیے خود ہی مامور تھے اور ان کی اس ذمے داری کے بعد وہ داخلی اس سے باز ہونے پر بھی مجبور ہو گئے تھے۔"

ثاقب کو اپنی بات پر خود ہی شرمسار ہونا پڑا، کیوں کہ مذکورہ مسجد سینما ہال کے بالکل عقب میں واقع ہے، جہاں تایا نے اپنی ڈیوٹی از خود لگائی تھی کہ وہ اپنے رب کے گھر کی حفاظت کریں گے، لیکن کم تر فنی سوچوں نے اسے تایا کی ذات سے منسلک کر کے سینما کی آڑ لے کر غلط حوالوں سے مشہور کر دیا تھا۔

☆.....☆

سیلاب بد باتھا۔ وہ آہ دہکا تو نہیں کر رہی تھی، مگر وہ دل کے آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ اسے اپنے محروم و مرحوم تایا کے مرنے کا از حد افسوس تھا اور سب سے زیادہ اسے ڈلانے پر مجبور کچرے کی وہ تو کر رہی تھی۔ جس میں ایک شق تریز داسی ہوا پڑا تھا، جس کی مالیت پارو محبت کی وہ بے انتہا دولت تھی، جس کا بدلہ وہ بھی لگ چکا نہیں سکتی تھی۔

وہ تریز داسی کچرا گھر سے اٹھا کر تو نہیں لایا تھا، مگر لب اس نے کچرا گھر ہی کی زینت بننا تھا۔

☆.....☆

تایا دفنائے جا چکے تھے، ان کے بیٹے اصغر حسین نے بھی اُن کی میت کو کندھا دیا تھا اور تین بچوں نے بھی۔ فاتحہ خوانی کی محفل جمی ہوئی تھی، جس میں کھڑے گڑا نے کے علاوہ، اخبار وغیرہ سے بھی شغل کیا جا رہا تھا اور کارگاہ حیات میں یہی کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے، دنیا کی افزائش آ بھی رہی ہے اور جا بھی رہی ہے، بندے جی رہے ہیں اور مر بھی رہے ہیں اور تایا جیسے بے ضرر انسان تو اکثر مرتے رہتے ہیں۔

میٹھک میں تمام صاحب مشغول و مصروف تھے کہ ایک سفید پوش باریش آدمی اندر آئے اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے، فاتحہ پڑھنے کے بعد گویا ہوئے۔

"میرا نام ڈاکٹر رشاد فاروقی ہے، گھیا نہ روڈ پر میرا کلینک ہے، خدائے اعلیٰ و ارفع مرحوم و مقبور کو سایہ رحمت میں جگہ نصیب فرمائے (آمین) مرحوم... بہت ہی نیک سیرت اور اعلیٰ شخصیت کے مالک تھے، مجھے اکثر ملتے رہتے تھے بلکہ روز ہی ملتے رہتے تھے، گزشتہ تین دن سے نہیں ملے تو تشویش لاحق ہوئی، پتا چلا کہ شریف صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔ خیر... تشویش تو پہلے بھی تھی۔" وہ ٹھنڈی آہ بھر کر متوقف ہوئے، پھر بولے۔

"انہوں نے یقیناً آپ کو بھی بتایا ہوگا کہ وہ بچیوں کے کینسر کے عارضے میں مبتلا تھے اور اس کے تمام اثرات ان کے پاؤں پر واقع ہوئے تھے جو جلد یا بدیر دوسری بچیوں کو بھی متاثر کرتے جا رہے تھے۔ میں نے ان کا فوری طبی معائنہ بھی کروایا تھا اور انہیں علاج کی بھی پیشکش کی تھی، کیوں کہ میرے دوست سٹی ہسپتال میں بچیوں کے کینسر کے ماہر ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر افتخار مسعود، ان کا نام

ہماکھنی

ارشاد علی ارشد



انہی سے دل اور حجت کی لہر سے لہا اور شریعت کی ایک حجت کی لہر سے لہا

ایک مافوق الفہم اسرار بھری عجوبہ داستان

تقسیم نمبر 16

گزشتہ قسط کا خلاصہ

مکھنی ایک نہایت لڑین و سمجھدار اوروں سے مختلف سوچی، خیالات، نظریات اور قیمتی طاقت رکھنے والی گاؤں کی ایک لڑکی ہے جو اپنے ماں باپ دو بھائیوں انہر اور مظہر، ایک بہن سکھن اور محبت میں ناکام، غیر شادی شدہ بچہ و ذکیہ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سکھس کو اپنے کانچ فیلو سانول سے محبت ہو گئی ہے، مکھنی محبت اور عشق کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اپنی بہن سکھس کو سفید چوڑے کی دیوار کو اپنی قیمتی طاقت سے پرہ اسکرین بنا کر ماضی میں مہاجرین و مسافروں کا ایک لشکر دکھاتی ہے۔ محبت اور عشق کی باتیں کرتی، گتھیاں سلجھاتی اور مسلمانوں کے عظیم ماضی، اسلاف کے کارنامے بتاتی اور مکھنی سکھس سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ سانول سے ان کے رشتے کے مسئلے میں گھروں سے بات کرے گی۔ مکھنی کے بھائی انہر کی دینی رہائی سے پہلے شادی کر دینی جاتی ہے۔ مکھنی اسی دوران میں سانول کے گھر اس سے ملنے جاتی ہے۔ ایک روز سکھس کانچ سے نکلت رہی ہوتی ہے تو چوہدری انند رکھا کا بیٹا چوہدری راجیش نے وہاں تک خرچ پھیل کر کہا ہے کہ ایک روز جب سکھس اپنی ماں کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے تو چوہدری راجیش دوبارہ وہی حرکت کرتا ہے۔ اس دوران میں سکھس کا باپ اس کی مکھنی کا طعنہ منہ کے اوپر سے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک روز پھل بھی ہوتا ہے کہ چوہدری انند رکھا، مکھنی کا ماستر دیکھ لیتا ہے۔ مکھنی اس کو برا بھلا کہتی ہے تو وہ اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن مکھنی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ چوہدری انند رکھا اپنے کارندوں کے سامنے اس بے عزتی پر مکھنی کو دھکی دیتا ہے کہ اب میرے گھر سے جس تیرا نام ہوگا اور میرا ایک روز چوہدری انند رکھا کے کارندے مکھنی کو اغوا کر کے اس کی کوٹھری کی شکل میں موجود گھر سے میں پہنچا دیتے ہیں۔

چوہدری انند رکھا کے گھر سے مکھنی اس کی خواہشات پوری کرنے کی بجائے موقع ملے ہی چوہدری انند رکھا کی رانگل سے اسے قتل کر دیتی ہے۔ مکھنی کو چوہدری کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور پھر سکھس قتلے میں آکر بتاتی ہے کہ چوہدری انند رکھا کے بڑے بیٹے چوہدری مشتاق نے اسے پیغام بھیجا ہے کہ اگر سکھس کے لیے چوہدری راجیش کا ورثہ قبول ہے تو ہم مکھنی کو معافی کے بعد ریت کے قانون سے رہائی دلا دیتے ہیں۔ اسی دوران میں اینڈی انسپکشن شانت کو مکھنی سے تفتیش کے لیے پایا جاتا ہے۔ مکھنی اسے دیوار پر محمد بن قاسم کا ٹھکانہ کر کے دہلا دیتی ہے اور وہ قتلے دار کے گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ مکھنی کے معاملات سے خائف ہو کر قتلے دار اسے لے کر گاؤں آتا ہے جہاں مکھنی کے قاتل ہونے کے گواہ اپنے بیان سے منکر جاتے ہیں۔ مکھنی قتلے دار سے رہائی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر آتی ہے۔

گمراہ کرا سے چاچا ہے کہ اس کا ابا قاتل کے باعث چار پائی سے لگ گیا ہے، پھر کچھ دن بعد اس کے ابا کا انتقال ہو جاتا

158



نے تو چو بدلی راحیل کو ہارا الا مگر چو بدلی تار بھلی اور باپ کی موت کا بدلہ ہمارے مہر اور مگر سے لینے لگا۔ گاؤں کا کوئی مردوات میں نہیں سنا۔ گاؤں کی ساری عورتیں خوف کے سائے میں زندگی گزار رہی ہیں۔ سانول کو باپ مصلیٰ کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے کہ نہیں اس کی وجہ سے کوئی مصیبت ان پر نہ آجائے۔ سانول مصلیٰ کو کہنے کی کوشش کرتا ہے مگر مصلیٰ انکار کر دیتی ہے اور اپنے گھر پہنچ جاتی ہے جہاں چار لگا ہوا تھا وہ سوچتی ہے کہ رات کے اس پہر تارا توڑنے کی آواز سے سب اٹھ جائیں گے اور پڑوسیوں کو پتا چل جائے گا کہ درجیم اللہ ترکھان کے گھر کے دروازے کا آٹا کوئی توڑ رہا ہے۔ مصلیٰ اللہ سے دعا کرتی ہے۔

(اور اب آگے پڑھیے)

میں نے آنکھیں بند کر کے حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت علاء بن الحضرمیؓ کی دعائیں پڑھنا شروع کر دیں۔ جب آنکھیں کھلیں تو میں گھر کے اندر تھی۔ اندر گھپ اندھیر تھا مگر جس جگہ زندگی کی بے شمار جنسیں اور شاخیں گزری ہوں وہاں کا چپ چاپ اُپر ہو جاتا ہے، میں سید حالبا کے کمرے میں داخل ہوئی، یہاں بھی خلقت کے سائے تھے، مگر مجھے سب کچھ نظر آ رہا تھا وہ چار پائی جہاں ہمیشہ لاسویا کرتا تھا، اسی چار پائی پر ملانے آخری ٹنگ لی تھی، میں چار پائی پر بیٹھ کر اس پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ جب اپنے کمرے میں آئی تو تمام تر اقیانام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں نے کمرے کی لائٹ جلا دی، البتہ لائٹ جلانے سے پہلے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میں سکھان کی چار پائی پر ٹیک گئی، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی سکھان مجھے آواز دے گی، میرے سامنے چوڑے کی سفید کمر دردی دیوار تھی، اس دیوار پر سکھان صلاح الدین الہوی کو بٹھا گئے دوڑتے دیکھ کر ڈر گئی تھی، میں نے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھا۔ گھر والوں کو یاد کرنی رہی اور روتی رہی، آخر تھک ہار کر چار پائی پر گر گئی۔ لینے ہوئے بھی ذہن ماضی میں گھومتا رہا، خیالات کی دنیا میں بھٹکتی ہوئی مجھے کب خیر آئی پتا ہی نہیں چلا، پتا تب لگا جب دروازہ سے احوال پچنے جانے لگے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، کچھ لمبے اپنے ہونے کو رہنے ہونے کے درمیانی احساس میں جتا رہی تھی۔ احوال مسلسل بچ رہے تھے، میں نے ہتھیلیوں سے آنکھوں کو دگر دگر اور سر کو جھٹکا دیا۔ یہ دورانیہ چند سیکنڈ پر محیط تھا اس کے بعد میں مکمل شعور میں آئی، جسے میں احوال سمجھ رہی تھی اور دروازہ تھا۔ جسے بڑی بے دردی سے چٹا جا رہا تھا۔ میں بھات کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ صبح کا سفید و پھیل رہا تھا، باہر سے شور و غل کی آوازیں بھی آرہی تھیں، میں سمجھ گئی مہر اور مگر والوں کو میرے لوٹ آنے کی اطلاع مل چکی ہے۔ مجھے حالات عندیہ



دے رہے تھے کہ میرے لیے مشکل گھڑی آنے والی ہے، دروازے کی تڑتڑاہٹ بڑھنے لگی تھی۔ میں نے قیاس لگایا اگر دروازہ نہ کھولا تو وہ توڑ کر اندر آ جائیں گے۔ میں نے چادر اوڑھ لی اور جھنجھکی دیا رک کی طرف دوڑ لگا دی۔ دیوار کے پاس پہنچ کر میں ٹھٹھک کر رک گئی جو کھدات میں پڑھا تھا وہ بدحواسی میں ذہن سے اٹھ گیا۔ اب ٹھوس اور اونچی دیوار کے اس پار جانا ناممکن تھا۔

”دروازہ کھول مٹھنی۔ ہم جانتے ہیں تم اندر ہو۔“ باہر سے چیخ کر حکم جاری کیا گیا۔

”تم نے دروازہ نہ کھولا تو ہم اسے توڑ دیں گے۔“ یہ دوسری آواز تھی، ساتھ ہی دروازے کو زور سے دھکا لگا۔

”دروازہ توڑ دیا رات گزار کیوں کرتے ہو۔“ تیسری آواز کے ساتھ ہی دروازہ ویری طرح ہلنے لگا۔

میں نے دیوار پر ہاتھ رکھا، شاید رات کی طرح میں اس بار پتلی جاؤں، مگر اب کی بار کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بدحواسی اور پریشانی میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے، مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی، میں کیا کروں۔ میں نے پریشان نظریں آسمان کی طرف اٹھائیں، ساتھ ہی دھڑم کی آواز گونجی، میں نے گھبرا کر دیکھا، دروازہ صحن میں گر چکا تھا۔ لوگ شور مچاتے ہوئے سیلاب کی طرح گھر میں داخل ہو گئے، انہوں نے آتے ہی مجھے گھیرے میں لے لیا۔

میں نے لگائیں گھبرا کر دیکھا، تمام لوگ میرے شناسا تھے۔

ضمیر چاچا، صابر چاچا، اسد کھن، چاچا بکرا، ماسی گریماں، جنتاں، چو چا پتی۔ سب کے سب میرے دیکھے بھالے لوگ تھے، مگر اس وقت ان کے چہروں پر اجنبیت مسفا کی اور بربریت عیاں تھی برخلاف جنتاں تقریباً مجھ سے چمٹی ہوئی فٹے میں بولی۔

”تو پھر آگئی اے۔ اے۔ اے (ابھی) کتنوں کو مارے گی اور کتنے کار (گھر) تباہ کرے گی؟“ اس کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی کہ چاچا پتی وچو درشت لہجے میں بولی۔

”تیرے گھر والے تھے (تو) اس (بھاگ) گئے۔ ٹو اسان (میں) صبر چاچا، باغ واسطے آگئی ہیں۔“ (مصیبتوں میں ڈالنے کے لیے) کہتے ہوئے اس نے مجھے ہلکا سا دھکا دیا، میں پیچھے گھڑی ماسی گریماں سے ٹکرائی، اس نے مجھے واپس آگے دھکا دیا۔

”دیکھ مٹھنی، تیرے حق وحق یہی بہتر ہے کہ تو ہم دادگر ہمیشہ کے لیے چھوڑ جا۔“ چاچا بکرا جو کبھی میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے دعا میں دیا کرتا تھا، آج بڑی بے رحمی سے مجھے حکم دے رہا تھا۔

”یہاں نہیں جائے گی۔ اسے دھکے دے کر مہر دادگر سے باہر نکال دو۔“

”ہاں ہاں اسے باہر نکالو۔“

”انہاں دی اپنی عزت ہے، کس سالہی عزتیاں تال بھی کھیلوا کرے گی۔“

”لوگوں کی باتیں میرے دل کو لہو لہان کر رہی تھیں، میرا اس وقت چپ رہنا دانش مندی تھا۔ اگر بولا جائے تو ان کے تیور بتا رہے تھے، وہ مجھے روٹی کی طرح ڈھنک کر رکھ دیں گے، مگر جب ماسی جنتاں بولی تو میرے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”ہاں، ہاں بھراں صابر ٹوچ کبہ رہا ہے، ان کی بھلا کیا عزت ہے۔ دو سالوں تو اوپر ہو گئے نے مٹھنی کو قابو ہوئے، پتا نہیں کتھے کتھے راتاں گزار کے آئی ہے۔“ اس کے الفاظ میرے دماغ میں گولیوں کی طرح برسنے لگے۔ بوڑھی عورت کو اتنی بھی حیاء آئی کہ وہ پرانے مردوں میں گھڑی ہو کر کیا بک رہی ہے۔ میرا پارہ چڑھنے لگا اور آنکھوں میں سرخی اتر آئی، میں چاہتی تو اس کی چھوٹی چھوٹی بے حیا آنکھیں اپنے بڑے ناخنوں سے باہر لال دیتی، مگر اس کے ہموا دوسرے مردوں عورتوں نے مجھ پر دھاوا بول دینا تھا۔ میں نے انتہائی ڈکھ سے کہا۔

”ذکر ماسی جنتاں، نہ کر۔ تیری دی اک دمی ہے۔ (تمہاری بھی ایک بیٹی ہے) سوچ ذرا۔“

میری بات سنا میں اچک کر وہ بولی۔

”ہائے ہائے میری معصوم بیٹی کے بارے میں کچ (کچھ) مت کہنا، اس معصوم نے کدھی ٹوے (کبھی دروازے) سے باہر نہیں بھانکا۔ تو تو دو سال غیروں میں گزار کے آئی ہے۔“

"کم بخت اب تو ہماری بیٹیوں پر الزام تراشیاں کرنے لگی ہے۔" مجمع کے بیچ میں سے کسی نے کہا۔ ہاں جتناں نے دو تھری ضرب سینے پر لگاتے ہوئے کہا۔

"ہائے او میرے رہا۔۔۔ میری معصوم بیٹی پر الزام۔۔۔" کہتے ہوئے اس نے مجھے زور کا دھکا دیا، اس بار کا دھکا سابقہ دھکوں سے بھاری تھا۔ میرے پاؤں اکٹڑ گئے، میں پیچھے لڑکھرائی تو کمر پر ایک اور ضرب لگی۔ "برے منحوس۔" ان الفاظ کی سماعت کے بعد مجھے نہیں پتا کہ کہاں کہاں اور کس کس کی طرف سے دھکے دیے گئے۔ دھکوں کے دورانیے میں متفرق آوازیں بھی کانوں سے گھرائی رہیں۔

"اسے دھکے مار مار کر مہر داؤ گھر سے باہر نکالو۔ یہ منحوس ہے، اس نے مہر داؤ گروالوں کو اندھیر گھری میں دھکیلا ہے۔" میں دھکے کھاتی رہی آگے بڑھتی رہی اور یہ باتیں سنتی رہی، حتیٰ کہ مجھے گھر سے باہر گھسیٹ کر پھینک دیا گیا۔ لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ بڑھتی ہوئی تعداد کے ساتھ تشدد میں بھی اضافہ ہونے لگا۔

مجھے ٹھہرے مارے گئے، دھکے دیے گئے اور عورتوں نے ملے جلی برساتے۔ میری زبان کو چپ کا تالا لگ گیا تھا۔ "آؤ! مکھنی تیرا ہا رجم اللہ تر کھان کتنا غیرت مند شخص تھا۔ تیرا بھائی اہا سے کئی زیادہ غیرت مند ہے، جس نے چوہدری کو کلباڑی کے دار کر کے عبرت ناک انجام تک پہنچایا، مگر تیرا اب یہ مشر، میرے اندر سے اسکی پکار اٹھی کہ تن بدن میں آگ جل اٹھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے پکھلا ہوا تانا میرے گلے میں اندھیل دیا ہے۔ میں بے اختیار چیخ اٹھی۔ میری بلند چیخ انتہائی اذیت ناک تھی۔ لوگ چند لمحے ٹھٹھک کر رک گئے۔ کسی نے جلا کر کہا۔

"مارو مارو اس کے چیخنے چلانے پر مت جاؤ" اس آواز کے ساتھ لوگوں نے پھر دھاوا بول دیا۔ درد کی تیز لہر میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی، ٹھوکریں اس قدر زیادہ تھیں کہ میں زمین پر گر گئی۔ میں لوگوں کے ہجوم میں گری پڑی تھی، شاید مجھے پاؤں سے روند دیا جاتا ایک آواز نے سب کو ساکت کر دیا۔ چوہدری مشتاق آگیا، چوہدری مشتاق آگیا، اس آواز نے مجمع میں کھلبلی مچا دی۔ میرے ارد گرد بھی ہوئی تانیں پیچھے ہٹ گئیں، میں نے بیشکل سراٹھا کر دیکھا، لوگوں کی توجہ چوہدری مشتاق کی گاڑی کی طرف مبذول تھیں، میں نے بہت کجباکی اور اُنھ کھڑی ہوئی، بہت سے لوگ چوہدری مشتاق کی گاڑی دیکھ کر ٹھٹھکنے لگے، لوگوں نے گاڑی کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ گاڑی میرے قریب آ کر ٹک گئی۔

ٹھٹھک کی آوازیوں سے دروازے کھلے۔ چوہدری مشتاق اپنے کارندوں کے ساتھ باہر آیا۔

چوہدری مشتاق فلمی ولن کی طرح میرے ارد گرد گھومتے ہوئے بولا۔ "بلے بلے ارج تے مہر داؤ گھر کے بھاگ جاگ اٹھے ہیں، رجم اللہ تر کھان کی دھکی مکھنی آئی ہے۔" چوہدری مشتاق نے انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر خباثت پوری آب و تاب کے ساتھ جمع تھی، میرے گالوں پر خون کی دھاریں لکیریں، ہمارے تھیں۔ چوہدری مشتاق نے میرے چہرے کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا مگر میں نے اس کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا، وہ ہنس کر بولا۔

"اتھری گھوڑی اور ضدی سوار، ارج تو مزہ آئے گا۔ جیل۔۔۔ اوئے جیلے۔"

"حکم چوہدری صاحب!"

"بھاگ کر جا قارم ہاؤس سے میرا گھوڑا لے آ، جلدی جا۔"

"بہتر چوہدری صاحب۔"

"اور سن۔"

"جی چوہدری صاحب۔"

"ساتھ میں رہی بھی لانا۔ آج ہم مکھنی کو مہر داؤ گھر کی سیر کروائیں گے۔" چوہدری کے تیور اور ارادے بھانپ کر میں اندر سے کانپ اٹھی، مجھے اپنی موت واضح نظر آنے لگی، میں موت سے کبھی

خوف زدہ نہیں ہوئی مگر اتنی ہولناک اور شرمناک موت۔ اوہ میرے اللہ۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا، میں نے تلاش بنوں پر لگا، ڈالی تو میرے اندر اک ہوک اٹھی، مٹھنی وہ چلے گئے جو مظلوموں کی آہ پر خالموں کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیتے تھے، یہاں تیرا کوئی پرسان حال نہیں۔ یہاں مظلوموں کی رادری نہیں کی جاتی، انہیں ظلم و ستم کی آگ میں دھکیلا جاتا ہے۔ نہیں نہیں۔ میں نے جواب دیکل دی، ذکیہ ہائی کے کوشوں پر جہاں جسوں کو نو جا جاتا ہے، وہاں بھی ایک مرد آہن پیدا کر دیا تھا۔ شاید یہاں بھی کوئی مائی کالال ولاور کی طرح جاگ اٹھے۔ چوہدری کے بندے مجھے رسیدوں سے ہانده رہے تھے جب میں نے چلا کر کہا۔

”واہ میرا دام کے مرد وواہ۔ جب بے بس لڑکی تمہارے زرخے میں تھی تو مجھ پر تباہ توڑ چلے کیے، اب تم لوگوں کو سانپ سوگھ گیا۔ مجھے رحیم اللہ کی بیٹی ہونے پر فخر ہے، میں لڑکی ہوں مگر خالم کے سامنے خاموش نہیں رہی، ظالم کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے تم اسی طرح اپنی ماں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزت ایسے بے غیرت چوہدریوں کے ہاتھوں لٹواتے رہنا مگر خاموش رہنا، ابھی جرأت و بہادری کا مظاہرہ نہ کرنا، رحیم اللہ ذات کا ترکھان ہے۔ مگر اس کی اولادوں نے کبھی ظلم کے سامنے سرخم نہیں کیا۔ میں نے تھوڑا توقف کے بعد چل کر کہا۔ فھو ہے تم مردوں پر۔ فھو۔“

”اوتے زیادہ بک بک نہ کر۔ جتنا بولے گی اتنی زیادہ مار کھائے گی، چل اوتے چیلے گھوڑا روڑا۔“ چوہدری نے حکم جاری فرمایا۔ میری باتوں کا لوگوں کے مجمع پر کوئی غیر معمولی اثر نہیں ہوا، جیٹا گھوڑے پر سوار ہونے کے لیے آگے بڑھا تو میں نے آخری حربہ اس پر آزمایا۔

”چیلے آج تیرے گھوڑے کے پیچھے مٹھنی بندھی ہوئی ہے، یاد رکھنا کل یہاں تیری بہن شائستہ بندی ہو گئی۔ جو عزتوں سے کھیلتے ہیں، ان کی عزتوں سے کھیلا جاتا ہے۔“ میری بات کا اس پر اتنا اثر ہوا۔ وہ حقارت سے بولا۔ ”مٹھنی تیرا بھی انجام ہوا تھا، کیوں کہڑا پیڑی (اپنی) اوقات سے بڑھ کر چلتی ہے۔ لہج تیری ساری بڑبڑناک کے راستے لکل آئے گی۔“ وہ اچک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ لوگوں کے لیے ایک دلچسپ کھیل کا آغاز ہونے والا تھا۔ چوہدری مشتاق یہ نگارہ دیکھنے کے لیے گاڑی میں جا بیٹھا۔

چیلے نے گھوڑے کو ایڑی لگائی، مجھے ایک جھٹکا لگا، جب تک گھوڑے کی رفتار دھیمی تھی میں ساتھ ساتھ بھاگتی رہی، جیسے ہی اس کی رفتار بڑھی میں اڑتی ہوئی منہ کے بل زمین پر گر گئی، لوگوں کی ٹلی چلی آوازوں سے اندازہ ہوا ہاتھ اوڑھ خوشی کا اظہار کر رہے ہیں، مظلوم کو وقت پہنچا کر اور اسے نابود کر کے دیکھ کر خوش ہونے جا رہے تھے۔ پہلے مرحلے میں مجھے بے تحاشہ چونٹیں آئیں، مجھے احساس ہونے لگا، جسم کے کئی حصوں سے خون کا رساؤ جاری ہو چکا ہے، اس احساس کے بعد اصولاً مجھے چٹخنا چلانا چاہیے تھا، مگر میرے لب خاموش تھے، دھنکا میرے ذہن میں زور زور کے دھماکے ہونے لگے۔ ان دھماکوں سے جسم لرزہ بر اندام ہوا اور زمین کے اندر کچھ حرکات و سکنات کا احساس جاگنے لگا۔ زمین میں یہ اٹھل پٹھل کیسی ہے، یہ حرکات و سکنات کیا ہیں؟ میری ساری توجہ زمین کے اندریوں بند ہو گئی جس طرح پانی کو بوتل میں ڈال کر ڈھکن بند کر دیا جاتا ہے، میرے ذہن میں حضرت بلالؓ بن رباحؓ کی خوب صورت حسین و جمیل شبیہ ابھرنے لگی۔ انہیں والدہ کی نسبت سے بلال ابن ابراہیمؓ کہا جاتا ہے، مگر عام مسلمان میں وہ بلال حبشی کے نام سے مشہور ہیں، حبشی ہونے کے سبب ان کا رنگ سیاہ نظر آ رہا تھا، قد لمبا اور قد رے جھکا ہوا۔ گھنے بال جو بیشتر سفید تھے، پتلا چہرہ جو عجیب و غریب چمک سے دک رہا تھا، میں انہیں غور سے دیکھ رہی تھی، یہ امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ انہیں پتا چلا، بلال مسلمان ہو چکا ہے۔ وہ مسلمانوں کا بدترین دشمن تھا، اپنے غلام کے ایمان لانے کو کیسے برداشت کر لیتا۔ امیہ کو سخت گزند پہنچا۔ حضرت بلالؓ کے ایمان لانے کی پاداش میں انہیں طرح طرح کا ایذا پہنچایا جانے لگا۔ میرے دماغ میں عرب کے ریگستان گھسنے لگے۔ یہ ریگستان آج بھی آگ بھی اگتے ہیں۔ چودہ سو سال پہلے ان کی حرارت کا کیا عالم ہوگا۔ حضرت بلالؓ حبشی کو گرم تپتی ہوئی ریت پر سیدھا لٹایا گیا۔ مزید ایذا دینے کے لیے سینے پر پتھر کی بڑی چٹان دھری گئی، ان تکالیف کے بعد حضرت بلالؓ کو حکم دیا گیا کہ اسلام چھوڑ دو۔ مگر بلالؓ کے منہ سے احدا حد کے الفاظ سن کر ان پر تشدد کی مٹا نہیں مزید کس دی گئی۔ رات میں

زنجیروں سے جکڑ کر جسم پر کوڑے برسائے جانے لگے۔ عتاب دینے والوں میں کبھی ابو جہل کوڑا اٹھالیتا، کبھی امیہ بن خلف وہ تھکنا تو ملازموں کے سپرد کر دے جاتے۔ دوسری صبح گرم زمین پر لٹا کر کوڑوں سے لگنے والے زخموں کو دسعت دی جاتی تاکہ وہ اسلام سے ہٹ جائیں۔ مگر حضرت بلال حبشیؓ کہتے مبعوض صرف ایک ہی ہے۔ ان الفاظ سے امیہ بن خلف تنگ پا ہو جاتا۔ سخت تشدد کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا تھا۔ حضرت بلالؓ کو مکہ کے لڑکوں کے حوالے بھی کیا تاکہ وہ انہیں طرح طرح سے ستائے۔ سیدنا حضرت حبشیؓ پر ظلم کے پہاڑ ڈھائے گئے مگر وہ اسلام پر ثابت قدم رہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے انہیں آزاد کر دیا۔ وہاں سے آزاد ہوئے تو سرکارِ دو عالم، نورِ دو عالم حضرت محمد ﷺ کے مبارک قدموں میں آ بیٹھے۔ حضور ﷺ نے انہیں ہجرت کے پہلے سال مؤذن مقرر فرمایا۔ جب فتح مکہ ہوا تو خایہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دینے کا شرف بھی حضرت بلالؓ کو حاصل ہوا۔

حضرت بلالؓ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شامل تھے، حضرت بلالؓ نے اپنے سابقہ کالور اسلام دشمن امیہ بن خلف کو بیٹے سمیت غزوہ بدر میں قتل کر دیا تھا۔ حضرت بلالؓ حبشیؓ کو آقائے دو جہاں حضرت محمد ﷺ کے لڑائی خادم، حصارِ پدر اور خازن ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ حضرت بلالؓ حبشیؓ کی وفات 641ء یا 20ھ میں ہوئی۔ آپ دمشق میں مدفون ہیں۔ حضرت بلالؓ دنیا کے واحد انسان ہیں جن کا حشر تو دمشق ہے لیکن مٹھریٰ شریف ہوگا۔

میرے جسم نے ایک زور کا جھٹکا کھایا۔ زمین میں جب تک حضرت بلالؓ کے واقعات دروالمبار ہے مجھے کسی بھی چوٹ کا احساس نہیں ہوا۔ میرے دل و دماغ سے یہ خیال تک ٹھوہر گیا کہ مجھے گھوڑے کے ساتھ ہاندھ کر کھینچا جا رہا ہے۔

سارے احساسات مٹ گئے تھے۔ اس لیے میں نہ جیتی نہ چلائی۔ جب اپنی پوزیشن کا احساس جاگا تب دردِ حملیہ اور ہونے۔ میری پوزیشن کا عالم یہ تھا کہ مجھے الٹا لٹا کر ہاتھ پاؤں سے باندھا گیا تھا۔ تم شدہ کہناں سینے کے ساتھ پیوستہ تھی، ہاتھ ٹھوٹھریٰ کو چمور ہے تھے دہرا سی جسے شہداء کھینچ رہا تھا میرے ہاتھوں کے درمیان سے گزری گئی تھی۔ متعدد مقامات سے میرے کپڑے پھٹ چکے تھے، زخموں سے جسم کا رول رولیں ڈھل رہا تھا، پورا جسم زخموں سے چھلکی ہو رہا تھا۔ اس وقت میری سوچ اور احساس عجیب حالت کا شکار تھے، میں نہ جینے کی آرزو مند تھی نہ موت کی طلبگار۔ شاید میں موت اور زندگی کے درمیان ان دیکھے خلا میں ملتی تھی۔ دلچا مجھے ایک اور زور کا جھٹکا لگا۔ میں زمین سے کئی میٹر اوپر اٹھ گئی، جھٹکا لگنے اور زمین سے اوپر اٹھنے کا عمل اتنا درشت ناک اور اذیت بھرا تھا کہ پہلی بار میرے منہ سے کرہ ناک نکلیں، پچیس بلند ہونے لگیں۔ میں چند سیکنڈ فضا میں بلند رہنے کے بعد وعرہ ام سے زمین پر گری اور گیند کی طرح لوٹتی چلی گئی، شاید ری ٹوٹ گئی تھی، میرے جسم نے سیکڑوں قلابازیاں کھائیں، مجھے ہالک بھی پتا نہیں چلا کہ میں کہاں گری ہوں اور کس طرف لڑکتی جا رہی ہوں، ہاں البتہ میری کرہ ناک نکلیں مجھے احساسِ دلاری تھیں، زخموں میں بے تحاشہ اضافہ ہو چکا ہے، دردِ قاطعی برداشت حد تک بڑھ گیا تھا۔ میں اچھلتی کودتی، یہاں وہاں گھرائی اور قلابازیاں کھاتے ہوئے جب دیکھتی تو آنکھوں کے سامنے کھل اندھیرا تھا۔ لختہ بھر جسم میں ہلکی سی حرکت پیدا ہوئی پھر کچھ پٹانہ چلا کر میرے ساتھ کیا ہوا۔

☆.....☆

میری آنکھیں کھلی تو جسم کا ایک ایک دردِ کردہ ہاتھ۔ سر بھاری اور چہرہ سو جا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ خون آلود آنکھوں سے جسم کا جائزہ لیا تو دل ڈوبنے لگا۔ پورا جسم خون میں لت پت تھا۔ کچھ زخموں سے خون کا لٹکا سا ذہنوز جاری تھا۔ دسیاں ٹوٹ چکی تھیں، مجھے احساس ہونے لگا چہرے پر بہت سا خون جم گیا ہے۔ خون صاف کرنے کے لیے ہاتھوں کو حرکت دی تو ذہن بھک سے اڑ گیا۔ پایاں بازو کام نہیں کر رہا تھا۔ دائیں بازو کی آستین سے چہرہ صاف کیا اور جسم کو حرکت دی۔ دوسرا انکشاف ہوا کہ ٹانگیں تو سلامت ہیں مگر پایاں پاؤں حرکت نہیں کر رہا۔ میں کسی نہ کسی طرح سمٹ کر ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

مہر داد مگر میں کوئی جنگل نہیں تھا۔ البتہ اس سے کوسوں دور ایک جنگل تھا۔ دوسرے علاقوں کی طرح مہر داد مگر کے لوگ بھی وہاں سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے ہیں۔ ماحول کا جائزہ لینے پر مجھے اندازہ ہوا میں اسی جنگل میں پڑی ہوئی ہوں۔ یہ

جنگل علاقے کی زمینی سطح سے کافی نیچے تھا۔ گویا میں ڈھلوان میں تھلا بازیاں کھاتی ہوئی گھری تھی۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ جسم کے چند حصے عریاں ہو گئے تھے، خوش فہمی سے ریشم سے لی گئی بڑی چادر میرے ساتھ لپٹی رہ گئی، گوکہ چادر بھی کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی مگر بڑی ہونے کی وجہ سے بہت حد تک سلامت تھی۔ اس کے محفوظ حصوں سے جسم کو ڈھانپ لیا۔ اب مجھے جنگل سے نکلنا تھا۔ یقیناً میری سحاش جاری ہوگی، چوہدری کے پالتو کتے جنگل کا چپہ چپہ چھان رہے ہوں گے، مجھے تنگ پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں نے قریب بڑی ہوئی درخت کی موٹی شاخ اٹھائی اور اٹھنے کی کوشش کی۔ میرا بازو اور ایک پاؤں کام نہیں کر رہے تھے، ایک ٹانگہ اور ڈانڈے کے سہارے چلنا محال تھا۔ میں کئی بار ٹھوکر کھا کر گر چکی تھی، بار بار گرنے سے زخموں کا درد سوا ہورہا تھا، مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ مجھے پتا ہے یہاں ہمت ہارنے کا مطلب ہے رات میں مجھے جنگلی جانوروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں تمام تر ہمت بروئے کار لا کر دھیرے دھیرے چلنے لگی۔ مجھے دو شدید مشکلات کا سامنا تھا۔ ایک تو بازو اور پاؤں کام نہیں کر رہے تھے دوسرا مجھے اوپر کی جانب چڑھنا تھا۔ میں جیسے تیسے اوپر پہنچنے لگی۔ یہاں جنگ کا اختتام ہو رہا تھا۔ سامنے جھل میدان تھا، یہ میدان میرے لیے لعلی اچھی تھا۔ مجھے تو فتح تھی کسی شہنشاہی علاقے میں اٹھوں گی، لیکن نتیجہ خلاف توقع ملا۔

میں نے چند لمحات سوچا ایک تو انا ٹھوڑا کتنے تیز بھاگ سکتا ہے۔ چوہدری کا ٹھوڑا کتنا تیز اور کب تک بھاگا ہوگا۔ اس کا دورانیہ دس پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہیں ہوگا۔ زیادہ ہوتا تو میرے جسم کی چھٹی ہڈی جانی۔ صرف دس پندرہ منٹ کی کل مسافت میں ہم اچھی علاقے میں کیسے پہنچ آئے؟ یہ سوال میرے ذہن میں کھلنے لگا۔ شاید میں اس پر مزید غور کرتی، لیکن میری توجہ چند لوگوں کی طرف مرکوز ہو گئی۔ مجھ سے چالیس پچاس گز دور دو کام میں مشغول تھے۔ دھیان دینے پر اندازہ ہوا وہ لوگ کنواں کھود رہے ہیں۔ ان کی تعداد آٹھ دس رہی ہوگی۔ میں نے ادھر ادھر لگا دوڑائی۔ جھل میدان حد نگاہ ہے اب وہاں تھلا خشک زمین بھر لگ رہی تھی۔ میدان میں اگر درخت، پودے اور گھاس بھی اگے بھی تھے تو اب دھوپ کی تیز تابلیت نے انہیں ہری طرح جھلسا دیا تھا۔ درختوں سے تمام پتے جھڑ چکے تھے۔ گھاس اور پودے جل گئے تھے، مجھے اندازہ ہوا یہاں بہتر ترین قسط سالی چل رہی ہے۔ دفعتاً میرے ذہن میں زور زور سے دھماکے ہونے لگے۔ میں بے اختیار ہر ٹکڑ کر بیٹھ گئی۔ اوہ میرے اللہ، میرے من سے اختیار لگا۔ میرا سر بھاری ہونے کے ساتھ چکرانے لگا۔ میں نے ایک بازو کی زمین پر قبضہ لگا کر خود کو سنبھالا۔ آنکھوں میں چند منظر گھومنے لگے۔ ایک ایسا ہی خیر شدہ جنگل جس میں ایک اوچتر عمر بد حال شخص کے ساتھ چل رہی تھی، اس کے پاؤں میں ہوائی سیلبر تھے۔ وہ انتہائی ست رہی سے چل رہا تھا۔ اب جنگل سے باہر میدان میں نکلے۔ یہاں آٹھ دس آدمی کنواں کھودنے میں ملن تھے۔ مناظر تیزی سے بدلنے لگے۔ کنواں سے پانی نکلا۔ لوگوں نے خوشی سے نعرے لگائے اور ہستی کی طرف برتن لینے کے لیے بھاگے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ڈول پھینک کر کنویں سے پانی نکالا۔ میرے پارٹنر نے مجھے دھکا دیا۔ یہ پانی تیرے لیے نہیں ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس انکلی شخص نے کنواں بھروا دیا۔

زہرا لود پانی۔ میرے دماغ میں الفاظ ہتھوڑے کی طرح برسنے لگے۔ مجھے اندازہ ہوا میں جس جنگل سے ابھی ابھی نکل کے آئی ہوں یہ وہی جنگل ہے اور اب اسی میدان میں گھری ہوں، ویسے ہی آٹھ دس لوگوں نے کنواں کھودا اور پانی نکلنے کی خوشی میں نعرے لگا رہے ہیں۔ میرے اندر خطر اب ختم نہیں لگانے لگا۔ یہ پراسرار معرکہ کیا ہے؟ کل اور آج کے سارے مناظر یکساں تھے، میں نہ کل کچھ سمجھ پائی تھی اور نہ آج سمجھ پادی ہوں۔ میں تب بھی کم فہم و ناقص الحقل اور بے بس لڑکی تھی اب بھی میری وہی حالت تھی۔ اس پراسرار سیلے کی کڑ پال باہم کیسے ہوست ہوئیں یہ سوچنا بعد کی بات ہے۔ فی الحال میرے لیے پریشان کن خیال یہ تھا کہ کنواں سے نکلنے والا پانی زہرا لود ہے۔

ادھر سے لوگ خوشی خوشی سے چلنے لگے۔

"پانی نکل آیا، پانی نکل آیا۔" وہ خوشی سے رقص کرنے لگے، مگر وہ لاعلم تھے کہ اپنی موت پر رقص کر رہے تھے۔ میں



مبارک باد

ہمارے دوست لکھاری ممتاز احمد (سرگودھا) گزشتہ ماہ عمرے کی سعادت سے فیض یاب ہوئے۔ ادارہ ممتاز احمد کو اس سعادت پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔

تفکرات میں گری ہوئی تھی۔ ادھر سے مزید آوازیں آنے لگیں۔

"چلو چلو اپنے برتن لاؤ۔ بستی والوں کو بھی اطلاع پہنچاؤ، سب پانی لے کر جائیں۔"

"ہاں ہاں چلو۔"

"اودھ میرے اللہ۔ یہ لوگ چل پڑے ہیں، میں بوکھلاہٹ میں کھڑی ہو گئی، میں نے سیکڑوں آدمیوں کو موت سے بچانا تھا، میں چٹکتی ہوئی ان کی طرف بھاگ پڑی۔"

"اے لوگو۔ سنو سنو۔ میری بات سنو۔ کہاں چل دیے رکھو؟" میں کہتی ہوئی سر پٹ بھاگ رہی تھی۔ اپنی خوشی میں تین لوگ میری آواز نہ سن سکے مگر میں نے بہت جلد انہیں پہنچا لیا۔ میں نے اپنی اکڑی سانسیں بحال کرتے ہوئے غصے میں کہا۔

"کب سے پکار رہی ہوں؟ سب کے سب بہرے ہوئے تھے نہیں میری بات؟"

مجھے انتہائی حیرانی سے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی امپوٹیل یا ناقابل فہم مخلوق ہوں۔ میں نے بلا تمہید ان سے کہا۔

"یہ کنوں جو آپ لوگوں نے کھودا ہے اس کا پانی نہ ہر آلود ہے، خدا کے لیے یہ پانی مت پینا ورنہ تم سب اپنی بیوی بچوں سمیت موت کے منہ میں جاؤ گے۔" میری بات سن کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسے لگا جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہے۔ چند لمحوں بعد ان میں سے ایک بولا۔

"اے لڑکی کیا کچھ اس کر رہی ہے۔" اس کی آواز سن کر دوسرے بھی ہوش میں آ گئے۔

"چل بھاگ ادھر سے۔"

"ہم نے دن رات کی محنت سے کنواں کھودا ہے، اب پانی لگا ہے تو تو اپنا منہ نہ بچنے آ گئی ہے۔"

"اے چھوڑ دو جی، چلو بستی والوں کو پانی نکلنے کی خوش خبری سنائیں۔"

ان لوگوں کی باتیں سن کر اودھ ارادے بھانپ کر میں کانپ اٹھی۔ میں نے تڑپ کر کہا۔

"آپ لوگوں نے ان تھک محنت یقیناً زندگی کو حرارت پہنچانے کے لیے کی ہے نہ کہ موت کے لیے، کہتے ہوئے میں نے ان کے ہنسنے والے چہروں پر نگاہ ڈالی، تیز دھوپ کے سبب ان کے رنگ مجلس گئے تھے۔ ہونٹوں پر پیاس کی شدت نے چڑیاں جھار رکھی تھیں۔ ان کی حالت زار دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہو رہا تھا۔ مگر اصل حقیقت بتانا ضروری تھی، میں نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ اس پانی کا کیا فائدہ جسے پیتے ہی ہندو موت کی آغوش میں سو جائے۔

"ہم کیسے یقین کر لیں کہ پانی نہ ہر آلود ہے؟" میں نے دیکھا ان کے لہجے کا جوش باند پڑ گیا ہے۔ میں نے کہا۔ "اللہ تعالیٰ نے کرہ ارض میں جتنی بھی مخلوقات پیدا فرمائی ہیں، سب کی سب قیمتی ہیں۔ لیکن انسان اشرف المخلوقات ہے، انسان سے کوئی مخلوق افضل نہیں۔"

"تم کہنا چاہتی ہو، جلدی بولو۔ ہمارے بیوی بچوں کا پیاس سے نہ احوال ہے۔"

"میں کہنا چاہتی ہوں آپ ایک دو جانور یا پرندے لے آئیں، پہلے پانی انہیں پلایا جائے تاکہ شک رفع ہو۔" میرے لہجے کے اعتماد نے انہیں پسپا کر دیا۔ وہ آپس میں بحث میں لگے۔ کچھ کا خیال میرے حق میں تھا اور کچھ کا نہیں۔

میں لیکن ترعدہ بہر حال میری تائید میں نکلا۔ ایک بکری اور گدہ حالاً پا گیا۔ انسانوں کی طرح جانوروں کی حالت زار بھی واضح کر رہی تھی کہ وہ بہت پیاسے ہیں۔ ڈول پھینک پانی نکالا گیا۔ پانی دیکھ کر لوگوں کی بے چینی سوا ہو گئی۔ وہ لشک ہوتوں پر زبان پھیرنے لگے۔ تاہم وہ صبر کا مظاہرہ کر رہے تھے، پانی جانوروں کے سامنے رکھ دیا گیا۔ پیاسے جانور غٹا غٹ پانی پی گئے، لوگ عجیب کیفیت میں مبتلا تھے، ان کی بے چینی نظریں جانوروں پر جمی ہوئی تھی۔ پانی پینے کے پانچ منٹ بعد بکری کے منہ سے غرغری آواز نکلی، ساتھ ہی سفید جھاگ کا اخراج ہوا، لوگ بے اختیار اس کے قریب چلے گئے۔ بکری لہرا کر زمین پر گر گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی بازی ہار گئی۔ لوگوں میں کھلبلی مچ گئی، ان کے چہروں کے رنگ فق ہو گئے تھے، کیفیت ایسی تھی کہ کانٹو تو خون نہیں۔ شاید وہ چشم تصور میں دیکھ رہے تھے۔ اگر میری بات نہ مانی جاتی تو بکری کی جگہ ان کی لاشیں پڑی ہوئی ہوتیں۔ وہ اپنی حواس باختہ کیفیت سے باہر نکل نہیں پائے تھے کہ گدھے کا حشر بھی بکری جیسا ہوا۔ لوگ میرے پاؤں میں گر گئے۔

"انہیں معاف کر دو، ہم لاعلم تھے۔ تم علم والی ہو، یقیناً ہم نہیں جانتے تھے کہ ہم اپنے لیے قبر کھود رہے ہیں۔" معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا ہے یہاں پر بدترین قحط سالی چل رہی ہے۔ انسان، جانور بھی بھوک و پیاس سے ہلہلا رہے ہیں، بھوک برداشت ہو جاتی ہے، مگر پانی کے بنا زندہ رہنا محال ہے۔ اس کنواں کو بند کر دو اور یہاں، میں نے آگے چل کر ایک جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں کنواں کھودو۔ یہ مٹی نرم ہے اور اس کا پانی بھی ٹھنڈا میٹھا ہوگا۔ جو محنت اور مشقت تم لوگوں نے اس کنواں پر صرف کی ہے۔ اسی محنت سے یہاں کام کر دو گے تو صرف ایک دن میں پانی نکل آئے گا۔"

"آپ ہماری کستی میں قیام کریں۔ ہمیں خدمت کا موقع دیں۔ ہم۔۔۔"

"انہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔ مجھے اور بہت سے کام نہانے ہیں، میرے کام بہت اور وقت بے حد کم ہے۔ اس لیے مجھے جانا ہے۔" میں نے کہتے ہوئے قدم بڑھائے تو عقب سے آواز آئی۔

"کیسے دیکھے۔ اتنا بتادیں آپ کون ہیں، کیا اس سے آئی ہیں اور کہاں جاتا ہے۔"

ان کے سوالوں پر میں چند لمبے سوچ میں گر گئی۔ نہیں کیا جواب دوں۔ تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے کہا۔

"میں رحیم اللہ ترکان کی بیٹی تھیں۔"

یہاں سے چند کلومیٹر دور پیچھے یا آگے ایک گاؤں ہے مہر داد نگر، میں وہاں سے آئی ہوں، جانا کہاں ہے فی الحال مجھے بھی نہیں پتا۔ میرے جواب پر میں نے دیکھا لوگوں نے حیران نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر ایک نوجوان بولا۔

"یہاں سے چند کلومیٹر دور کوئی بھی مہر داد نگر نام کا گاؤں نہیں ہے، بلکہ ہم یہ نام ہی پہلی بار سن رہے ہیں۔" نوجوان کی بات جاری رکھتے ہوئے میرے ابا کا ہم عمر ایک دوسرا شخص بولا۔

"چند کلومیٹر کی سیکڑوں میل دور بھی ایسا کوئی گاؤں نہیں۔"

ان کی باتوں نے مجھے حیرت کی وادی میں دھکیل دیا۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا واقعی آپ مہر داد نگر سے واقف نہیں ہیں۔"

"نہیں بی بی، ہم میں سے کوئی بھی مہر داد نگر سے واقف نہیں۔" ایک اُدھیز عمر شخص نے دو قدم آگے بڑھ کر بڑے وثوق سے کہا۔

"مفت مشقت سے اس کا جسم کافی توانا نظر آ رہا تھا۔ میں نے براہ راست اس سے پوچھا۔"

"آپ کے اس گاؤں کا کیا نام ہے۔"

"ہمارا گاؤں ساٹھڑ سے کوسوں دور ہے، ہم نے قمر کا نام سنا ہے۔"

اس کی بات سن کر میں حیرت سے اچھل پڑی۔ قمر، ساٹھڑ، الفاظ دہراتے ہوئے مجھے اپنے جسم میں کپکپاہٹ محسوس ہونے لگی تھی، ماندر تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ یہ کیسے ممکن ہے، مہر داد نگر ضلع راولپنڈی کا مضافاتی گاؤں ہے، میں ایک دم پنجاب سے سندھ کیسے منتقل ہو گئی۔ یقیناً وہ جھوٹ بول رہے ہیں، میں نے اب انہیں غور سے دیکھا، مابینے چہرے لورڈ ہان

سے دو واقعی سنگمی لگ رہے تھے، میرا دماغ چکر اکر رہ گیا۔ اچانک ایک دوسرے خیال نے میرے اندر پریشانیوں کو دراز کر دیا۔ کہیں میں پھر سے امن کے علاقے میں پہنچ آئی ہوں۔ اس خیال سے میں نے ان سے پوچھا۔
 ”گوٹھ چند من پہاں سے کئی دور ہے؟“ سوال کرتے ہوئے میری اندرونی کیفیت ہی کی طرح منتشر تھی، گوٹھ چند من کا نام سن کر ان میں کوئی پہل پیدا نہیں ہوئی، لگ رہا تھا وہ اس نام سے واقف نہیں۔ تاہم ایک شخص چند قدم آگے بڑھ کر بولا۔
 ”گوٹھ چند من کون سے ضلع میں واقع ہے۔ اپنے طے سے یہ شخص پڑھا لکھا دکھائی دے رہا تھا، میں نے چند لمحے سوچ کر اسے بتایا۔“
 ”ضلع گھوٹکی میں۔“

”گھوٹکی، سکس، خیر پور، نواب شاہ، نوشہرہ فیروز یہ پانچ اضلاع سکس ڈویژن میں آتے ہیں۔
 میر پور خاص، قمر، ساکھڑ اور عمر کوٹ یہ میر پور خاص ڈویژن میں واقع ہیں۔ ہمارا گاؤں ساکھڑ کے انتہائی کونے پر قمر کے قریب واقع ہے۔ گوٹھ چند من ہم بھی نہیں سمجھتے۔“
 اس کی بات سن کر مجھے یاد آیا۔ پاکستان کے دو مشہور صحرا ہیں، ایک وادی سندھ کے جنوب میں واقع قمر دوسرا بہاولپور اور بہاولنگر میں واقع چولستان۔

میرے لیے یہ انتہائی پراسرار اور ناقابل فہم معائناتھ کہ میں پنجاب سے سندھ کے علاقے قمر میں کیسے آ گئی ہوں۔ میں اس بل بھمن کاٹری طرح فکار تھی۔ معاکسی نے مجھے اندر سے پکار کر کہا۔
 ”مکسنی اٹو بھول گئی ہے، جس طرح اس کنواں کا پانی زہر آلود ہے۔ اس طرح وہ پانی بھی زہر آلود ہے جس سے ایک شخص سبکدول بھر رہا ہے۔ یہ تو بچ گئے کیا اُسے مرنے دے گی۔“
 ”نہیں..... نہیں.....“ اندر کی آواز سن کر میں نے تڑپ کر حیرت لے لی۔ ساتھ ہی میری نگاہوں میں چند مناظر گردش کرنے لگے۔

میں ایک شخص کے ساتھ بڑے پتھر پر بیٹھی ہوئی ہوں، ہم سے ایک کلومیٹر دور ایک شخص چٹان کی جڑ میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے سامنے سبکدول ہے جس میں چٹان سے آنے والے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ کر رہے ہیں، آدی سے چند میٹر پیچھے ایک عورت پتھر سے ٹپک لگائے بے حال نیم دراز ہے۔

”اوہ میرے اللہ، یہ پانی تو زہر آلود ہے۔“ میں نے بڑبڑاتے ہوئے خود کھامی کی۔
 ”کون سا پانی۔“ میری خود کھامی لوگوں نے سن لی تھی۔ ان کے چہروں پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔

آپ لوگ اپنا کام جاری رکھیں، اس بار صاف دشتاف پانی ملے گا۔ مجھے اب جانا ہے۔ مجھے اندازہ تھا وہ آسانی سے چچا چھوڑنے والے نہیں ہیں، اس لیے چند قدم چلتے کے بعد میں نے پلٹ کر انتہائی سخت لہجے میں کہا۔

”مجھے روکنے یا میرے پیچھے آنے کی کوشش نہ کرنا۔“ جس نے ایسا کیا اپنا نقصان کا ذمہ دار خود ہوگا۔“ کہہ کر میں آگے بڑھ گئی، میں سوچوں کی انتہا گہرائیوں میں ڈوب کر چل رہی تھی، یہ صحرائی علاقہ ہے۔ جب کہ سبکدول میں پانی بھرنے والا شخص پہاڑی علاقہ میں موجود تھا۔ جہاں ہر طرف عمودی چٹانیں نظر آتی تھیں، میں سوچوں کے گھنور میں اس قدر الجھ کر چل کر احساس ہی نہیں ہوا، میں صحرا سے نکل کر پہاڑوں میں داخل ہو گئی ہوں۔ یہ احساس تب جاگا جب ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر میں گرتے گرتے پئی۔ سنبھل کر دیکھا تو ہر طرف عمودی چٹانوں کو کھڑا پایا۔ میرا دماغ پھر کی طرح گھومنے لگا۔

”باللہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟“ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ کیسے منتقل ہو رہی ہوں۔ میں سر پکڑ کر ایک نرمے پتھر پر بیٹھ گئی، بیٹھتے ہی مجھے احساس ہوا یہاں میں پہلے بھی بیٹھ چکی ہوں، میں نے فوراً آنکھیں کھولی کر اس کا جائزہ لیا۔ یہ وہی پتھر تھا۔ اس پر میرے ساتھ ایک شخص بیٹھا ہوا تھا، اس نے یہاں اپنی ہوائی جہاز لی تھی، یہاں سے کچھ دور ایک دوسرا شخص سبکدول بھرنے کے لیے چٹان کی جڑ میں بیٹھا ہوا تھا۔ خیال آتے ہی میں نے اس طرف نگاہیں دوڑائیں۔
 نگاہوں کا سفر ختم ہوا تو میں بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ اب بھی وہ شخص اسی پوزیشن میں سبکدول زمین پر دھرے ہوئے بیٹھا

تھا۔ اس کے پیچھے ایک عورت بے حال نیم دراز تھی۔

زہرا لود پانی۔ الفاظ پھر سے سے میرے دماغ میں برسنے لگے۔ میں نے دیکھا وہ شخص شکل بھر کر نیم دراز عورت کی طرف پلٹ رہا ہے۔ لود میرے لیے اس پانی میں زہر ہے۔ میں چیختی ہوئی اس طرف بھاگ پڑی۔ اے رگو۔ ماں کو پانی مت پلانا، یہ پانی زہرا لود ہے، میں کہتی ہوئی برق رفتاری سے بھاگ رہی تھی، ماں دیرانے میں مکمل سناٹا اور سکوت تھا، میری چیخ بکار سن کر اس کے قدم تھم گئے، میں اپنی کانپتی لپٹ کے قریب پہنچی گئی، حیرت کی ساری تھیں اس شخص کے چہرے پر تھی وہ لٹی تھی، میں نے جاتے ہی کہا۔

"یہ پانی اسے مت پلانا، اس میں زہر ہے۔"

"تک۔ کیا۔" وہ حیرت سے اٹھ پڑا۔ "یہ پانی، آپ کون۔۔۔۔۔" وہ بری طرح ہلکا گیا تھا۔

"میں کچھ کہہ رہی ہوں، یہ پانی زہرا لود ہے۔ اسے پیئیں۔"

"م۔ مگر۔" وہ لٹی ہاتھوں میں تھا، وہ نے شکل کو دیکھ رہا تھا اور کبھی نیم دراز عورت کو۔ جس کی پیاس کے سبب حالت ابتر ہو رہی تھی، میں نے اسے بتاتے ہوئے کہا۔

"وہ سامنے موڑ۔ موڑ مڑتے ہی ایک ٹھنڈی ٹھنڈی آبخار پہاڑی سے گر رہی ہے۔ آپ وہاں سے پانی لے لیں۔ ہم پچھلے چھ گھنٹوں سے ان چٹانوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ نہ راستہ سمجھائی دے رہا ہے نہ پانی مل رہا ہے۔ یہ میری ماں ہے۔ اس کی حالت تم دیکھ رہی ہوں، یہ پانی بڑی مشکلوں سے مل رہا ہے اور تم کہہ رہی ہو زہرا لود ہے۔" وہ تذبذب میں گرا ہوا تھا۔ شکل ابھی تک اس نے ہاتھوں میں مضبوط سے پکڑ رکھا تھا۔

"تم اپنی ماں کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو یہ پانی اسے مت پلانا، یہ زہرا لود پانی ہے، بجز اس کے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میرے لہجے کے اعتماد نے اسے ڈالو ڈال کر دیا۔ اس نے تاسف سے ہاتھ کو دیکھا، پھر اس جانب سنا، جہاں آگے موڑ پڑی تھی۔

"اس پار جا کر دیکھ لو آبخار ملے گی۔" اس پار وہ چٹانوں پر رہا۔ شکل وہیں رکھ کر موڑ کی جانب چل پڑا، اس کے جاتے ہی میں نے شکل سے پانی باہر انڈیل دیا، وہ پانی منٹ میں پلٹ آیا۔ اس کے چہرے کا جوش و خروش ظاہر کر رہا تھا، میری بات کی ثابت ہوئی ہے، وہ آتے ہی خوشی سے بولا۔

"آپ۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں، اس طرف آبخار موجود ہے۔"

"ٹھیک ہے، اسے وہاں لے جاؤ، میں نے عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "خود بھی پانی پیو اور اسے بھی سیر ہو کر پلاؤ۔"

"اور آپ۔ آپ وہاں۔"

"مجھے جانا ہے، ابھی مجھے بہت سے کام نہانے ہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

وہ مزید کچھ کہنا چاہ رہا تھا، مگر عورت کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نے اسے روک دیا۔

"پانی۔ پانی۔ لاؤ۔"

"جلدی کرو، دیر مت کرو۔" میں نے حکمانہ لہجے میں کہا۔ وہ شکل اٹھا کر آبخار کی طرف بھاگ پڑا۔ میں انہی قدموں سے واپس چلی آئی۔

اب میں جان گئی تھی، تین پانی زہرا لود ہیں، دو کا قصہ میں صاف کر چکی تھی، اب تیسرا پانی تھا۔ یہ تیسرا پانی مجھے کہاں ملے گا، میں نہیں جانتی، میں ایک بار پھر ان دنوں منزل کی جانب چل پڑی۔ مجھے یاد آ رہا تھا پہاڑی علاقے سے ہم چلے تھے تو قبرستان کے نزدیک آبادی میں جا گئے تھے۔ وہ پانی کی بڑی نیگی تھی جسے میرے ہمسار نے خالی کر دیا تھا۔ اس لحاظ سے میری منزل پانی کی وہی بڑی نیگی تھی، مگر وہ بھی کیاں یہ میرے علم میں نہیں تھا۔ میرا کام تھا سفر کرنا۔ منزل تک پہنچانا اللہ تعالیٰ کا کام تھا۔ میرے دل میں یہ بات جز پکڑ چکی تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ کام لینے ہیں، اس کا مین ثبوت پچھلے

دو واقعات تھے، جو میرے ساتھ گزر چکے تھے، دورہ میں تو مہر داد نگر میں چوہدری مشتاق کے گھوڑے کے جیسے کمسنی جاری تھی، وہ منظر یاد آیا تو میں چلتے چلتے ٹھٹھک کر رک گئی، مجھے یاد آیا میں جب جنگل سے چلی تھی تو بری طرح زخمی تھی، کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور جسم لہو لہان تھا، میرا ایک اور پاؤں کا کم نہیں کر رہے تھے، میں نے حیرانی سے اپنے آپ کا جائزہ لیا۔ کپڑے بے شک بٹھے ہوئے تھے، مگر بڑی چادر اوڑھنے کے سبب نظروں سے اوجھل تھے، جبکہ میرا پورا جسم کچھ سلامت تھا۔ نہ کہیں زخم کا کوئی نشان، نہ خون کے آثار تھے کہ ہاتھ پاؤں بھی بالکل ٹھیک کام کر رہے تھے۔ خود کو کچھ سلامت دیکھ کر میں بے اختیار سجدے میں گر گئی۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے وہ جو چاہے کر لیتا ہے۔ میں سجدے میں اللہ تعالیٰ کا شکر بجالا رہی تھی، میری نظر زمین پر پڑنے والی کھڑی پر پڑی۔ میں نے سجدے سے سر اٹھا کر مٹکڑی کو نکلی پر اٹھالیا۔ مٹکڑی کو دیکھ کر میرے ذہن میں عربی کے چند اشعار کا ترجمہ ابھرنے لگا۔ ابن نقیب نے کیا خوب کہا ہے۔ رستم کا کیزا جو رستم بننا ہے، اسے پہن کر ہر شخص جہاں حاصل کرتا ہے، لیکن کھڑی اس سے زیادہ جلیل الشان ہے کہ اس نے سرکار دو عالم خیر دو عالم حضرت محمد ﷺ کے لیے جانا بن دیا۔

میں نے مٹکڑی کو بڑی عزت و احترام سے ایک پتھر پر چھوڑا اور اپنی ان دیکھی منزل کی طرف چل پڑی۔ اس سے پہلے جب میں اپنے ہمسفر کے ساتھ ان دیکھی منزل کی جانب چلی تھی تو میری عجیب کیفیت تھی۔ میرا جی چاہا تھا میں اس شخص کے بال نوچ لوں جس نے ایک بے بس دلا چار پیاسے آؤنی کا کھٹکاول بار بار گرایا تھا، میں سست روی سے چلتے والے بے پروا شخص کو پیٹ میں زور زور سے گھونسنے مارنے کی خواہاں تھی اور دل چاہ رہا تھا اس کے دل و دماغ پر جی ظلم و ستم کی سادی کافی دھوڑا لوں، مگر میری یہ کیفیت تب تک تھی جب تک میں ایمان تھی۔

میں آج بھی ان دیکھی منزل کی طرف گامزن تھی۔ مگر آج میں اکیلی تھی۔ میں نے تنہا جنگل، میدان، پہاڑ اور ریگستان کا سفر طے کیا۔ سفر کرتے کرتے میں ایک قبرستان میں جا گئی، مجھے بہت اچھی طرح سے یاد تھا، اس قبرستان کے سامنے جتنے ہوئے خوشوں کا والا ایک درخت تھا۔ خوشی کے سامنے میں بیٹھ کر میں نے بند آنکھوں سے ایک حسین و جمیل جگہ کا نظارہ کیا تھا۔ درخت کے پاس پہنچ کر میری حلاشی نکالیں پانی کی ٹینگی کے لیے بھٹکنے لگی۔ میری نظریں جیسے ہی شرق کی جانب اٹھیں، میں نے بہت بڑی ٹینگی کو جالیا۔ ہاں وہی ہے بالکل یہی ٹینگی ہے، میں نے خود کلامی کی اور ٹینگی کی طرف تیز قدموں سے چل پڑی۔ میں نے دور سے دیکھ لیا تھا کہ ٹینگی کو ابھی ابھی بھرا گیا ہے، ٹینگی کے اور قوتوں سے پانی گر رہا تھا۔ عنقریب یہ پانی ارد گرد کے سو گھروں میں پہنچ جاتا تھا۔ میرے تصور میں لاشوں کے ذہیر لگ گئی، میں نے بے اختیار ایک جھرجھری لی اور تیزی سے ٹینگی کی سیر میں چلنے لگی۔ قریب کے چند لوگوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے، میں نے اوپر جاتے ہی ٹینگی کی صفائی والا بڑا ٹکٹ وال کھول دیا۔ پانی پوری طاقت سے نیچے گرنے لگا۔ ساتھ ہی میں نے سپلائی ہونے والے بائپ کا وال بند کر دیا تاکہ پانی کی ترسیل رک جائے۔

اے لڑکی کیا کر رہی ہو، رک جاؤ یا گل ہو گئی ہو کیا، تیز آبطار کی طرح گرتے ہوئے پانی کو دیکھ کر نیچے والے جی پڑے۔

اے مارے بند کر دیا پانی یا گل، لوگوں کی چیخی چلائی آوازوں کی میں نے چنداں پروا نہیں کی۔

”رکویا سے ورنہ یہ بےوقوف سارا پانی ضائع کر دے گی۔“

میں نے نیچے جھانک کر دیکھا، لوگ میری جانب دوڑ پڑے تھے، پانی کی یہ ٹینگی اسٹیل اسٹرکچر کے بلند ٹاور پر رکھی گئی تھی، یقیناً لوگوں میں سے چند آدمی اوپر آنے کی کوشش کریں گے۔ اوپر شاید میں انہیں باز نہ رکھ سکوں، اس لیے میں فوراً سیر حیاں نیچے اترنے لگی۔

”تمہارا دماغ خراب ہے۔ پانی کیوں کھول دیا ہے؟“ نیچے اترنے ہی مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ تمہیں معلوم ہے یہ پانی یہاں کے سو سے زائد گھروں کو سپلائی کیا جاتا ہے۔ انتہائی غصے میں ایک شخص نے مجھے کہتے کہتے روئے سخن ساتھ کھڑے آدمی کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ”رستم جاؤ پانی بند کرو۔“

جی ٹھیک ہے، رستم کہتا ہوا جیسے ہی سیر حیاں چڑھنے لگا میں نے اسے زور کا دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔

لوگوں کی حیرت سے مٹی گم ہو گئی، انہوں نے مجھے حیرت دینے میں دیکھا، میرے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی نے غصے میں دانت پیستے ہوئے کہا۔

”دل چاہتا ہے تمہیں اٹھا کر زمین پر بیٹھ دوں، مگر تم ہولڑکی۔“

مجھے تو یہ پاگل لگتی ہے، محلے کے بچے اکٹھے کر دیا کہ اسے پھر بار بار کر یہاں سے نکالا جائے، یہ تجویز دینے والے شخص کے قریب جا کر میں نے اس کی چھاتی پر سیدھی پھیلی کا وار کرتے ہوئے کہا۔

”یہ پانی زیر آلود ہے تم لوگ اپنی بیچوں کی لائیں دیکھنا پسند کرو گے۔“

”اے لڑکی! اس سے پہلے کہ ہم تمہیں تل کر دیں یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

”میرا تل تم لوگوں کی چھاتی کو نہیں روک سکتا۔ تم لوگ خود اپنے ہاتھوں سے لاشوں کے ڈھیر اٹھاؤ کے بچر اس کے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میرے لہجے کے اعتماد نے ان کی زبانوں کو تالے لگا دیے۔ میں نزدیکی راستے کی طرف چل پڑی، مجھے یقین تھا وہ پانی بند کرنے کی جرأت نہیں کریں گے، چند میٹر چلنے کے بعد میں نے مڑ کر کہا۔ ٹنگی خالی ہو جائے تو اسے دھو کر پھر سے بھر لینا، محفوظ رہو گے، میں انہیں حیران و پریشان چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

مجھے یاد آیا میرے ہمسرا کا نام عبداللہ تھا۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا، اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو کسی کسی کے پاس ہوتا ہے۔ کاش وہ پھر سے مجھے آئے۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے حیرت بھرنے انداز میں سوچا۔

بہت سے بعید مجھ پر اب کھل رہے تھے، میں نے عبداللہ سے جو کچھ سیکھا تھا، آتش حالات میں وہ بھول جاتی تھی، مگر اب پھر اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ میری یادداشت میں لوٹ آئے تھے، میں نے عبداللہ سے اللہ تعالیٰ کو دلیل سے پہچاننے کے بارے میں پوچھا تھا، اس نے کیا خوب جواب دیا تھا۔

”ملکھنی اللہ تعالیٰ کو عقل و خرد اور دلیلوں سے نہیں اپنے عشق سے پہچانتا۔“

عبداللہ نے مجھے مولوی اور صوفی کے بارے میں باور کروایا تھا۔ اس نے آخری لمحات میں کہا تھا۔

”میرے اور حیرے پاس جو بھی ہے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت ہے۔ اس کی نظیر عنایت ہے، سرخسے سے کبھی اٹھنے نہ پتا اور وصیت کر جانا۔ جب مٹی سے مٹی بن جاؤ تو ضرور نہ بنے نہ عمارت کھڑی ہو۔ نہ لوگ جیسے رگڑیں نہ امیریں باندھیں، جنت الیقین میں جا کر دیکھ لینا سب کچھ جاؤ گی۔“ میرے دل میں ایک اور حسرت نے انگڑائی لی۔ کاش میں جنت الیقین کو دیکھ لوں۔

میرا دل کسی حد تک مطمئن ہو گیا تھا، یہ جو میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بلا روک ٹوک چلی رہی ہوں، یہ اللہ تعالیٰ کی منشا ہے میں نے سوچا مجھے خود کو حالات پر چھوڑ دینا چاہیے۔ حالات جس جگہ پر لے چلیں چلتا ہوگا۔

☆.....☆

چمن چمن چمن چمن، چمن چمن، چمن چمن۔ ٹھنکر دی لہراتی ہوئی آوازیں، حق اللہ کی پرسوز دل سوز آواز، دھوک کی تھاپ اور ہانسی کی لے۔ لے لے لے بکھرے ہوئے بال، گلے میں موتیوں کی بے شمار مالا لائیں۔ ہاتھوں میں بڑے بڑے گجرے اور کڑے۔ جسم پر بزرگ کا لہا پٹھ۔ ہاتھوں کی ساری انگلیوں میں تیروں دالی انگلیاں۔ پاؤں میں چمن چمن کرتے ٹھنکر والے لوگوں کے جھوم میں مست و محال۔

یا اللہ یہ میں کہاں آگئی ہوں، بے شمار لوگ جوق در جوق اندر داخلے میں داخل ہو رہے تھے۔ مرکزی دروازے پر اندر داخل ہونے والے افراد کی پولیس باقاعدہ تلاشی لے رہی تھی، یہاں کا ماحول دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا، میں کسی عرس میں آگئی ہوں۔ نظریں گھما کر دیکھا تو ایک عمارت پر لگا ہیں جم گئی۔

”کچھ مہر علی کچھ تیری شا۔ گستاخ اکھیاں کچھ جاڑیاں۔“

شعر پڑھ کر میری نگاہوں میں سید پر مہر علی شاہ کی قد آور بزرگ ہستی جلو افروز ہونے لگی۔ سید مہر علی شاہ صاحب دو عظیم ہستی ہیں جنہیں آج کے مسلمانوں کا محسن کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اصبت مسلک پر ان کا عظیم احسان ہے۔ ان کی محنت و ہردمندی کا نتیجہ ہے کہ اسلام برصغیر میں اپنی اصل حالت میں پروان چڑھا اور ہم تک پہنچا۔

میں نے عمارت سے لگا ہوا ہٹا کر دیکھا۔ سیکڑوں کی تعداد میں لوگ زمین سے لٹل رہے تھے۔ دل میں اشتیاق نے اٹھرائی لی۔ جھانک کر دیکھا تو پتا چلا زبرد زمین وضو خانہ ہے۔ لوگ با وضو ہو کر نیچے سے لاپر آ رہے ہیں، کچھ کا زرخ مسجد کی طرف تھا۔ کچھ کا اس عمارت کی طرف۔ جس میں لوگ بڑی عزت و احترام سے داخل ہو رہے تھے۔

یہ عمارت زمینی سطح سے دو ڈھائی میٹر اونچی تھی، میں بھی اس طرف بڑھ گئی، اندر جا کر پتا چلا یہ کسی کا مزار ہے۔ اندر ہنر قالین چھپی ہوئی تھی، کمرے کے وسط میں قبر بھی، جسے چاروں طرف سے جالیوں کا پہرہ دیا گیا تھا۔ اندر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر ایک کا ٹٹل جدا جدا تھا۔ کوئی جالیاں چوم رہا تھا کوئی جالیوں سے ہاتھ رگڑنے کے بعد جسم پر پھیر رہا تھا۔ کوئی جالیوں سے زخار رگڑنے میں مصروف تھا اور بہت سے افراد بچہ کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ سارے مشرکانہ عمل دیکھ کر مجھے شدید جھٹکا لگا۔ میں نے قرآن پاک کو جب بھی پڑھا ہا ترجمہ پڑھا۔ اس لیے بہت سی آیات کریمہ کا ترجمہ میرے ذہن میں اکثر تروتازہ رہتا ہے۔ یہاں لوگوں کو دیکھ کر میرے ذہن میں فوراً "سورۃ حشر کی آیت 19" کا ترجمہ ابھرنے لگا۔ "تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں۔" میں تھوڑی دیر وہاں کا ماحول دیکھتی رہی، ساتھ ہی سورۃ الزمر کی آیت نمبر 36 کا ترجمہ دل میں دہرانے لگی۔ "کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کالی نہیں۔"

قرآنی آیات کا مبارک ترجمہ ذہن میں تازہ ہوا تو ساتھ ہی کچھ حدیث پاک بھی یاد آنے لگی۔

ترجمہ۔ جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات نکالی وہ ناقابل قبول ہوگی۔

یہ حدیث اتنی سخت تھی کہ میرے روٹنے کھڑے ہو گئے اور میں قہر قہر کاٹنے لگی۔ میں نے دیوار کا سہارا لیا اور ایک طرف گونے میں ہو کر بیٹھ گئی، یہاں پر کسی کو کسی کی پروا نہیں تھی، ہر شخص اپنے حال میں مست تھا۔ میں نے بیٹھ کر مرد دیوار کے ساتھ لپک دیا اور آنکھیں موند لی۔ آنکھیں بند کرتے ہی زمین میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ایک اور حدیث پاک تازہ ہونے لگی۔ ان سے روایت ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے ہمارے سامنے ایک لکیر کھینچی، پھر فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ ہے اور پھر اس لکیر کے دائیں جانب کئی لکیریں کھینچیں اور کئی لکیریں بائیں جانب کھینچیں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا ان سب راستوں پر ایک ایک شیطان کھڑا اپنی طرف ہار رہا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے قرآن کی آیت مبارکہ پڑھی۔

"اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے تو تم اس پر چلو۔"

اتنا کچھ یاد آنے کے بعد مجھ میں سکنت نہیں گئی کہ آنکھیں کھول کر یہاں کا ماحول دیکھوں۔ میں نے آنکھیں بند کیے رکھیں، چند لمحوں میں یونہی ادھر ادھر بھٹکتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ایسی پاک حدیث ذہن کے دروازے پر دستک دینے لگی کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ نبی آخر الزماں، رحمت العالمین، فخر و عالم، حضرت محمد ﷺ نے دعا فرمائی تھی۔ "اے اللہ میری قبر کو عرس گاؤ نہ بنانا۔" یہ حدیث بھاری شریف میں موجود ہے، میں نے بدک کر آنکھیں کھول دیں، میرا جسم خوف سے کاپٹنے لگا۔ میرے قریب ہی ایک شخص سجدے کی حالت میں لوٹ پوٹ تھا، میں نے اسے بھی دے کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

اے بھائی سہو۔ میری آواز پردہ سیدھا بیٹھ گیا۔ اس کی حیرت زدہ لٹا ہوا چہرے پر مرکوز تھیں۔

جی۔ اس نے مختصر کہا۔

یہ کس کا مزار ہے بھائی؟ میرے سوال پر اس کے چہرے کی حیرت دو چند ہو گئی۔ وہ جواب دینے کی بجائے مجھے حیرت و پریشان نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔

بولو بھائی۔ میں نے وہ بارہ پوچھا۔ اس بار وہ چونک کر بولا۔

آپ یہاں آ کر بیٹھ گئی ہیں آپ کو نہیں پتا یہ کس کا مزار ہے۔

نہیں بھائی۔

تو پھر یہاں آئی کس لیے ہو۔

یہ تو مجھے بھی نہیں پتا بھائی کہ میں یہاں کس لیے آئی ہوں۔

عجیب لڑکی ہو۔

بتاؤ نا بھائی یہ مزار کس کا ہے۔

یہ پیر سید مہر علی شاہ کا مزار ہے، جواب سن کر میں نے طویل سانس لی اور ایک بار پھر سر دیوار سے لگا دیا، شعر پڑھ کر مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میں اسی عظیم ہستی کے مزار میں کھڑی ہوں جسے اس صدی کا مجدد کہا جاتا ہے۔ اب پتا چلا تو مجھے دو شدید جھٹکے لگے۔ ایک یہ کہ میں گولڑہ شریف میں موجود ہوں جو وہاں ہندوؤں سے صرف گیارہ میل دور ہے۔ اس کا مطلب ہے مہر وار مگر سے صرف 25 میل دور ہوں، مجھے دوسرا جھٹکا حدیث پاک کے یاد آنے سے لگا۔ فرمان رسول گرامی ﷺ ہے۔
"جس نے میرے طریقے سے روگردانی کی وہ ہماری امت سے نہیں۔"

آہ میں نے انتہائی سرد لہو دور دھجری آہ کشی، کہاں پیر سید مہر علی شاہ کی تعلیمات اور کہاں ان کے چاہنے والوں کا مزار مہر علی کے ساتھ یہ حشر۔ یہ سب کچھ جو ہو رہا تھا، یہ مہر علی شاہ کی تعلیمات اور دینی خدمات کی بے حرمتی ہے، میں نے کچھ دیر خود پر ضبط کیا، مگر رہا نہ گیا تو اس آدنی سے پوچھا۔ آپ کو پیر مہر علی شاہ کی تادم وادع کا پتا ہے، میرے سوال پر وہ ہونٹوں کی طرح میرا منہ دیکھنے لگا۔ میں نے تاسف بھرے لہجے میں اسے بتایا۔ خواجہ پیر مہر علی شاہ کیم رمضان المبارک 14 اپریل 1859ء میں پیدا ہوئے، 25 واسطوں سے آپ کا سلسلہ نسب نوٹ الاظم شیخ عبدالقادر جیلانی سے جاتا ہے اور 35 واسطوں سے حضرت حسن سے۔

تفصیل بتاتے ہوئے شاید میری آواز کچھ زیادہ ہی بلند تھی۔ قریب کے چند دوسرے لوگ بھی ہمارے طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے سوچا اچھا ہے۔ جالیوں کو چوم کر ہاتھوں سے جسم پر گزرنے والے ان کا شکان مہر علی سے بھی کچھ استفادہ کر لیا جائے۔ میرے ذہن میں اس سلسلے میں جو کچھ پڑھا تھا، سب پازہ ہو چکا تھا، میں نے انہیں بھی طلب کرتے ہوئے پوچھا۔
آپ میں سے کوئی یہ بتا سکتا ہے، پیر مہر علی شاہ نے سلسلہ چشتیہ میں کس سے بیعت لی تھی۔

میرے سوال پر لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، تاہم بواہ کوئی نہیں، بہت سوں نے بے چینی سے پہلو بدلے اور مجھے متوقع نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں نے کہا۔

انک کی تحصیل حسن ابدال کے نواحی موضع بھوئی میں مولانا محمد شفیع قریشی سے پیر مہر علی شاہ نے ڈھائی سال تک تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے منطق میں قطبی تک اور نحو اور اصول کے درمیان اسباق تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے ضلع شاہ پور کا رخ کیا۔ وہاں کے ملاقاتیوں کے ہر موضع انک میں سلطان محمود انگوٹی سے استفادہ کیا۔ آپ مولانا صاحب کے ساتھ ان کے مرشد خواجہ شمس الدین سیواوی کی زیارت کو جایا کرتے تھے، حضرت خواجہ شمس الدین سیواوی سے پیر مہر علی شاہ نے سلسلہ چشتیہ میں بیعت کی۔ میرے خاموش ہونے پر ایک بڑی عمر کے آدمی نے نرمی سے کہا۔

بھئی پیر مہر علی کے بارے میں کچھ مزید جانتی ہو تو ہمیں بتاؤ، تا کہ ہم پر بھی پیر صاحب کے حالات زندگی آشکار ہوں۔
لوگوں کا بہت بڑا حلقہ لگ گیا تھا۔ آدمے سے زیادہ لوگ میری طرف متوجہ ہو چکے تھے، میں نے طویل سانس خارج کرتے ہوئے سوچا۔ اس رٹش میں کتنی کے چند لوگ ہوں گے جو پیر مہر علی شاہ کے بارے میں معلومات رکھتے ہوں گے، باقی سب اپنی غرض یعنی حاجات منوانے آئے ہوں گے۔ میں نے اپنی معلومات کے مطابق کہنا شروع کیا۔

انک سے فارغ ہو کر گولڑہ شریف واپس تشریف لائے تو علوم کے بہت سے درجات ابھی باقی تھے۔ حدیث شریف میں صحاح ستہ، میں آگے بتانا چاہ رہی تھی کہ ایک خیال سے پوچھا۔

صحاح ستہ کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟ جواب ملا۔

لیا لی۔ آپ بڑی رعبی، ہم سے کچھ مت پوچھیں۔

حدیث شریف کی چھ مشہور اور سب سے زیادہ مستند مانی جانے والی کتابوں کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔

ان چھ کتابوں میں ایک مشہور کتاب سنن بخاری ہے۔ حدیث کی اس مستند کتاب میں 7275 احادیث مبارکہ مذکور

ہیں، اسے امام بخاریؒ نے مرتب فرمایا ہے۔ امام صاحب کی پیدائش 194ھ اور وفات 256ھ ہے۔ اس کتاب کو امام صاحب نے اٹھارہ سالوں میں مکمل کیا تھا۔

دوسری مستند کتاب سنن ابی داؤد ہے۔ اس میں 4800 حدیثیں مذکور ہیں، اس کتاب کو مرتب کرنے والے داؤد سلمان بن الاشعث السجستانی ہیں۔ ان کی پیدائش 204ھ اور وفات 275ھ میں ہوئی۔ تیسری کتاب کا نام ہے سنن ابن ماجہ۔ یہ ابن ماجہ الرمی کی مرتب کردہ کتاب ہے، جن کی تاریخ پیدائش 209ھ اور وفات 273ھ ہے۔ اس تالیف میں 14341 احادیث پاک صحیحہ درج ہیں۔

چوتھی کتاب جامع ترمذی ہے۔ تالیف ابو یوسفی الترمذی۔ پیدائش 202ھ اور وفات 279ھ ہے۔ اس کتاب میں کتنی احادیث شریفہ مذکور ہیں مجھے یاد نہیں۔

پانچویں کتاب سنن نسائی ہے۔ اسے ابو عبد الرحمن احمد بن شعبہ نسائی نے مرتب کیا ہے۔ ان کی پیدائش 215ھ اور وفات 302ھ ہے۔ افسوس کہ مجھے اس کتاب میں مذکور احادیث کی تعداد بھی یاد نہیں رہی۔ پچھٹی کتاب صحیح مسلم ہے۔ یہ مسلم بن حجاج قشیری کی تالیف ہے۔ ان کی پیدائش 206ھ اور وفات 261ھ ہے۔ حدیث کی اس مستند کتاب میں 6500 احادیث مذکور ہیں۔

ایک دوسری بات میں آپ لوگوں کو بتاؤں۔ ماسوائے امام نسائی کے صحاح ستہ کے تمام مصنفین کی وفات غیلہ المستند علی اللہ کے دور خلافت میں ہوئی ہیں۔ ہم بات کر رہے تھے پیر مہر علی شاہ کے بارے میں۔

بولی۔ ہمیں بتائیں بولی بولی۔
میں کہہ رہی تھی پیر صاحب کی تعلیم ابھی ادھوری تھی۔ صحاح ستہ، تفسیر میں بیضاوی، درسی نظامی میں فلسفہ، معقول، ریاضی اور فقہ کی آخری کتب وغیرہ ہوتی تھی، ان کے حصول کے لیے 1290ھ میں مولانا احمد حسن محدث کی خدمت میں کانپور چلے گئے۔ مگر مولانا صاحب کی حج روانگی کے سبب پیر مہر علی شاہ، مولانا احمد حسن کے استاد گرامی مولانا لطف اللہ کے پاس چلی گئے۔ مولانا لطف اللہ سے قرآن مجید، کتب احادیث، صحاح ستہ اور کچھ خصوصی احادیث کی سند حاصل کیں۔ پانچ سال بعد فارغ التحصیل ہو کر کوٹہ شریف واپس لوٹ آئے۔ میں کہتے ہوئے خاموش ہو گئی، میں نے دیکھا جو لوگ اپنی عبادت میں مشغول تھے وہ بھی میری طرف متوجہ ہو گئے تھے، میں شش و پنج میں گر گئی۔ بات جاری رکھوں یا سلسلہ موقوف کر دوں۔

بولی۔ پیر مہر علی شاہ صاحب کے بارے میں ایسی باتیں کہہ ہی سننے کو ہنسی ہیں، آگے بولو بولی۔ میں نے لوگوں کے اندر جو جذبے کو برپا کرنا چاہتا دیکھا تو کہا۔

مریدین کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے پیر و مرشد کے بارے میں تمام اہم معلومات حاصل کریں اور انہیں یاد رکھیں، مرشد کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ہم اپنی دنیاوی اور اخروی زندگی سنوار سکتے ہیں۔

آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے پیر مہر علی شاہ نے شادی کہاں سے کی تھی؟ میرے سوال پر ایک پچاس پچپن سالہ شخص بولا۔

ضلع انک کی تحصیل حسن بدائی، پیر مہر علی شاہ کا خنیاں ہے۔ وہیں سید چراغ علی شاہ کی دختر سے شادی ہوئی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ بالکل آپ نے درست فرمایا ہے۔ مجھے ان کی شادی کی حتمی تاریخ تو معلوم نہیں مگر اتنا معلوم ہے۔ 1890ء میں آپ خواجہ عبدالرحمن کے ہمراہ کہ کرم روانہ ہو گئے تھے۔ روانگی سے غالباً آٹھ نو سال قبل شادی ہوئی تھی۔

”اب میں ایک اور اہم بات بتاؤں۔“

(اس حیرت انگیز اور اسرار بھرے ناقابل فراموش سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھے)

شعلہ سماں تحریریں

چٹا شعلہ

نظر کا دھوکا

حنابشری



روحانی باپ کے گرد گھومتی ایک شعلہ سماں تحریر

ہوں ہر کسی پر اعتبار کر لینا اور اپنے طور پر رائے قائم کر لینا مناسب نہیں، مگر وہ ایک کان سے سنتی تھی اور دوسرے سے نکال دیتی تھی۔

☆...☆

اُس دن موسم بے حد خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہواؤں نے ماحول کو بے حد خوب صورت بنا دیا تھا۔ کلاس لینے کے بعد میں باہر لان میں آکر بیٹھ گئی تھی۔

”اچھا تم یہاں چھپی بیٹھی ہو!“ سبیرہ کی شوخ آواز پر میں نے سر اٹھایا سامنے ہی سبیرہ کے ساتھ فیلیم اور کول بھی کھڑی تھیں۔ ”اور ہم کبھی سارے ڈپارٹمنٹ میں ڈھونڈ رہے تھے۔“ کول یہ کہتے ہوئے میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”اے! موسم کتنا خوب صورت ہو رہا ہے، چلو آؤ کیٹین چلتے ہیں پار۔“

سبیرہ نے کہا۔

”نہیں تم لوگ ہو آؤ، میں یہاں بیٹھی ہوں۔“ میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پھر ہم بھی یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے سبیرہ اور فیلیم بھی بیٹھ گئیں۔ ”ویسے حنا کیا خیال ہے،

سبیرہ سے میری ملاقات پنجاب یونیورسٹی کے اسلامک ڈپارٹمنٹ میں ہوئی۔ یونیورسٹی میں میرا پہلا دن تھا اور میں بے حد نروس تھی۔ میری کوئی کان فیلو تھی ساتھ نہ تھی۔ جب کہ پہلی مرتبہ کوانٹیکیشن سے میرا واسطہ پڑ رہا تھا۔ چون کہ آج کلاس میں پہلا دن تھا، اسی لیے زیادہ تر اسٹوڈنٹس غیر حاضر تھے۔

میں کلاس میں خاموش بیٹھی تھی کہ ایک دل نش نقوش والی لڑکی میرے قریب بیٹھ گئی، کچھ دیر کے بعد میری خاموشی سے اکتا کر وہ خود ہی مجھ سے بولی۔

”میرا نام سبیرہ ہے اور آپ کا؟“ وہ میری طرف براہِ دیکھ رہی تھی۔

”حنابشری!“ میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر میں ہم دونوں کافی کھل کھل ملنے لگی۔ اس میں زیادہ بات سبیرہ کی ملنساری اور خوش مزاجی کا تھا، ورنہ میں کم ہی لوگوں سے گھلتی ملتی ہوں۔ چند دنوں میں ہمارے گروپ میں فیلیم اور کول کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ دونوں بھی اچھی طبیعت کی مالک تھیں، مگر سبیرہ خوب صورت کے ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد سادہ دل بھی تھی۔ ہر کسی پر جلد اعتبار کر لیتی تھی۔ ہم اسے سمجھاتے اور منع کرتے تھے کہ

سیرہ پروفسر وصی احمد کے پیڑ میں بہت ناراض ہوئی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق ان کا انداز اسے کنفیوژ نہیں ہونے دیتا تھا۔ رفتہ رفتہ سیرہ پروفسر وصی کی مزید گرویدہ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بھی خاصے خاموش مزاج واقع ہوئے تھے۔

☆...☆

اس دن پروفسر وصی احمد کی کلاس تھی۔ سیرہ نے کوئی بات کی تو یک لخت نیلم اور میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ہمارے مننے پر سیرہ بھی ہنسنے لگی۔ اس لمحے پروفسر وصی کی نظر ہم پر پڑی تھی اور ہم ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔

"میرے خیال میں میرے پیچھے سے زیادہ ضروری آپ لوگوں کا ہنسنا ہے۔" پروفسر وصی احمد نے یہ کہتے ہوئے سنجیدہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور روم سے باہر نکل گئے۔

☆...☆

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے!" نیلم، سیرہ پر ہنسا پڑی۔

نیچر تو تمام اچھے ہیں۔" نیلم نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں ہاں سب ہی اچھے ہیں۔" میں نے بھی رائے دی۔

"ہاں! مگر پروفسر وصی احمد کی کیا بات ہے۔ ان کی شخصیت کی سادگی اور چہرے پر نورانی جھلک انہیں مزید سو پر ہڈویتی ہے۔" سیرہ عادت کے مطابق پروفسر وصی احمد کی قصیدہ گوئی میں مصروف تھی۔

"سیرہ! اتنی جلدی کسی کے بارے میں مانے نہ قائم کیا کرو۔ بعض اوقات آنکھوں دیکھا بھی جچ نہیں ہوتا۔" نیلم ناصحانہ انداز میں بولی۔

"اور ویسے بھی ہم یہاں پڑھنے کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں کسی کے بارے میں حد سے زیادہ مثبت اور منفی رائے رکھنے کی ضرورت نہیں۔"

یہ کول تھی، جو اپنی رائے کا اظہار کر رہی تھی۔

"اٹو! اب تم لوگ مجھے بور نہ کرو۔" سیرہ چڑکر

بولی۔ اس کے جواب پر نیلم نے میری طرف بڑی حیران کن نظروں سے دیکھا تھا، جب کہ میں بے بسی سے خاموش رہی تھی۔



اس وقت پروفیسر وحسی احمد نے سیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"واقعی کچھ لوگ ہستے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں۔" وہ کہہ رہے تھے کہ "پہلے جہاں میں پڑھاتا تھا، وہاں ایک اسٹوڈنٹ کو بے حد ہنسی آتی تھی، مگر لڑکیوں کے ہنسنے میں ایک الگ خوب صورتی ہوتی ہے۔" پروفیسر وحسی احمد کی بات بھرزد معنی تھی۔

☆.....☆

ہم چاروں کینٹین میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سیدہ خوب سوسوں سے انصاف کر رہی تھی، کینٹین میں تو اس کی ہنسی ویسے ہی آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتی تھی۔ نیلیم کی کسی بات پر سیدہ بے تحاشا ہنسنے لگی تھی۔ اس کو اس طرح کھل کر ہنسا دیکھ کر میں اور کول بھی مسکرانے لگی تھیں۔ اسی وقت قریب سے پروفیسر وحسی احمد گزر رہے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر ڈک گئے۔

"ہمیں بھی بتائیے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" پروفیسر وحسی احمد نے سیدہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ ظاہر سر کا اندازہ ہے حد سادہ تھا، مگر ان کی آنکھوں میں ایک شاعرانہ چمک نمایاں تھی۔

"سر کچھ خاص نہیں۔" سیدہ لگاؤں جھکا کر شرمندگی سے بولی۔

پروفیسر صاحب مسکراتے ہوئے چلے گئے تھے۔ سفید شلوار قمیص میں ان کا سراپا نمایاں تھا۔ وہ خاصی جاذبِ نظر شخصیت کے مالک تھے، مگر مجھے نہ جانے کیوں اس پروفیسر سے نامعلوم سی چوٹی ہو گئی تھی۔

"سیدہ! سر سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔" ان کے جانے کے بعد میں سیدہ سے مخاطب ہوئی۔

"کیوں کیا ہوا ہے؟" سیدہ نے پروا لی سے بولی۔

"کیا آتے جاتے اس طرح ان کا ہمیں مخاطب کرنا اور بلاوجہ کی بات کرنا کوئی اچھی بات ہے۔" نیلیم ناصحانہ انداز میں بولی۔

"دراصل سر بے حد جولیہ نس کچھ طبیعت کے مالک ہیں۔ مجھے تو سر کو دیکھ کر اپنے ایک انگل کا خیال آ جاتا ہے۔ وہ بھی بالکل سر کی طرح خوش مزاج ہیں۔ سیدہ! کا وہی انداز تھا جو پروفیسر کے لیے اس نے پہلے دن سے

"میں نے کہا کیا ہے؟" سیدہ بے بسی سے بولی۔

"تو کیا ضرورت تھی، کلاس میں ہنسنے کی؟" کول بھی بول پڑی۔

"سر کیا سوچ رہے ہوں گے ہمارے بارے میں؟" میں نے پریشانی سے کہا۔

"چلو آؤ سر کے آفس میں جا کر ان سے ایکسکوز کر کے آتے ہیں۔" اور پھر ہم چاروں نے سر کے آفس میں جا کر سوری کی۔ ہمارے معذرت کرنے پر پروفیسر وحسی احمد کا موڈ بہال ہوا تھا، مگر اس دن کے بعد سے مجھے شک ہو گیا تھا کہ سر بار بار سیدہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ اتنے بار بار بات بے بات مخاطب کرنے لگے تھے۔

ایک دن کہنے لگے۔ "سیدہ! آپ کے نام کا مطلب کیا ہے؟"

سیدہ جو سر جھکا کر لوٹ بک پر کچھ لکھ رہی تھی، سر کی آواز پر چونکی تھی۔

"جی سر! سیدہ نے گزرا کر سوال کیا۔

"بھئی میرا مطلب ہے کہ آپ کے نام کا کیا مطلب ہے، بڑا یونیک سا ہے تمہارا نام، اس سے پہلے کبھی سنا نہیں۔" پروفیسر وحسی احمد خوش دلی سے بولے۔

"سر میرے نام کا مطلب ہے حسین اور خوب صورت۔" سیدہ نے بڑی سادگی سے اپنے نام کا مطلب بتا دیا۔

"واقعی صحیح نام رکھا گیا ہے آپ کا۔" پروفیسر وحسی احمد کے ذوق منی انداز پر میں چونک گئی تھی، مگر ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوتا، سو میں خاموش ہو رہی تھی۔

☆.....☆

چوں کہ کلاس میں میل اور فی میل اسٹوڈنٹس کے درمیان میں پردہ حائل ہوتا ہے، اس لیے صرف آواز ہی پہنچ رہی ہوتی ہے۔

اس دن کلاس کے دوران پروفیسر وحسی احمد کی بات پر کسی میل اسٹوڈنٹ نے کوئی جواب دیا اور تمام کلاس ہنسنے لگی تھی۔ سیدہ بھی ہنسنے ہنسانے کے معاملے میں بے حد فراخ دل واقع ہوئی تھی۔

آئے تھے مگر سیرہ اور کوئل نے شاید موسم کے تبد
دیکھتے ہوئے چھٹی کر لی تھی۔ جب پروفیسر وسی احمد
کلاس میں آئے تو دورانِ پیکچر بارہا اُن کی نظریں
ہماری طرف اٹھ رہی تھیں، آخر اُن سے نہیں رہا گیا
اور انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

”حالا آج سیرہ نہیں آئی۔“ پروفیسر وسی احمد نے
مجھے مخاطب کیا تھا۔

”نو سرائی“ جواب دیتے ہوئے میں ان کی اس
حرکت پر جل بھن کر رہ گئی تھی، کہ سر کس خوشی میں سیرہ
کی اتنی فکر کر رہے تھے۔

سر کے اس طرح اچانک پوچھنے پر تمام کلاس نے
ہماری طرف متنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔ ظاہر ہے
بیان کے لیے بے حد خاص بات تھی۔ کافی اسٹوڈنٹس
غیر حاضر تھے، مگر کسی خاص کا اس طرح پوچھنا، لوگوں کو
فلک میں ہی جلا کر رکھنا تھا۔ یہ سب سیرہ کی ہی بے
واپسی کا نتیجہ تھا۔

☆.....☆

اگلے دن سیرہ آئی تو تمام کلاس کے ذریعے اُسے
معلوم ہو گیا تھا کہ سر اُس کے بارے میں خاصے فکر مند تھے۔
”کیا جی، سر میرا پوچھ رہے تھے واقعی؟“ سیرہ
حیرت زدہ تھی۔

”جی واقعی!“ میں نے جمل کر کہا۔

”دیکھا میں نے کہا تھا کہ پروفیسر وسی احمد
سب سے الگ ہیں اور کتنے کیسے تنگ تھے، انہیں اپنے
اسٹوڈنٹس کی تنگی فکر ہوتی ہے“ وہ مگن تھی، اُن کی قصیدہ
گوئی میں۔

”تمام اسٹوڈنٹس کی نہیں، صرف ایک اسٹوڈنٹ کی
فکر ہے انہیں..... آخر سیرہ تم پروفیسر وسی احمد کو کیوں
انتہائی کر رہی ہو۔“ میں نے بے لکھی سے پوچھا۔

”کیوں کہ سر مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ سر بہت
ایک اور اچھے انسان ہیں۔ میں سر کی بہت عزت کرتی
ہوں، بالکل اپنے والد کی طرح۔“ سیرہ بہت جذب
سے لفظوں میں ڈوب کر بول رہی تھی۔

میں ہمیشہ کی طرح چپ ہو گئی تھی۔ دوسرے بارے
میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ ظاہر ہے اُس کے دل

رکھا ہوا تھا۔
”ہاں! مگر سر تمہارے انگل نہیں ہیں۔“ میں غصے
سے بولی۔

”اچھا دادی! ماں صحیح فرمایا آپ نے۔“ سیرہ نے
مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا۔

اُس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہماری
باتوں کو سنجیدگی سے لینے کو تیار نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی
کہ دنیا میں رہنے والے کیا کیا روپ بدلتے ہیں۔

☆.....☆

انہی دنوں پروفیسر وسی احمد کی پرموشن ہوئی
تھی، تمام پیکچرز نے مل کر ان کے اعزاز میں پارٹی
ارینج کی تھی۔ سیرہ بھی پھول اور گفٹ لے کر سر کے
آفس پہنچ گئی تھی۔ اسے دیکھ کر پروفیسر وسی احمد بے
حد خوش ہوئے تھے، مگر وہ میل اسٹوڈنٹس کی موجودگی
کی وجہ سے اس سے کوئی بات نہ کر سکے۔ مجھے سیرہ
پر بے حد غصہ آ رہا تھا کہ اسے کیا ضرورت تھی ان
کے آفس میں جا کر انہیں پھول دینے کی، مگر سیرہ کو
کون سمجھائے۔

☆.....☆

ایک دن پروفیسر وسی احمد بے حد پریشان تھے۔
تمام کلاس کے پوچھنے پر سر نے بتایا تھا کہ اُن کی بیوی
بہت بیمار ہے اور اسپتال میں داخل ہے۔ یہ سن کر ہم
سب کو بہت افسوس ہوا۔ اگلے دن جیسے ہی ہم
یونیورسٹی پہنچے تو معلوم ہوا کہ پروفیسر وسی احمد کی بیوی
کا انتقال ہو گیا ہے اور تمام کلاس تعزیت کے لیے اُن
کے گھر گئی ہوئی ہے۔ سیرہ بھی اس عادی نے پر بے حد
دل گرفتہ تھی۔ تمام کلاس افسوس کر رہی تھی، سر بے حد
نڈھال اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خلافِ توقع
سیرہ بے حد خاموش تھی۔ اُس کی خاموشی پر پروفیسر
وسی احمد نے بڑی شکوہ کناں آنکھوں سے اس کی
طرف دیکھا تھا۔ ان کے اس طرح دیکھنے پر سیرہ کو
کیا سمجھ آئی تھی یہ تو مجھے پتا نہیں، البتہ میں اپنی جگہ مل
کھا کر رہ گئی تھی۔ مجھے پروفیسر وسی احمد کی سیرہ کی
ذات میں حد درجہ دلچسپی نہ ہو سکتی تھی۔

اُس دن موسم بے حد ابر آلود تھا، میں اور نیلم تو

میں کوئی برائی نہ تھی۔

"نہیں سر، شکر یہ ہم چلے جائیں گے!" میں نے
مجید کی سے کہا۔

"نہیں نہیں، تکلف مت کریں۔" پروفیسر صاحب
بندھے تھے۔

"چلو آؤ چلتے ہیں۔" سمیرہ نے میری طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔

"مگر سمیرہ!" میں ہچکچاہتی تھی، لیکن سمیرہ میرے
منع کرنے کے باوجود گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

"آپ آگے آ جائیں۔" پروفیسر دمی احمد بولے۔
"سراب دونوں تو آگے نہیں بیٹھ سکتے!" میں نے

ظاہر ہوتے ہوئے کہا، مگر اندر تو خون کھول رہا تھا، البتہ
سمیرہ بالکل مطمئن تھی۔ اس کا یہی اطمینان مجھے بے چین

کر دیتا تھا۔ سر تھے تو اجنبی، غیر مرد۔ اتنا جلدی یقین
کر لینا، توڑی ہے اعتباری تو رکھنی چاہیے۔ مگر سمیرہ پر

تو..... مجھے افسوس ہو رہا تھا۔
اللہ اس کی حفاظت فرمائے۔ میں دل ہی دل میں

ڈراما نگار بنی تھی۔
یہ ایک میری لگا لگا سامنے کی طرف اٹھی تھی۔

پروفیسر دمی احمد آئینے میں سمیرہ کو بار بار دیکھ رہے
تھے۔ گو کہ سمیرہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی، مگر میری

نظروں سے سر کی حرکت قلمی نہیں رہ سکتی تھی۔ حقیقت
میں مجھے پروفیسر دمی احمد کی اصلیت جان کر بے حد

ڈکھ ہو رہا تھا۔ مجھے ان کی شخصیت کا کھلا تضاد نظر آ رہا
تھا۔ ظاہری شرافت اور پھر کے دوران وہ اخلاقی

تکلف، وہ چند نصائح کیا تھا وہ سب کہ ایک شخص جی
جیسی لڑکی پر غلط لگاؤ ڈال رہا ہو، جب کہ وہ لڑکی اسے

باپ کا درجہ دیتی ہو۔ افسوس ہو رہا تھا مجھے کہ کیسے کیسے
لوگ شعبہ تدریس سے منسلک ہیں، جنہیں اس شعبے

کے تقدس کا بھی خیال نہیں۔
☆.....☆

انہی دنوں ایک لڑکے نے سمیرہ کو پھینک دیا۔ سمیرہ
نے پروفیسر دمی احمد کے آفس میں جا کر اس کی

شکایت لگا دی۔ سر نے فوراً اس کو یونیورسٹی سے نکال
دیا۔ ان کا اس قدر غصہ بھی اس موقع پر میری سمجھ سے

باہر تھا۔ سمیرہ بے وقوف اس بات پر بے حد خوش
☆.....☆

☆.....☆

گرمیوں کی بے حد خوشگوار دہ پہر تھی۔ کبھی ہاول
اور کبھی بارشوں نے گرمیوں کی مٹی کاٹی حد تک کم کر دی

تھی۔ آج کے درختوں پر آم بہار دکھانے لگے تھے۔ ہم
لوگ بارش میں بیٹھے کپ کپ کر رہے تھے کہ سمیرہ

اچانک بولے۔
"آؤ حنا! چل کر آم توڑیں، بیڑا سزا آئے گا۔" یہ

کہتے ہوئے وہ بہت ہڈ جوش تھی۔
"کیسے توڑیں گے آم؟" میں نے آم کے پڑ کی

جانب لگا دی جو لمبا چوڑا قد لیے کسی دیو کی مانند آموں
سے لدا کھڑا تھا۔

اسی لمحے سمیرہ کی لگاؤ ایک لمبے ڈنڈے کی طرف
مٹی، جو خاصا بھاری بھی تھا، پھر کیا تھا، ٹپلم اور کول بھی

اس نیک کام میں شامل ہو گئیں۔ آم تو کیا کونٹے تھے،
بس بھاری ڈنڈے کو اٹھانے اور مارنے کی وجہ سے

خاصا لطف آ رہا تھا۔ اس کھیل میں خوشی سے ہم بے حد
انس رہے تھے، پھر میری جو جی لگاؤ چلتی تھی تو گویا میں

ساکت سی رہ گئی تھی، پروفیسر دمی احمد نجانے کب سے
کھڑے اس نظارے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

میں نے سب کو اپنی جانب متوجہ کیا۔
اتنے میں پروفیسر دمی احمد خامے ہمارے قریب

آ گئے تھے۔
"لگتا ہے بھئی آپ سب کو آم بہت پسند ہیں۔

ہمیں کہہ دیتے، ہم آپ کو آم منگوا دیتے۔" پروفیسر بہ
ظاہر محظوب تو ہم سب سے تھے، مگر دیکھ وہ صرف سمیرہ کو

نہایت سے تھے۔
"نہیں سر ایسی تو کوئی بات نہیں۔" ٹپلم شرمندگی

سے بولی۔
☆.....☆

"اس دن موسم بے حد آبدار آلود تھا۔ پھٹی تک تو اچھی
خاصی بارش ہو گئی۔ میں لاد سمیرہ پچاٹ کا انتظار کر رہے

تھے کہ گاڑی میں پروفیسر دمی احمد پاس سے گزرے۔
"ارے آپ آئیں میں ڈراما کر دیتا ہوں۔"

پروفیسر دمی ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔
☆.....☆

اسٹوڈنٹ ہو، کوئی پرابلم شیئر کر رہی ہو۔“ سہرہ
رہائیت سے بولی۔

پتا نہیں، مگر مجھے سر کے بارے میں اطمینان نہیں ہو رہا
اور تم بھی سر سے دور رہا کرو۔ سر کا جھپٹا ہوا مخاطب کرنا
مجھے ہر گز لگتا ہے۔“ میں نے دل کی ہڑ اس نکالی۔
”اوہ کم آن حنا، کیوں فکر کرتی ہو، ایسا کچھ نہیں ہے، تم
خواتین کا دل نما کر رہی ہو۔“ سہرہ اذلی کا پردائی سے بولی۔

☆.....☆

انہی دنوں سہرہ کی سال گرہ کا دن آ گیا تھا۔ گلابی
رنگ کے سوٹ میں وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔
اس نے کیک کاٹا تھا اور ہم سب نے اسے چنے دیے
تھے۔ ہماری محبتوں پر اس کی آنکھیں جھجک گئی تھیں
اور پھر اچانک ہی سہرہ کیک لے کر پروفیسر ویس احمد کے
آفس میں پہنچی گئی تھی۔ ہمیں بھی مجبوراً اس کی تھلید کرنی
پڑی، مگر میں سہرہ سے سخت خفا ہو رہی تھی۔

پروفیسر ویس احمد کی آنکھوں میں سہرہ کو دیکھتے ہی
جھجک آگئی تھی، جو میری نظروں سے چھٹی تھوڑی سی۔
”آپ اگر ہمیں پہلے بتا دیتیں تو ہم کوئی گفت لے
تے۔“ پروفیسر ویس احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں سر، اس کی کوئی ضرورت نہیں، آپ کی
دعائیں ہی ہمارے لیے تحفہ ہیں۔“ سہرہ خوش دلی سے
بولی، پھر ہمارے منع کرنے کے باوجود سر نے ہمیں
چائے پلائی تھی اور خاصی دیر تک وہ سہرہ سے باتیں
کرتے رہے۔ اس تمام صورت حال میں سہرہ نے مجھے
کھل نظر انداز کیے رکھا تھا، کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ میں
نظروں سے ناراضگی کا اظہار کر دیاں گی، اس لیے وہ میری
طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہی تھی۔

اگلے دن نیلم اور کوئل چھٹی پر تھیں۔ اس لیے میں
اکیلی ہی اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی تھی۔ سہرہ کا بھی کچھ
پتا نہ تھا۔ میں نہ جانے کب تک خیالوں میں ہی کھوئی
رہتی کہ پروفیسر ویس احمد کی بھاری آواز میرے قریب
ہی آ بھری۔

”تو آج آپ اکیلی آئی ہیں۔ آپ کی دوست نظر
نہیں آ رہیں۔“

انہوں نے قریب آ کر پوچھا۔

ہو رہی تھی کہ سر کتنے اچھے ہیں، کتنے ٹیک اور پاکر دار
انسان ہیں کہ انہوں نے اس کے کہنے پر ایک
اسٹوڈنٹ کو یونیورسٹی سے باہر کر دیا۔

☆.....☆

میں اور نیلم لائبریری میں اسائنمنٹ مکمل کر رہے
تھے کہ سہرہ اور کوئل بھی آ گئیں۔

”ارے یہ پڑھا کو دنوں یہاں موجود ہیں۔“
سہرہ ہیکٹے ہوئے ہمارے سامنے ہی بیٹھ گئی۔

”تم دنوں کہاں تھیں؟“ نیلم نے پوچھا۔
”ہم دنوں تو سر ویس احمد کے روم میں تھے۔ کچھ
ضروری نوٹس مانگتے تھے، اس کے لیے سر نے ہمیں بلایا
تھا۔“ سہرہ نے خوش خوشی جواب دیا۔

”جھپٹا کیا ہوا ہے؟“ میری مسلسل خاموشی پر سہرہ
نے مجھ سے پوچھا۔

”کچھ نہیں دیسے ہی بس کام کر رہی ہوں۔“ میں
نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”اچھا سہرہ، وہ لڑکی کون تھی؟“ کوئل کو اچانک یاد
آ گیا تھا۔

”کون سی لڑکی؟“ سہرہ نے حیرت سے سوال کیا۔
”وہی وہی لڑکی جو سر ویس احمد کے آفس میں تھی،
جو جواب میں تھی۔“ کوئل نے یاد دلایا۔

”ہاں، وہ لڑکی جو کافی دیر سے دور رہی تھی۔“ سہرہ
کو یاد آیا۔

”ہاں، ہاں وہی۔“ کوئل جلدی سے بولی۔

”یہ کون سی لڑکی ہے جس کے بارے میں تم دنوں فکر
مند ہو رہی ہو؟“ نیلم نے تڑپے تیروں سے دنوں کو گھورا۔

”کوئی خاص بات نہیں ہے، دراصل جب ہم سر
کے آفس میں گئے، تو وہاں ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی،
جو کافی دیر سے شاید دور رہی تھی۔ اور سر اسے مسلسل
انگور کر رہے تھے۔ ہمارے آنے پر وہ روم سے نکل
گئی تھی، نہ جانے کون لڑکی تھی؟“ سہرہ نے جواب
دیتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو پروفیسر ویس احمد ایک آنکھ نہیں بھارتے۔ استاد
ہیں، مگر بس انسان کیا کہے؟“ میں ٹھننے میں پوتی چلی گئی۔

”حنا تم کیوں سر کے خلاف سوچتی ہو، ممکن ہے کوئی

"میں چاہتا ہوں سیرہ کہ ہماری یہ دوستی مزید آگے بڑھے۔" پروفیسر دمی احمد زیادہ دیر اپنی اصلیت چھپانہ سکے۔ اُن کے لفظ دوستی کہنے پر مجھے اور سیرہ کو حیرت کا شدید جھکا لگا تھا۔

اُس نے اچانک میری طرف دیکھا تھا، میری نظروں میں بھی حیرت تھی۔

"سر میں بھی نہیں؟" سیرہ نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے ناگہی سے پوچھا۔

"اب آپ انجان نہ بنیں۔ آپ کا مجھے گفت دینا، میرے التفات پر خوش ہونا، دوستی نہیں تو اور کیا ہے؟"

پروفیسر دمی احمد مزید چل رہے تھے۔ انہوں نے سیرہ کے احترام اور خلوص کے رشتے خود دوستی کا رنگ کس آسانی سے دے دیا تھا۔ دوسرے گفتگوں میں سر نے واضح کر دیا

تھا کہ مرد و عورت کے درمیان احترام، خلوص، عقیدت اور دوستی سے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ سر کی مزید

وضاحت پر سیرہ نے میری طرف دیکھا تھا۔ میں بھی اُس کی طرف متوجہ تھی۔ اُس کے دیکھنے پر میں نے اسے

بھی ہنسنا دکھا ہوں سے صورا۔

سیرہ کی خاموشی پر پروفیسر دمی احمد بلا آخر خود ہی بولے۔

"اوپر بھی! آپ تو سنجیدہ ہو گئیں۔ میرا مطلب ہے، آپ کسی دن میرے گھر آئیں، میرے گھر والے

آپ سے مل کر خوش ہوں گے اور مجھے بھی خوشی ہوگی۔"

پروفیسر صاحب آج سادے حساب بے باق کرنے پر تلے ہوئے تھے اور سیرہ کے لیے شاید آج

Surprising Day تھا۔۔۔۔۔ حیرت پر حیرت۔

"مگر سیرہ! سیرہ نے کچھ کہنا چاہا۔"

"اگر مگر کچھ نہیں، آپ میرے گھر آ رہی ہیں۔"

پروفیسر دمی احمد بے حد اچانکیت سے بولتے چلے گئے۔

"دوستی میں کوئی اگر غم نہیں ہوتا۔" وہ پھر مسکرائے، مجھے اُن کے بار بار دوستی کہنے پر سخت چڑ ہو رہی تھی، مگر میں

کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی اور سر بھی سیرہ کی طرف ہی متوجہ تھے، ایسے جیسے کہ روم میں صرف وہ دونوں

ہوں۔ میں بھی خاموشی سے آج سر کی تمام حقیقت جاننے

چاہ رہی تھی۔

"بس سرا! ابھی تک آئی نہیں۔" گھبراہٹ میں مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

"اچھا! اگر سیرہ آئے تو اسے میرے آفس میں بھیج دیں، کچھ کام ہے۔" وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

سر کے جانے کے کچھ دیر ہی بعد سیرہ آ گئی تھی۔

"ہیلو خترمہ صاحبہ! صاب، کیسے کیسے حراج ہیں؟"

سیرہ یہ کہتے ہوئے میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"ٹھیک ہوں۔ تم آج بہت لیٹ پہنچی ہو؟" میں نے جواب دیتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں، وہ بس نکلتے نکلتے دیر ہو گئی اور پھر پوائنٹ بھی دیر سے پہنچا۔" سیرہ نے وجہ بتائی۔

نیلیم اور کوئل کہاں ہیں، وہ نہیں آئیں؟" سیرہ نے

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نیلیم کی طبیعت خراب تھی اور کوئل کو ضروری کام تھا اس لیے وہ دونوں نہیں آئیں۔ تمہیں پروفیسر دمی احمد

اپنے روم میں بلارہے تھے، کہہ رہے تھے کہ ضروری کام ہے۔" میں نے نیلیم کی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے، مگر کیوں؟" سیرہ نے حیرت سے سوال کیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں سنجیدگی سے بولی۔

ناچار مجھے بھی اُس کے ساتھ سر کے آفس جانا پڑا۔

ہمیں دیکھتے ہوئے سر یکدم کھل اٹھے تھے۔ ہم سے خراب صرف سیرہ ہی ہے۔

"سر آپ نے مجھے بلایا تھا۔" سیرہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

"جی ہاں آپ کو ہی بلایا تھا!" پروفیسر دمی احمد خوش دلی سے بولے، سر کے کہنے پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔

"اور سنائیے سیرہ اسٹڈی میں کوئی پراجیکٹ نہیں ہے؟"

پروفیسر دمی احمد نے پوچھا۔

"نوسرا! ایسی کوئی خاص پریکٹس نہیں ہے اور اگر

ہوتی بھی تو آپ ہیں نا؟" سیرہ نے مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔

میں بظاہر اپنی کتاب میں مگن تھی، مگر ان کی ہر بات

سن رہی تھی۔ آج پروفیسر دمی احمد کا انداز ہی نرالا تھا۔ وہ

کافی چمک رہے تھے۔

کروں۔ گھروا نے مسلسل شادی پر اصرار کر رہے ہیں اور انکار کی وجہ مانگ رہے ہیں، آپ نے کہا تھا کہ ہم کورٹ میرج کے حوالے سے اپنے گھروالوں کو منالیں گے۔ آپ کے نکاح میں ہونے کی وجہ سے میں کسی دوسرے کے لیے کیسے ہاں کر سکتی ہوں سراسر امتحان بہت پریشان ہوں، پلیز میری کال ریسیو کر لیں اور میرے خط کا جواب دے دیں، ورنہ میں پریشانی میں کہیں خودکشی نہ کر لوں۔

بے حد مجبور
غزل صدیقی

☆.....☆

خط پڑھ کر میں اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی تھی۔ پروفیسر دسی احمد کا یہ روپ ہو گیا۔ میں نے تو سوچا بھی نہ تھا۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود اپنی ایک اسٹوڈنٹ سے محبت کی اور اس سے خفیہ طور پر نکاح کیا اور اب اس کی پریشانیوں میں اکیلا چھوڑ دیا ہے اور سیرہ کو اپنے اگلا شکار بنا چاہا تھا۔ یہ قدریں جیسے مقدس شعبے سے کس طرح کے لوگ وابستہ ہو گئے تھے، جو روحانی باپ کا کردار نبھانے کی بجائے دل پھینک عاشق مزاج کا کردار نبھا رہے تھے۔ میں سوچتی ہوں کہ ہماری عقیدت اور محبت کو بغض اوقات کیا غلط رنگ دے دیا جاتا ہے۔

اپنے سے آدھی عمر کی لڑکیوں سے عشق لڑانا اور پھر خفیہ طور پر کورٹ میرج کرنا یہ کیا تھا۔ مجھے تو سرت پہلے ہی چڑھ گئی، اب مزید غصہ آ رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" سیرہ نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے خط اس کے سامنے دکھا۔

"اسے گھولو اور پڑھو!" میں سنجیدگی سے بولی۔

"مگر اس میں کیا لکھا ہے۔ یہ تم اتنا جنس کیوں پھیلا رہی ہو!"

سیرہ نے پوچھا۔

"پڑھو گی تو تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" میں نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔

"یہ سب کیا ہے؟" سیرہ نے پڑھنے کے بعد میری طرف دیکھا۔

یہ آپ کے بہت ہی پیارے اور عظیم استاد محترم پروفیسر دسی احمد کی اصلیت ہے۔" میں ایک ایک لفظ

"سر آپ کو پروفیسر عبداللہ بخا رہے ہیں۔"

یہوں نے اچانک روم میں آ کر ہماری باتوں کے تسلسل کو توڑ دیا تھا۔

پروفیسر دسی احمد فوراً یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ بیٹھے میں ابھی آتا ہوں۔" پروفیسر صاحب نہایت جلدت میں روم سے نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے سیرہ کو دیکھا، جو خاموش بیٹھی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" میں نے اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں بس ویسے ہی چپ ہوں۔" سیرہ غائب دماغی سے بولی۔

میں اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔ نیلی پر کچھ اسٹیکس پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے اٹھالی، پہلی اسائنمنٹ غزل صدیقی کی تھی۔ وہ ہم سے سینئر تھی۔

بہت لائق اسٹوڈنٹ تھی۔ میں نے دیکھنے کے لیے کھولی تو اسائنمنٹ کے درمیان میں سے گھائی رنگ کا لفافہ میز پر گرا۔

میں نے سیرہ کی طرف دیکھا تو وہ اس طرف متوجہ نہیں گئی۔ میں نے وہ لفافہ جلدی سے اپنے بیک میں رکھ لیا۔

تھی تو غیر اخلاقی حرکت، مگر ایک انجانے احساس کے تحت میں نے وہ لفافہ اپنے پاس رکھ لیا۔

"چلو اب چلتے ہیں۔" سیرہ نے سر تو صیغہ کا۔

میں نے سیرہ کو مخاطب کیا۔

☆.....☆

چھٹی کے بعد گھر آ کر وہ لفافہ میرے ذہن سے نکل چکا تھا۔

رات میں جب فارغ ہوئی تو مجھے وہ لفافہ یاد آیا، جلدی سے بیک میں سے وہ لفافہ نکالا اور پڑھنے لگی۔

☆.....☆

اس کے نام جو زندگی سے بڑھ کر عزیز ہے سر آپ میرے فون کا جواب نہیں دیتے۔ ملنے آتی ہوں تو انکور کرتے ہیں۔ جانتی ہوں آج کل آپ کی توجہ کا مرکز کوئی اور ہے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ کیا

پارینہ ہو گئی تھی۔ پروفیسر وحسی احمد پھر سے گا ہے بگا ہے
سیر کو قافلہ کر رہے تھے۔ بلا وجہ کوئی نہ کوئی جملہ اچھا
دیتے، مگر اب میں مطمئن تھی، کیوں کہ اب مجھے اُسے
سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

"سیر! آپ ذرا میرے روم میں آئیں!"
پروفیسر وحسی احمد کی آواز ہمارے قریب سے ابھری۔
"سوئی مرا مجھے آج گھر جلدی جانا ہے، ضروری
کام ہے!"

سیر نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔
جو پارس وحسی احمد کی آنکھوں میں حیرت ابھری تھی،
جسے دیکھ کر میں دل ہی دل میں بے حد ہنسی تھی اور یوں
چند دفعہ گنور کرنے کی وجہ سے پروفیسر وحسی احمد نے سیر
کو قافلہ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا، شاید وہ سیر سے مایوس
ہو گئے تھے، جس کم جہاں پاک!

☆.....☆

یونیورسٹی آتے ہی سیر میرے گلے لگ گئی تھی۔
"ارے بھئی کیا ہوا؟" مجھے حیرت ہوئی۔
"بس یونیورسٹی تم پر یاد آ رہا تھا۔" سیر نے مسکراتے
ہوئے کہا۔

"حانتم بہت اچھی ہو، مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے۔"
سیر نے تم آنکھوں سے کہا۔

"تمہانے نادانی میں مجھ سے کچھ غلط ہو جاتا!"
سیر نے اندیشوں میں گھرتے ہوئے کہا۔

"یہ سب اللہ کا کرم ہے۔" میں نے محبت سے کہا۔
زندگی کی اس تصویر نے مجھے یہ سبق سکھایا ہے کہ
ہماری حد سے بڑھی ہوئی دانستگی دوسرے کو غلط نہیں سمجھا
جسکا کر سکتی ہے۔

بالکل صحیح کہا، کیوں کہ صرف ظاہر دیکھ کر باطن کا
اندازہ لگانا مشکل ہے، بعض اوقات چہرہ پر نور اور دل
گناہوں سے سیاہ ہوتا ہے۔ اُس دن اگر وہ خط نہ ملتا تو
پروفیسر وحسی احمد نے تمہیں جال میں پھنسا ہی لینا تھا۔

اور میں سیر کی حفاظت پر دل ہی دل میں خدائے
بزرگ و برتر کا شکر ادا کر رہی تھی۔ خدا ہم سب کو آفات و

مصائب سے بچائے۔ (آمین)

☆.....☆

چبا کر بولی۔
"حانتم بہت مشکل کربات کرو میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"
سیر نے اُسکا کر کہا۔

"وہ لڑکی یعنی غزل صدیقی جو سر کے روم میں رہ رہی
تھی وہ سر کی مشکوٰۃ ہے۔ اور اب سر اُس سے جان چھڑانا
چاہ رہے ہیں، کیوں کہ وہ خود کو راجہ اندر سمجھ رہے ہیں اور
خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اسی لیے
آج کل آپ سے دوستی بھانے کی تیاریاں ہو رہی
ہیں۔" میں جوش میں بولتی چلی گئی تھی۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ سر ایسے بھی ہو سکتے ہیں۔
میں نے تو ہمیشہ سر کو اپنا روحانی باپ سمجھا ہے اور اسی لیے
اُن کی عزت کرتی ہوں، مگر یہ سب؟" سیر نے پریشانی
سے سر جھکا لیا۔

"میں جانتی ہوں تم سادہ دل ہو۔ تمہارا دل صاف
ہے، مگر سیر ضروری تو نہیں جو تم سوچ رہی ہو، وہی سر
بھی سوچیں۔ سر تو تمہیں صرف ایک مرد کی نظر سے دیکھ
رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "بس..... اسی لیے میں تمہیں
منع کرتی تھی، ان کے قریب جانے سے روکتی تھی کہ بعض
اوقات ضروری نہیں ہے، جو نظر دیکھے وہی سچ ہو اور سچا پر
اتنا بھی اعتبار اچھا نہیں ہوتا۔"

سیر، خاموش بیٹھی تھی، مگر اُس کی آنکھوں کی لہریں
بتا رہی تھی کہ وہ بے حد ڈر رہی ہے۔

"سیر! دل چھوڑنا مت کرو۔ یہ زندگی ہے، یہاں
بہت کچھ ہوتا ہے۔ شکر کرو تمہارے ساتھ کچھ نہ نہیں ہوا۔"
میں نے وہ خط واپس سر کی میز کی ورنہ میں رکھ دیا تھا۔

☆.....☆

اگلے دن یونیورسٹی میں یہ خبر گردش کر رہی تھی کہ غزل
صدیقی نے خودکشی کر لی ہے ماس خیر کو جو سن رہا تھا حیران تھا۔
یونیورسٹی کی قابل ترین اور خوب صورت اسٹوڈنٹ تھی وہ۔

اگرچہ میں اور سیر وہ جانتے تھے، مگر ہم دونوں
خاموش تھے۔ ایک بے گناہ لڑکی موت سے ہلکتی ہو چکی
تھی۔ اب رہ بھی کیا گیا تھا، جو ہم یونیورسٹی میں اُس کی
زسوائی کر رہے۔

☆.....☆

چند دنوں کی بات تھی اور پھر غزل صدیقی بھی قصہ



ہاشمی عرقِ گلاب



آنکھیں Sparkling
چہرے Glowing

گلاب کی تازہ پتیوں سے کیے گئے ہاشمی عرقِ گلاب
کا روزانہ استعمال آنکھوں اور چہرے کو
شہید موسمی حالات، گرد، دھول، دھواں، آلودگی
نہات دلا کر ٹھنڈک، تروتازگی اور ماحول کے
مضر ہونے کا احساس عطا کرتا ہے۔



Mohammad Hashim Tajir Surma

E-mail: hashim@pak.com Web: www.hashim.com
All rights reserved. Hashim is a registered trademark of Hashim Tajir Surma. © Copyright 2014



دوسرا شعلہ

ہٹوارا

اسلام قریشی

دل کی طرح عورت کا ہٹوارا بھی ممکن نہیں، کوئی اسے دوسرا شعلہ

www.paksociety.com

www.paksociety.com

قریب ہی واقع گاؤں میں میرے بچپن کا دوست جاں نثار رہا۔ میں نے اسے دیکھا اور جھکا ہوا انسان تھا۔ ہم نے میٹرک ایک ہی اسکول سے پاس کیا تھا۔ اس نے میٹرک کے بعد پڑھائی کو خیر باد کہہ دیا تھا، جبکہ میں نے بی۔ اے پڑھنے کے بجائے والد صاحب کے کہنے پر انجینئرنگ کے لیے امریکی قبول کر لی تھی۔ یوں میری زندگی بھی ختم ہونے لگی تھی۔ کچھ عرصہ بعد جاں نثار نے دوبارہ میری زندگی میں آکر میرے ساتھ رہنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے کچھ خاص اشتیاق کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ دو کمروں پر مبنی اس کا کچا کادو۔ صحت گھر گاؤں کے درمیان میں واقع تھا۔ دروازہ کھٹکنا۔ پھر باہر نکالنا۔ اور مجھے سامنے کھڑا دیکھ کر کچھ دیر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، پھر چلاتے ہوئے وہ میرے ساتھ لپٹ گیا۔ خاصی دیر ہم ایک دوسرے کے گلے گلے رہے، پھر میں نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔ وہ محویت کے عالم میں میری آپ بیتی سننا رہا، پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا ہوا گھر کے اندر بیٹھک میں لے آیا۔ جاں نثار کے دونوں بچے اور بیوی ساتھ والے کمرے میں موجود تھے۔ بھائی نے میرے لیے چائے بنائی اور جاں نثار مجھے گھر کے قریب واقع ان کے

پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی تہائی اور مایوسی کی وہ شدت یکدم ختم ہوئی چلی گئی، جس سے میں گزشتہ پانچ دنوں سے دوچار تھا۔ آگ و خون کا دور یا عہد کرتے اور اپنی جان بچا کر بھاگتے ہوئے مجھے جن حالات کا سامنا کرنا پڑا، وہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔ بارہویہ دور کرتے ہی میں سجدے میں گر گیا اور زار و قیادہ کرنے لگا۔ میری کل جمع پونجی سیاہ رنگ کے بیگ میں دھم کی صورت میں موجود تھی۔ حالانکہ یہ میری تمام دولت تھی، جس نے مجھے دوسرے لوگوں کو غلبت کی حالت میں فروخت کر دیا تھا۔ جس کی مجھے مناسب رقم نہیں مل سکی تھی، لیکن بہر حال کچھ نہ ہونے سے تو کچھ ہونا بہت بہتر تھا۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اس لیے سیاہ بیگ میں موجود رقم میرے لیے کافی زیادہ تھی، ہاں یہ نقد زیادہ بہتر ہوگا کہ مجھے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کے لیے زیادہ قربانیاں نہیں دینی پڑیں۔ اس لحاظ سے میں بہت خوش نصیب واقع ہوا تھا۔ پاکستان کا بارڈر لے گئے مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ پاکستانی فوج کے جوان ان کی ہڈ کے لیے کمر بستہ تھے۔ بارڈر سے کچھ دور بے سرو سامانی کی صورت میں وارد ہونے والے افراد کے لیے کیمپ کا بندوبست بھی تھا۔ میں نے کیمپ کا رخ نہیں کیا۔ بارڈر کے



تیار کیا تھا۔ گھری وستیابی کے فوراً بعد میں بے سر و سامانی کے عالم میں وہاں منتقل ہو گیا۔ جب رہائش کا مسئلہ حل ہوا تو روزگار کے جنگ نے مجھ کو ابھارنا شروع کیا۔ میرا حاصل کردہ مکان ایڈوانس رقم کی فراہمی کے بعد ماہانہ اقساط پر مشتمل تھا۔ اس لیے ابھی خاصی رقم میرے پاس بچ رہی تھی۔ میری خوش قسمتی کہ انہی دنوں گاؤں سے کچھ دور چند ایکڑ زمین فروخت ہو رہی تھی۔ میں نے جاں نثار اور بھائی سے صلاح مشورے کے بعد زمین خرید لی اور اپنے آبائی پیشے کھیتی باڑی کا آغاز کر دیا۔ خدا نے پیشے میں برکت ڈالی اور خوشحالی میرے قدموں کو چومنے لگی۔ اب میں اصل

مکانوں کی تفصیل بتانے لگا، جو پاکستان گورنمنٹ کی جانب سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں کے لیے آسان اقساط کی صورت میں بخش دیے گئے تھے، لیکن چونکہ ابھی تک زیادہ تر مکانات زیر تعمیر تھے۔ اس لیے مکانات کی تعمیر نہیں کی گئی تھی۔ وہ تو جاں نثار جیسے خالص لوگ ہجرت کر کے آنے والے بے آسرا لوگوں کو بھیجنا تیار نہ کر سکتے تھے، اور حکومت کی جانب سے پیش رفت ہونے کے پر ابھی۔ کچھ رقم کی فراہمی کے فوراً بعد ایک چھوٹا سا صاف ستھرا گھر میرے حوالے کر دیا گیا۔ گھری وستیابی کے دوران میں نے کچھ دنوں کے لیے جاں نثار کے گھر بھی

لگا ہوں سے دیکھا۔ جاں نثار نے کھنگھار کر گلا صاف کیا، پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”میں بتاتا ہوں۔ آج معمول کے مطابق عصر سے کچھ پہلے جب میں گھر کی جانب آنے کے ارادے سے بڑی سڑک سے واپس آ رہا تھا تب میں نے سڑک کے کنارے ایک نوجوان لڑکی کو کھڑے دیکھا۔ وہ سیاہ رنگ کی چادر میں لپیٹیں تھی اور کسی حد تک گھبرائی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ حالات کے لحاظ سے اس وقت کسی مرد کو بھی وہاں موجود نہیں ہونا چاہیے تھا، لیکن وہاں ایک لڑکی تھی اور وہ بھی اکیلی..... میں نے ہجرت ریانت کرنے کے لیے تاگھر روک لیا اور اس سے وہاں کھڑے ہونے کی وجہ دریافت کی۔ تب وہ رو دینے والے لہجے میں بولی کہ وہ بار بار عبور کر کے بمشکل یہاں پہنچنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ علاوہ انہیں اس کے آگے پیچھے موجود بھائی بہنوں اور رشتے داروں کا کچھ اتنا ہی معلوم نہیں ہے۔ اسے چوں اکیلا چھوڑنا میں نے مناسب خیال نہیں کیا اور اپنے ہمراہ کھڑے آیا۔ میں نے پریسین لہجے میں پوچھا۔

”اب وہ کہاں ہے؟“

”رہائشی کمرے میں۔“ جاں نثار نے جواب دیا۔
”کیا تم نے اس کے حقائق کچھ معلومات کیں۔ اسے بلا سوچے سمجھے گھر لے آنا کہاں کی عقلندی ہے؟“
”لیکن اسے اکیلا چھوڑ دینا بھی انسانیت کے برخلاف تھا۔“ جاں نثار بولا۔ ”پھر میں معلومات کہاں سے کرتا۔ وہاں ارد گرد کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ لڑکی نکل و صورت سے شریف اور اچھے گھرانے کی دکھائی دیتی ہے۔ اگر کہتے ہو تو میں معلومات کیے لیتا ہوں۔“

میں نے جینیب کر بھالی کی جانب دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے جارہی تھیں۔ پھر بولیں۔

”بھیا..... کب تک یوں ہی اکیلے رہو گے۔ تمہارے بھائی صحیح کہہ رہے ہیں۔ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد لڑکی کے ساتھ چلا کر لو..... یقین جانو..... لڑکی تمہیں ہمیشہ خوش رکھے گی۔“ میں نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

”بھالی کیسی باتیں کرتی ہو۔ بھلا ایک ایسی لڑکی سے میں کیونکر شادی کر لوں، جس کے خاندان کے حقائق میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ مجھے کچھ نہیں معلوم..... آپ خود بتائیے۔ یہ کہاں کی عقلندی ہوگی کہ میں

دانتے کا آواز کرتا ہوں۔

وہ گرمیوں کے دن تھے۔ کچیتوں پر کام کرنے کے بعد جب میں تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا تو گھر سے باہر میں نے جاں نثار کو اپنا منتظر پایا۔ اس کے چہرے پر بے چینی کے تاثرات تھے۔ اور وہ کچھ نے جوش بھی دکھائی دیتا تھا۔ اس کی گھوڑا گاڑی میرے گھر کے سامنے لگے شہوت کے درخت کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ جاں نثار تاگھر چلا تا تھا، مجھے دیکھتے ہی وہ تیر کی مانند میری جانب کھینچا چلا آیا اور پھر بولا۔

”نورا سے پیش تر تانتے میں بیٹھو۔ تمہاری بھالی گھر میں شدت سے تمہاری آمد کی منتظر ہے۔ ایک بہت بڑے ٹیبلر سٹول سے دو چار ہونے کے بعد تمہاری دستیابی کے لیے میں کب سے یہاں کھڑا ہوں۔

میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور تانتے میں بیٹھ گیا۔ اس نے ہانکیں دراز کیں اور گھوڑا اٹھا سے ہاتھ کرنے لگا۔

جاں نثار کا گھر میرے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کی بیوی اور بڑا بچہ دروازے کے باہر دروازے منتظر تھے۔ مجھے معاملے کی شدت کا احساس اس کے چہرے کو دیکھ کر ہونے لگا تھا، لیکن باہر بات کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے میں نے خاموش رہنے میں ہی بہتری جانی۔ جاں نثار نے تانتے کو گھر کے ساتھ موجود بھیڑ بکریوں کے بازو میں بانٹھا اور میرے ہمراہ اندرون مکان کی جانب چل دیا۔ بیٹھک میں بیٹھنے کے فوراً بعد بھالی نے میرے سامنے چائے سے بھرا ہوا کپ رکھ دیا، پھر جاں نثار کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں۔

”بھیا..... یقین کریں آپ کو یہاں بلائے ہوئے ہم دونوں کو بہت سنگی محسوس ہو رہی ہے۔ آپ تمام دن کے تھکے ہارے گھر آئے ہوں گے، لیکن معاملہ بھی کچھ ایسا تھا کہ اپنے آپ کو منع کرنے کے باوجود روک نہ پائے۔ آپ یقیناً برا نہیں مناد گے۔“

اب میرا جتنس آخری حدوں کو قریباً پار کر چکا تھا۔ میں نے بے چین لہجے میں پوچھا۔

”معاملہ کیا ہے؟ میں جاننے کے لیے بے چین ہوں۔“ بھالی نے دوبارہ جاں نثار کی جانب سوالیہ

سوچے سمجھے بغیر..... پوچھ بچھ کیے بغیر شادی کر لوں گا" بھابی
قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں، پھر چپکتے ہوئے بولیں۔

"یعنی پوچھ بچھ کرنے کے بعد تم شادی کے لیے
بخوشی و رضامند ہو جاؤ گے۔ ٹھیک ہے۔ ہم دونوں آج ہی
سے گفت و شنید کا آغاز کر دیتے ہیں اور اگر اصرار کرو جب لڑکی
سے تمہاری بات چیت بھی کروائے دیتے ہیں۔" میں
گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ جاں نثار نے قہقہہ لگایا اور بھابی
مسکراتے ہوئے بولیں۔

"بھیا..... اب تم فرار نہیں ہو سکتے۔ تمہارے
قد سوں کو زنجیروں سے جکڑنے والی آگئی ہے، پس شادی
رچانے کی تیاریاں کرو۔" میں نے بیکھلا کر دودھاڑ کھولا
اور باہر نکل کر گھر کی جانب چل دیا۔

لڑکی زیادہ خوبصورت نہیں تھی، لیکن کم عمر اور کم گوشتی۔
عمر بمشکل اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ چونکہ اُس نے رشتے
والوں کی موجودگی کے متعلق مکمل طور پر لاعلمی کا اظہار کیا تھا
اس لیے گاؤں کے سرکردہ افراد کی موجودگی میں لڑکی سے
کچھ سوال جواب پوچھے گئے، جن کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔ کیا
وہ شادی شدہ ہے؟ یا نہیں..... لڑکی نے انکار میں سر ہلایا۔

دوسرا سوال..... نام کیا ہے؟ لڑکی نے کچھ دیر سوچتے رہنے
کے بعد جواب دیا۔ چاند بی بی..... مجھے اپنے جسم میں لطیف
جذبات کی لہر دوڑتی محسوس ہوتی اور میں خوبصورت و شگفتہ
کے تانے بانے جوڑنے لگا۔ تیسرا اور آخری سوال جو پوچھا
گیا۔ وہ یوں تھا۔ کیا تم امیر علی کے ساتھ بیاہ رہا ہے؟

لیے رضامند ہو یا نہیں..... اُس نے ایک دفعہ پھر کچھ دیر
سوچتے رہنے کے بعد اقرار میں سر ہلادیا اور کمرہ مبارکباد کی
صداؤں سے گونج اٹھا۔ فوراً سے جیسے ترشادی کی تیاریوں کا
آغاز کر دیا گیا۔ تیاری میں زیادہ اہتمام یا توجہ صرف کھانے
پر دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ سادگی کو کوٹھ نظر رکھا گیا۔

بہر کیف اُس رات چاند بی بی میری زندگی کے مسلسل کی
حیثیت سے گھر میں داخل کر دی گئی۔ اس کے ہمراہ چھتری
صورت میں صرف تین تین کا ایک ٹرک تھا۔ شاید اُس میں چاند
بی بی کے کپڑے وغیرہ تھے۔ میں نے زیادہ پوچھ بچھ نہ کرنا
مناسب نہیں جانا۔ اس کے علاوہ کچھ دیر کی بات چیت کے
بعد صرف اتنا مزید جان پایا کہ اُس کے خاندان کا تعلق پٹیاہ
سے تھا اور وہ بمشکل ہجرت کر کے ایک قافلے کے ہمراہ

پاکستان پہنچ پائی تھی۔ مجھے اس کے خاندان سے بھلا کیا لینا
دینا تھا۔ اس لیے خاموش ہو گیا۔ دن تیزی کے ساتھ
گزرنے لگے۔ وہ ایک اچھی رفیقہ حیات کے طور پر اپنے
آپ کو پیش کرنے میں مہم تھی۔ نا جانے کیوں مجھے اس کے
عادات و اطوار، اُٹھنے بیٹھنے، پیار کرنے کے علاوہ عبادت
کرنے میں بھی مصنوعی پن کا شدت کے ساتھ احساس ہوتا
تھا۔ شروع کے کچھ دنوں کے دوران میری آنکھوں پر پٹی
بندھی رہی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ محبت کا سرچرہ کر
یوں لے والا نشہ جب اُترنا چلا گیا۔ تب وہ سب کچھ دکھائی
دینے لگا، جو شروع کے دنوں میں محسوس نہیں کر پایا تھا۔

وہ صبح منیہ اندھیرے اُٹھ جاتی تھی۔ منہ میں بچا جانے کیا
کچھ بڑبڑاتی تھی، پھر میرے لیے ناشتا تیار کرتی تھی۔ میں
ناشتا کرنے لگتا۔ تب وہ سامنے بیٹھی نا جانے کیا سوچتی
رہتی۔ اُس نے کبھی کبھی میرے ہمراہ ناشتا نہیں کیا۔ ہمیشہ
بعد میں ناشتا کرتی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد
میں کچھ پانی پیتی کے اوزار سنہالنا اور کھیتوں کا زرخ کرتا۔
دو پہر کو وہ چھانچ کی تکی اور کچی کی روٹی کے ہمراہ اپنا بھی لائی
تھی۔ دو پہر کے کھانے پر بھی اس کے معمولات ویسے ہی
تھے۔ ناشتے پر..... وہ میرے ہمراہ کھانا نہیں کھاتی تھی۔ بلکہ
کچھ دلوں کے دوران میں نے مزید یہ بات بھی محسوس کی کہ
وہ کم گو ہونے کے علاوہ بلاوجہ بات چیت کرنے سے بھی
پرہیز کرتی تھی، پھر کچھ ہی دنوں کے دوران مجھے یہ بھی محسوس
ہونے لگا کہ شاید اُس کی دلچسپی کا مرکز میں نہیں کوئی اور تھا،
لیکن اُس پر زور نہ دیتی تھیں کی گئی تھی۔ ہنجائیت کے دوران
اُس سے شادی کے متعلق دریافت کیا گیا تھا۔ تب اُس نے
اپنی مرضی سے ہل کی تھی۔

پھر اب یہ سرد مہری کی دیوار بھلا کیوں قائم ہوتی جا رہی
تھی، شاید میں اس موضوع پر اُس سے بات چیت کرتا، لیکن
انکل اچانک ہی مجھے بھابی کے ذریعے معلوم ہوا کہ چاند بی
بی اور میں ماں باپ بننے والے تھے۔ اس معاملے میں بھی
چاند بی بی نے بے اعتنائی برتی تھی۔ مجھے خبر نہیں ہونے دی
تھی۔ حالانکہ وہ ایک مہینے کے حمل سے تھی۔ میں اُس دن
بہت خوش ہوا۔ ان تمام اختلافات کے باوجود میں چاند بی
بی سے نوٹ کر محبت کرنے لگا تھا۔ اب بچے کی خوشخبری کے
بعد اس کی قدر و منزلت میری نگاہوں میں بڑھ گئی تھی اور

میں اس کا ہر طرح سے خیال رکھنے لگا تھا۔ بچے کی ولادت تک حالات معمول کے مطابق رہے لیکن ولادت کے بعد کروٹ بدلتے گئے۔

ہمارے ہاں لڑکی ہوئی۔ میں نے اس کا نام مہتاب رکھا تھا۔ چاند بی بی نے اب بھی توجہ دینا مناسب خیال نہیں کیا۔ میں نے بھی تنقید کرنا بہتر نہیں جانتا۔ یہ گرمیوں کی تہمتی دودھ پھر کا واقعہ ہے۔ میرے سر میں سنا سے ہی ہلکا ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا۔ بارہ بجے کے قریب اردو نے شدت اختیار کیا، تو میں نے گھر جانا مناسب خیال کیا اور کام اچھوڑ کر گھر کی جانب چل دیا۔ گھر پہنچی کر جو منظر میں نے دیکھا وہ... گھر کا دروازہ چوہٹ کھلا ہوا تھا اور وہاں میری نو مولود لڑکی کے علاوہ اور کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ لڑکی زار و قطار رو رہی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھایا تو وہ ایک دم خاموش ہو گئی، لیکن مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ لڑکی بھوک سے ہلک رہی تھی۔ آج سے پہلے ایسا بھی نہیں ہوا تھا کہ چاند بی بی گھر کو یوں کھلا چھوڑ کر باہر چلی گئی ہو۔ یا شاید ایسا پہلے بھی ہوا ہو۔ میں آج سے پہلے بھی شام سے پہلے گھر واپس نہیں آیا تھا۔ مجھے چاند بی بی پر غصہ آنے لگا اور کچھ عرصے سے دل میں دہی چنگاری نے دوبارہ دھواں اُگلنا شروع کر دیا۔ میں ایک دفعہ بھر سوچنے لگا۔ جتنا اس کی زندگی میں میرے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے۔ جہ تو یہ کہ اب کی دفعہ اس نے بھوک سے ہلکتی چنگاری کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ میں نے دل میں پکارا وہ کر لیا کہ میں پتالگا کر چھوڑوں گا کہ وہ کس سے ملے جاتا ہے۔ وہ ایک بچے کے قریب واپس آئی۔ میری غیر متوقع آمد پر وہ یکدم ہراساں ہو گئی، لیکن پھر کمالِ ڈھائی گئے ساتھ بولی۔

"میں آپ کے لیے کسی لینے جاں نثار بھائی کے گھر گئی تھی۔ وہاں بھابی نے روک لیا۔ اس لیے زیادہ دیر ہو گئی، لیکن آپ جلدی گھر واپس کیسے آ گئے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

میرا غصہ جھاگ کی مانند بیٹھتا چلا گیا۔ اس کے ہاتھوں میں لسی سے لبریز مٹی کا برتن موجود تھا۔ مجھے اپنی سابقہ سوچ برندامت محسوس ہوئی اور میں اسے طبیعت کی ناسازی کے متعلق بتانے لگا۔ اس نے فوراً لسی کا پیالہ زمین پر رکھا اور چادر لپیٹ کر مکان کے دروازے کی

جانب چل دی۔ میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟ مہتاب بھوک سے ہلک رہی ہے؟"

"سامنے پرچوں کی دکان سے ڈسپرین کی گولی لاتی ہوں۔ دو منٹ سے زیادہ نہیں نکلیں گے۔" وہ جواب سنے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ میری گود میں موجود نو مولود مہتاب بھوک کو برداشت کرتے کرتے سو گئی تھی۔ میں نے اسے چار پائی پر لٹایا۔ تب اچانک ہی میری نگاہ چار پائی کے ساتھ رکھے تین کے صندوق کے اوپر رکھی کاسی رنگ کی ٹکڑی پر پڑی۔ وہ ٹکڑی اور اس پر موجود کپڑا میرے لیے یکسر اجنبی تھا۔ میں نے تجسس سے مضطرب ہو کر ٹکڑی کو دونوں ہاتھوں میں تھاما اور پھر لی کے ساتھ اسے کھولنے لگا۔ اس کے اندر کچھ مردانہ کپڑے، ایک عدد پتھر کی سورتی، سیندر لکڑی اڈیا اور منگل سورتہ موجود تھا۔ مجھے اپنے سر پر پہاڑ ٹوٹا محسوس ہوا۔ ٹکڑی میں موجود تمام سامان ہندو رسم و رواج کی عکاسی کرتا تھا، لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ ان چیزوں کا ہمارے گھر میں بھلا کیا کام آئے گا؟ مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی، پھر چاند بی بی نے گھر میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں ڈسپرین کی گولی موجود تھی اور آنکھوں میں شدید حیرت کے تاثرات کے علاوہ خوف بھی موجود تھا۔ میں نے ٹکڑی کو دوبارہ ٹریک پر رکھ دیا، پھر طویل سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"چند ایہ کیا ہے؟ ہندوؤں کا ساز و سامان۔۔۔"

ہمارے گھر میں ان کا کیا کام؟ وہ بڑبڑا کر بولی۔

"میں اس کے حقائق کچھ نہیں جانتی ہوں۔ صبح چشمے پر پانی بھرنے کے لیے گئی تھی۔ مجھے چشمے کے قریب یہ ٹکڑی پڑی ملی، سو میں اٹھا کر یہاں لے آئی۔ اسے کھول کر دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا اور بولا۔

"اسے گھر سے دور کہیں چھوڑ آؤ اور وہ کھول کر کو بھوک لگی ہوئی ہے، اسے دودھ پلا دیتا۔ میں ڈسپرین کی گولی کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کروں گا، پھر کھیتوں میں جاؤں گا۔" چاند بی بی نے اثبات میں سر ہلایا اور پانی لانے کے لیے باورچی خانے کی جانب چل دی۔

ایک ہفتہ نہ امن گزر گیا۔ ان کچھ دنوں کے دوران میں نے محسوس کیا کہ چاند بی بی کے طور و اطوار میں نمایاں

جواب دیے بغیر نائٹے سے نیچے اتر گیا، پھر اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس وقت کچھ بتانا ممکن نہیں ہے۔ میں رات کو تم سے ملنے کے لیے گھر آؤں گا۔ معاملہ کچھ گھمبیر ہے۔ تم میرا انتظار کرنا۔“

میں اس کا جواب سنے بغیر درختوں کے جھنڈ کی جانب چل دیا۔ جس کی طرف میں نے عورت کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ سڑک کچھ اونچائی پر تھی۔ وہاں سے نیچے کھیتوں کا سلسلہ موجود تھا، پھر کھیتوں کے بعد بجر زمین، اس کے بعد درختوں کا وسیع و عریض سلسلہ..... وہاں آبادی نا ہونے کے برابر تھی۔ اس لیے ارد گرد نو کا عالم تھا۔ مجھے جھنڈ تک پہنچنے میں پانچ منٹ لگے۔ جھنڈ کے قریب پہنچ کر میں نے رفتار آہستہ کی اور درختوں کی آڑ لپکا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ یہاں زمین زرخیز تھی اور گھاس کے قطعات بھی موجود تھے۔ جن کی بدولت قدموں کی آہٹ سننے سے جانے کا خدشہ بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ جھنڈ کے وسیع و عریض قطعہ زمین پر جا بجا خشک تھماڑیوں کے جھنڈ موجود تھے۔ ایسے ہی ایک جھنڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ میں جہاں تھا وہیں کھڑا ہو گیا اور کان آواز کی جانب لگا دیے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”مدھوتی..... میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ہوں۔ لیکن اتنی جلدی تمہیں بارڈر کے پار لے جانا ممکن نہیں ہے۔ ابھی ہمیں مزید کچھ وقت ملے گا۔ میرا کیلے یہاں آنا ہی بہت زیادہ دشوار ہے، لیکن کسی جوان لڑکی کے ہمراہ واپس جانا ممکن نہیں ہے۔ بارڈر کے حالات دن بدن خراب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے کسی بھی قسم کا رسک لینے کے لیے آمادہ نہیں ہوں۔ کچھ دن اور انتظار کر لینا ہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوگا۔“ عورت کی آواز سنائی دی۔

”میرے خیال میں مزید انتظار کرنا ہم دونوں کے حق میں مناسب نہیں ہوگا۔“ مجھے اپنے سر پر ہلکی گرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ آواز بلاشبہ چاندلی بی عرف مدھوتی کی تھی۔ وہ بولے جا رہی تھی۔

”میرے شوہر کو کسی وقت بھی تمہارے وجود کے

تبدیلی کا آغاز ہوا۔ وہ پانچ وقت نماز پڑھنے لگی اور مجھ سے محبت بھی زیادہ کرنے لگی۔ وہ احساسات جن سے کچھ دن پہلے میں رو چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ختم ہونے لگے۔ لیکن پھر ایک دن ایسا حادثہ پیش آیا جس نے مجھے دوبارہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ہوا کچھ یوں کہ مجھے کھیتوں کی زمین کی زرخیزی کے لیے کھاد کی بوریاں دور کا تھیں۔ شہر میں کھاد کی قلت کی بدولت بوریاں کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا، لیکن بارڈر پار سے کھاد نہایت کم قیمت پر اسمگل ہو کر پاکستان آ رہی تھی۔ میں نے دوپہر کو کام جلدی جلدی پتہ پایا اور بارڈر کی جانب چل دیا جو کہ اندر سے گاؤں سے زیادہ دور نہیں تھا، بمشکل پونے گھنٹے کا راستہ تھا۔ جاں نثار میرے ہمراہ تھا۔ ہم بات چیت کرتے ہوئے بارڈر کی جانب رواں دواں تھے۔ سہ پہر کے قریب چار بجنے والے تھے۔ اچانک بے خیالی میں میری نگاہ سڑک سے کچھ ہٹ کر پہاڑی علاقے کے پاس لگے درختوں کے جھنڈ کی جانب جانی ایک عورت پر پڑی۔ وہ سرخ رنگ کے کپڑوں اور سیاہ رنگ کی چادر میں ملبوس تھی۔ اس کے ہاتھوں میں کاسی رنگ کی ٹھڑی موجود تھی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی بدولت چہرے کے نقوش واضح نہیں تھے، اس کے ہاتھوں میں کاسی رنگ کی ٹھڑی میرے اندازے کے مطابق دتہا تھی، جسے کچھ دن پہلے میں اپنے کمرے میں دیکھ چکا تھا۔ علاوہ ازیں مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد تھا کہ میں کاشٹے لگے بعد میں نے چاندلی بی کو کپڑوں کے فرق میں سے سرخ جوڑا نکالتے ہوئے بخوبی دیکھا تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہ باہر جانے کے لیے سیاہ چادر پہنتی تھی۔ میری کاروباری سرگرمیاں کچھ اس حد تک بڑھ چکی تھیں کہ مجھے گھریلو معاملات میں دلچسپی لینے کا موقع کم ہی ملتا تھا، لیکن کچھ باتیں ہمیشہ کے لیے لا شعور میں محفوظ ہو جاتی ہیں، مان میں سے ایک کاسی ٹھڑی بھی تھی۔ عورت کا رخ درختوں کے جھنڈ کی جانب تھا اور وہ کچھ غلط میں ہونے کے علاوہ گھبرائی ہوئی بھی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے جاں نثار کو تاکہ روکنے کے لیے کہا۔ اس نے حیرت بھری نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے باتیں سمجھتی دیں، پھر بولا۔

”خیریت تو ہے، مجھے تمہارے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھرتے دکھائی دے رہے ہیں۔“ میں

بنانے کے لیے یکن کی جانب چلی گئیں۔ جاں نثار نے سلام پھیرا پھر دعائے کھٹنے کے بعد مصلیٰ اٹھاتے ہوئے میری جانب دیکھا اور بولا۔

”بھئی بھئی مجھے تمہاری شخصیت کے متعلق شک سا ہوتا ہے۔ پتا نہیں تم واقعی طور پر صحت مند ہو گی یا نہیں۔“

”آج تو کچھ ایسا ہی شک مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے۔“ میں غصہ سی سانس لیتے ہوئے بولا۔

”تم یقین نہیں جانو گے کہ میں آج کتنا پریشان ہوں۔ میری بیوی گھر پر موجود نہیں ہے اور نو مولود لڑکی گھر میں تباہ پڑی بھوک کی شدت سے بک رہی ہے اور میں غریب خود کشی کرنے کے متعلق بھی سوچ رہا ہوں۔“ جاں نثار نے حیرت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھا، پھر پریشان لہجے میں پوچھا۔

”خیریت تو ہے۔۔۔۔۔ بھابی کہاں ہے؟ اور مہتاب گھر میں اکیلی کیوں ہے۔“ میری آنکھوں کے آگے موجود وہ بندھے میں جا جانے تک کیسے قائم رکھے ہوئے تھا، اچانک ہی مٹی کا ڈھیر فنا چلا گیا اور آنسوؤں کا سیلاب اٹھتا چلا آیا۔ جاں نثار نے ٹھہرائے ہوئے چہرے کے ساتھ میری جانب دیکھا، پھر ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”تم رو رہے ہو؟ کیا ہوا؟ معاملہ کیا ہے؟ مجھے کچھ تو بتاؤ۔“ میں نے آنسوؤں کو پونچھا اور ہچکیاں لیتے ہوئے اسے سب کچھ بتانے لگا۔ اس اثناء میں بھابی بھی چائے کے ہمراہ کمرے میں آ چکی تھیں۔ میں نے ان سے بھی معاملے کو پوشیدہ رکھنا مناسب نہیں جانا اور سب کچھ لفظ بہ لفظ دونوں کو بتا دیا۔ جاں نثار اور بھابی کا یہ عالم تھا کہ انہیں ہاتھوں میں جھپتی ہوئی سوئی کی تکلیف بھی اس سے محسوس نہیں ہو پاتی۔ ان دونوں کی آنکھیں حیرت کی شدت سے قریب پائے کے قریب تھیں۔ میرے خاموش ہونے کے بعد بھابی بولیں۔

”تمہاری باتوں پر یقین کرنے کو دل نہیں کرتا، لیکن اگر تم اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر آئے ہو، تب یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ حالانکہ چاندنی بی کو میں اس کچھ عرصے کے دوران اچھی طرح جان چکی ہوں اور میرے اندازے

متعلق آگاہی ہو سکتی ہے۔ تم یقین جانو۔۔۔۔۔ کہ وہ شک و شبہ کے گرد لب میں نہیں چکا ہے۔ اسے صرف ثبوت کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد کیا ہوگا تم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہو۔“

میں نے احتیاط کے ساتھ جھاڑیوں کے جھنڈ کے دوسری جانب جھانکا۔ وہ دونوں جھنڈ کے دوسری جانب گئے درختوں کے نیچے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے میری جانب تھے۔ دھڑکتی یا پھر میری چندا ہاتھوں میں لاسی گھڑی تھامے کھڑی تھی۔ اس کا الٹا ہاتھ سامنے کھڑے لڑکے کے ہاتھوں میں تھا۔ اس سے زیادہ برداشت کرنا میرے اختیار سے باہر تھا۔ اس لیے میں نے وہاں سے ہٹ جانا مناسب جانا۔ سڑک پر جاں نثار موجود نہیں تھا۔ میں پیدل گاؤں کی جانب چل دیا۔ میرا دماغ تیز و تند آندھیوں کی لپیٹ میں تھا۔ مجھے اپنی بے وقوفانہ فطرت پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ایک ایسی لڑکی پر اظہار کیا، جس کے متعلق میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھی؟ اور کہاں سے آئی تھی؟ اس کا شادی کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا تھا۔ اس کی پند اسرار شخصیت کو کون سا خاطر رکھتے ہوئے یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ وہ ہمسایہ ملک کی ایجنٹ ہو، بہر کیف میں گاؤں کیسے پہنچا مجھے کچھ معلوم نہیں، لیکن میں نے گھر جانے کے بجائے جاں نثار کے گھر کا رخ کیا۔ اس کا تانگہ جانوروں کے باڑے کے قریب بندھا ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ دروازہ بھابی نے کھولا۔ مجھ سے ہی وہ چپکتے ہوئے بولیں۔

”بھیا۔۔۔۔۔ آج تم راستہ بھول کر اپنے گھر جانے کے بجائے ہمارے گھر بھلا کیوں چلے آئے۔“ خیریت تو ہے؟“

”بھابی خیریت نہیں ہے۔ مجھے جاں نثار سے کچھ بات چیت کرنی ہے۔ کیا وہ گھر پر موجود ہے؟“ بھابی نے میرے چہرے پر پریشانی کی ویزینہ کو فوراً محسوس کر لیا۔ اور کوئی بات کیے بغیر مجھے اپنے پیچھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جاں نثار بیٹھک میں موجود عصر کی نماز پڑھنے کے لیے کھڑا تھا۔ میں خاموشی کے ساتھ ایک جانب درہی پر رکھے عجبے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بھابی چائے

شادی اُسے مجبوراً کرنی پڑی اور شادی کے بعد ماں بڑا ایک فطری عمل ہے۔ جس میں شاید اُس کی رضامندی بھی شامل نہ رہی ہو، لیکن میرے بے وقوفانہ عمل دخل کی بھی انتہا ہے۔" جاں نثار نے میرے کانڈھول پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا، پھر بولا۔

"میں تمہارے احساسات کے متعلق اچھی طرح جانتا ہوں، لیکن اب بھی یہی کہوں گا کہ بات کھلنے تک اپنے جذبات پر کنٹرول رکھنے کی کوشش کرنا۔ ہو سکتا ہے۔ معاملہ وہ نہ ہو، جو دکھائی دے رہا ہے۔" میں غصیلے لہجے میں بولا۔

"معاذ اللہ! ہے جو سامنے دکھائی دے رہا ہے۔ بھوک سے ہلکتی لڑکی تمہارے سامنے موجود ہے۔ اگر مزید جانکاری کرنا چاہتے ہو تب میں تمہیں وہ جگہ بتائے دیتا ہوں۔ تم اپنی آنکھوں سے محبت کا ڈراما دیکھ کر آ سکتے ہو۔ وہ یقیناً درختوں کے جھنڈ کے درمیان اپنے محبوب کے ہمراہ موجود ہوگی۔" جاں نثار نے کمرے میں موجود جگ میں سے پانی گلاس میں اٹھایا اور مجھے تھماتے ہوئے بولا۔

"قصہ حرام ہے، اور صبر کا پھل ملتا ہوتا ہے۔ اگر دینے والی ذات خدا کی ہے۔ تم معاملے کو خدا پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔" اس کی بات درمیان میں رو گئی۔ محسن میں قدموں کی آہٹ سنائی دی، پھر دروازہ جھٹکے کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ وہ سرخ کپڑوں اور سیاہ رنگ کی چادر میں لپیٹ کرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں کاسی شیشی بھی موجود تھی۔ ہم تینوں پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کا رنگ فق ہوتا چلا گیا اور قدم جہاں تھے۔ وہیں گڑھ گئے۔ وہ پتھر کی سورتی بنی ایک تک میری جانب دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے ہاتھوں میں موجود پانی کا گلاس طلق میں اٹھایا، پھر جاں نثار کی جانب دیکھتے ہوئے رخ لیجے میں بولا۔

"اب تم خود معاملے کی تحقیق کر سکتے ہو۔ میں اپنے قصے پر کنٹرول کر چکا ہوں۔" جاں نثار نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا، پھر نرم گرم لیجے میں بولا۔

"بات چیت اگر بیٹھ کر ہو جائے تب زیادہ بہتر ہوگا۔ مہتاب سوئی ہے۔ اسے بستر پر لٹا دو۔" اس واقعہ

کے مطابق وہ ایسی لڑکی نہیں ہے، لیکن آج کل کے مردوں کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ وہ بھی ذہنیت کی لڑکیوں کو درغلانے کے گردوں سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں، لیکن ہمیا تم بغیر سوچے سمجھے اور ہم سے صلاح و مشورے کے بغیر کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے کی کوشش نہیں کرنا۔ یہ معاملہ ایسا ہی ہے کہ مل بیٹھ کر الہام و نصیہ کے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور گھٹکی لگا ہوں سے جاں نثار کی جانب دیکھنے لگا۔ جاں نثار طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔

"کیا وہ اس وقت تک گھر واپس آ گئی ہوگی۔ میرے خیال کے مطابق معاملہ سامنے ہونے کے باوجود ابھی تک کھل نہیں پایا۔ ہم تینوں اندر کی بہت سی باتوں سے بے خبر ہیں۔ ان باتوں سے پردہ اُسی صورت میں ہٹ سکتا ہے۔ جب عمل کر بات چیت کا آغاز کیا جاسکے۔"

"میرے اندازے کے مطابق اب تک اُسے واپس آ ہی جانا چاہیے۔ مہتاب گھر میں اکیلی ہے، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مغرب سے کچھ پہلے گھر کا رخ کرے۔ اُسے مہتاب کی رتی بھر بھی پروا نہیں ہے۔ جاں نثار کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد بولا۔

"پھر تمہارے گھر چلتے ہیں، تاکہ وہاں چاند بی بی سے آنے سامنے بات چیت ہو سکے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اُن دونوں کے ہمراہ گھر کی جانب چل دیا۔ گھر کا دروازہ بند تھا، لیکن دروازے پر تالا موجود نہیں تھا، صرف باہر سے کنڈی لگا دی گئی تھی۔ میں نے کنڈی کھولی اور محسن میں داخل ہو گیا۔ سامنے موجود درہائیں کراہی کے رونے کی آواز سے گونج رہا تھا۔ وہ یقیناً چھلی واقعہ کی طرح بھوک سے ہلک رہی تھی۔ بھابی نے بھاگ کر کمرے کا دروازہ کھولا اور جلت میں لڑکی کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا، پھر غصیلے لہجے میں بولیں۔

"درندگی کی انتہا ہے۔ کوئی ماں ایسے اپنی بیٹی کو بھوک سے ہلکا چھوڑ کر گھر سے باہر جاسکتی ہے۔ میں تو سوچتا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔" میں نے زہریلے لہجے میں جواب دیا۔

"وہ ماں نہیں، ایک ہندو لڑکی ہے۔ میرے ساتھ

اور اُداسی کا ایسا عالم اُن میں پوشیدہ تھا۔ جس نے مجھے ایک دفعہ پھر اپنی سوچ پر نظر ثانی کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ وہ پھر اے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تصور تو میرا اپنا ہی ہے۔ بہت سے ایسے فیصلوں کی سزا مجھے بھگتنا پڑ رہی ہے، جو سراسر حماقت پر مبنی تھے۔ میں شروع سے اپنی کہانی سناتی ہوں۔“

میرا نام بدھوتی ہے اور میرا اہلی ایک ہندو گھرانے سے ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی ایک دم آزادی نے جہاں مسلمانوں کو پریشان کر دیا۔ وہاں ہندو بھی صدمے کا شکار ہوئے۔ میرا گاؤں یہاں سے کچھ دور شاداب نگر کے قریب واقع ہے۔ آزادی کے بعد جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہمارا گاؤں پاکستان کی سرزمین میں شامل کر دیا گیا ہے۔ تب ہمارے خاندان والوں کو شدید دھچکا لگا اور انہوں نے غفلت میں فرار ہونے کی کوشش کی۔ قائدہ کچھ نہیں ہوا، لیکن گھبراہٹ میں ہم سب بکھرتے چلے گئے۔ میں یکدم لوگوں کے جھوم میں اکیلی ہو گئی۔ گھبراہٹ کے عالم میں بارود کا زرخ کیا۔ تب جاں نثار بھائی سے ملاقات ہوئی۔ اگر اپنے آپ کو ہندو ظاہر کرتی تب جان کو خطرہ پیش آ سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے آپ کو حالات کے تیز دھارے کے سپرد کر دیا۔ آپ میں سے کسی نے بھی میرے دین و دھرم کے متعلق پوچھنے کی کوشش نہیں کی اور مجھے اپنے گھر لے آئے۔ حالات کے دھارے پر اپنے آپ کو چھوڑنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں نے بالکل ہی حالات سے بروہوش کر لی تھی۔ میرا دماغ وقتی طور پر ماؤف ہو گیا تھا، لیکن آنکھیں کھلی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ میں ایسے گھر میں موجود تھی۔ جس کے کینوں کا مذہب مخالف تھا۔ اگر میرا پول کھل جاتا، تب شاید میں یہاں سے زیادہ باہر نہ جاسکتی۔ اپنی حیثیت کو مضبوط کرنے کے لیے مجھ سے بہت بڑی عطی سرزد ہو گئی۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر شادی کی حامی بھر لی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں پہلے سے شادی شدہ تھی۔“

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی، لیکن مجھے کمرے میں زلزلے کی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ میرے جسم میں سے جان نکلتی چلی جا رہی تھی۔ میری بیوی نا صرف ہندو تھی، بلکہ پہلے سے شادی شدہ بھی

اُس نے بھابی سے مخاطب ہو کر کہا اور بھابی نے لڑکی کو بستر پر لٹا دیا۔ چار پائی کے ساتھ درمی پر تکیے رکھ کر بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی اور ہم چاروں درمی پر بیٹھ گئے۔ چاند بی بی کے چہرے پر موجود گھبراہٹ عزم و استقلال کی صورت اختیار کر چکی تھی اور اب وہ کسی نہ کسی حد تک مطمئن دکھائی دیتی تھی۔ جیسے بہت سے فیصلوں پر غور و خوض کرنے کے بعد اب وہ حتمی فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئی ہو۔ کمرے میں کچھ وقت کے لیے خاموشی طاری ہوئی چلی گئی، پھر جاں نثار گلے کو کھینکھارتے ہوئے بولا۔

”بھابی... معاملہ کچھ تعمیر صورت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ آپ کے شوہر کے دماغ میں بہت سے دھوڑے اور گلے شکوے ایسے موجود ہیں، جنہیں اگر ابھی دور نہیں کیا گیا تو آپ کی گھریلو زندگی جاؤ ہونے سے کوئی نہیں روک پائے گا۔ گھریلو زندگی کو سنبھالنے میں اہم کردار ادا کرنے والی دو چیزوں میں سے ایک کا نام اعتماد کا رشتہ ہے، جو آپ دونوں کے درمیان منسوخ ہو گیا ہے۔ اور دوسرے نمبر پر پیار و محبت ہے، جو اعتماد کے رشتے سے ہی پروان چڑھتا ہے۔ معاف کرنا بھابی... لیکن آپ اپنا اعتماد گنوا چکی ہیں۔ اب اگر محبت کے رشتے کو قائم رکھنا چاہتی ہیں، تب اعتماد کو دوبارہ بحال کرنا ہوگا۔“

”میں کبھی نہیں...“ چاند بی بی نے کمال مصونیت کے ساتھ پوچھا۔ جاں نثار نے مٹیلے سانس کھینچا پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دوبارہ ہم کو مخاطب ہوا۔

”کاسنی رنگ کی اس ٹمڑی کا کیا راز ہے؟“ میری معلومات کے مطابق امیر علی نے آپ کو اسے پیچک دینے کا حکم دیا تھا۔ آپ نے حکم کی خلاف ورزی بھلا کیوں کی؟“ چاند بی بی نے نظر جھکا لیا، پھر کمزور لہجے میں بولی۔

”میرے خیال میں اب مزید کچھ چھپانا بہتر نہیں ہوگا۔ میں سب کچھ لفظ بہ لفظ بتائے دیتی ہوں، ورنہ غلط فہمیاں بڑھتی چلی جائیں گی۔“

”میں بھی ایسا ہی چاہتا ہوں۔“ جاں نثار بولا۔“ سب کچھ سچ سچ بتا دیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بقینا بے قصور ہوں گی۔“ چاند بی بی نے نظریں اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

”شادی کا فیصلہ کرنے سے پہلے میں نے اپنے گھر والوں کا بہت انتظار کیا، لیکن ان میں سے کوئی نہیں آیا۔ شادی کے بعد میں راہ گئی رہی۔ بارڈر پر حالات سدھرنے کے بجائے بگڑتے چلے گئے۔ ایسے عالم میں تاجا نے کیسے اور کیوں میرا سابقہ شوہر رامو بارڈر عبور کر کے مجھے ڈھونڈنا ہوا یہاں تک چلا آیا۔ ہماری ملاقات ہوئی۔ گلے شکوے ہوئے، لعن طعن ہوئی۔ اس کے بعد میں نے اس سے کچھ بھی چھپائے بغیر سب کچھ بتا دیا۔ وہ طیش میں آ گیا۔ مجھے مارا پٹا بھی..... لیکن پھر غصہ اتر جانے کے بعد وہ مجھے دلاسا دینے لگا۔ وہ اب بھی مجھے قبول کرنے کے لیے تیار تھا۔ بارڈر عبور کرنا کچھ آسان نہیں تھا، لیکن ناممکن بھی نہیں تھا۔ وہ حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے بھی اس نے صبر و سکون کے ساتھ انتظار کی تلقین کی۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔ کاسنی رنگ کی اس ٹھڑی کے اندر سیندور، منگل سوتر اور میرے سابقہ شوہر کے کپڑے موجود تھے۔ میں انہیں اپنے ہمراہ یہاں لائی گئی۔ شوہر سے ملاقات کے بعد میں نے سامان لے لیا تھا دیا، لیکن حالات موافق نہ ہونے کی وجہ سے اس نے واپس کر دیے۔ آج بھی میں اسے ٹھڑی واپس کرنے کی نیت سے گئی تھی، لیکن بات چیت کے دوران اس نے خفیف قدموں کی آہٹ سن لی اور میں نے آپ کو سڑک کی جانب جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں نے رامو کے ساتھ مشورہ کیا۔ رامو نے مجھے کچھ رقم تھماتے ہوئے گاؤں کے قریب کہیں اور گھر کرائے پر لینے کی تلقین کی اور دو دن بعد واپس آنے کا وعدہ کرنے کے بعد بارڈر پار چلا گیا۔ چاند بی بی خاموش ہو گئی۔ کمرے میں کھل سکوت چھایا ہوا تھا۔ میرا دماغ تیز دستد بگولوں کی زد میں تھا۔ جاں نثار خلاؤں میں گھورتا ہوا جانے کیا سوچ رہا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سے بھائی بھی دو چار تھیں۔ چاند

دوسرے دن عصر کی نماز کے بعد گاؤں کے درمیان
 بنی چال میں گاؤں کے سرکردہ افراد کے علاوہ گاؤں
 والے بھی موجود تھے۔ معاملہ گاؤں کے بچوں کے علاوہ
 گاؤں والوں کو بھی معلوم ہو چکا تھا اور وہ کسی حد تک
 اشتعال میں دکھائی دیتے تھے۔ چاندنی لی اور اس کے

کے بعد بھی پتا نہیں چلنے دیا گیا۔ وہ تو خدا کی مرضی اور حالات کی ستم طرہی کی وجہ سے بات کھلتی چلی گئی، ورنہ مجھے اب بھی معلوم نہیں ہو پاتا اور چاند بی بی خاموشی کے ساتھ بارڈر کے پار چلی جاتی۔“ مولوی عبدالرحمن نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بولا۔

”اب تمہاری اس مسئلے کے متعلق کیا رائے ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق وہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔ تمہارا نکاح بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ ہندو لڑکی کے ساتھ اس وقت تک نکاح جائز نہیں۔۔۔۔۔ جب تک وہ اسلام کے دائرہ کار میں قدم نہ رکھ دے۔ میرے خیال میں ایسا نہیں ہو سکا۔ اس لیے تمہارے نکاح کی حیثیت نا ہونے کے برابر ہے۔ اب میری نصیحت صرف یہی ہے کہ تم جو کچھ بھی کرنا۔۔۔۔۔ وہ اسلامی دائرہ کار میں نہ کرنا۔“ میں نے افسردہ نگاہوں سے بچوں کی جانب دیکھا، پھر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔

”فیصلہ تھی ہے اور قانون کے مطابق بھی ہے۔ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔ طلاق لیے بغیر دوسرا نکاح جائز نہیں۔ اس کے علاوہ وہ ہندو بھی ہے۔ میری عقل و فہم کے مطابق ملک کا بٹوارا ممکن ہے، لیکن عورت کا بٹوارا ممکن نہیں ہے۔ اسے ہم دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو گا، باقی آخری فیصلہ میں بچوں کی عقل و دانش پر چھوڑتا ہوں۔“ میں خاموش ہو گیا۔ مولوی عبدالرحمن نے بتایا اور چار بچوں کے ساتھ سر جوڑ کر مشورہ کیا، پھر مجھے اپنی جگہ بیٹھنے کا حکم دیا اور چاند بی بی سابقہ مدھوتی اور اس کے شوہر رامو کو بلانے کی ہدایات دیں۔ کچھ دیر بعد چو پال میں مدھوتی کے علاوہ اس کا شوہر رامو داخل ہوا۔ نضا میں کشیدگی کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ گاؤں والوں میں زیادہ تعداد ایسے افراد کی تھی، جو بارڈر پار ہندوؤں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے ہوئے پاکستان آنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اُن کا اشتعال فطری طور پر درست تھا۔ موقع کی نزاکت کو جانچتے ہوئے بچوں نے پہلے ہی دونوں میاں بیوی کی حفاظت کے اقدامات کر رکھے تھے۔ چو پال میں میاں بیوی کے ہمراہ پولیس کے دو اہلکار بھی ہاتھوں میں رائفل تھے داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر مشتعل افراد واپس زمین پر بیٹھتے چلے گئے۔ رامو چھوٹے قدم اور کالے سیاہ رنگ کا۔۔۔۔۔ دوسروں کی

سابقہ شوہر رامو کو پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ اُن کو منظر عام پر لانا حالات کو بگاڑنے کے مترادف تھا۔ لیکن اُن دونوں کی عدم موجودگی میں بھی کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے گاؤں کے سرکردہ بچوں کے حکم کے مطابق انہیں پنجائیت میں بلانے کے لیے مختصر وقت دیا گیا تھا، تاکہ دونوں سے پوچھ گچھ کے بعد کسی حتمی فیصلے کو سامنے لایا جاسکے۔ گاؤں کے سب سے بڑے بیچ کا نام مولوی عبدالرحمن تھا۔ اس کی عمر پچھتر سال سے اوپر تھی اور چہرے پر نور کی شدت تھی۔ وہ پانچ وقت کا نمازی اور پرہیزگار ہونے کے علاوہ گاؤں کی انگوٹی مسجد کی امامت کا اعزاز بھی رکھتا تھا۔ چو پال میں دو چار پائیاں موجود تھیں، جن پر بچوں کے علاوہ میں، جاں نثار اور گاؤں کے متولی حیثیت رکھنے والے اشخاص بیٹھے تھے۔ اس کے علاوہ باقی تمام گاؤں والے زمینوں پر بیٹھے مقدمے کی شروعات کے منتظر تھے۔ مولوی عبدالرحمن نے آیات کی تلاوت کے بعد گاؤں والوں کی جانب نظر دوڑائی۔ پھر بولا۔

”میرے خیال میں آپ سب امیر علی کے مسئلے کے متعلق سب کچھ جانتے ہی ہیں۔ اب میری آپ سب سے درخواست والی ہے کہ اپنے جذبات پر حتی الوسع قابو رکھنے کی کوشش کیجیے گا۔ ہمارا مقصد بھی ہمیں اسی بات کی تصدیق کرنا ہے۔“ پھر اس نے مجمع کی جانب سے لگا ہٹا کر میری جانب دیکھا اور بولا۔

”امیر علی ولد شبیر علی۔۔۔۔۔ چاند بی بی یا پھر سابقہ مدھوتی کا شوہر ہے۔ میں اسے بچوں کے سامنے آنے کی درخواست کرتا ہوں، تاکہ معاملے کو سلجھانے کے لیے پیش رفت کی جائے۔“ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور بوجھل قدموں کے ساتھ چلتا ہوا بچوں کی چار پائی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ مولوی عبدالرحمن نے فیصلہ کی نگاہوں سے میرا جائزہ لیا، پھر بولا۔

”امیر علی۔۔۔۔۔ کیا شادی سے قبل یہ بات تمہارے علم میں تھی کہ تمہاری ہونے والی بیوی چاند بی بی یا مدھوتی ایک ہندو گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ میں بہت سی باتوں سے باخبر ہوں، لیکن تمہارے منہ سے سنا چاہتا ہوں۔“ میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے اس بات سے بیکسر لاء علم رکھا گیا، بلکہ شادی

سے تمہاری ایک ہڈی کی بھی موجود ہے۔ یا یوں سمجھو کہ تمہیں ایک شوہر نہیں بلکہ ایک مذہب کا انتخاب کرنا ہے۔ ظاہر ہے یہ اتنا آسان کام نہیں ہوگا، جتنا دکھائی دیتا ہے۔ بہر کیف پھر بھی مسئلے کے فیصلے میں تمہارا اقرار یا پھر انکار بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ سوچو سمجھ کر فیصلہ کرنا۔"

چاند بی بی کے چہرے پر سوچ و پکار کے تاثرات ابھرے، پھر وہ پریشان لہجے میں بولی۔

"مجھے سونے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ شاید کل صبح تک..... لیکن اتنی جلدی میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتی۔" مولوی عبدالرحمن نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا پھر بولے۔

"یقیناً یہی درست ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں، موجود مسئلے کا حل تمہاری ہاں..... یا نا میں پوشیدہ ہے۔ تم آج رات اچھی طرح سوچو سمجھو۔ اگر اپنے سابقہ شوہر کے ہمراہ بار بار جانا چاہو تب صبح خاموشی کے ساتھ اس کے ہمراہ جاسکتی ہو۔ علاوہ از یہ اگر امیر علی کے ہمراہ رہنا چاہتی ہو۔ تب راسو سے طلاق لینے کے بعد امیر علی کے ہمراہ صبح مسجد میں آ جانا، تاکہ اسلام قبول کرنے کے بعد دوبارہ نکاح پڑھایا جائے۔ اس کے بغیر تم ہمارے درمیان نہیں رہ سکتی ہو۔ اب تم جاسکتی ہو۔ آج کی رات امیر علی کے گھر رہنا۔ صبح تمہارا فیصلہ منظر عام پر آ جائے گا۔ پختائیت پر خاست کی جاتی ہے۔" مولوی عبدالرحمن نے حتمی لہجے میں فیصلہ سنایا اور چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ رات یقیناً فیصلے کی رات تھی۔ دوسرے دن کسی ایک سے سب کچھ چھپنے والا تھا۔ میری آنکھوں میں خینکا نام دھنچان موجود نہیں تھا۔ ماتھے پر لکڑی لکیروں کا جال بنا ہوا تھا اور جسم میں بے چینی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ اگر میری بیوی چندا مجھے چھوڑ کر اپنے سابقہ شوہر راسو کے ہمراہ چلی گئی۔ جب میری دودھ پیتی بیٹی کا کیا ہوگا؟ وہ تو اپنی ماں کے ہوتے ہوئے بھی ماں کے سائے سے محروم ہو جائے گی اور خود میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں ایک دفعہ پھر اُسی مقام پر پہنچ جاتا۔ جہاں سے چلا تھا۔ ہزارے کے بعد جب میں نے پاکستان کی سر زمین پر قدم رکھا۔ تب سب کچھ قربان کر کے یہاں آیا تھا۔ اب

زمینوں پر کام کرنے والا ہماری دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکینیت کی وحشت چھٹی دکھائی دیتی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑے تھر تھرتھاتا ہوا مدھنچن کے ہمراہ چلتا ہوا بچوں کی چارپائی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ مولوی عبدالرحمن نے دلوں میں بیوی کا جائزہ لیا، پھر نرم گرم لہجے میں بولا۔

"تمہیں پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ تم یہاں اتنے ہی محفوظ ہو جتنے اپنے ملک میں.....

اگر معاملہ گنیمت نہیں ہوتا تب تم دونوں کو پختائیت میں بلانا ضروری نہیں تھا، لیکن اب چونکہ معاملہ کچھ غیر معمولی نوعیت اختیار کر چکا ہے۔ اس لیے میں اسے تم دونوں پر چھوڑتا ہوں۔ یقیناً تم دونوں موجودہ مسئلے پر غور و خوض کرتے ہی رہے ہو گے۔ اب کل کر اپنی رائے کا اظہار کر دو تاکہ ہمیں بھی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

"راسو تم بتاؤ۔ تمہارے مسئلے کا حل کیا ہو سکا ہے؟"

راسو نے تھوک نلکتے ہوئے بچوں کی جانب دیکھا، پھر کانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"سرکار..... آپ جیسے عقلمند اور اچھے لوگوں کی موجودگی میں..... میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ یقیناً جو بھی فیصلہ کریں گے، ہمارے حق میں بہتر ہی ہوگا۔ ہمارا اپنا فیصلہ آپ کے فیصلے کے ساتھ منسلک ہے۔" مولوی عبدالرحمن نے مسکراتے ہوئے راسو کی جانب دیکھا پھر بولا۔

"میں نے فیصلے کی نہیں..... صرف رائے کی بات

کی ہے۔ مسئلہ وحیدہ ہے اور قصور سراسر تمہاری بیوی کا ہے۔ وہ بیک وقت طلاق لینے بغیر دو شہادیوں کی سرکوب ہوئی ہے اور ایسا ہونا ممکن نہیں..... لیکن ہو گیا ہے، لہذا ہمارے مذہب میں معافی کی گنجائش موجود ہے۔ اگر یہ طلاق لینے اور مسلمان ہونے کے بعد دوبارہ نکاح کر کے امیر علی کو اپنائے۔" راسو ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"جو حضور کو منظور ہو۔ اگر مجھ ناچیز کی رائے کی کچھ بھی اہمیت آپ لوگوں کی نگاہوں میں موجود ہے۔ تب مجھے اپنی بیوی کے ہمراہ واپس جانے دیا جائے۔ اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔"

مولوی عبدالرحمن نے اس دفعہ چاند بی بی سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"چاند بی بی تم کیا کہتی ہو؟ یہ یاد رکھنا۔ دوسرے شوہر

دیا۔ میرے پاس اب بھی مہتاب کی صورت میں بہت کچھ موجود تھا۔ اب مجھے صرف اپنی انکوائری لڑکی کے لیے جینا تھا۔ لیکن ڈیڑھ سال سے قائم رشتے کو یوں یکدم بھلا دینا بھی کچھ آسان نہیں تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر چاند بی بی اور رامو کی جانب آخری دلدھ دیکھا۔ وہ دونوں بارڈر کی جانب رواں دواں تھے۔ میں نے قدموں کو حریص تیز کر دیا۔ اب دوبارہ پیچھے مڑ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

گاؤں کے قریب پہنچے تک میرا سانس پھولنے لگا اور میں نے رفتار آہستہ کر دی۔ گاؤں بارڈر زندگی بیدار ہو چکا تھا اور چوہل پھل کا سماں تھا۔ لیکن مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میری نظر میں زندگی کی حقیقت بے حقیقی ہو چکی تھی۔ سب کچھ بے کار تھا۔ اگر مہتاب کا اندازہ نہ ہوتا۔ تب شاید میں خود کشی کے متعلق بھی سنجیدگی کے ساتھ غور کرتا۔ اچانک کسی نے میرے کانٹے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نور پھان تھا وہیں سناکت ہو گیا۔ چاند بی بی سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور ہونٹ نیچے مڑ کر کاغذ پر تھرا رہے تھے۔ میں نے تسلی بخشا ہوں۔

”مجھے مسجد کی جانب لے چلیے۔ میں مسلمان ہوں چاہتی ہوں۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا، لیکن وہ بولے چلے جا رہی تھی۔ رامو وہاں درختوں کے پاس کھڑا ہے۔ وہ مجھے طلاق دینے کے لیے رضا مند ہے۔ میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

”لیکن میں نے تمہیں رامو کے ہمراہ بارڈر کی جانب جاتے ہوئے دیکھا تھا، پھر یکدم یہ سب کچھ کیسے تبدیل ہو گیا۔“ چاند بی بی بولی۔

”اپنی ہنسی کے بغیر رہنا میرے لیے ممکن نہیں۔۔۔ اور وہ بچی کو اپنے ہمراہ رکھنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ اس لیے میں سب کچھ تیاگ کر واپس چلی آئی۔ رامو مولوی صاحب اور گواہوں کے سامنے مجھے طلاق دینے کے لیے تیار ہے۔ ویرست کیجیے۔ مہتاب گھر میں اکیلی ہے۔ وہ یقیناً بھوک سے ہلک رہی ہوگی۔“ میں نے بخوشی اثبات میں سر ہلایا اور چاند بی بی کا ہاتھ تھامے۔ حق بائی سے بھرپور قدموں کے ساتھ مسجد کی جانب چل دیا۔ جو وہاں سے قریب ہی تھی۔

☆ ☆

دوبارہ سر زمین قربانی مانگ رہی تھی، لیکن اس وفد میری نومولود لڑکی کو بھی قربانی کی بھیئت چڑھتا تھا اور میں ایسا سوچتا بھی نہیں جانتا تھا، لیکن میرے سوچنے سے بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ سب کچھ تو میری جیتتی بیوی کے فیصلے میں پنہاں تھا۔ میں نے منہ موڑ کر ساتھ والی چار پائی پر موجود بیوی کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے اور دم سا دھے خاشا موٹ لیٹی تھی۔ اس کا چہرہ بظاہر نہ سکون اکھائی دیتا تھا، لیکن میں جانتا تھا کہ کچھ نہ کچھ پریشان تو ضرور ہوگی۔ اگرچہ اس کی نگاہوں میں میری اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ تب بھی نومولود لڑکی کی کچھ نہ کچھ اہمیت تو موجود ہونی ہی چاہیے تھی۔ اُسے بہر حال لڑکی کو میرے پاس ہی پیوڑ کر جانا تھا۔ کچھ نہ کچھ۔ ایک باکا دھجکا اُسے لگتا ہی تھا۔ میں نے منہ پھیر کر آنکھیں موند لیں۔ فیصلے کی وہ رات کروٹیں بدلتے ہوئے گزر گئی۔

صبح منداں میرے میں نے وضو کیا اور نماز پڑھنے مسجد کی جانب چل دیا۔ نماز پڑھنے کے بعد میں نے خشوع و خضوع سے اپنے رشتے کی مضبوطی کی دعا کی اور قرآن شریف کی تلاوت کرنے کے بعد بے ہنسن قدموں کے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ جب میں گھر کے قریب پہنچا تب میں نے چاند بی بی کو گھر سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں کاسنی رنگ کی کھڑی موجود تھی اور اس کا چہرہ مخالف سمت بارڈر کی جانب تھا۔ وہ بھر پور ہنسنے لگی تھی۔ پیچھے قدموں کے ساتھ بارڈر کی جانب چل رہی تھی۔ مجھے اپنی دنیا لگتی ہوئی محسوس ہوئی، پھر پانچو نے گھر پہنچنے کے بعد میں بھی چاند بی بی کے پیچھے بارڈر کی جانب چل دیا۔ چاند بی بی کے قدموں کی رفتار بہت تیز تھی۔ شاید وہ جلد از جلد اپنے سابقہ شوہر کے پاس پہنچ جاتا چاہتی تھی۔ یقیناً وہ اپنے ہم مذہب سامی سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ ایک غیر مذہب انسان کی اُس رشتے کے ساتھ بھلا کیا حیثیت۔۔۔ کچھ ہی دیر میں وہ بارڈر کے قریب موجود درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ گئی۔ رامو وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ شاید اُس نے رات درختوں کے جھنڈ میں ہی بسر کی تھی۔ چاند بی بی نے ہاتھوں میں موجود کھڑی اُسے تھما دی، پھر سرگوشیاں انداز میں بات چیت کرنے لگی۔ اب وہاں مزید کھڑے رہنا بے معنی تھا۔ میں تھکے قدموں کے ساتھ واپس گاؤں کی جانب چل

تیرا شعلہ

تیرے انتظار میں

مجید احمد چلی



حسد میں جل کر رہا ہونے والے ایک خاندان کی داستانِ حب

www.paksociety.com

www.paksociety.com

طرف چلی گئی۔

احمد نہ جانے کن سوچوں میں ڈوب گیا۔ احمد نیلے آسمان پر آوارہ بادلوں کو دیکھتے جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں کھڑے اپنے چچا علی کے ساتھ آگئی۔

احمد کہنے لگا۔ "علی! میرا ایک کام تو کرو۔ صرف آخری کام۔ تیار کرو گے؟" احمد نے علی کو آمادہ کرتے ہوئے والی نظروں سے دیکھا۔

علی حیران رہا پریشان احمد کے چہرے کو دیکھ رہا تھا کہنے لگا۔ "جی ہاں کیا بات ہے؟"

"سب خیر تو ہے نا؟ میری جان صبح و شام آپ پر قربان، ایک کیا ہزاروں کام کروں گا۔ آپ حکم تو کریں۔" علی نے محبت بھرے انداز میں احمد کو جواب دیا۔

"علی! آخری بار تم اپنی بھانجی کے پاس جاؤ اور اسے لے کر آؤ۔ مجھے امید ہے ایمان اب سب ناراضگیاں ختم کر کے چلی آئے گی۔ مجھے قوی امید ہے تم جاؤ تو سہی۔ تمہیں دیکھتے ہی اس کی موتا جاگ اٹھے گی۔ اس کی مٹھا کھڑوہ نور صبا اور مہک کے لیے تواب رہی ہوگی۔ اس کا قصہ ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ بولو جاؤ گے نا۔"

احمد نے علی کو تصدیق طلب کیجے میں کہا۔

ایمان احمد کی بیوی تھی۔ جو تین سال سے اپنے میکے

عیدالاضحیٰ کی آمد آمد تھی۔ ہزاروں مہمانوں میں خوب رونق تھی۔ ہر طرف کاغذی پھولوں سے جڑی دکائیں گاہکوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی جیسے ہانڈیاں میں بہار نے قبضہ جما لیا ہو۔ رنگ برنگی اکائیں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔ گاہکوں کے گرد بولبلیوں کی شکل میں آکر ہزاروں میں رونق کا اضافہ بن رہے تھے۔ ایک احمد تھا جو اپنے گھر میں لگے نیم کے درخت کے نیچے چار پانی پر پڑا ہوا نیکی روٹھوں سے بے نیاز، سانس کی گنتی کر رہا تھا۔ دائیں طرف گولیاں مچھلیاں ہر سیرپ کی شیشیاں موجود تھیں۔ بائیں طرف اس کی بڑی بیٹی کھڑوہ جو ابھی دس سال کی تھی۔ اپنے معصوم اور نرم و جانم ہاتھوں سے اپنے پاپا کے سر کو ہانسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ احمد کا سرور کی وجہ سے پھٹنے کو آ رہا تھا۔ آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح جل رہی تھیں۔ اچھے بال اور ناکامی، ناامیدی کے بادلوں میں گھرا چہرہ زندگی کے ختم ہونے کی نوید دے رہا تھا۔ احمد نے کھڑوہ واز میں اپنی بیٹی کو آواز دی۔ "کھڑوہ!"

"جی پاپا جانی۔"

"بیٹا! اپنے چچا علی کو بلاؤ۔"

"جی اچھا پاپا۔"

کھڑوہ جو احمد کا سرور رہی تھی۔ اٹھی اور کمرے کی

روشن ہے۔ فرق صرف اتنا ہے تم پاس نہیں ہو۔"
 امد رات کی تاریکی میں ستاروں کو سمجھتا، ایمان سے
 باتیں کرتا رہتا اور رات دھیرے دھیرے گزر جاتی۔
 علی نہ چاہتے ہوئے بھی بچا بھی کو لینے چلا گیا۔ اسے
 یقین تھا ایمان نہیں آئے گی، لیکن جدائی کی بات مال بھی
 نہیں سمجھتا تھا، اس لیے ایک دن پھر لینے چلا گیا۔ امد احمد
 اپنی بیٹیوں بیٹیوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا
 تھا۔ ان کی آنکھوں میں ہزاروں پہلے پوشیدہ تھے۔ ان

میں ناراض بیٹھی تھی، جسے اپنی معصوم بیٹیوں کی فکر تک نہ تھی
 اور سب سے بڑھ کر جانتا پنچا اور کرنے والے محبت کے
 جذبہ سے سرشار شوہر کو بستر مرگ پر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔
 کتنی شغل دل تھی۔ امد سے کیے بھی وعدے، بھی
 قسمیں بھول گئی تھی۔ بھی تو کتنی تھی، امد میری جان تجھ پہ
 قربان، لیکن جب جان پنچا اور کرنے کا وقت آیا تو انھوں نے
 کون مخلوق کی مقیم ہو گئی تھی۔؟ احمد کی بھی امیدوں، بھی
 خوابوں، بھی۔۔۔ امد تھی۔ امد تھا اس کا اتنا کر رہا



بچیوں کا کیا تصور تھا، جو ماں کی ممتا کو ترس رہی
 تھیں۔ اپنے رب سے یہی دعا کرتا "اے رب کریم تو، تو
 رحیم ہے رحم فرما، ان ننھی ننھی زندہ گیوں کا واسطہ میرا گھر
 خوشیوں سے منور کرو۔ میری خوشیاں لوٹا دے، انھیں
 ان کی ماں سے ملا دے۔"

رب سے دعا کرتے امد کی آنکھیں ساون بہاؤوں
 کی طرح برس پڑتیں۔ کسزہ نور صبا اور مہک کو کیا خبر تھی
 کہ چاہا نہیں ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔؟ ان کے من

تھا۔ اس کی ترستی آنکھیں آج بھی ایمان کا انتظار کر رہی
 تھیں۔ اس کے لبوں پر اب بھی ایمان کا نام مچاتا
 تھا۔ تاروں سے باتیں کرتے ہوئے امد یہی کہتا۔ "دیکھو
 ایمان وہ دن یاد کرو جب ہم اکٹھے تھے یہ ستارے، وہی
 چاند آج بھی چمکتا، دمسکتا ہے لیکن تم کہیں کھو گئی ہو؟ کہاں
 ہو لوٹ آؤ بے قراری یہ جدائی میری جان لے لے
 گی۔ یہ ستارے، یہ چاند میرے سفارشی روزِ اول کی
 طرے رہے ہیں۔ وہ دھواں دن کی طرح آج بھی چاند

میں کیسی آگ لگی ہے جو شعلہ کی ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ ان کے کیا خواب ہیں؟ آنکھیں کیوں بہتی رہتی ہیں؟

احمد ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ کچی اینٹوں سے بنے دو کمروں پر مشتمل چھوٹا سا گھر تھا جس میں احمد اپنے چھوٹے بھائی علی اور لاڈلی بہن نورین کے ساتھ احمد دین کے گھر کی خوشیاں بانٹ رہا تھا۔ احمد کے والد احمد دین اور ماں بختاں بڑے خوش مزاج اور رحم دل انسان تھے۔ سنے بچوں کی پرورش بڑے عمدہ طریقے سے کر رہے تھے۔ محسن میں لگا نیم کا درخت پورے گھر کی رونق میں چار چاند لگا رہا تھا۔ دو پہر کو بھی اس کی چھاؤں میں آکر آرام کرتے تھے۔ خوشحال گھرانہ تھا۔ جہاں کھیتیں، چاہنیں تھیں۔ مسکراہٹوں کے پھول نکلتے تھے۔ غریبی، مفلسی میں احمد دین نے پورے گھرانے کی دے داریاں خوش اسلوبی سے سنبھالی ہوئی تھیں۔

احمد سب سے بڑا تھا۔ ماں باپ کا پیارا، گھر کی رونق تھا۔ احمد کو مقامی سکول میں داخل کیا گیا تاکہ کچھ بڑھ لکھ جائے۔ علی اور نورین چھوٹے تھے۔ احمد روزانہ سکول جاتا کرتا۔ زندگی کے شب و روز اسی طرح گزرتے چلے گئے۔ ایمان احمد کی خالہ زاد تھی۔ احمد کے گھر سے پچھ دروی پران کا گھر تھا۔ تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ سب سے بڑا سلیمان، پھر نوید اور احمد تھے۔ سلیمان سے چھوٹی ایمان تھی۔ آخری نمبر سب سے لاڈلی زیب النساء کا تھا جو بہت شیرارتی اور ہنسنے والی تھی۔ ایمان مفرد اور نخریلی تھی۔ اس کے سن میں وہ ملت کا مقام تھا۔ رشتے ناتوں کو اہمیت نہیں دیتی تھی۔ اس کے لیے دولت ہی سب کچھ تھی۔ ان کا گھرانہ احمد کے گھرانے سے زیادہ امیر تھا۔ گھر میں ہر چیز کی فراوانی تھی۔ عیش و عشرت نے انہیں پر لگا دیے تھے۔ ایمان بالکل ماں پر تکی تھی۔ جہاں کہتی وہی ایمان کے الفاظ ہوتے۔ دونوں ناک پر کبھی نہیں بیٹھنے دیتی تھیں، البتہ ایمان کا والد حسن بخش خوش مزاج طبیعت کا مالک تھا۔ لوگ اس کی تعریف کرتے نہیں جھکتے تھے۔ یہی وجہ تھی محلے میں ان کو عزت و مقام حاصل تھا۔

احمد روز گھر سے لاڈلہ سیدھا اپنی خالہ کے گھر

جاتا، وہاں سے ایمان اس کے ساتھ جاتی تھی۔ دونوں کے اسکول ساتھ ساتھ تھے۔ احمد ایمان کو اس کے سکول چھوڑتا ہوا اپنے اسکول کی طرف چلا جاتا۔ دونوں ایک ساتھ جاتے اور اکٹھے گھروں کو لوٹتے تھے۔ ایمان اور احمد نے میٹرک پاس کر لیا۔

زندگی کے شب و روز گزرتے چلے گئے۔ دونوں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ ایمان سنہری زلفوں، چاند کی طرح چمکتا و منکا چہرہ، ہونٹ گلاب کی پتھریوں کی طرح، جھیل سی آنکھیں، سفید دودھ کی طرح نرم و ملائم ہاتھ، سادگی کے تو کیا کہنے۔ سفید لباس میں پرستان سے آئی ہوئی پری معلوم ہوتی تھی۔ قدرت کا حسین شکار تھی۔ ایمان خوبصورتی کی حدیں پھلانگ رہی تھی تو احمد بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ گھنے سیاہ بال، ستواں ناک، چادو بھری آنکھیں، سرخ گلاب جیسے گلاب، لبہ نقد اور شرابی ہونٹ، کتنا خوبصورت لگا تھا۔ خوبصورتی میں کوئی اس کا ثانی نہیں تھا۔

وقت کا بھی محو سفر رہا اور نہ جانے کس گھڑی میں دونوں کے اندر محبت کے چشمے پھوٹ پڑے۔ دونوں ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے تھے۔ روز حسین گل تعمیر ہوتے۔ ساتھ جینے مرنے کے عہد و بیان ہونے لگے۔ محبت کے لازوال جذباتوں نے دونوں کو ایک دوسرے پر قربان ہونے کا حوصلہ دے دیا۔

ایک دن اسکول سے واپسی پر گھر آنے کی بجائے راستے میں بنے پارک میں چلے گئے۔ ننھے ننھے گلابوں کے پھولوں کے ٹھمرات میں بیٹھے مستقبل کے پلان بنانے لگے۔ جب شام کے سائے ڈھلنے لگے تو دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھر کی طرف چل پڑے۔

ایمان نے لی۔ اے کر لیا اور گھر میں بیٹھ گئی۔ احمد لی۔ اے کرنے کے بعد جاب کی تلاش میں مارا مارا پھرنے لگا۔ دن بھر جاب کی تلاش ہوتی اور شام کو Study ہوتی۔ ماں کی دعاؤں کے سائے میں روز بروز سویرے نئی امید، نئی آگ، نئے جذبے سے گھر سے لاڈ اور مختلف محکموں میں اپلائی کرتا جاتا، لیکن ساری محنت، ساری جدوجہد رائیگاں جاتی۔ جہاں بھی جاتا رشوت کا زہریلا سانپ ڈسنے کو تیار ملتا۔ رشوت

”نہیں ایمان میں تمہاری شادی کسی امیر زادے سے کروں گی۔ میری لاڈلی، تازوں والی بیٹی کسی گھل کی شہزادی بنے گی۔ اس گھنوا احمد کے ماں باپ تمہیں کیا دیں گے۔؟ ان کے پاس سے ہی کیا۔؟“

ماں کی باتیں ایمان کو ناگوار گزر رہی تھیں۔

”نہیں ماں۔۔۔ میں شادی کروں گی تو صرف احمد سے۔۔۔ ورنہ کوئی بھی نہیں۔“ ایمان نے بھی اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔

جب ایمان نے الٹی میٹم دیا تو ایمان کی ماں کی لاپٹی سوچوں نے کام دکھایا۔ اس کی ماں نے اسے سمجھا دیا۔ ایمان ایک شرملا پرھیری شادی احمد سے کراؤں گی۔

”وہ کیسے۔؟ امی جان ایمان نے جلدی سے پوچھا۔“

”وہ۔۔۔ وہ کدو نورین کو اپنی بہو بناؤں گی۔“

”یہ تو اور بھی خوبی کی بات ہے امی۔ مجھے منظور ہے۔“

ایمان کو کیا خبر تھی کہ اس کے من میں کیا ہے۔؟

”تو پھر ٹھیک ہے۔ احمد سے کہو اپنے گھر والوں کو سمجھیں۔“ ایمان ٹوٹی سے ہواؤں میں اڑنے لگی۔ اسے ہر طرف پھول ہی پھول کھلے نظر آنے لگے۔ ایمان نے احمد کو کال ماری۔

”ہیلو احمد! کیسے ہو۔؟“

”آج صبح چاند نے کیسے یاد کر لیا۔؟“

”احمد میری بات غور سے سنو۔ میرے گھر والے میری شادی کرنے لگے ہیں۔ کئی لوگ آئے بھی ہیں۔ تم ایسا کرو اپنے والدین کو ہمارے گھر بھیجو۔“ دونوں نے آپس میں چند باتیں کیں، پاپان تیار کیے، پھر کال منقطع ہو گئی۔

احمد دن بھر آپس میں سوچتا رہا۔ کس طرح امی سے بات کروں۔۔۔؟ کس طرح دل کا حال زبان پر لائیں۔؟ سوچوں کی یلغار میں دن بھر الجھا رہا۔ شام ہوئی تو گھر آیا۔ چوہے ارد گرد محفل تھی تھی۔ سبھی خوش گوار موڈ میں تھے اور قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔ احمد نے موقع غنیمت جانا اور بات شروع کی۔ نورین تو جیسے اچھل پڑی۔

”میرے بھیا کی دلہن آئے گی۔ کون ہے۔؟“

”کیسی ہے۔؟ نورین نے بے صبری سے احمد سے پوچھا۔ احمد مسکرائے بنا روٹ سکا۔ احمد نے دھیرے دھیرے ایمان کی طرف اشارہ کیا۔

نذرانے کی باتیں ہوتی۔ احمد مایوسی، اذاسی میں ڈوبا گھر کی طرف واپس لوٹ آتا۔ اگر اتنی رقم اس کے پاس ہوتی تو وہ اپنا کاروبار بند کر لیتا۔

ایمان گھر میں سلائی، کڑھائی کرنے لگی۔ کبھی کبھار احمد ایمان کے ہاں جاتا تو خوشیوں کا میلہ سج جاتا۔ ایمان کے لیے جیسے عید آگئی ہو۔ اسے ہر چیز مبارک دیتی محسوس ہوتی۔ دونوں پر یہی دنیا سے بے خبر، بے نیاز، اپنی دنیا میں کھو جاتے۔ جہاں ان کی اپنی گھری ہوئی۔ ان کے خواب ہوتے اور یوں شام کے سائے ڈھلتے تو احمد آنکھوں میں سنے سجائے اپنے گھر کی طرف لوٹ آتا۔ محبت انسان کو طاقتور بنا دیتی ہے۔

قدرت کی دیوی مہربان ہوئی۔ احمد کو دوست کے توسط سے پرائیوٹ فرم میں معمولی جاب مل گئی۔ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے کے مصداق احمد نے غنیمت جانا اور جاب پر جانے لگا۔ شروع میں تنخواہ کم تھی لیکن رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا گیا۔ احمد کو جاب مل جانے سے احمد دین کے کدھوں کا بوجھ کم ہونے لگا۔ گھر میں خوشیوں کا سماں تھا۔ چہرے پھول کی طرح مہک اٹھے تھے۔ نورین کی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں مادر خوشی سے پوری کر دیتا۔

ایمان کے گھر رشتے آنے لگے تو ایمان ماں کے کان جا لگی۔ ”امی، پیاری امی جان۔“

ایمان کی ماں نے جیسے ایمان کے بال کی بات چاہی۔

پوچھنے لگی ”خیر تو ہے بیٹی! آج بڑی مصدقے والی ہو رہی ہو۔“

”امی میرے رشتے آنے لگے ہیں۔ کہیں آپ مجھے کسی انگڑے، ماندھے کے حوالے نہ کر دیتا۔“

ایمان اصل موضوع پر آتا جا رہی تھی۔

”تمہاری بتادو۔ جو تمہارے دل کا شہزادہ ہو۔“ ایمان کی ماں نے تو ایمان کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ ایمان کی جیسے لائری نکل آئی ہو۔ ماں وہ۔۔۔ وہ اپنا راز۔ احمد ہے۔

ایمان کے لبوں سے جیسے یہ الفاظ نکلے تو اس کی ماں کی رنگت اڑنے لگی۔ وہ تو اپنی بہن کو دشمن سمجھتی تھی اور ادھر اس کی بیٹی اس کے بیٹے کے خواب آنکھوں میں سجائے بیٹھی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ نہیں نہیں۔

ایمان ٹرے میں جائے اور بسکٹ سجائے حاضر ہوئی۔ ایمان کو آتا دیکھ کر بھی نے اپنی ہاتھوں کا رخ تبدیل کر لیا۔ جائے کا دور ختم ہوا تو احمد دین نے اجازت چاہی اور خوشی خوشی گھر کو آگئے۔

کئی دن گزر گئے تو احمد دین، بیوی کو ساتھ لیے پھر ایمان کے گھر پہنچ گیا۔ اس دفعہ احمد کی خالہ اور خالو دونوں موجود تھے۔ ایک سلیک کے بعد اصل موضوع کی طرف آئے تو ایمان کی ماں کہنے لگی۔

”دیکھو بہن، مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے، البتہ ایمان کے ابو کہتے ہیں کہ سلیمان کے لیے ہم بھی رشتہ مضبوط رہے ہیں، تو کیوں نا رشتے داری کو مضبوط کیا جائے اور نورین کو اپنی بیٹی بنا کر گھر لے آئیں۔ فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔“

احمد دین اور اس کی بیوی نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا لیکن احمد کی خوشیوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور نورین کی قسمت کا فیصلہ بھی کر لیا۔ یوں وٹہ سٹک کی بنیاد پر رشتے طے ہو گئے۔

نورین ابھی چھوٹی تھی مگر بھائی کی خوشیوں کی خاطر قربانی کیلئے تیار ہو گئی۔ دونوں گھروں میں خوشیاں چھائیں۔

ایمان کی ماں کی من مانی پوری ہوئی تو خوشی منانے لگی۔ خوشی کیوں نہ منانی، اس کا پاپان کا سیاب جو ہو گیا تھا۔ احمد اور ایمان کی خوشی بھی دیدلی تھی۔ دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں عروج پہنچ گئیں اور طے شدہ پروگرام کے ساتھ احمد دو لہجے کے روپ میں، ساتھیوں کے ہمراہ، وصول کی تال پر دھن کرتے نوجوانوں کے ہمراہ تاروں کی چھاؤں تلے ایمان کو اپنا ہم سفر بنا کر اپنے آگن میں لے آیا۔

دونوں پریمیوں نے جو چاہا قائل کیا تھا۔ کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ کوئی رقیب نہیں بنا تھا اور نہ کوئی کیڑا پیدا ہوا۔ یوں کچھ قدرت مہربان بہت تھی۔ نورین بھی سلیمان کی ران کداری بن کر چلا گھر سدھار گئی۔ یوں دونوں گھر مضبوط بندھن میں بندھ گئے۔ عرصے سے جو ناراضگیاں تھیں ختم ہو گئیں۔ مگر کس کو پتا تھا کہ دشمن کھیل کھیل رہا ہے۔

تین سال کا عرصہ پرگٹا گزر گیا۔ احمد کو اللہ تعالیٰ

احمد دین اور اس کی بیوی جیسے ساکن سے ہو گئے ہوں۔۔۔ احمد نے کس گھر میں خوشی تلاش کی تھی وہ جنہوں نے کبھی خبر تک نہ لی تھی۔ چار مہینے کیا آئے، انہوں کو بھول بیٹھے۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ کوئی بہن اس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ احمد کی ماں کے دماغ میں سوچیں جنم لے رہی تھیں۔

”ای کی کن سوچوں میں کھو گئی ہو۔“ احمد نے ماں کو خلا میں گھورتے پایا تو بولے بارہ نہ سکا۔

”کچھ نہیں بیٹا۔ بس کچھ پرانی باتیں دل پر حملہ کرنے چلی آئیں۔ تم فکر نہ کرو، لو کھانا کھاؤ۔“ احمد کی ماں نے احمد کو کھانا دیتے ہوئے کہا۔

”ہم تھیں صبح کو تائیں گے، ابھی کھانا کھاؤ اور آرام کرو۔“

”کھک ہے ای جان۔“ احمد کھانا کھانے کے بعد اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔

رات کو جب بچے سو گئے تو احمد دین اور اس کی بیوی کی محفل تھی۔ بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے۔ اوپر والے نے کس کے نصیب میں کیا لکھا ہے۔؟

قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ احمد کی خوشی میں ان کی بھی خوشی تھی، سوانہوں نے حتیٰ فیصلہ کر لیا کہ ایمان کا ہاتھ مانتے کے لیے ان کے گھر جائیں گے اور چھرواوند بیٹا تو ہمیشہ اولاد کے لیے سوچتے ہیں۔ اولاد کو خوش دیکھنا، خوش رکھنا ان کا مشن ہوتا ہے۔

صبح سویرے جب احمد کو اطلاع دی گئی تو احمد مارے خوشی سے دیوانہ ہوئے جا رہا تھا۔ ایمان کو خبر دی کہ میرے امی ابو آج ہی تمہارے گھر آ رہے ہیں۔ اور چھرواوند چھ مے احمد دین بیوی کے ہمراہ ایمان کے گھر موجود تھے۔

احمد اپنی اپنی سال کے گھر چند لمحے لوہرا دھری کی باتیں کر رہا تھا اور پھر اصل موضوع کی طرف آیا۔ ایمان کی ماں موجود تھی۔

”ہم ایمان کا ہاتھ مانتے آئے ہیں۔ احمد اور ایمان ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔“ بااخر احمد کے والد نے کہہ ہی دیا۔

ایمان کی ماں تو پہلے ہی منتظر تھی۔ اپنی بہن سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”بہن! ایمان آپ کی ہی بیٹی ہے۔ بس شام کو ایمان کے ابو آ جاتے ہیں تو میں ان سے بات کرتی ہوں۔ آخر گھر کے بڑے جو ہیں، اتنے میں

ایمان اور اس کی ماں نے نورین کو حد سے بڑھ کر ذلیل کیا۔ ایمان کی ماں اپنی بہن سے بدلہ نورین کی صورت لے رہی تھی۔ ایمان کی ماں نے اپنے انتقام کی آگ کو مزید بھڑکایا۔ ایمان کی ماں کا اپنی بہن سے بدلہ لینے کا وقت آ گیا تھا۔ صدیوں پرانی من میں گئی آگ شعلہ بھڑکی ہوئی تھی۔ بختاں احمد کی ماں کا تصور صرف اتنا تھا کہ اس نے احمد دین سے شادی کر لی تھی۔ جب کہ احمد دین ایمان کی ماں کی پسند تھا۔ ایمان کی ماں احمد دین پر قربان ہوتی تھی، لیکن تقدیر کے فیصلے نرالے ہوتے ہیں۔ تقدیر ہمیشہ کھیل کھاتی ہے۔

احمد دین کو کچھ علم نہیں تھا۔ بڑوں کے فیصلوں نے یہ بندھن قائم کیا تھا جس کا ایمان کی ماں کو رنج تھا۔ اب موقع آ گیا تھا کہ وہ اپنا بدلہ نورین کی صورت میں لے رہی تھی۔ ایمان کی ماں چاہتی تھی۔ یہی تھی۔ اس کی سوچی سمجھی سازش تھی اس کا پلان تھا۔ جس میں کالی حد تک کامیاب ہو چکی تھی۔

احمد خوب محنت سے گھریلو ذمے داریاں نبھا رہا تھا، لیکن شک کی آگ کب کسی کو چھوڑتی ہے۔ اچھے بھلے انسان کا جینا حرام ہو جاتا ہے۔ زندگیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ احمد کے گھر کی فضا بھی حسد کی آگ کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ خوشیوں کے پل مختصر تھے جو گزر گئے تھے۔ خوشیوں کے حسین سچم، غموں میں بدلنے لگے اور ایک قیامت احمد کی منتظر تھی۔

احمد دین، بختاں اپنی بیوی کے ہمراہ شہر سے واپس آ رہے تھے۔ مین سڑک کر اس کرتے ہوئے تیز رفتار کار کی زد میں آ گئے۔ تیز رفتار کار نے انہیں کچل ڈالا۔ دونوں موقع پر دم توڑ گئے۔ احمد کے گھر صرف ماتم بچھ گئی۔ احمد کی جنت روٹھ گئی تھی۔ شفیق باپ بھی انہیں بے رحم دنیا کے حواس کو کر کے خود ابدی نیند سو گئے تھے۔ احمد بھی علی کو گلے لگاتا تو بھی بہن نورین کو تسلیاں دیتا اور پھر اپنے اندر آنسوؤں کے ٹھانیں مارتے سمندر کو روک نہ پاتا۔ باپ کی لاش سے لپٹ لپٹ کر رہتا۔ کوئی سہارا دینے والا نہیں تھا۔ دشتے دار آئے رسم دنیا بھائی اور چلے گئے۔ احمد دین اور بختاں کو دشتے داروں کے جہوم میں منوں مٹا گئے دفن کر دیا گیا۔ احمد کے گھر کی خوشیاں روٹھ گئیں

نے چاندی بنی کنزہ کی صورت میں عطا کی تھی۔ احمد بہت خوش تھا۔ اس کے گھر میں رشتوں کی برسات ہوئی تھی۔ ایمان پھر سے اُمید سے تھی۔ ایمان کی خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ اس دلہہ بیٹا عطا کرے، لیکن ہوتا ہی ہے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے۔ اس میں انسان کا بس کہاں چتا ہے۔؟ اللہ تعالیٰ نے احمد کو دوسری بھی بیٹی عطا کر دی۔ نور مبا بہت خوبصورت چٹی گوری، گول منہ تھی۔ پری جیسی بیٹی کی پیدائش ایمان کو ناگوار گزری۔ نجانے کیوں ایمان کو بیٹیاں پسند نہیں تھیں۔ حالانکہ دستور زمانہ ہے۔ بیٹیاں ماؤں کو عزیز ہوتی ہیں اور بیٹے باپ کی شان ہوتے ہیں۔ یہاں سے ایمان تبدیل ہونا شروع ہو گئی۔ نور مبا کو خوشی کا لقب دے دیا۔

دوسرے نورین کو اللہ تعالیٰ نے دوسری مرتبہ بھی بیٹے سے نوازا تھا۔ وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ سلیمان کی ماں بھی کبھار تلخ دکھائی کر بھی لیتی تو محسوس نہ کرتی۔ سلیمان اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

نورین کی خوشیاں ایمان کو زبردستی تھیں۔ ویسے بھی عورت ہی عورت کی دشمن رہتی ہے۔ عورت ہی عورت کا گھر برباد کرتی ہے۔ نورین کے ہاں دوسرے بیٹے کی پیدائش حسد کی آگ کو بھڑکانے کے لئے کافی تھی۔ ایمان جب بھی میسے جاتی ایک طوفان برپا ہو جاتا۔ ماں بیٹی مل کر نورین کا بیٹا حرام کر دیتی۔ سلیمان گھر پر نہیں رہتا تھا، ان کی عید ہو جاتی۔ نورین بہت برداشت کرتی، لیکن جب حد سے بڑھ جاتی تو وہ جواب دے دیتی۔ یوں جھگڑا طویل پکڑ جاتا۔ گھر میدان جنگ بن جاتا۔

نورین جب بھی میسے جاتی، گھر میں بہادری کا سماں چھا جاتا۔ ماں صدے داری ہوتی۔ احمد تو جان قربان کرتا تھا۔ علی کے لیے روح تھی، یوں بھی مسکراتے، ہنستے ہنساتے تھے۔ نورین ایمان سے ملتی تو ایمان حسد کی آگ میں جل بھن جاتی۔ اس حسد کی آگ نے طویل پکڑا اور یوں دونوں گھروں کا چین و سکون برباد ہو کر رہ گیا۔ ایمان کی طبیعت میں جڑ چڑا ہوا تھا آیا۔ بات، بات پر لڑتی، جھگڑتی، کتڑہ اس کا نشانہ بن جاتی تو کبھی نور مبا۔ یہ بھی حقیقت ہے غصہ ہمیشہ بچوں پر ہی نکلتا ہے۔

میں دھنستا چلا گیا۔ جاب جاتی رہی اور بیماری نے جنم لے لیا۔ نئی بچیوں کی دیکھ بھال اور اندر کے انسان نے احمد کو بستر مرگ پر آکر لایا۔ ایمان کو بھانہ چاہیے تھا، ایمان کب کی جا چکی تھی۔ محبت کے سبھی وعدے، سبھی قسمیں، عہد و پیمان، ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ زندگی کا خوشیوں سے شروع ہونے والا سفر تنہائی پر ختم ہو گیا۔ ایمان کا بچے جانا تھا کہ نورین کی زندگی برباد ہو گئی۔ روز نئے الزامات، روز نئے شکونے زندگی کو جلا کر رکھتے۔ نورین زندگی کا ماتم کرتی، بھائیوں کے پاس آتی۔ سلیمان جو جان بچھا کر رہا تھا، لیکن اور ماں کی باتوں میں آ گیا اور غلط فیصلہ کر کے اپنی زندگی برباد کر بیٹھا۔ اپنا اتنا اچھا ہم سفر نکلا بیٹھا۔ جانا لینے والا جان کا دشمن بن بیٹھا۔

ماں باپ کی وفات کا ماتم بھولا نہیں تھا اور پھر طلاق ملنے کا غم نورین کو دھوا کر مٹانے کے لیے کافی تھا۔ بے جا کی بھائیوں کے سامنے خاموش رہتی۔ کبھی مسکرا بھی لیتی لیکن جب دونوں بھائی گھر سے باہر جاتے۔ نورین سے گھر کے سبھی ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے اور منہ زور آنسوؤں کا سمندر آنکھوں کے راستے رخساروں سے بہتا ہوا، دامن بھگوتا زمین یوں ہو جاتا۔

قدرت کے عجیب کھیل تھے۔ ماں باپ نامہائی موت سے خالق حقیقی سے جا ملے۔ بھائی کا گھر اجڑ گیا۔ نورین کو اپنے گھر اجڑنے کی فکر کم تھی۔ جتنا وہ بھائی کے لیے تڑپتی تھی، تنہی دودھ جتنی مہک کا کیا تصور تھا؟ کیا بیٹیاں عذاب ہوتی ہیں۔

ہمارے حضور اکرم ﷺ نے بیٹیوں سے محبت کر کے ثابت کر دیا کہ بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں نہ کہ زحمت۔ نبھانے کا سمجھ لوگ اس حقیقت سے کیوں منہ موڑے ہوئے ہیں۔ نورین سارا دن مہک کو سنبھالتی تھی۔ اس کے صدقے داری ہوتی۔ اسے اپنی بیٹی سمجھتی تھی لیکن ایمان کو رحم نہ آیا۔ واپس پلٹ کر نہ آئی۔ مہک پر بھی رحم نہ آیا۔ آتا بھی تو کیسے وہ تو بیٹیوں کے خلاف تھی۔ کیسی ماں تھی جسے اولاد پسند نہیں تھی۔ اولاد تو والدین کے لیے جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ ایمان۔ کیا ماں کے لفظ سے نا آشنا تھی؟

احمد دن بھر چار پائی پر پڑا کھانست رہتا۔ اپنی بیماری

تھیں۔ رب تعالیٰ کی رضا کے آگے سب راضی ہیں۔ احمد بھی رب کی رضا مان کر زندگی کی طرف پلٹ آیا۔ گھر کی تمام تر ذمہ داریاں احمد کے کمزور کندھوں پر آ گئیں تھیں۔ علی ابھی بڑھ رہا تھا۔ احمد کی معمولی جاب گھر کی اخراجات پورے نہیں کر سکتی تھی۔ احمد نے پارٹ ٹائم کام کرنے کا بندوبست کیا اور تھوڑی سی کوشش کے ساتھ ہی پارٹ ٹائم جاب حاصل کر لی۔

احمد کو کچھ حوصلہ ملا، لیکن ایمان نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ اس دن ایمان پھر امید سے بھی۔ اللہ تعالیٰ نے پھر اسے بنی سے نواز دیا۔ ایمان بھوکا شیرنی کی طرح چلانے لگی۔

مہک کی پیدائش کے آٹھویں روز ایک قیامت برپا ہو گئی۔ ہوا کچھ یوں کہ مہک بھوک سے رو رو کر پورے کمرے کو سر پر اٹھائے ہوئے تھی۔ ایمان سے برداشت نہ ہو اور پھر ایک عورت، عورت نہ رہی۔ زندگی پر اثر آئی۔ ایمان نے دونوں ہاتھ محسوس مہک کے گلے پر رکھ دیے۔

کہتے ہیں نامار نے والے سے بھانے والا زیادہ طاقتور ہوتا ہے یا جسے رب رکھے اسے کون چکھے کے مصداق یہ قدرت کی مہربانی تھی کہ خلاف معمول احمد اسی لمحے گھر داخل ہوا شاید کوئی ڈاکومنٹ لینے آیا تھا۔ احمد کا آنا قدرت کا کرشمہ تھا۔ مہک کی جان بچ گئی۔ در نہ محسوس کل کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جاتی۔

احمد سے برداشت نہ ہو اور ٹپٹی، دلچہ اس کا ہاتھ ایمان پر اٹھ گیا۔ پھر کیا تھا، قیامت برپا ہو گئی۔ ایمان نے زمین و آسمان ایک کر دیا۔ الزامات کی بارش کر دی۔ گھر، گھر نہیں میدان جنگ بن گیا۔ ایمان، مہک کو روٹا چھوڑ کر لڑتی، جھگڑتی میسے چلی گئی۔ اب احمد جھجھکا رہا تھا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پیار سے ایمان کو سمجھانا چاہیے تھا، مگر اس نے غلط بھی نہیں کیا تھا۔ پھر بھی سوچ رہا تھا کہ مجھے ایمان پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ دوسرے لمحے اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا وہ تنہی جان کا خاتمہ کر چکی ہوتی۔ نبھانے کیا قیامت ہوتی؟

اس بات کا اثر احمد کو ذہنی مریض بنا گیا۔ وہ وقت سے پہلے کمزور ہو گیا۔ ہنستا مسکراتا چہرہ، غموں کی دھول

دوسری طرف ایمان کا بدلا روپ احمد کی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹنے لگا۔ کسی پروفیسر نے ٹی بی کہا تو کسی سرجن نے کینسر بیسی موزی مرض کا سندیر سنایا۔ جہاں جاتے ہزاروں خرق ہو جاتے۔ مگر کوئی فرق نہ پڑا۔

احمد کی انتظار میں ڈوبی آنکھیں دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اسے امید تھی کہ کہیں سے ایمان لوٹ آئے گی۔ اس کے من میں آتی بھی ایمان کے لیے محبت، چاہت تھی۔ اسی لیے تو بھی باتیں بھلا کر ملی کو ایمان کے پاس بھیج دیا تھا۔ مگر بھیجی کو لینے چلا گیا۔ احمد اپنی آنکھوں کے چروں پر پھلکی اور ای تکتا رہتا۔ نورین چوبیس پہ ہنری بناتی رہا، خاطر و سختی رہی۔ رب سے دعا کریں، انجوا میں سرتی زبان۔ یا اللہ اس گھر کی خوشیاں واپس لوٹ دے۔ ایمان واپس آ جائے۔ میرے بھائی کو زندگی بخش دے۔ اسے صحت بخشنے فرما دے۔ آمین ثم آمین!

احمد کی در دو دم سے ہر بڑ آنکھیں باہر کے دروازے کی طرف مرکوز تھیں، جیسے اسے کسی کاشدیت سے انتظار ہو۔ لیکن اس کی سگی امیدیں، کبھی تنہا نہیں دم توڑ گئی جب علی اکبر اندر داخل ہوا۔ علی کی آنکھیں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ ایمان اس کے ساتھ نہیں آئی۔ شرمائی آنکھیں کہاں راز چھپا سکتی تھیں۔

"ایمان نہیں آئی نا۔ علی" احمد نے کبرائی میں ڈوبی آواز میں مخاطب کیا۔

"بھائی آپ پریشان نہ ہوں۔ بس آنے والی ہے۔" لیکن احمد، علی کی چوری پکڑ چکا تھا۔ علی کی آنکھوں میں ناکامی کے آنسو پڑھ لیے تھے۔

"علی! بھائی سے جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہاری آنکھیں صاف بتا رہی ہیں کہ تم کچھ چھپا رہے ہو۔"

علی کہاں تک چھپاتا۔ آنکھوں نے بغاوت کر دی۔ بھائی کو جھوٹی تسلیاں دیتا رہا۔ جب پروا شدت نہ کر سکا تو اٹھ کر نورین کے پاس جا بیٹھا۔ نورین سے کبھی احوال کہنے لگا۔ جو اس کے ساتھ سلوک ہوا تھا۔

"نورین! جب میں وہاں گیا۔ خالہ اور ایمان گھر میں موجود تھیں۔ میں نے ایمان سے فریاد کی۔ خالہ کے پاؤں پڑا، لیکن ان بے رحمیوں کو رحم نہ آیا۔ اتنے میں سلیمان اور احمد آ گئے۔ انہوں نے مجھ دھکے دے کر باہر

اور اپنی بیٹیوں کو دیکھ کر آنسوؤں کی ندیاں بہانے کے علاوہ کوئی راست بھی تو اس کے پاس نہیں تھا۔ احمد اپنی بیٹیوں کو سینے سے لگاتا۔ چومتا، بو سے دیتا اس سے سکون و قرار مل جاتا۔ کچھ لمبے اندر کی آگ، سکون میں بدل جاتی۔ اب علی ہی واحد سہارا تھا جو بڑے بھائی کی میڈیسن اور گھر کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

رونی، اجڑی بہن کا اداس چہرہ ہر وقت اس کی آنکھوں کا مرکز ہوتا۔ کبھی معصوم ہتھیاریاں آتے بھی بہت پیاری تھیں۔ گھریلو حالات دیکھ کر علی نے تصمیم کو خیر باد کہہ دیا اور جب کرنے لگا۔ شام کو گھر آتے ہوئے کترو، نورین، دیمک کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتا۔

وقت کا بھی پرواز کرتا رہا۔ علی نے گھریلو حالات کے پیش نظر اپنا آپ بھلا دیا اور اپنی زندگی، اپنا مستقبل قربان کر دیا۔ تین سال کا عرصہ عذاب، کرب اور رنج و فم میں گزر گیا۔ نورین نے دیمک کو عمدہ طریقے سے یاد تھا۔ ظالموں نے نورین سے اس کے بیٹے بھی چھین لیے تھے۔ نورین کی دنیا صرف اور صرف بھائی کی اداوار تھی۔ جب بھی اپنے بچوں کی یاد سے زیادہ بے چین کرتی، ننگے پاؤں ان کی طرف دوڑتی۔ کبھی گھر کے باہر کھیلتے، ان کو کھیتی اور کبھی محلے کی ماسی کو چند روپے چھو کر بہانے سے بچوں کو باہر بلواتی اور انہیں چرتی، ان پر ممتا قربان ہوتی تھی۔ عجیب تھا مگر قدرت تھا۔ ایک سال بچوں کے لیے تربی رہی تھی۔ دوسری ماں۔ بھونم ہو کر بچیوں کو چھوڑ کر جا چلی تھی۔ نورین ملانی کڑھائی کر کے علی کا ہاتھ بندھ رہی تھی۔ احمد تو بستر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ نبھانے کس جرم کی سزا مل رہی تھی؟

ایمان اتنی بے رحم تھی کہ پلٹ کر خبر تک نہ لی۔ کوئی اتنا سنگدل بھی ہوتا ہے؟ اور عورت تو بیٹہ دم دل اور محبت کرنے والی ہوتی ہے۔ یہ کبھی عورت تھی۔؟ ایمان نے تو عورت کو بدنام کر دیا تھا۔ اسے محبت کرنے والے شوہر کا خیال تک نہ آیا۔ کتنی سنگدل تھی۔ مریض کو اچھی دوا کے ساتھ ساتھ اچھے، حوصلے کی خوشیوں، محبت کی ضرورت ہوتی ہے، محبت کے دو میٹھے بول بیماری کو کم کر دیتے ہیں، لیکن احمد کیا کرتا؟

ایک طرف ڈاکٹروں کے منت سے شکوے اور

ہو؟ ہماری ماں تو تین سال پہلے مر گئی تھی۔ تم تو ہمارے
پاپا کی قاتل ہو قاتل۔ نفرت بھری نگاہوں سے ایمان کو
دیکھتی رہی تھیں۔ ایمان بت بنی بیٹھی تھی۔ علی نے بھی منہ
دوسری طرف موڑ لیا تھا۔ ایمان گرچھ کے آنسو بہا لی اپنی
دنیا میں لوٹ گئی۔

سورج غروب ہوتے ہی احمد کو منوں مٹی سے دفن کر
دیا۔ اس کی یادیں، اس کی باتیں۔ اس کی محبت، آج
بھی مٹی اور نورین کے دلوں میں روزِ ازل کی طرح قائم و
دامم ہیں۔ علی نے بہن نورین اور بیٹیوں کی خاطر شادی
نہیں کی۔ اسے بس یہی خوف ہے کہ ایمان کی طرح کوئی
اس کی بھی میری زندگی تہ خراب کر دے اور میں اپنی
بہن اور بھائی کی نشانیوں سے محروم ہو جاؤں اور یہ آئین
پھر سے تہل اٹھے۔

ایمان نے چار ماہ بعد کسی شہزادے سے شادی رچا لی
لیکن شادی کے چند روز بعد ہی اچانک ایک عجب واقعہ ہوا
ایمان کو دوبارہ بڑا دلہن ہوا اپنے گھر سے نکلے پاؤں نکل کر
بھائی اور احمد کے گھر پہنچی گئی۔ بڑی بیٹی کنزہ اپنی پھوپھی
نورین کے ساتھ کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ ایمان
"بیٹی" کہہ کر اس کی طرف بڑھی لیکن کنزہ نے نفرت سے
نگاہیں دوسری طرف کر لیں۔ باقی دونوں بیٹیوں نے بھی
منہ سے انکار کر دیا۔ وہ دیوانوں کی طرح ان سے
مواپاں مانگ رہی تھیں لیکن بیٹیاں اس سے لاشعور ہیں۔
شام کو "نیا شہزادہ" آئے اچھوٹا سا بھائیہاں آن پہنچا
اور گھسٹتا ہوا ساتھ لے گیا۔ جس کے بعد سے ایمان
مستقل پہلی مریضہ بن گئی۔ دو سوتے سوتے اچانک
جاگتی اور بچیوں کو یاد کر کے رونے لگتی۔ نئے شہزادے کے
لے اب وہ انسانی بوجھ بن گئی تھی، جس سے بالآخر اس
لے حیات حاصل کر لی۔ بچیوں نے پھوپھی اور چچا کی
مدت حاجت کے بعد ماں کو قبول تو کر لیا لیکن دل سے
نہیں صرف اپنا مذہبی فریضہ جان کر اور یہی بات ایمان
کی زندگی کا روگ بن گئی۔ آج کل وہ احمد والی پیاری کا
شکار ہے اور بسترِ مرگ پر احمد کے پاس جانے کا انتظار
اس آس میں کر رہی ہے کہ شاید احمد کی روح اسے
معاف کر دے۔

ہذا..... ہذا

نکال دیا۔ ہزاروں زنجشیں ہوں، اپنا خون یوں سفید ہو
جائے، کسی موت سے کم نہیں ہوتا۔ میں نے ایسا سوچا بھی
نہیں تھا کہ وہ لوگ اس طرح مجھے ذلیل و خوار کر کے اپنے
گھر سے نکال دیں گے۔ میں تماشا بن کر رہ جاؤں
گا۔ ایمان نے ہازیرا الفاظ استعمال کیے۔ تمہارے دامن
کو داغدار کیا۔ آپ پر بدچلتی کا الزام لگایا۔ ایک بھالی
سے کیسے برداشت ہو سکتا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ مجھے جو
مرضی کہہ لیتے مگر تمہاری ذات پر احترام مجھے کہاں
برداشت ہوتا۔ لیکن وہ چار اور میں تن تھا۔ کب تک
مقابلہ کرتا؟ سلیمان اور احمد درندے کی طرح ٹوٹ پڑے
اور میں زخم کھاتا، ناکامی کے آنسو لیے وانہیں پلٹ
آیا۔ "ساتھ ہی مٹی کی آنکھیں چٹک پڑیں۔

علی نمازِ ظہر کی تیاری کر رہا تھا۔ وضو کرتے ہی احمد
کے پاس آیا۔ بڑی محبت سے، چاہت سے احمد کے
چہرے کو دیکھنے لگا۔ احمد نے علی کو قریب پایا تو خوشی سے
مسکراتے کی کوشش کی۔ اس مسکراہٹ میں کتنا درد تھا۔ مٹی
آہیں تھیں، کتنے آنسو تھے۔ محبت کا عم انگوٹوں کے
زہریلے تیروں نے اسے وقت سے پہلے موت کے
حوالے کر دیا۔ احمد علی کی طرف ٹٹکی باندھ دینے لگا۔ علی
کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھا، اور اپنی بیٹیوں کی طرف
اشارہ کیا۔ جیسے کہہ رہا ہو مٹی میرے بعد تو ہی ان کا جب
کچھ ہے۔ میری بیٹیوں کو بھی غم نہ دینا، انہیں خوش
رکھنا۔ ماں کی یاد آئے پائے۔ میری یادیں کونہ نہ تھائیں۔

مؤذن اذان دے رہا تھا۔ احمد کے اب ہلنے لگے اور
وہ کلہ شریف کا ورد کرنے لگا۔ اذان ختم ہوئی۔ ساتھ ہی
احمد اس دنیا سے کنارہ کر گیا۔ آج ہی تو پر سکون ہو کر سویا
تھا۔ ایسی فینڈ جس میں کوئی درد، کوئی غم، کوئی دھوکہ نہ تھا۔
نورین احمد سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ ننھی معصوم کنزہ
نور صبا، مہک پاپا۔ پاپا کہہ کر آنسو بہا رہی تھیں۔ ہر
کوئی ماتم کناں تھا۔ ساری برادری، رشتے دار، ہمسائے
غم دیدہ تھے۔ دشمن بھی آخری دیدار کرنے آئے تھے۔
دشمن جاناں بھی لوٹ آئی تھی، لیکن اب لوٹ کر آنے کا
کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جس کا انتظار تھا وہ تو چلا گیا تھا۔

ایمان نے بچیوں کو سینے سے لگانا چاہا لیکن وہ مجھے
ہٹ گئیں جیسے کہہ رہی ہوں تم کون ہو؟ ہماری کیا لگتی

دیارِ غیر سے زندگی کی تصویریں

پروٹیسٹ سے پہلی کہانی

مکافاتِ عمل

تاشقین خان تاشی

بیٹوں کے گھر اجازت والی محبت سے غاری ایک ماں کی داستانِ الم

”تو اپنی بیوی کے لیے بیس کوں رہا ہے بے شرم،
تجھے شرم نہیں آ رہی ہے، بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔
دیکھو کیسے چپ چاپ بیٹے کی بدتمیزی برداشت کر رہے
ہیں۔ یہ نہیں کہ اٹھ کر اس کا منہ بند کریں۔“ اماں غصے
سے سراج علی کی جانب مخاطب ہوئیں۔
”ارے بھئی اس نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہی تو کہا
ہے۔“ سراج علی بڑے اطمینان سے بولے۔
”تم نے ہمیشہ غلط بات کو ٹھیک ہی کہا ہے۔ تم نے
دونوں بیٹوں کو بگاڑ کر رکھ دیا۔“ اماں نے تیوری پر مل
ڈالتے ہوئے کہا۔

”اماں تم تو بولتی اتنا ہو کہ اچھا خاصا آدمی پاگل
ہو جائے۔ اماں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔“ کاشف ابا
کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
”چپ بے۔۔۔“ سراج علی ایک دم بولے۔ اپنے
جھگڑے میں مجھے مت جھیسٹ۔
”بھائی آپ بھائی کو گھر لے آئیں، گھر دلا دینا
اچھی بات نہیں ہے۔“ اس کی بہن زہیدہ سمجھانے والے
انداز سے بولی۔

”تو چپ ہو جا زہیدہ، تیری ابھی شادی نہیں ہوئی
ہے۔ تجھے کیا پتا گھر دلا دیا ہوتا ہے؟ میں ماں باپ کا گھر

”اماں میں تم سے کہتے کہتے تھک گیا تھا کہ میں
ابھی شادی نہیں کروں گا، نہیں کروں گا۔ لیکن تمہیں تو بیٹے
کا سہرا دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ تم کیا سمجھتی تھیں کہ میں مستقل
سہرا باندھے بیٹھا رہوں گا۔ اب دیکھو جو جاگے سہرا
دوسرے کمرے میں کیل پر تنگا ہوا ہے۔“ کاشف غصے
میں اپنی ماں اور بہن سے مخاطب ہوا۔
”جائے کیا بکے جا رہا ہے کاشف، میری تو کچھ سمجھ
میں نہیں آ رہا ہے۔ اپنی سسراں میں گھر دلاؤ تو دین گیا
اور غصہ ہمارے اوپر اتار رہا ہے۔“

”اماں! میں گھر دلاؤں دیتا تو اور کیا بنتا؟ خالدہ کو
تم لوگوں نے جان سے مارنے میں کیا کسر چھوڑی
تھی۔ اگر میں آس دن وقت سے پہلے گھر نہ آ جاتا تو
خالدہ تو جان سے گئی تھی اور تم لوگ قہقہے میں ہوتے۔
غضب خدا کا اس کے سر میں پیچھے سے آ کر ڈنڈا مار کر
سر پھاڑ دیا۔ بعد بعد آٹھ دن ہوئے تھے خالدہ کو اس
گھر میں آئے ہوئے اور تم دونوں نے مارنا پیٹنا
شروع کر دیا۔ اماں اگر ہماری بہن کے ساتھ اس کے
سسراں میں یہ سلوک ہو تو تمہارا دل کیا کہے گا؟ اور
خالدہ کا تو باپ بھی نہیں ہے اس دنیا میں۔“ کاشف
ایک دم بولتا چلا گیا۔

"ہم اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہیں، تیری جو مرضی میں آئے دو کر۔" اماں غصے سے بولیں۔

"اماں میں خالدہ کے گھر رہنے کے باوجود بھی وقت نکال کر تم لوگوں سے ملنے روز آتا ہوں، کیا یہ میری محبت کا ثبوت نہیں ہے؟" کاشف نے کہا۔

"بس رہنے دے تو اپنی محبت۔ اگر تجھے محبت ہوتی تو یوں گھر چھوڑ کر کیوں چلا جاتا؟ رہ گئی بات خالدہ کی، تو زبیدہ تو سچ بتا، ہم نے خالدہ کو بے قصور تو نہیں مارا تھا۔ دو مہینے آرام سے کپڑے دھو رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ خالدہ اب کا حق تازہ کرو، تو مجھے جواب دینے لگی۔

"تم خود اپنا حق تازہ کرو اماں میں کپڑے دھو رہی ہوں۔" اماں خالدہ کی نقل اتارتے ہوئے بولیں۔
"بس اماں بس۔ خدا کے واسطے بس کرو، اگر میں تھوڑی دیر کے لیے یہاں آ جاتا ہوں۔ تو سکون سے بیٹھنے دیا کرو تاکہ اہا سے بھی دو چار باتیں کر سکوں۔" کاشف نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

"جا کر لے تو اہا سے باتیں، دونوں جیسے کے تیسے جو ہوئے۔" اور کاشف اماں کی شعلہ بیالی سنتے ہوئے ابا کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

چھوڑ کر خالدہ کے گھر رہنے لگا تو گھر واپس گیا اور اگر خالدہ اپنی ماں باپ کا گھر چھوڑ کر یہاں آ گئی تا تو اماں اسے گھر پہنچنے نہیں دیں گی۔" کاشف یہ کہہ کر اٹھ کر جانے کے لیے کمر اہو گیا۔

"تجھے اس وہ نکلے کی لڑکی نے کر دیا ہے پاگل۔" اماں بولیں۔

"اگر وہ دو نکلے کی ہوتی تو وہ اتنا بڑا دل نہیں رکھتی۔ اس کی بڑائی دیکھو کہ اب بھی وہ یہ کہتی ہے کہ اگر اماں آ کر مجھے لے جائیں تو میں چلی جاؤں گی۔" کاشف نے انکشاف کیا۔

"میری جاتی ہے جوتی۔ اس کا نکاح ہوا ہے تیرے ساتھ، میرے ساتھ نہیں ہوا۔ اس سے کہنا میں مرتے مر جاؤں گی لیکن اسے بھی نہ لاؤں گی۔ ہاں تو اگر اسے لانا چاہتا ہے تو بے شک لے آ لیکن میں نہیں جانے کی اس کے گھر۔" اماں بڑے یقین سے گریں۔

"اماں تمہارا نکاح جس سے ہوا ہے، وہ کون سا سکھی ہے۔ میں اسے یہاں خود بھی لے کر نہیں آؤں گا۔ میں وہاں بہت خوش ہوں۔ تم سب کو کیا اعتراض ہے؟" کاشف نے جتنی فیصلے کے انداز میں کہا۔



بہت تیز و طرار تھی۔ بات بے بات اور ہر وقت اس کا کام بولتے رہتا تھا۔ وہ ہر وقت جلی کٹی باتیں کرنا یا کسی نہ کسی پڑوسن سے لڑتے رہنا ہی اس کا مقصد حیات تھا۔ سرائی علی کے بڑے بیٹے دانش کی جب شادی ہوئی تو سسلی صرف ایک ماہ میں گھٹنے فیک گئی۔ کئی بار مار کھائے اور روزانہ گالیاں سن کر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس لیے اس نے دانش سے علیحدہ گھر کا مطالبہ کر دیا تھا یا دوسری صورت میں اپنے ماں باپ کے گھر چلے جانے کی دھمکی دے ڈالی تھی اور پھر سرائی علی نے ایک دن دانش سے کہا "چونکہ تمہاری ماں کے ہاتھ اور زبان اس کے کنٹرول میں نہیں ہیں اگر تمہاری بھی زبان اس سے بھی کوئی ایسا جملہ ماں کی شان کے خلاف نکل گیا تو تمہاری آخرت خراب ہو جائے گی اور اس سلسلے میں، میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔ آج سوچو گا۔ میری رائے یہ ہے کہ اگر تم سسلی اور ان دونوں کو خوش رکھنا چاہتے ہو تو کوئی بڑا کام کرنا پڑے گا۔ مکان لے کر وہاں شفٹ ہو جاؤ۔" ہوسٹل سے اللہ کوئی کرشمہ دکھائے اور تمہاری ماں ٹھیک ہو جائے تو ہم پھر ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ ابا کا مشورہ دانش کو اچھا لگا اور وہ تھوڑے ہی دنوں میں گھر سے تھوڑے فاصلے پر کمرائے کے ایک مکان میں شفٹ ہو گیا۔ گھر سے جاتے وقت سسلی کو وہ گونے سے گونے جو بھی کسی کی زبان سے نہیں سنے تھے۔ اماں کے نزدیک سارے فساد کی جڑ سسلی تھی، جس نے ماں کو بیٹے سے جدا کر دیا تھا۔

جب سے دانش گھر سے علیحدہ ہوا تھا۔ اماں نے کاشف کو شادی کے لیے زور دینا شروع کر دیا۔ لیکن چونکہ وہ بڑے بھائی دانش اور بھالی سسلی کا انجام دیکھ چکا تھا اور وہ ماں کی فطرت سے بھی انہی طرح آگاہ تھا، اس لیے اپنی شادی سے برابر انکار کیے جا رہا تھا۔

دفتر میں دو پہر کھانے کے وقت کے دوران عمران جو کاشف کے ساتھ ہی دفتر میں کام کرتا تھا اور ان کی ایک ہی محلے میں رہائش تھی۔ کاشف سے کہنے لگا۔

"یار کاشف مجھے تجھ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ میں تیرے پاس آ جاؤں یا تو میرے پاس آ جا۔"

اوپر کھڑکی میں کھڑی شاہدہ جوان کی کراہی دار تھی، ان کی تمام گفتگو سن رہی تھی۔ وہ اس بحث کو ختم کرانے کے لیے وہیں سے بولی۔

"کاشف ٹھیک کہہ رہا ہے اماں، خالدہ کو جا کر لے آئیں، گھر میں روٹی ہو جائے گی۔" اماں حیران ہو کر اوپر کھڑکی کی جانب دیکھتے ہوئے منہ سے بولیں۔

"بڑی آلی خالدہ کی کچھ لگتی۔ اے میں کہتی ہوں تو اپنے گھر کا سارا کام کاج چھوڑ کے چھپ چھپ کر ہماری باتیں سن رہی ہے! تیرے بھی پچھن ٹھیک نہیں ہیں۔ میاں مل گیا ہے سیدھا سادا اور ساس سے نہیں، ورنہ مزا چکھا دیتی کھڑکی میں کھڑے ہونے کا۔ چل جا یہاں سے اپنا کام کر۔" اماں کی بات ختم ہوتے ہی سرائی علی بولے۔

"مینی شاہدہ تو اپنی ماں کو کوئی مفید مشورہ نہ دیا کر، کیونکہ اچھا مشورہ اس کے لیے زبردستی ہے۔" اور پھر شاہدہ نے مسکراتے ہوئے کھڑکی بند کر لی۔

"تم سے جتنا ہو مجھے بدنام کرنے کی کوشش کرو۔" اماں نے تنک کر کہا اور سبزی کاٹنے میں مصروف ہو گئیں۔

جی آبادی کے گھروں میں ایک گھر سرائی علی کا بھی تھا لیکن اب وہ اپنی باندی صاحب نامی ہی صاحبہ رہ گئی تھی۔ مکان زیادہ تر یکے اور اچھے تعمیر ہو چکا تھے۔ سرائی علی کا مکان پانچ مربع فٹ کا تھا اور ان کی ملازمت کے دوران ذیل اسٹوری تعمیر ہو چکا تھا۔ وہ انڈسٹری ڈیپارٹمنٹ میں ہیڈ کلرک کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ اپنے دنوں میں اچھا خاصا کمایا تھا۔ انہوں نے اور اب ہر ماہ سنے والی چٹن اور گھر کے اوپر والے حصے کا کرایہ ان کے لیے کافی تھا۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ دونوں بیٹے بھی ان کی تھوڑی بہت مالی اعانت کرتے تھے۔

بڑا بیٹا دانش ایک باقی اسکول میں ٹیچر تھا اور چھوٹا بیٹا کاشف ایگر ٹیکنالوجی میں کلرک تھا۔ مالی طور پر تو وہ مطمئن تھے، لیکن ہر یلو پریشانی انہیں ہمیشہ سے لاحق رہی تھیں۔ ان کی بیوی شہ شاد بیگم زبان کی

رشتے کے لیے بھیج دے۔“
 کاشف بہت غور سے عمران کے چہرے کی جانب
 دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ابھی تک تو اماں کو میری شادی کی فکر
 کھائے جا رہی تھی، اب بھائی رضیہ بھی میرے لیے فکر
 مند ہو گئی ہیں۔“ عمران بولا۔

”یار بات یہ ہے کہ خالدہ بہت اچھی لڑکی ہے،
 میٹرک بھی اس نے پچھلے سال کلیئر کر لیا ہے۔“

”یار جس چیز کے بارے میں تجھے پتا نہ ہو، اس
 بارے میں نہ بولا کر۔“ کاشف نے کہا۔

”جس بات کا مجھے پتا نہیں ہے، تو تو مجھے
 بتا دے۔“ عمران نے سوال کیا۔

”بات یہ ہے۔“ کاشف بولا۔ ”جب تک میری
 بہن اپنے گھر کی نہیں ہو جاتی، میں شادی نہیں کروں
 گا۔ اس کے علاوہ تو والدین بھائی کی شادی کا حشر دیکھ
 چکا ہے، شادی کے بعد بہن بہت مشکل سے ایک ماہ
 گزار پاتی تھیں۔ سارا محلہ جانتا ہے کہ اماں ذرا تیز
 طبیعت کی مالک ہیں۔ اس لیے ان کے ساتھ گزارہ
 کسی بڑے کا نہیں ہو سکتا۔“

اتنے دکھ خالدہ نے قیسی میں نہیں سہے ہوں گے
 مجھے دکھ اسے ہمارے گھر آ کر برداشت کرنا ہوں گے۔
 تجھے کیا پتا۔“ نہ جانے کیا بکواس کیے جا رہا ہے، اچھا ایسا
 کر شام کو گھر آ جا تیری بھائی تجھ سے بات کرے گی اور
 اماں سے بھی بات کر لے گی۔“ یہ کہہ کر عمران اپنی سیٹ پر
 واپس چلا گیا۔

کاشف دفتر سے اپنے بڑے بھائی دانش کے گھر
 چلا گیا، اس لیے ذرا دیر سے گھر پہنچا، لیکن نے کھانے
 کا پوچھا تو کاشف نے بتایا کہ دانش بھائی کے گھر سے
 کھا کر آیا ہوں۔ ابھی زبیدہ سے بات کر رہی رہا تھا
 کہ کمرے سے اماں کی آواز سنائی دی، جو لمحہ پہنچ
 قریب آ رہی تھی۔

”کاشف میں نے تیرے لیے ایک لڑکی دیکھی
 ہے، اگر تو ہاں کرے تو میں اس کی ماں سے بات کروں،
 یہ کہتے ہوئے اماں کاشف کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

”میں نے کہا اماں کہ میں ابھی شادی نہیں کروں
 گا۔ ایسا کرو اماں پہلے زبیدہ کی شادی کر دو، پھر میں اپنے

کاشف نے عمران کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں سچ کر چکا ہوں اور باخالی ہوا ہے۔“

”ابے سچ کی کون بات کر رہا ہے۔ میں کہہ رہا ہوں
 ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے عمران اپنی سیٹ سے اٹھ کر کاشف
 کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”عمران آج مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔“ کاشف
 نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کس بات کی تجھے خوشی ہو رہی ہے۔ میں بھی تو
 سنوں۔“ عمران نے پوچھا۔

”بھائی مجھے خوشی اس بات کی ہو رہی ہے، کہ تو بھی
 کوئی ضروری بات کر لیتا ہے۔“ کاشف نے کہا۔

”ابے بکواس مت کر۔ اس وقت میں بہت شہیدہ
 بات کرنے لگا ہوں۔“ عمران نے کہا۔

”اچھا بتا کیا بات ہے؟“ کاشف نے پوچھا۔

”وہ اپنے محلے کے آخر میں خالہ صفراں رہتی
 ہیں، میری بیوی رضیہ ان سے ہی کپڑے سلوائی
 ہے۔ عمران کی بات ابھی جاری تھی کہ کاشف اس کی
 بات کاٹ کر بولا۔

”ابے یہ کون سی خاص بات ہے۔ بھائی رضیہ
 ہی کیا پورے محلے کی عورتیں ان سے کپڑے سلوائی
 ہیں، بلکہ شادی بیاہ کے کپڑے بھی خالہ صفراں ہی
 سیتی ہیں۔“

”ابے چپ تو کر، بیٹے میری بات سن تو سہی۔“

بات یہ ہے، رضیہ کہہ رہی تھی کہ خالہ صفراں کو اپنی بیٹی
 خالدہ کی شادی کی فکر ہے۔ محلے کی سب ہی عورتیں

خالہ کی تعریف کرتی ہیں۔ بہت خوبصورت اور سکھز
 لڑکی ہے، سارا محلہ خالہ صفراں کی بہت عزت کرتا

ہے۔ جب سے وہ بیوہ ہوئی ہیں۔ انہوں نے بہت
 محنت مشقت اور ایمانداری سے سب کے دلوں میں

اپنا گھر بنایا ہے۔ رضیہ بتا رہی تھی کہ خالہ صفراں نے
 خالدہ کو دینے کے لیے جہیز کا بھی بہت اچھا انتظام کیا

ہے۔ اس کے علاوہ خالہ صفراں کا مکان بھی ایسا ہے،
 وہ بھی خالدہ کے نام ہے۔ رضیہ رات کہہ رہی تھی، اگر
 کاشف رضامند ہو تو اپنی امی کو خالہ صفراں کے گھر

ہماری خاموشی پر یہ حال ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے، وہ نظر نہیں آتا۔ تم چپ رہ کر دیکھو، یہی بہتر ہے۔" یہ کہہ کر شمشاد بیگم زبیدہ کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

وقت اپنی رفتار سے گزر رہا تھا۔ ایک دن سراج علی نے کاشف کو سمجھایا کہ اپنی ضد چھوڑ کر ماں کا کہنا مان لے۔ دانش کو گھر سے علیحدہ کرنے کے بعد وہ ضرور پہچتا رہی ہے، شاید اب وہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرے گی۔ دیکھنا اگر زبیدہ کی شادی تجھ سے پہلے کر دی گئی تو گھر میں کام کرنے والا کون ہوگا، تیری ماں کی عمر اب زیادہ کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ تیری شادی کے بعد زبیدہ کی شادی بھی جلدی کر دیں گے۔ جا اپنی ماں سے اپنی شادی کے لیے باب بھدے۔

اتفاق سے اماں نے بھی خالد صفراں کی بیٹی خالدہ علی کو اپنی بیوی بنانے کے لیے منتخب کیا ہوا تھا، شاید رضی نے اماں کو قائل کیا ہو۔ دونوں طرف شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ خالدہ صفراں کی تیاری تو پہلے ہی مکمل تھی، لیکن پھر بھی کچھ تو وقت لگتا ہی ہے، تین ماہ کے اندر اندر خالدہ رخصت ہو کر کاشف کے گھر آ گئی۔

شادی کے تیسرے دن سے ہی جھگڑا شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے تو اماں نے خالدہ سے اس کے مکان کے کاغذات طلب کیے، جس پر کاشف نے اماں کو سمجھایا کہ خالدہ کے مکان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ مکان خالدہ کا ہے اس لیے وہ جانے یا اس کی ماں خالدہ صفراں، تمہیں اس بارے میں بات کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

"میری بات سن، مکان خالدہ کے نام ہے اور وہ تیری بیوی ہے، اس ناتے مکان کے کاغذات اور مکان کے حقوق ہمارے پاس ہونا چاہیے۔ تجھے کسی بات کا پتا نہیں کیا ٹھیک ہے اور کیا نہیں۔ بس تو چپ رہا کر۔" اماں نے فحش سے کہا۔

"اماں خدا کو مانو، ہمارے پاس خدا کے فضل سے اپنا مکان موجود ہے۔ ہم کسی دوسرے کا حق کیوں لیں۔" کاشف نے کہا۔

"میں کب خالدہ کا مکان بچ رہی ہوں۔ میں نے تو صرف مکان کے کاغذات لانے کو خالدہ سے کہا تھا۔"

بارے میں سوچوں گا۔" کاشف نے کہا۔

"میرے ساتھ شرطیں لگا رہا ہے؟ یہ تو تیری بہن زبیدہ ہے، تیرے نظروں پر نہیں چلی رہی ہے، ابھی خیر سے اس کے ماں باپ زندہ ہیں۔ تو کون ہوتا ہے اس معاملے میں بولنے والا، ابھی تو یہ گڑیوں سے کھیلتی ہے۔ اور عقل نہیں ہے اس میں، پھر میں اس کے لیے کوئی ایسا گھر دیکھوں گی جہاں یہ بیگم سراج کرے۔" اماں بولیں۔ "ٹھیک ہے لیکن میں نے ابھی شادی نہیں کر لی۔" کاشف حتمی فیصلے کے انداز میں بولا۔

"دیکھ جینا مجھے تیرا سہرا دیکھنے کی بڑی آرزو ہے، میں چاہتی ہوں اپنی زندگی میں ہی تیرا سہرا دیکھ لوں۔" اماں بڑے پیار سے بولیں۔

"کیا کہا سہرا دیکھنے کی آرزو ہے۔ میرا سہرا کائنات عالم میں سے کوئی بچہ ہے جسے دیکھنے کی تمہیں آرزو ہے۔ لوگوں کو حج کرنے کی آرزو ہوتی ہے۔ جوان بیٹی چاہنے کی آرزو ہوتی ہے۔ یہ سکون زندگی گزارنے کی آرزو ہوتی ہے اور تمہیں سہرا دیکھنے کی آرزو ہے۔ اماں میرے حال پر رحم کرو اور میری شادی کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔" یہ کہہ کر کاشف دروازہ سے باہر نکل گیا اور اماں فحش سے سراج علی سے مخاطب ہو گئی۔

"تم ہی کچھ بول لیا کرو، کبھی کبھی بولنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔"

"ارے بھئی مجھے بولنے کا موقع وہی تو منہرہ ریز ہوا گا۔ بات دراصل یہ ہے کاشف شادی سے انکاری نہیں ہے، بس کچھ تم لوگوں کی ماضی میں ہونے والی غلطیوں نے اسے شادی سے بیزار کر دیا ہے، لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ نہ ہماری حکومتیں ماضی سے کچھ سبق حاصل کر لی ہیں اور نہ ہی تم۔ ایک جینا تم نے گھر سے الگ کر دیا ہے، اب دوسرے کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ بھی ٹھیک کہتا ہے کہ پہلے زبیدہ قادیان ہو جائے خیر سے جس سے اوپر کی ہوئی ہے۔" ابھی سراج علی کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ شمشاد بیگم نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"بس بس۔ مجھے معلوم تھا کہ تم باپ جینا میری معصوم بچی کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ لوہو تو ہمیں تیز بتا رہے ہیں۔ ہم ماں بیٹی تو کسی سے بولتے ہی نہیں۔"

ہی فوت ہوگئی تھیں۔" کاشف نے سنجیدگی سے کہا۔
سراج علی جو سامنے ہی ورائڈے میں کرسی پر بیٹھے
اخبار پڑھ رہے تھے۔ کاشف کی بات سن کر اخبار سے
نظر اٹھاتے ہوئے بولے۔

"جس والدین کی ایسی اولاد ہو، وہ بھلا کب زیادہ
عرصہ زندہ رہ سکتے ہیں۔" ان کا اشارہ شمشاد بیگم کی
جانب تھا۔

"میں کہتی ہوں، میری زبان مت کھلاؤ۔ اگر میں
بول پڑی تو کڑے مردے اکھاڑ کر رکھ دوں گی۔" اماں
نے غصے میں کہا۔

کاشف اماں باپ کی ٹوک جھونک پر مسکراتے
ہوئے بولا۔ "اماں! میں مردے اکھاڑنے کی ضرورت
نہیں، لپا کو سکون سے اخبار تو پڑھنے دو۔" اماں ابھی کچھ
کہنے ہی والی تھیں کہ زبیرہ نے انہیں کچن سے آواز دی
اور اماں منہ چھائی ہوئی اُدھر چل دیں۔

اماں نے آخر کار ایک جگہ سب کے مشورے سے
زبیرہ کا رشتہ طے کر دیا۔ دونوں بھائیوں نے اپنی حیثیت
کے مطابق ایک سال کے اندر اس کو رخصت کر دیا۔
زبیرہ کی سسرال شہر میں ایک پوش خانے میں تھی۔ اس
کے سسرال والے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ زبیرہ کی
شادی کے بعد اماں گھر میں تنہائی محسوس کرنے لگیں۔
سراج علی کے اصرار سے باوجود وہ کسی بہو کو بھی گھر لانے
کے لیے تیار نہیں تھیں۔ وہ نہ صرف اپنی ضد پر قائم تھیں،
بلکہ کاشف کو انہوں نے ایک طلاق دینے کا مشورہ دیتے
ہوئے کہا۔ "میں تیری شادی بہت دولت مند خاندان
میں کروں گی، وہ لوگ راضی ہیں، لیکن وہ صرف یہ کہتے
ہیں کہ پہلی بیوی کو طلاق دے دے۔" کاشف اماں کی
بات سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ کہنے لگا۔

"اماں خالہ میرے دو بچوں کی ماں ہے، میں
اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا، آئندہ میں یہ بات نہ ہی
سوں تو بہتر ہے۔"

زبیرہ کی شادی کو بھی چھ ماہ ہو گئے تھے۔ شمشاد بیگم
بھی گھر میں تنہائی کی عادی ہوگئی تھیں، لیکن ایک روز
اچانک زبیرہ گھر آ گئی، اس کے ساتھ اس کا شوہر نہیں
تھا۔ اماں کے پوچھنے پر زبیرہ نے بتایا کہ شادی کے بعد

اماں نے اس بات کو ایسے کہا جیسے انہوں نے کوئی خاص
بات نہیں کی۔ کاشف جب بھی دفتر سے گھر آتا اماں اور
زبیرہ خالہ کو گالیوں سے نواز رہی ہوتی تھیں یا اس کو
چوٹی سے پکڑ کر مار رہی ہوتی تھیں۔ سراج علی نے بہت
سمجھایا کہ دونوں ماں بیٹی اپنی بہت دھڑلے سے باز
آ جائیں ورنہ اس کا انجام بہت برا ہوگا، لیکن کسی اچھی
بات کو سمجھنا ان کی سرشت ہی میں نہ تھا۔ وہ دونوں اپنی
ذکر پر قائم رہیں اور ایک دن تو ایک چھوٹی سی بات پر ان
لوگوں نے خالہ کا سر پھاڑ دیا۔ سراج علی بھی گھر میں
نہیں تھے، اچانک کاشف دفتر سے اس دن جلدی گھر
آ گیا اور یہ واقعہ اس کے گھر پہنچنے سے پانچ منٹ پہلے ہوا
تھا۔ جب وہ خالہ کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا تو واپس اس
گھر میں نہیں لایا، بلکہ اپنا ضروری سامان بھی شام کو خالہ
کے گھر لے گیا اور وہیں رہنے لگا۔ اس کے باوجود کاشف
اپنی ماں اور باپ سے منہ تھریا روزانہ ہی اپنے گھر جاتا
تھا، لیکن اس مختصر عرصے میں بھی اماں اس کو جلی جلی سنانے
میں کوئی کسر اٹھانہ دیتی تھیں۔

کاشف کو سسرال میں رہتے ہوئے تقریباً دو سال
ہو گئے تھے۔ عید تہوار کے موقع پر دونوں بھائی اپنی
بیویوں کو اماں سے ملوانے گھر لاتے تھے، لیکن اماں اپنی
بہوؤں سے بات نہیں کرتی تھیں، ناچار وہ لوگ اباسے مل
کر واپس چلے جاتے تھے۔ اماں اپنے دہلوں بیٹوں سے
کہتی تھیں۔

"میں بہت خود دار قسم کی گورت ہوں۔ جب ایک
بار کوئی فیصلہ کر لیتی ہوں تو اس پر تمام عمر قائم رہتی ہوں۔
میں نے اپنی کسی بہو کو خود جا کر اس گھر میں نہیں لانا۔" اور
کاشف ماں سے کہتا۔

"اماں ہماری مجبوری، ہمیں یہاں لے کر آتی
ہے۔" اماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تیری یہاں سرکھپانے کی کیا مجبوری ہے؟"

"اماں تمہاری جنت ہمارے قدموں میں نہیں ہے،
لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہماری جنت تمہارے
قدموں میں ہے، اس لیے ہم یہاں حاضری دینے کے
لیے مجبور ہیں۔ پتا نہیں اماں تم نے اپنی جنت کے ساتھ کیا
سلوک کیا ہو، کیونکہ ہماری نالی، ہماری پیدائش سے پہلے

بھولا نہیں کہتے۔ "لیکن شمشاد بیگم ان کے جواب میں پہلی مرتبہ خاموش رہیں۔

شام کو کاشف دفتر سے جب گھر آ رہا تھا تو راستے میں اپنے ساری صورت حال کی اسے خوش خبری سنا دی تھی۔ اس نے اب اپنے گھر جانے کی بجائے خالہ صغریٰ کے گھر کی جانب موٹر سائیکل کا رخ کر لیا۔ گھر پہنچنے پر خالہ صغریٰ نے اسے بتایا کہ خالہ و اماں اپنے گھر لے گئی ہیں۔ کاشف نے کہا۔

"خالہ مجھے سب معلوم ہو گیا ہے، لیکن میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ آج سے پہلے دفتر سے فارغ ہونے کے بعد پہلے میں اپنے گھر والدین سے ملنے جایا کرتا تھا۔ وہاں سے چلے گا کہ یہاں آتا تھا۔ آپ بھی مجھ کے لیے میری ماں کا درجہ رکھتی ہیں اور آج سے میں دفتر سے فارغ ہو کر پہلے یہاں آیا کروں گا اور پھر اپنے گھر جایا کروں گا۔" خالہ صغریٰ کی آنکھوں میں محبت کے آنسو منڈا رہے تھے۔ انہوں نے کاشف کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے فہموں دھامیں دیں۔

انہی ماں کو دونوں بیٹوں، بہوؤں اور ان کے بچوں کو اسے ہوتے صرف ایک ہفتہ گزارا تھا کہ اچانک ایک دن زبیدہ کے سسرال والے جن میں ساس، سسر اور زبیدہ کا شوہر بھی شامل تھا، زبیدہ کو لینے کے لیے آ گئے۔ انہوں نے زبیدہ کے والدین اور بھائیوں سے اپنی زیادتوں کی معافی طلب کی اور زبیدہ اپنے ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں واپس اپنے گھر کی ہو گئی۔

اسی شام کاشف اور دانش صحن میں بیٹھے تھے اور اماں نماز کے بعد دعا کے دوران اللہ سے روروں کا خطاب تھیں۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ محبت اتنی زود اثر ہوتی ہے تو میں اپنے دل کے کسی گوشے میں نفرت کو جگہ نہیں دیتی، یا اللہ مجھے معاف فرما دے۔ میں نے جو زیادتیاں دیدہ و دانستہ کی ہیں، میں اس کی معافی تجھ سے خطاب کرتی ہوں، بلاشبہ تو معاف کرنے والا رؤف و رحیم و کریم ہے۔

www.paksociety.com

اس کی ساس اور نندیں روزانہ بھڑتی تھیں اور اپنے بیٹے کی شہ پر اسے مارتی بھی تھیں، لیکن آج تو انہوں نے ایک چھوٹی سی بات پر میرنی بہت پٹائی کی، یہ کہ زبیدہ نے روتے ہوئے اپنے جسم پر پڑے نل دھائے جہاں خون جم گیا تھا۔ اماں نے زبیدہ کے جسم پر چونوں کے نشان دیکھے تو آنکھوں میں آنسو ہونے کے باوجود زبان سے کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ حیرت ناک طور پر وہ خاموش تھیں۔ ایک صوفے پر چپ چاپ بیٹھی کچھ سوچتی رہیں اور پھر اچانک اپنی جگہ سے اٹھیں برقع اودھا اور گھر سے باہر نکل گئیں اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ خالہ کے گھر بیٹھی خالہ اور خالہ صغریٰ سے اپنی زیادتوں کی معافی مانگ رہی تھیں۔

"خالہ صغریٰ نے شمشاد بیگم سے کہا۔

"ہم نے تو اپنی بیٹی سے رشتہ ختم کر کے تمہاری بیٹی بنا کے بھیجا تھا۔ یہ اب بھی تمہاری بیٹی ہے۔ اگر تمہارے گھر سے خالہ اکیلی واپس آتی تو میں واپس تمہارے گھر بھیج دیتی، لیکن یہ اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھی، اس لیے مجھے ہونے کا کوئی حق نہیں تھا۔ شمشاد بیگم خوش خوشی خالہ کو لے کر گھر واپس آئیں تو زبیدہ اپنی بھابی کو اماں کے ساتھ دیکھ کر حیران رہ گئی اور اس کی حیرانی اس وقت ۱۰ چند ہوئی جب اماں نے کہا۔

"زبیدہ اپنی بھابی سے بھڑکی زبانوں کی معافی مانگ۔" اور زبیدہ نے خالہ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لی۔ خالہ نے زبیدہ کو گلے سے گایا۔

سراج علی یہ سب دیکھ کر شمشاد بیگم سے کہنے لگے۔ "اس گھر میں یہ الٹی گڈا کیسے ہو رہی ہے؟" شمشاد بیگم نے کہا۔ "کاشف کے ابا یہ گڈا الٹی ہے یا سیدھی، لیکن اب یہ اسی طرح ہے۔ انشا اللہ اور شام کو میں دانش اور بیدی بہو کو بھی لے کر آؤں گی، مکان کے اوپر والا حصہ آج کل خالی ہے، اب اسے کبھی کراٹے پر نہیں اٹھاؤں گی۔ بڑی بہو کے لیے ہیں اوپر صفائی کمرے کی۔"

"وہ بھی دادا" سراج علی خوش ہوتے ہوئے بولے۔ "صبح کا بھول اگر شام کو گھر واپس آ جائے تو اسے

پردیس سے دوسری کہانی

مقدر کی آگ

عاصمہ الیاس

حاصل ماں کے حکم کی شکار ایک بیٹی کی عبرت انگیز کہانی

کے اس دوست کا نام کمال تھا۔ اس نے ان کے استقبال کے لیے بیٹھنا چاہا تو ذیشان نے اسے لپٹے رہنے کا کہا۔

”متم کیسے ہو، کیا حال ہے تمہارا۔“

”بس یار پہلے سے تھوڑا بہتر ہوں۔ تم سناؤ کیا حال ہے کسی بات ہے کہ ہم ایک ہی شہر میں مقیم ہیں، مگر ایک دوسرے کے حال سے قطعی ناواقف ہیں۔ وہ تو ڈائری سے تمہارا فون نمبر ملا تو تمہیں بلا سکا ہوں۔“

ذیشان جواباً کچھ نہ بولے۔ اتنی دیر میں اکمل نے سونپا کو چائے بنانے کا کہا۔ سونپا نے ذیشان صاحب کو چائے دی تو وہ مسکرا کر بولے۔

”جیتی رہو بیٹا۔ تمہارے والد کو عادت ہے پریشان ہونے کی، اب میں آ گیا ہوں تو پوچھتا ہوں اس سے کہ کیا تکلیف ہے اسے۔“ ذیشان صاحب نے ماحول میں چھائی خیمہ کی کم کی۔ فہمیدہ نے اسے گلے لگا کر تسلی دی۔ ذیشان بولے۔

”میں ادھر اکمل کے پاس رہتا ہوں اور تم سونپا کو لے کر گھر جاؤ تاکہ یہ بھی تھوڑا ریسٹ کر لے۔ فہمیدہ بیگم سونپا کو لے کر چلی گئیں۔“

فہمیدہ نے سونپا کو انیل سے ملایا۔ انیل بھی بے حد خوش ہوئی۔ وہ شروع ہی سے بھائیوں کے درمیان چلی

انیلہ بچیاں لے کر رو رہی تھی۔ اس کی وارڈروب میں کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے، مگر ان میں سے کوئی بھی اس کے چہرے کے مطابق نہ تھا، کیوں کہ بچے ہوئے چہرے پر کوئی بھی رنگ مناسب نہیں لگتا، اس لیے وہ رو رہی تھی۔

فہمیدہ بیگم اسے خاموش بھی نہ کروا سکتی تھیں، انہیں تو آج کل قدم قدم پر یہ احساس ہو رہا تھا کہ جو بچہ میں گئے اسے ہماری اولاد کا لے گی۔ یہ وہی بڑھا تھا جو انہوں نے اپنی بہو کے لیے نکھوا تھا، مگر اس میں ان کی اپنی بیٹی گر پڑی تھی۔

فہمیدہ کے سات بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان کا سب سے بڑا بیٹا شاہ میر تھا جو انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر رہا تھا اور آخری سال میں تھا۔ وہ اپنے بیٹے کا بیاہ و صوم و ہڑنے کے ساتھ اپنی بھانجی کے ساتھ کرنا چاہتی تھیں، مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک دن فون کی بیل بجی۔ ذیشان احمد نے اٹھ کر فون اٹھایا تو دوسری طرف نہ جانے کون تھا، جس کو وہ والا سادیتے ہوئے آنے کا کہہ رہے تھے۔ فہمیدہ کو انہوں نے تیار ہونے کا کہا اور اس کو بتایا کہ میرا ایک دوست شدید بیمار ہے، اس سے ملنے جانا ہے۔ فہمیدہ اور ذیشان صاحب اسپتال پہنچے۔ ذیشان احمد



تھی۔ اب تو میں صرف سو نیا کے لیے زندہ ہوں، میں ایسا اتنی جلدی کچھ نہیں کر سکتا۔
 ”تم غم نہ کرو اصل، خدا بہتر کرے گا۔ میں کچھ کرنا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ سو نیا وغیرہ آتی ہیں کہ نہیں، دوسرے دن صبح کے وقت ڈاکٹر راول پر آئے تو ان کے چہرے پر پیاس کے سائے لہرا رہے تھے۔ سو نیا نے ڈاکٹر سے رپورٹ کے متعلق پوچھا تو ڈاکٹر سنجیدگی سے بولے کہ ہم آپ کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے، بلکہ آپ کو کہنا چاہتے ہیں کہ آپ ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رہیں۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

ڈیشان کو جلد از جلد کوئی تدبیر نہ سوجھی تو انہوں نے اپنے بیٹے شاہ میر کو بلا لیا، جبکہ فہیدہ بیگم راضی نہ تھیں۔

تھی۔ اس کی بڑی آرزو تھی کہ اس کی ایک بہن بھی ہو۔ خوش تو سو نیا بھی بہت ہوئی، لیکن کہہ دو تو اگونی تھی اور اس کا کوئی بہن بھائی نہ تھا، بس ایک بابا تھے۔ بابا نے اسے مایہ اور باپ دونوں کا پیار دیا تھا۔ ان کی طبیعت دن بدن گہری گئی، انہیں ایک دن بھی بھکی تکلیف ہوئی جو بڑھتی گئی اور اسی وجہ سے انہیں اسپتال داخل ہونا پڑا تھا۔

ڈیشان احمد اکمل کے پاس ہی رک گئے تھے۔ اکمل نے اس خاموشی کو توڑا۔

”ڈیشان میں تم سے کہنا چاہتا تھا کہ میں اپنی جینی کی وجہ سے پریشان ہوں۔ تم میرے اچھے دوست ہو، جلد از جلد اس کے لیے کچھ کرو۔ مرنے میں اسی دن ہی گیا تھا جس دن سو نیا کی ماں مجھے چھوڑ کر منوں مٹی تھے جاسوئی

"شاہ میر پنا تم اپنا ماں کا رویہ اس کے ساتھ دیکھ چکے ہو، اگر ہو سکے تو اسے ساتھ لے جاؤ۔"

"بابا جان یہ میرا آخری سال ہے، آپ ہی اس کا خیال رکھیے گا، میں جیسے ہی جواب پر لگ گیا اسے ساتھ لے جاؤں گا۔ اچھا حال اس سے مل تو آؤ۔"

دروازے پر لگی سی دستک دے کر شاہ میر اندر چلا آیا۔

"سونیا! شاہ میر نے پکارا۔"

"جی۔"

"سر اوپر اٹھاؤ..... سونیا نے سر اوپر اٹھایا۔"

"سونیا میں امی کی طرف سے بھی تم سے معافی مانگتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم اپنے اچھے اخلاق سے اُن کا دل جیت لو گی۔ سونیا بولو نا۔"

"ہاں میں کوشش کروں گی، بشرطیکہ وہ مجھے میرے خراف سے زیادہ مست آزمائیں۔" اور یوں شاہ میر چلا گیا اور لمبیہ کے مطالب میں شدت آگئی۔

اُس دن وہ برتن وصولی تھی کہ انہوں نے اتنی زور سے اس کا نام پکارا کہ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر خراب ہو گیا۔

"اندھی ہو گیا، نظر نہیں آتا کس قدر قیمتی برتن ہیں خود تو تین کپڑوں میں آگئی ہو۔ اگر اپنے لائے ہوتے تو احساس ہوتا۔" سونیا کچھ نہ بولی۔

"اُس دن پھنسی گئی۔" وہ لمبیہ اور ڈیٹان احمد کو چائے دے کر پلٹنے لگی کہ ڈیٹان صاحب نے آواز دی۔

"جنا کیا مجھ سے ناراض ہو جو مجھ سے دور بھاگتی ہو۔"

"نہیں اکل۔"

"ارے جانے دیں اسے اور بھی بہت سے کام ہیں۔" ڈیٹان کی بجائے لمبیہ بولیں اور وہ خاموشی سے چلی آئی۔ شاہ میر بھی اب مہینے میں ایک آدھ بار چکر لگاتا تھا۔

سونیا نے لاکھ رنجش کے باوجود روتے روتے ماں کو یہ خبر سنائی تو وہ بولیں۔ "بیٹا پیدا ہو تو ٹھیک، ورنہ جہاں دل چاہے چلی جانا۔"

مگر قدرت کو سونیا کا مزید امتحان مطلوب تھا کہ خود یہ اس دنیا میں چلی آئی، مگر خود یہ ماں کی نسبت باقی سب کو قبول تھی، کیوں کہ جس دن خود یہ دنیا میں آئی، شاہ

انہیں تین کپڑوں والی بہنہ چاہیے تھی، بلکہ انہیں تو بہن کے ساتھ آنے والے جہیز کی بھی فکر تھی۔ اس لیے انہوں نے جی بھر کر اس شادی کی مخالفت کی تھی۔ تھوڑی دیر میں شاہ میر بھی آگیا۔ لمبیہ بیگم اسے بیٹنے کی مہلت دے بغیر بولیں۔

"بیٹا میں اس لڑکی کو اپنے گھر میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ میں تمہیں تنہی کے ساتھ بیاہنا چاہتی ہوں۔"

"امی پتا تو چلے کہ بات کیا ہے۔"

بیٹا بیٹھو پانی پیو، پھر بات بتانا ہوں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ایلہ کو آواز دی۔

"ایلہ بیٹے پانی پلاؤ بھائی کو۔" ایلہ نے پانی پلایا تو ڈیٹان بولے کہ بیٹا میں نے بھی مخالفت کی کہ تمہاری شادی تنہی سے نہ ہوگی اور حقیقتاً تنہی میں کوئی عیب بھی نہیں ہے، مگر بیٹا! بات یہ ہے کہ میرا ایک دوست شدید بیمار ہے۔ ڈاکٹر اتنے پر امید بھی نہیں ہیں اور میں نے اُس سے وعدہ بھی کر لیا ہے۔"

"میری بات مان جاؤ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" شاہ میر نے بابا کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"بابا جان آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔"

"شاہ میر بیٹا یہ تم کیا کہہ رہے ہو اس شہر میں کنواروں کی کمی نہیں ہے، انہیں صرف میرا بیٹا ہی ملا ہے۔"

"لہذا کا شکر ادا کرو کہ اُس نے تمہیں سات بیٹے دیے ہیں، ہاتی چہ پرتم اپنی مرضی چلا لیتا۔"

"جب بڑے ہی کنکس مانیں گے تو چھوٹوں کے کیا کہنے۔ خیر میں اور شاہ میر اسپتال جا رہے ہیں اگر تم چلنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لمبیہ نہ کہیں۔ اسپتال میں ہی خاموشی سے شاہ میر اور سونیا کا نکاح ہو گیا اور اصل نے آگئیں سوند لیں۔ سونیا کا حوصلہ جواب دے گیا مگر ڈیٹان اور شاہ میر اسے سنبھالے ہوئے تھے۔ دویں کے بعد جب وہ گھر آئی تو لمبیہ نے فوراً ٹوکا۔ ضرورت کیا تھی اس گھر میں آنے کی، اچھا ہوتا جو باپ کے ساتھ وہیں مرجاتی، مگر سن لو میں تمہیں اپنی بہن نہیں مانتی۔"

"اماں بس کریں۔" شاہ میر بولا۔

"ہاں بیٹے کرواؤ تم بھی میری مخالفت یہ وقت بھی آتا تھا مجھ پر۔" لمبیہ بولیں۔

☆.....☆

میر کو جاب مل گئی اور انیلہ کی معافی ہو گئی، مگر حور یہ بھی عجیب لگتی، اُسے جس کام سے منع کرتے وہ صند میں آ کر بیٹھ جاتی، اُس کام کو زیادہ کرتی۔ کبھی لمبیدہ کے اوپر چڑھ جاتی، کبھی بچوں کی کاپیاں پھاڑ ڈالتی۔ ایک دن لمبیدہ نے بھی ہوئی کاپیاں دیکھیں تو حور یہ کوٹھسٹ کر سونیا کے پاس لے گئیں اور بولیں۔

”سنجھا لو اسے۔ بچوں کی کاپیاں پھاڑ ڈال ہیں۔ پیسے درختوں پر نہیں لگتے خود تو آگنی ہوشیار پڑوں میں۔“ کہتے ہیں کہ بے زبان جانور پر بھی ظلم ہوتا رہے تو وہ بھی کاٹ کھاتا ہے اور آج سونیا بولی ہی پڑی۔

”اگر میرے باپ نے مجھے کچھ نہیں دیا تو کیا ہوا میں جو سارا دن کاموں میں سرکھپاتی ہوں، شام کو سب بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہوں تو حساب برابر کر دیتی ہوں۔ اُستادیاں تو ہزاروں روپے لیتی ہیں اور عزت علیحدہ، مگر یہاں تو انکی گڑگا رہی ہے۔ سونیا نے کمرے میں داخل ہو کر کندی لگائی۔ لمبیدہ باہر سے بڑبڑا کر چلی گئیں۔ اُس سے اگلے دن سونیا کو بخار ہو گیا اور وہ اٹھ کر کوئی کام نہ کر سکی۔ انیلہ کے پرے پرے ہو رہے تھے اس لیے لمبیدہ بیگم خود ہی میدان میں اُتریں۔ سارا دن کام کر کے تھک گئیں۔ جب سرخیا کا بخار دوسرے دن بھی نہ اُترا تو لمبیدہ کا بخار بھی دوسرے دن نہ اُترا۔ لمبیدہ اُس کے بخار کی پروا کیے بغیر بولیں۔

”اے بی بی سن لو، میں شاہ میر کی شادی کر دی ہوں، اپنی بھانجی تانیہ کے ساتھ اور تم ڈھکوسلے چھوڑو اور کام کرو۔“

سونیا کی اس گھر میں حیثیت ہی کیا تھی بنا بول چال کے کام کرنا شروع ہو گئی۔ دن کا ایک بجتا تھا دروازے پر دستک ہوئی۔ انیلہ دروازے پر گئی تو شاہ میر تھا۔ انیلہ نے سلام دعا کی اور بھائی کو اندر لے گئی۔ بھائی کے اچانک آنے پر سب ہی خوش تھے۔ سونیا نے شاہ میر کا پسندیدہ رنگ کا سوٹ پہنا، اپ اسٹک لگائی اور جوس دینے چلی گئی۔ شاہ میر دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ جوس کے بہانے ہاتھ بھی ساتھ ہی پکڑ لیے، مگر دوسرے ہی لمحے بولا۔

”ارے، تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔“
”ارے رہے دو میں نے صبح گولیاں دی تھیں، تیز بخار ہے آہستہ آہستہ ہی اُترے گا۔“ لمبیدہ بیگم بولیں۔
”سونیا کسی ڈاکٹر کو دکھایا۔“

”نہیں۔“ سونیا نے جواب دیا۔
شاہ میر ماں پر عیسیٰ نظر ڈال کر سونیا کو گھسیٹتے ہوئے اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے سونیا کو دوا دی اور مکمل بند ریسٹ کا مشورہ دیا۔ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے تو ایو کی کسی بات کے جواب میں شاہ میر بولا کہ اگلی مرتبہ یہ تمہارے ساتھ نہ جائے گی، بلکہ میں تمہارا بیٹا تانیہ کے ساتھ کراؤں گی۔ یہ اس گھر کی نوکرائی ہے اور نوکرائی ہی رہے گی۔ لمبیدہ بیگم کہہ کر چلی گئیں۔ سونیا نے حور یہ کو گلے لگا کر رونا شروع کر دیا۔ شاہ میر سونیا کو کمرے میں لے آیا اور حور یہ کو اس سے لیتے ہوئے بولا۔

”سونیا تم نے میرے ساتھ زندگی بسر کرنی ہے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا اندازہ نہ کرو، چلو اب آنسو پونچھو یا میں خود ہی صاف کرتا ہوں۔“ شاہ میر حور یہ سامنے ہے۔ سونیا بولی، بائیں بچوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے شاہ میر حور یہ کو گدگداتے ہوئے بولا، یوں ہی جیسے بولتے تھیں دن گزار گئے اور شاہ میر کے جانے کا وقت آ گیا۔ تیار ہو کر وہ جانے لگا تو سونیا کے چہرے پر نظریں لگا کر بولا۔
”بولی تو چاہتا ہے کہ تمہیں پاس بٹھا کر دیکھتا ہوں۔“
”اگلی مرتبہ آئیں گے تو پھر زیادہ دنوں کے لیے آجئے گا۔“ سونیا بولی۔

”انسان کے تو لمبے کو پتا نہیں ہوتا، پھر کیا پتا کہ میں دوبارہ آؤں یا نہیں۔“
”اللہ نہ کرے سونیا ڈر کر بولی۔“

شاہ میر نے حور یہ کو پیار کیا سونیا کو خدا حافظ کہا اور چلا گیا۔

لمبیدہ نے شاہ میر کے جاتے ہی ایک ہفتے بعد اپنے شیطانی پروگرام پر عمل کر ڈالا۔ اُس دن سب سو رہے تھے۔ سونیا نے حور یہ کے لیے دودھ گرم کرنا چاہا کہ چوبیسے میں کچھ گڑ بھسوس ہوئی، مگر وہ چوبیسے کو آگ دکھا چکی تھی۔ آگ ہی آگ ہر سو پھیل گئی۔ سونیا نے باہر کی طرف بھاگنا چاہا تو باہر سے کنڈی بند گئی۔ جب لمبیدہ کو یقین ہو گیا تو انہوں نے آہستہ سے کنڈی کھولتے ہوئے شور مچا دیا۔

”سونیا جل گئی، سونیا کو بچاؤ۔ سونیا نے جان دے دی، سونیا مر گئی۔“

لمہیدہ دھاڑیں مار مار کر روئے جا رہی تھی۔

"ہائے میں کیوں مارکیٹ گئی تھی۔ ہائے کاش مجھے پتا ہوتا کہ میرے آنے تک یہ سب کچھ ہو جائے گا تو میں کبھی نہ جاتی۔" شاہ میر بھی آچکا تھا وہ بالکل خاموش تھا۔ وہ ایک لفظ نہ بولتا یا پھر حوریہ کو سننے سے لگا کر روتا رہتا۔ کچھ دن کے بعد شاہ میر دوبارہ چلا گیا۔ چھ ماہ بعد لمہیدہ نے اسے دوبارہ بلوایا اور بڑی لگاؤ سے بولیں۔

"بیٹا، سونیا کے مرنے کا مجھے بھی بہت المیہ ہے، مگر بیٹا مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جاسکتا، میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اپنا گھر بساؤ۔ میں نے بات کی ہے تانیہ کی ماں سے اور اس نے اجازت دی۔"

"بس کریں امی بس کریں۔ لوگ بھول سکتے ہیں اسے، مگر میں نہیں۔ سونیا کو آپ نے مار ڈالا ہے۔ لوگوں کو یہ پتا نہ چلے کہ میں ماں کا نافرمان ہوں اس لیے خاموش ہوں اور لے آئے آپ تانیہ کو۔"

لمہیدہ نے شاہ میر کی شادی تانیہ سے کر دی۔ شاہ میر نے تانیہ سے کہا۔

"تم میری بیوی تب تک ہو، جب تک حوریہ سے اچھا سلوک کرو گی، ورنہ آگے تمہاری مرضی ہے۔"

حوریہ کو شاہ میر نے ہاسٹل میں داخل کر دیا تھا اور وہ صرف چشمیوں میں گھر آتی تھی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ دیکر شاہ میر کے باقی بھائیوں کی بھی شادیاں ہو گئیں اور تانیہ تین بیٹوں کی ماں بن گئی۔

تانیہ گھر میں تنگ کر نہ بیٹھ سکتی تھی۔ آج بھی جب وہ گھر پر نہ تھی تو لمہیدہ نے شاہ میر سے شکایت لگادی۔ شاہ میر بولا۔ "آپ کو تو سونیا بھی ناپسند تھی، اب تانیہ پسند نہیں تو کوئی بات نہیں کوئی اور کوئی بتا دیں، میں اس سے شادی کر لیتا ہوں۔ آپ کو تو یہ احساس ہی نہیں ہے کہ حوریہ صرف چشمیوں میں یہاں آتی تھی۔ اب تو وہ بڑی ہو گئی ہے اور چشمیوں میں بھی نہیں آتی ہے۔ مجھے تو بیٹیاں پسند ہیں، باپ کی بات بغیر کہے سمجھ لینے والی۔ ہمارے خاندان میں تو بیٹیاں پہلے ہی خال خال ہیں، اب تو بالکل بھی نہیں ہیں۔" لمہیدہ بیگم پشیمان تو پہلے ہی تھیں، مگر آج بیٹے نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔

اس دن انیلہ دھچکوں کے ساتھ گھر آ گئی۔ لمہیدہ

کے پوچھنے پر انیلہ نے بتایا کہ آج حماد نے گھر آئے مہمانوں کے سامنے میری بے عزتی کر ڈالی۔ اب میں اس گھر میں دوبارہ نہیں جاؤں گی۔ رات کو حماد سے لینے بھی آیا، مگر وہ ضد میں آئی بیٹھی تھی، نہ گئی۔ دوسرے دن دروازے پر دستک ہوئی۔ انیلہ دروازہ کھولنے گئی اور ذرا ہی دیر میں انیلہ کی چیخوں سے دروازہ پر ہار لڑنے لگے۔ لمہیدہ بھی باہر آ گئیں دو لڑکے جن میں ایک حماد تھا، بھاگ گئے۔ انیلہ کو اسپتال لے جایا گیا، مگر تیزاب اپنا کام دکھا چکا تھا۔ انیلہ آئینہ دیکھ کر چیخنے لگتی۔ ایک دن لمہیدہ اکیلی بیٹھی تھی کہ انیلہ آ گئی اور وہ بیٹھتی ہی بولی۔

"امی والدین کے کیسے کی سزا بچوں کو کیوں ملتی ہے۔ آپ نے سونیا کو پہلی مرتبہ میں مار ڈالا، مگر میں تو پہلے ہی جیتی مرنے والی تھی۔ میں بال بنا کر آئینہ نہیں دیکھ سکتی۔ ڈر تک پہلے پر میک اپ کا تمام سامان ہے، مگر ادھر سے چہرے کے لیے نہیں۔"

"نیل بولا۔" "نا تو کتنا اچھا ہوتا اگر حوریہ ہاسٹل کی بجائے گھر میں ہوتی۔ ہر بات میں مجھ سے لڑتی، مجھ سے کچھ مانگتی، ذرا دیر ہو جانے پر کہتی۔ میں بابا کو بتاؤں گی۔"

نا تو آپ اسے ہمیں لے آئے نا۔ شاہ میر نہ جانے کب کے آئے تھے، بولے۔ "امی جی میں حوریہ کی شادی طے کر چکا ہوں، نئی الحال میں اسے گھر بلا رہا ہوں۔ اسے کچھ ماہ بعد ہمیں سے رخصت کروں گا۔"

حوریہ کے آنے پر لمہیدہ نے آتے ہی اسے اپنے ساتھ لینا کر دنا شروع کر دیا اور ساری کہانی سنا کر معافی مانگی اور حوریہ نے معاف بھی کر دیا، مگر انیلہ جب بھی حوریہ کے چہرے پر نظر ڈالتی تو اس ہو جاتی پھر لمہیدہ بیگم سوچتیں کہ میں نے سونیا کو آگ لگائی، جس نے سونیا کو جلا ڈالا، مگر کہتے ہیں کہ ہر عمل کا رد عمل ہوتا ہے۔ سونیا کو لگائی جانے والی آگ نے رد عمل کے طور پر انیلہ کے مقدرد جلا ڈالے اور لمہیدہ انیلہ کے مقدرد کی آگ دیکھ کر اپنے ضمیر کی عدالت میں مل جل کا حساب دے رہی ہے۔

ضروری تو نہیں کہ آگ سے جل جائے انسان کچھ لوگوں کو مقدرد بھی جلا ڈالتے ہیں

☆.....☆

پرویس سے تیسری کہانی

ایک حقیقت ایک کہانی

عائشہ صدیقہ ضمیر

محبت کی پیاس میں بہکتی ایک روح کی کہانی جو اپنی ہی آگ میں جل اٹھی

ہاں تو صاحب آج سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے کہ اس کوائر میں ایک راجپوت کنیش پال نامی آکر رہا۔ اس کی بیوی بہت خوب صورت تھی۔ دونوں میاں بیوی کا اخلاق بہت اچھا تھا۔ ٹھوڑے دنوں میں ہی محلے والے ان کے گرویدہ ہو گئے۔ دائیں طرف والے کوائر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بوڑھے نے کہا۔ اس میں ظہیر صاحب رہتے تھے۔ وہ بڑے اچھے اور کھرے آدمی تھے، پھر نہ جانے کس بات پر کنیش اور بابو ظہیر حسین میں نا اعلانی ہوئی۔ انہی دنوں میں بابو ظہیر کے گھر کوئی تقریب ہوئی، بابو ظہیر نے کنیش پال کو بھی دعوت دی اور کہا ہم ایک جگہ رہتے ہیں اور تم میرے ہمسائے ہو، لہذا میں تم سے معذرت کرتا ہوں۔ تم اس تقریب میں ضرور آنا اور بھائی کو بھی بھیجنا۔ سب محلے کی عورتیں بھی شریک ہوئیں، لیکن کنیش پال کی بیوی نہ آئی۔ ظہیر اور اس کی بیوی نے بہت کہا مگر وہ نہ مانا، لیکن کنیش کی بیوی کا دل چاہ رہا تھا اس تقریب میں آنے کا، لیکن وہ کنیش کی خد کے آگے مجبور تھی۔

اس نے سوچا کہ جب کنیش چلا جائے گا۔ تب ہی جانا ممکن ہوگا، مگر پال اس کے ارادے کو بھانپ گیا۔ وہ اپنی بیوی سے کہنے لگا۔ ظہیر بابو کے گھر نہ جانا، میری اس سے لڑائی ہے۔ اگر وہاں تم گئیں تو مجھ سے برا

بوڑھے چوکیدار نے جھرجھری لے کر جواب دیا۔ نہ بابا کس کی ہمت ہے جو اس کوائر میں رہے۔ اب تو ارشد میاں کی دل چسپی اور بڑھئی۔ بابا کچھ بتاؤ گے یا یونہی پھیلیاں بچھاتے رہو گے۔

بوڑھے نے اپنی چند حیا کی ہوئی آنکھوں پر دلیاں ہاتھ پھیلا کر کہا۔ کیا کرو گے میاں اس واقعے کو سن کر رات کی نیند بھی حرام ہو جائے گی، پھر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ اللہ رحم کرے۔ بڑی اچھی تھی، مگر انجام نہ اچھا۔ سچ ہے کہ ہر وقت اللہ سے توبہ کرنی چاہیے، یہ کہہ کر بابا کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”ہاں بابا کچھ تو بتاؤ۔“ ارشد نے کہا۔

”اچھا بتاتا ہوں۔ اگر آپ اسے سننا ہی چاہتے ہیں تو سنو۔“

اس کوائر میں کوئی کیوں نہیں رہتا۔ میں جو کہہ رہا ہوں بالکل سچ ہے اور مجھے جھوٹ کہنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ارشد نے اپنی ہنسی پر ہنسنے کا بو پایا۔ اتنا تو اسے بہر حال اندازہ ہو گیا تھا کہ بذحانہ کی آوی ہے اور کیا تمہیں جھوٹ بولنے کی ضرورت۔ ہاں تو بابا کیا ہوا؟

بوڑھا چوکیدار کہنے سے پہلے کھانسا، پھر سنبھل کر بیٹھ گیا اور بڑے کا ایک لمبا کش لگا یا اور یوں گویا ہوا۔

﴿سچی بات سنانا﴾

کافی دیر تک عورتوں میں فنی مذاق ہوتا رہا۔ بعض بے تکلف عورتیں چھینر خانی کرتی رہی ہیں۔ یہ کہہ کر بوڑھے نے غصے کا ایک کٹس لگایا اور چلم کو درست کر کے پھونک دیا۔

جب عورتیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو جائز ناجائز کا فرق مٹ جاتا ہے۔ بس بھی کچھ وہاں ہوا۔ مکھلے والے گانے ناچنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، پر اس وقت بہت سی عورتیں ناچنے گانے لگیں۔ کنش کی بیوی بھی ناچتا جانتی تھی۔ جب سب نے اس سے کہا تو وہ جیسے ادھار کھائے بیٹھی تھی، بے۔۔۔ مجاہد۔۔۔ شروع ہو گئی۔ اس نے کانچ

کوئی نہ ہوگا۔ اس نے کہا۔ کنش پال مطمئن ہو کر دفتر چلا گیا۔ ادھر اس کی بیوی جھٹ پٹ تیار ہو کر ظہیر بابو کے گھر چلی گئی۔ سب عورتیں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں، ظہیر کی بیوی بولی۔

”تمہارے ظہیر محفل میں رونق کہاں۔“
”اگر ایسی بات بھی تو اپنے پتی دیتا ہے کتنی وہ پال کو تالیتا۔“ اس نے کہا۔
”وہ تو منع کر گئے تھے پر میرا دل نہیں مانتا اس لیے پہلی آئی۔“



میں ڈانس سیکھا تھا، پھر ہندوؤں میں ویسے بھی اس کا رائج ہے۔ ہولی، دیوالی، شادی بیاہ میں یہ سب تاقی رنگ میں حصہ لیتی ہیں۔
کنش پال مطمئن نہیں تھا، کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی کو تقریبات میں جانے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ ظہیر بابو کی بیوی اس کی سہیلی بھی تھی، اس لیے وہ درمیان میں ہی گھروٹ آیا تو دیکھا گھر میں تالا لگا ہوا ہے۔ اسے تو غصہ ہی چڑھ گیا۔ وہ فوراً ادھر آیا اور بچوں

سلٹی نے کہا۔ ”ظہیر نے تو کنش بھیا کو بہت کہا، پر وہ ماننے ہی نہیں۔ خیر اب آگئی ہو تو دل خوش ہو گیا۔“
”اور کیا جانتی تھی آئے گی محبت کی مادی۔ ارے تم کیوں فکر کرتی ہو، جب تمہارے یہاں کوئی خوش ہوگی تو ہم ان بلائے ہی آجائیں گے اور کنش بھیا کو سنا لیں گے۔“
سلٹی نے ہنستے ہوئے کہا۔
”میں کنش کے گھر آنے سے پہلے ہی چلی جاؤں گی۔“ اس نے کہا۔

تو بڑا بھلا کہہ کر واپس دفتر چلا گیا۔ دوپہری ہوئی

1. *Phragmites australis* (Cav.) Trin. ex Steud.

کی آواز آتی ہے اور وہ دو چار ماہ میں ہی گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ پانچویں دوپہاری ہی جینا بھوت بن گئی ہے۔

پانچویں نے جھر جھری لیتے ہوئے کہا: "اللہ تو بہ" تنیش پال اپنا چنی توازن کھو بیٹھا ہے اور سڑکوں بازاروں میں جینا میری جینا کی صدا لگاتا پھرتا تھا۔ آخر کار اس کے رشتے دار اسے لے گئے۔ سنتے ہیں وہ کسی حد تک اچھا ضرور ہو گیا، مگر اس شہر میں وہ بارہ کبھی نہ آیا۔ ظہیر باہو بھی اپنی تہہ ملی گرا کر چلے گئے ہیں، مگر جینا نہیں گئی، وہ اسی گھر میں ہے، جانے کب اسے شائق ملے گی۔ رات کو اکثر اس کمرے میں سے رونے کی آواز ہائے رام بیاسی کی آواز آتی ہے۔ "آہ اس کی پیاس کب بجھے گی۔ کب تک دوپہاری رہے گی۔"

یہ کہہ کر پانچویں نے آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور ارشد، رومال اور میں دو تیس فلاؤس میں گھور رہے تھے اور سوچ رہے تھے کیا یہ سب واقعی میں سچ ہے؟ کیا ایسا ہی ہو سکتا ہے؟

اس کی دوسری طرح پیاسی بھنگ سکتی ہے؟ اب اس کی پیاس کیسے بجھے گی، یہ کون بتائے گا؟

☆ ☆

ہے۔ میری جینا کبھی نہیں مل سکتی۔" لوگ اسے قریبی اسپتال لے گئے، بڑی کوشش کے بعد اسے ہوش آیا، مگر کیسے؟ وہ ایک طرف سے دوسری طرف سہ مارنی اور پکار رہی۔

"ہائے رام پانی۔۔۔ ہائے پانی۔" تنیش اس کی آواز سن کر اس کی طرف دوڑا۔ "جینا میری جینا، تو نے یہ کیا کیا۔ میری اتنی سی خطا کی اتنی بڑی سزا دی تو نے، کچھ تو سوچتیں۔ تم مجھے سے انتقام لے لیتیں۔ تم نے خود اپنے آپ کو کیوں جلا ڈالا؟ تم اتنی کم عقل تو نہ تھیں۔ ارے لوگو! میری جینا سے کہو مجھے معاف کر دو۔ ہائے بھگوان مجھے فہر ہوئی تو بس اسے اکیلا چھوڑ کر ہی نہ جاتا۔"

تنیش کے کہے ہوئے ایک ایک حرف لوگوں کے دلوں کو چیرے ڈال رہے تھے۔ سب کے آنکھوں میں آنسو تھے، مگر جینا سوائے ہائے رام بیاسی کے کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ اس کی سماعت، بصارت دونوں ختم ہو گئی تھیں۔ بڑے ڈاکٹر آئے، ہر ایک نے اپنے علم و تجربے کو آزمایا، مگر جب وہاں کی آن لگے تو محسوس کی بہت جو درد سکے۔ وہ اس اذیت میں تین گھنٹے جتا رہ کر ختم ہو گئی۔ اب اس کو اور فریاد کوئی نہیں رہتا۔ اگر کوئی آتا ہے تو کبھی کراہنے اور کبھی رونے

قاریہ مشہد شہر

کیا آپ کو پرچہ نہیں ملتا؟

کچھ عرصے سے کئی شہروں سے شکایات موصول ہو رہی ہیں کہ مائیکروفن کی صورت میں قارئین کو پرچہ نہیں ملتا۔ ایجنٹ حضرات کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے قارئین سے ہماری التماس ہے کہ پرچہ نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط لکھ کر یا فون کے ذریعے درج ذیل معلومات فراہم کریں۔

بکس نمبر، اسم، جہاں پر چر دستیاب نہیں۔ شہر اور علاقے کا نام۔ اگر ممکن ہو تو بک اسمال کاسٹل نمبر یا لینڈ لائن نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ممتاز زمان

0300-2313256

پہلے ہی گھر چلا گیا تھا "دو شہر"

110- آدم آرکیڈ۔ شہید ملت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ، کراچی۔

سکھ

خلق خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم کارکنین! مسئلہ یہ ہے کہ "کامسلسہ خلق خدا کی بھلائی اور روحانی حالات میں امن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت، ہمارا "کئی کہانیاں" کے اولین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ خط و کتابت اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کر دینے والے تجربے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اسی تناسب سے ہر ماہ و چھ ماہ ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہوئی کہ اگر ہمارا "کئی کہانیاں" میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو کارکنین کو اپنے جوابات کے لیے کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ ہر ماہ میں صفحات کی تعداد ہر حال محدود ہے۔ ان عملی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوٹس لگے۔ مسائل کے جوابات براہ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، ان کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں ہر وڈاک کرنا خاصہ وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہ راست جوابات کے لیے بڑا معاون پاکستان کی مسابقتی، قومی تنظیم کی دعا اور مسابقتی و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دعا کرنے پر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دعا کے خیر سے بڑا معاون اور قیمتی تعداد کی کئی کہانیاں کے مطابق آقا و زمین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں ہر وڈاک کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ہمارے "کئی کہانیاں" کے نام ارسال کریں۔ یہ رقم ان افراد کی تنخواہ کی مدد میں آپ کی امداد ہونی چاہیے۔ یہ متعلق ہیں۔ منی آرڈر دینی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحب استطاعت حضرات نوکین منی =300 روپے کو آخری مدد نہ سمجھیں، وہ حسب استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم ان خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

[illegible]

- (1) مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت "مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے مجھوں نے غلطوٹاں بھیجیں ہوتے فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔
- (2) مٹی آرڈر، بینک ڈرافٹ مابینہ "بچی کہانیاں" کے نام ارسال کریں۔
- (3) اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

[illegible]

ماہنامہ ”حقی کہانیاں“ 110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی

روزی میں برکت عطا ہوتی ہے۔ جی روزانہ بعد نماز فجر ایک بار سورہ رخصن ترجمہ کے ساتھ پڑھو۔ بکثرت یا مالک الملک کا ورد کرو۔ انشاء اللہ سارے مسائل رفتہ رفتہ حل ہوں گے۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ ن۔ش۔ ٹیکسلا

○ محترم باباجی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! اللہ تعالیٰ آپ کو عزت دے۔ آپ نے مجھے وظیفہ بتا کر میرے اوپر احسان کیا ہے۔ باباجی ایک بات کہنی ہے کہ میں 5 وقت کی نمازی اور تہجد گزار بھی لیکن جب سے سو لیا ہے میرا دل نہیں کرتا نماز پڑھنے کو اور تین سال ہو گئے ہیں میں نے ٹھیک طرح سے نماز نہیں پڑھی حالاں کہ میں چاشت اور اشراق کے نفل بھی باقاعدگی سے پڑھتی تھی اب فرض بھی چھوٹ گئے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی چیز مجھے روک رہی ہے۔ پلیز کوئی وظیفہ دیں کہ میری نماز میں باقاعدگی آجائے اور میں آپ کے اس ماہنامے کی وساطت سے فقیر لوگوں سے گزارش کروں گی کہ یہ فرض اتارنے میں میری مدد کریں اور مزید گمراہ ہونے سے بچالیں۔ اللہ پاک آپ کو اجود دے گا۔

○ بی بی! تمہیں تو خود ہی اندازہ ہے کہ تمہاری اس کیفیت کی کیا وجہ ہے۔ بہت ضروری ہے کہ تمہارا فرض اتر جائے۔ جی سو لینے والے کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ سے جنگ کا مرتکب ہوتا ہے۔ تمہیں جس دن یہ احساس ہوگا کہ تم نے بہت غلط حرکت کی ہے اس دن سے تمہارے معاملات میں سدھار شروع ہو جائے گا۔ ہر نماز کے بعد ایک بار سورہ توبہ پڑھو اور بہت گزرا کر معافی مانگو مدت 21 روز ہے۔

□ رابعہ بصری۔ چیچہ وطنی

○ پیارے باباجی! چند ماہ سے میرے احساسات میں غیر معمولی تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک لبا شخص جس نے سفید لباس پہنا ہوا ہے میرے پاس موجود ہے اور میری طرف آ رہا ہے۔ اور اک و خیال میں یہ تصویر مجھے اس قدر گہری دکھائی دیتی ہے کہ میں اسے دیکھ کر نہیں کر سکتی۔ اچانک جب نگاہ تصور اسے دیکھتی ہے تو میں ڈر کر بھاگنے پر مجبور

□ شاہین اختر۔ کراچی

○ السلام علیکم باباجی! امید ہے آپ اللہ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں گے باباجی میں نے ہر لمحہ آپ سے رہنمائی لی ہے، آج پھر میرے ساتھ چند مسائل ہیں، امید ہے کہ آپ جلد جواب دیں گے باباجی میری عمر 40 کے قریب ہے، میرے سر کے بال اس قدر تیزی سے سفید ہو رہے ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتی آپ مہربانی کر کے میرے بال دوبارہ کالے ہو جائیں کوئی ترکیب یا دوا بتادیں۔ میں آپ کو دعاؤں میں یاد رکھوں گی، نیز دوسرا مسئلہ یہ ہے آج چار پانچ ماہ ہو گئے ہیں میری سیدھی آنکھ مسلسل پھڑکتی رہتی ہے بس کبھی کبھار رک جاتی ہے۔ میں بے حد عاجز آ گئی ہوں آپ مجھے کوئی ایسی دوا بتادیں کہ یہ آنکھ پھر کنٹرول ہو جائے، میں بے حد پریشان ہوں آپ کی یہ جی سی آپ کو ہمیشہ دعا میں یاد رکھوں گی۔

○ بی بی شاہین! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے نماز کی پابندی رکھو اور ذرہ ذرہ شریف بہت پڑھو۔ بالوں کے سفید ہونے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں جس میں سب سے اہم وجہ موروثی ہے۔ دوسری اہم وجہ خوراک کا متوازن نہ ہونا ہے۔ تم اپنی غذا میں پھل کا استعمال بڑھا دو یہ بالوں اور آنکھوں کے لیے بہت مفید ہے۔ ہفتہ میں ایک بار سرسوں کا تیل بالوں کی جڑوں میں ضرور لگاؤ۔ بکثرت یا اللہ کا ورد کیا کرو۔ انشاء اللہفاقہ ہوگا۔

□ یسرانی قاطرہ۔ کراچی

○ بی بی یسرانی! تمہاری خواہش کے مطابق خط شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ بعض اوقات انسان کو محسوس ہوتا ہے جیسے چاروں جانب گہرا اندھیرا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا ہے کوئی نہ کوئی دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے سب ہمیں نظر نہیں آتا۔ جی تم بھی بالکل مایوس مت ہو۔ اللہ سب خیر کرے گا اس سے مکمل اعتماد کے ساتھ مانگو نہایت بابرکت ماہ شروع ہو چکے ہیں، ان کی جانے والی تمام جائز دعائیں قبول ہوتی ہیں تم بھی اللہ سے مدد مانگو۔ نماز کی پابندی بہت ضروری ہے جب انسان دن میں پانچ بار وضو کر کے نماز پڑھتا ہے تب مایوسی ویسے ہی دور ہو جاتی ہے۔ کچھ نہ کچھ صدقہ خیرات ضرور کیا کرو اس عمل سے

ایسے لوگوں کا پتا چلا جو بہت ضرورت مند ہیں۔ بابا جی! میں چاہتا ہوں کہ ان کی مدد آپ کے ذریعے ہی کروں تاکہ ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ یہاں تو لوگ ضرورت مند کی مدد بھیج دینے کے انداز میں کرتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کار خیر میں حصہ لوں؟

ہنا بیٹے راشد! تمہارے خط نے مجھے اپنی بیٹی UK کی یاد دلا دی۔ اللہ اس کو اچھا رکھے۔ وہ اسی طرح لوگوں کی مدد کیا کرتی تھی۔ اس کا شوہر بیمار تھا۔ بہت عرصہ ہوا کوئی رابطہ نہیں۔ میری دعا ہے وہ جہاں ہو، سنبھلی ہو، اچھی ہو۔ بیٹے! نیک کام میں شامل ہونے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ تو نصیب کی بات ہے۔ ماہنامہ ”جی کہانیاں“ کے دفتر غون کر کے جو معلومات چاہو لے لیگا۔

□ ختم ہو جاؤ گاؤ اور

بابا جی! السلام علیکم! میرے اندر عقل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہوں تو خود کو انتہائی کمتر محسوس کرتا ہوں۔ کسی سے بات چیت نہیں کر سکتا۔ دماغ ہمہ وقت مختلف النوع خیالات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ کوئی کام شروع کرتا ہوں تو کچھ ہی عرصہ بعد چھوڑ دیتا ہوں۔ شاید اسی لیے تعلیم کے معاملے میں بھی پیچھے ہوں۔ گھر کے سارے کام کرتا ہوں لیکن گھر میں وہ عزت نہیں جو ہونی چاہیے بلکہ میری کہیں بھی عزت نہیں۔ آج کے دور میں گفتگو کرنے کی صلاحیت ضروری ہونی چاہیے لیکن میں اپنی بات کسی کو سمجھا نہیں سکتا۔ میرے اندر کسی کو متاثر کرنے کی قوت بھی نداد ہے۔ کیا کروں؟

ہنا بیٹے نعیم! قدرت کی طرف سے ہر شخص کو مختلف اوصاف اور صلاحیتیں ودیعت ہوئی ہیں۔ دوسروں سے موازنہ کر کے خود کو بہتر بنانا یا اپنی اصلاح کرنا ایک اچھی بات ہے تم اپنے خیالات کا محاسبہ کرو اور اپنے اندر سے احساس کمتری اور دوسروں سے بے جا موازنہ کرنے کا رجحان بالکل ختم کر دو۔ نماز فجر اور نماز عشاء کے بعد سو سو مرتبہ یاد اسع کا ورد کرنے سے انشاء اللہ تم کو فائدہ حاصل

ہو جاتی ہوں۔ خاندان کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ عالم خیال میں مجھے وہ شخص چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے اور میرا خوف کے مارے نہ حال ہو جاتا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ کئی راتوں سے سوئی نہیں، احساس سے نجات دلانے کے لیے کچھ کریں آپ کی احسان مند رہوں گی۔

ہنا بیٹی راہبہ! ذہن انسانی میں جو اطلاعات وارد ہوتی ہیں اگر کسی وجہ سے ان میں گہرائی واقع ہو جائے تو آدمی انہیں دیکھنے اور محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کی وجوہ اور تفصیلات بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے لیکن پنجگانہ نماز کی ادائیگی کے ساتھ مندرجہ ذیل باتوں پر عمل کرنے سے انشاء اللہ اس کیفیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

غذا پر کنٹرول کرو، ہاسی اور مثیل اشیاء سے پرہیز کرو، گوشت کم کھاؤ۔

اگر کوئی ورد یا وظیفہ کرتی ہو تو اسے ترک کر دو۔

سورہ فلق ایک مرتبہ پڑھ کر دونوں ہاتھوں پر دم کر کے ہاتھ سر سے چیر تک پھیر کر ہاتھ زمین سے مس کر دو۔ اس طرح پانچ مرتبہ کیا جائے۔ ان اعمال پر کم از کم چالیس دن عمل کرو خدا بہتری کرے گا تعویذ تیار کر دیا گیا ہے آفس سے منگوا لو۔ خدا بہتری کرے گا۔

□ ربیعہ حسین۔ اسلام آباد

بابا جی! ربیعہ! اللہ تعالیٰ سے صرف یہ دعا کرو کہ وہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے (آمین) بعض اوقات جو لوگ یاد دہشتے یا فیصلے نہیں برے لگتے ہیں وہ ہمارے لیے بہترین ہوتے ہیں۔ نماز کی پابندی رکھو اور یا رحیم کا بہت ورد کرو۔ بہن کا مسئلہ میں سمجھ نہیں سکتا ہوں۔ وضاحت سے لکھو اندازوں سے میں ایسے بھی علاج نہیں بتا ہوں۔

□ راشد خان۔ کینڈا

بابا جی! امیرا تعلق مرگودھا سے ہے۔ 35 سال ہو گئے ہیں دیار غیر میں محنت کرتے۔ اللہ نے توفیق دی ہے لہذا حسب استطاعت لوگوں کی مدد کرتا رہتا ہوں۔ آپ کا پچھلا شمارہ نظر سے گزرا تو کچھ

ہوگا۔ اس وظیفے کو کم از کم چالیس روز ضرور پڑھو۔

□ نسرین گھمن۔ رحیم یار خان

○ محترم بابا صاحب! السلام علیکم ایہ مسئلہ میری بڑی بھالی کا ہے جن کی عمر 35 سال ہے۔ ان کی شادی کو 14 سال ہو گئے ہیں۔ جب سے شادی ہوئی ہے تب سے اکثر بیمار رہتی ہیں۔ ہر دوسرے مہینے میں ان کا گھبراہٹ ہو جاتا ہے۔ وہ اخلاق کی بہت اچھی ہیں۔ بات کرتے اس طرح نظر آتی ہیں جیسے ان کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کے واسطے ان کو کوئی ایسی دوا یا وظیفہ بتا دیں جس سے ان کی بیماری دور ہو جائے۔ ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ گلوں کی تکلیف کے لیے جو دوائی آپ دیتے ہیں اسے منگوانے کا طریقہ کار بتا دیں۔

بلا بنی نسرین! اللہ تعالیٰ تمہاری بھانج کو مکمل شفا عطا فرمائے۔ (آمین!) مریضہ خود نماز عصر کے بعد ایک بار سورۃ یسین پڑھ کر پانی کی ایک پیالی پر دم کرے اور ذرود شریف کا ورد کرتے ہوئے تین سانسوں میں یہ پانی پی لے۔ انشاء اللہ اتفاق ہوگا۔ مدت 90 دن ہے۔ ناسلو کی دوا منگوانے کے لیے تمہیں براہ راست ذیل خط نامہ ہوگا میرا جوابی اٹاف۔ دوا کا طریقہ استعمال دوا کے ساتھ تحریر کر دیا جائے گا۔

□ نصرت حامد۔ کوٹ ادو

○ باباجی! اللہ آپ کو صحت دے۔ میں بہت پریشان ہوں میرا مسئلہ ہے مکی بہت عظیم۔ میری شادی کو 7 سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر میں نے ایک دن بھی سکون کا نہیں دیکھا۔ شوہر بہت پیسے والے ہیں مگر بے انتہا شہلی اور ہاتھ چھوڑتے ہیں مجھے بے تحاشا مارتے ہیں۔ بچے اب بڑے ہو رہے ہیں۔ ایک بیٹی ہے جو 5 سال کی ہے اور بیٹا ڈھائی سال کا ہے۔ دونوں باپ کے قدموں کی آواز سن کر سہم جاتے ہیں۔ ان 7 سالوں میں میں جتنا اپنے آپ کو بدل سکتی تھی بدل لیا مگر اب مار نہیں سہی جاتی۔ جسم میں جان ہی نہیں ہے۔ منہ پر پھڑپھڑانہ تو کوئی بات ہی نہیں ایسے کوئی جانوروں کو بھی نہیں رکھتا جیسے میں دن گزار رہی ہوں۔ خدا کے لیے باباجی! مجھے کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ

میری اس شخص سے جان چھوٹ جائے۔

بلا بنی نصرت! تمہارا فیصلی خط پڑھا بہت دکھ ہوا مگر بنی! ایک بات جو ناقابل برداشت ہے کہ وہ شخص تمہیں مارتا ہے اور تم برداشت کرتی ہو۔ مرد کا اگر ایک دفعہ ہاتھ اٹھ گیا تو پھر وہ نہیں رکتا۔ تم 7 سالوں سے یہ سب برداشت کر رہی ہو غلط ہے۔ میں کسی بچی کو ایسے شخص کے ساتھ رہنے کا مشورہ نہیں دوں گا کیونکہ ذہنی بیمار کے ساتھ رہنا نقصان دہ ہوتا ہے۔ تمہیں ہمت کرنی ہوگی اپنے بڑوں کو درمیان میں ڈالو۔ بچوں کی فکر مت کرو وہ تمہارے ہی ہیں اور تمہارے ساتھ ہی رہیں گے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد بنو حنیم کا بہت ورد کرو۔

اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ فلک شمس۔ باغ، آزاد کشمیر

○ باباجی! میں بہت پریشان رہتا ہوں نوکری کے سلسلے میں عرصہ 10 سال سے دینی میں مقیم ہوں۔ بیوی بچے گاؤں میں ہیں سال میں ایک بار 20 دن کے لیے گھر جاتا ہوں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں ان کے معاملات ماں کے بس سے باہر ہیں۔ مجھے کوئی ایسا جلالی وظیفہ بتائیں جس کی برکت سے میرا روزگار اپنے وطن ہی میں ہو جائے تاکہ میں گھر کی ذمہ داری اچھی طرح اٹھا سکوں۔

بلا بنی فلک! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ذرود شریف بہت پڑھو۔ جب جب یاد آئے بکثرت آیت کریمہ پڑھو۔ اس ورد کو اپنی عادت میں شامل کر لو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ اس کے علاوہ جو لوگ کسی بھی مشکل میں گرفتار ہوں وہ بھی یہ ورد کریں۔ ضرور کرم ہوگا۔

□ عروہ بیگ۔ فتح جنگ

○ محترم باباجی! السلام علیکم! "میں نے کہا کیا" میں لوگوں کے مسائل اور آپ کے بتائے ہوئے حل پڑھ کر میں نے سوچا کہ میں بھی اپنا مسئلہ آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ میری شادی کو پندرہ ماہ ہونے والے ہیں۔ میرے شوہر کا روزگار نہیں ہے جس کی وجہ سے میں سخت پریشان ہوں اور دوسرا یہ کہ انہیں اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس نہیں ہے۔ میرے سر پر میرا

سب کا خیال رکھو۔ اس کا صلہ بہت بڑا ہے۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 1100-1100 بار پڑھو سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم، اللہ سے دعا کرو۔ وہ ضرور اپنا کر مفرمائے گا۔

□ اللہ بندی۔ پوری

○ بابا جی! خوش رہیں۔ بابا جی! میں ایک بیوہ عورت ہوں 3 بچے ہیں جو ابھی پڑھ رہے ہیں۔ میرے شوہر نے اپنے انتقال سے پہلے بہت لوگوں کو پیسا ادا کیا تھا جو اب میں واپس لینا چاہتی ہوں مگر ہر دفعہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ لینے والے یہ تو مانتے ہیں کہ انہیں رقم ادا کرنی ہے مگر کب کرنی ہے اس کا کچھ نہیں جانتے۔ بابا جی! میرا ذریعہ آمدنی کچھ نہیں کوئی نوکری بھی نہیں کر سکتی کہ بیٹوں کا ساتھ ہے۔ اپنے گھر والوں کی مدد لینا اچھا نہیں لگتا۔ مجھے کوئی ایسا وظیفہ دیں جس کی برکت سے مجھے میرا پیسا واپس مل جائے۔ بچوں کو ترستے ہوئے دیکھتی ہوں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔

بابا جی! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ یقیناً یہ وقت تمہارے لیے بہت مشکل اور تکلیف دہ ہے مگر یقیناً رکھو بیوہ اور یتیم کا مال کھانے والے اس دنیا میں بھی رسوا ہوتے ہیں اور وہاں تو حساب کتاب ہی بہت سخت ہوگا۔ ہر حال تم نماز کی پابندی رکھو اور دُور دُور شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد یا سحیح کی 7-7 تسبیح پڑھو۔

□ فرحین گل۔ کوٹری

بابا جی! فرحین! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُور دُور شریف بہت پڑھو۔ بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ الواقعة ضرور پڑھو۔ کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کیا کرو۔ تعویذ منگوانے کے لیے مجھے براہ راست خط لکھو ہمارا جوابی الفاظ۔ سورۃ الواقعة 21 روز پڑھو پھر مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

□ کلثوم علی۔ تونسہ شریف

○ بابا جی! السلام علیکم! جب میں نے آپ کا ارسال کردہ وظیفہ پڑھنا شروع کیا تو ایسے لگا جیسے کسی نے میرے گرد حصار باندھ رکھا ہو لیکن آہستہ آہستہ اس میں کمی شروع ہو گئی۔ میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ

گھر چلا رہے ہیں۔ ان میں ضد بھی بہت ہے۔ مجھ سے تو خاص طور پر برہات میں ضد کرتے ہیں۔ مجھے کوئی ایسا حل بتائیں جس سے ان کو روزگار بھی مل جائے اور ان کی ضد بھی ختم ہو جائے۔ میں آپ کو بہت دعا کہیں دوں گی۔

بابا جی! عروہ! رزق کا وعدہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ جب انسان پریشان ہوتا ہے تو اس کا مزاج خراب ہو جاتا ہے۔ نماز کی پابندی رکھو اور نماز عصر کے بعد سورۃ قمر آیات 13 تا 1 پڑھو اور دعا کرو کہ کرم ہوگا۔ مدت 21 دن ہے۔

□ انیلا۔ شورکوٹ

بابا جی! انیلا! اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ (آمین!) نماز کی پابندی رکھو اور نماز فجر کے بعد سات تسبیح یا قلب کی پڑھو اور دعا کرو۔ صدقہ خیرات ضرور کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ نوما۔ جام پور

بابا جی! نوما! والدہ سے کہو کہ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ کتب پڑھیں اور ایک پیالی پانی پڑم کریں اور پانی بیٹے کو پلائیں۔ جب جب یاد آئے الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر دم کرو یا کریں۔ ضرور افادہ ہوگا۔ مدت 31 دن ہے۔

□ زینت ابوشاد۔ راولپنڈی

○ بابا جان! السلام علیکم! بہت جلد کر کے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ ہمارا تعلق سلطیہ پوش لوگوں میں سے ہے۔ واحد کمانے والے میرے شوہر ہیں اور کھانے والے 8 افراد ہیں۔ میری ساس بیوہ ننڈا اس کے 3 بچے ہیں اور میرے 2 بچے۔ میرے شوہر ذلیل ڈبل نوکریاں کرتے ہیں پھر بھی پورا نہیں پڑتا۔ بہت پریشانی رہتی ہے۔ بابا جان! ہم لوگ تو کسی سے مانگ بھی نہیں سکتے۔ بچے معمولی چیزوں کے لیے بھی ترستے ہیں۔ مجھے ایسا وظیفہ دیں جس کی برکت سے روزی میں اضافہ ہو۔

بابا جی! زینت! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ جی! تم بہت خوش نصیب ہو کہ بیوہ اور یتیموں کی کفالت تمہارے شوہر کے ذمے ہے۔ بہت محبت اور سلوک سے

نہیں لیتا۔ نہ صرف بھائی کے ساتھ ایسا ہے بلکہ ہمارے گھرانے کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ دیگر معاملات میں بھی مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا ہے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی الجھنوں اور پریشانیوں نے گھیر رکھا ہے۔ پتا نہیں کیوں؟ ایسا کوئی عمل وظیفہ بتادیں کہ ہم اس مشکل سے نکل آئیں۔

بھلا جی رشیدہ۔ بھائی سے کہو کہ دو نماز فجر کے بعد سو مرتبہ یا رحیم پڑھ کر ہاتھوں پر دم کرے اور ہاتھ چرے پر پھیر لیا کرے۔ کم از کم نوے دن اس عمل کو جاری رکھے۔ انشاء اللہ خدا کرم کرے گا۔ اس کے علاوہ آفس سے تعویذ منگو الوداع گھر کے صدر دروازے پر اس طرح لگاؤ کہ نظر نہ آئے۔

□ حسنہ مومن۔ لاہور

○ پیارے باباجی! میری نو سالہ بیٹی بہت کمزور ہے اس کو بھوک بھی بہت کم لگتی ہے۔ کبھی اس کا رنگ زرد سا ہو جاتا ہے اور کبھی لکڑی لگتی ہے اکثر صبح اٹھ کر پیٹ میں درد کی شکایت کرتی ہے صبح کو سوت رہتی ہے اور رات کو دیر سے سوتی ہے پڑھنے لکھنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتی۔ میں کیا کروں باباجی! پلیز جواب دیں۔

بھلا جی حنا! کسی اچھے طبیب کو دکھاؤ کیوں کہ علامات کسی طبی خرابی و بیماری کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ لوبح قرآنی، علی الصباح اکتالیس مرتبہ پانی پر دم کر کے پلاؤ انشاء اللہ جسمانی تھکائی کی بحالی میں بہت معاون ثابت ہوگا ساتھ ساتھ طبیب کی ہدایت کے مطابق غذا میں پرہیز و احتیاط کرنا لازمی ہے۔ خدا شفا دے گا۔

□ اریبہ۔ شجاع آباد

بھلا جی! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور روزہ و شریف بہت پڑھا کرو۔ جس قدر ممکن ہو عبادت کرو۔ نماز فجر اور نماز عصر کے بعد اس طرح بسم اللہ الرحمن الرحیم کا ورد کرو کہ تعداد بارہ ہزار مکمل ہو جائے پھر دعا کرو۔ کرم ہوگا۔ مدت 21 دن ہے۔

□ فیاض احمد۔ سرانے عالمگیر

○ باباجی! السلام علیکم! میں آپ کو بڑی امیدوں سے خط لکھ رہا ہوں۔ آپ ضرور کوئی بہتر حل بتائیں

میں دو دن اس سے بات نہیں کرتی ہوں تو بے چین ہو جاتی ہوں لیکن آپ کے وظیفے سے صبر آتا گیا۔ آپ کا دیا ہوا وظیفہ پڑھ رہی ہوں پورے چالیس دن میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی مگر ایک رات پتا نہیں کیسے بہک گئی اور اسے فون کر دیا۔ اب اس نے خود بتایا ہے کہ اس کے پاس میری وہ ساری باتیں جو رات میں نے کی تھیں سب ریکارڈ ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہارے منگیتر کو یہ سب بتا دوں گا۔ باباجی! مجھے پتا ہے کہ یہ کام جو میں کر رہی ہوں گناہ ہے؟ مجھے احساس ہے کہ میں اپنے آپ کو تباہ کر رہی ہوں مگر میں اب یہ داغ مٹانا چاہتی ہوں۔ میں ایک عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے امی ابو بہت اچھے ہیں۔ ان کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اگر ان کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا؟ وہ مجھ پر بے حد اعتماد کرتے ہیں۔ میں ان کی لاڈلی بیٹی ہوں۔ بابا جی! پلیز میرے لیے کچھ کیجیے ورنہ میں مر جاؤں گی۔ باباجی! میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔ آپ کو خط لکھتی ہوں تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ باباجی! میری ساری باتیں پڑھ کر آپ کو بھی دکھ ہوگا۔ پلیز مجھے ڈائیجیٹل مگر میرے لیے کچھ کیجیے۔ مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟ کیسے چھٹکارہ پاؤں اس لڑکے سے؟ یہ وظیفہ کب تک پڑھوں؟ ساری باتیں لکھ دی ہیں۔ آپ میرے لیے خاص دعا کریں کہ مجھے اس لڑکے سے نجات ملے۔

بھلا جی کلثوم! تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ تم کیا غلطی کر رہی ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہیں محفوظ رکھے۔ (آمین!) فوراً قطع تعلق کر لو۔ تمہارا خط صرف اس لیے شائع کر رہا ہوں تاکہ دوسری بچیوں کو احساس ہو کہ یہ وقتی کھیل تماشے کتنے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ نماز فجر اور ظہر کے بعد سورۃ فتح آیت 29-100-100 بار پڑھو اور دعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ رشیدہ ہانو۔ خان پور

○ بھائی جہاں نو کرمی کے لیے جاتا ہے وہاں سے جواب نفی میں ملتا ہے اگر کسی کو کہتے ہیں تو وہ بھی دلچسپی

ماں بھی جائیں مگر امی بہت سخت ہیں۔ میں چاہتا ہوں بڑوں کی مرضی سے یہ شادی ہو۔ مجھے تعویذ بتا دیں تاکہ میری انی کا دل نرم ہو جائے اور وہ مجھے خوش خوشی اجازت دے دیں۔

ہلا بیٹے غفار! یقیناً مذہب تمہیں اپنی پسند کی جائز زندگی گزارنے کی اجازت دیتا ہے مگر بیٹے! یہ بھی یاد رکھو کہ والدین کا اولاد پر بہت حق ہے۔ ماں باپ کا تجربہ اولاد کو بہت سارے مسائل سے بچا لیتا ہے اگر اولاد فرمانبردار ہو تو۔ تم اپنی والدہ سے خود بات کرو اور پوچھو کہ وہ کیوں اس رشتے پر تیار نہیں؟ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ لڑکی اسلام قبول کر لے گی تو یہ بات درست نہیں۔ تمہاری وجہ سے وہ مذہب بدل سکتی ہے تو کل کسی اور وجہ سے اسلام کے دائرے سے باہر بھی نکل سکتی ہے۔ ہاں! اگر وہ دین اسلام کو سمجھے اور انہی طرح سمجھنے کے بعد اس فیصلے پر پہنچے کہ یہی سچا اور اللہ کے آخری نبی اور محبوب کا پھیلا ہوا دین ہے تو درست ہوگا۔ اس کے لیے شہراری ہے کہ وہ قرآن مجید کا اپنی زبان میں ترجمہ پڑھے اور سمجھے اور پھر اپنا رہن سہن اور چال ڈھال سب اسلامی شریعت کے مطابق کر لے پھر یقیناً تمہاری والدہ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میری نصیحت ہے کہ اگر دنیا میں عزت چاہتے ہو تو ماں باپ کے فرمانبردار رہنا۔ نماز پابندی سے ادا کیا کرو اور بکثرت یا قُذُّوس کا ورد کرو۔

□ اجازت یاب۔ تلمہ گنگ

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میرے بہنوئی پر غالج کا ایک ہوا ہے اور زیادہ تلمہ دماغ پر ہوا۔ اب چھ ماہ سے ان کا علاج ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پہلے سے کافی بہتر ہیں۔ ایک ان پر داکس سائڈ پر ہوا تھا۔ سہارے کے بغیر چل تو لیتے ہیں لیکن ابھی سچے طور پر چل نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ ہازہ بھی لی الحال سچے طور پر حرکت نہیں کر سکتا۔ باتیں کرتے ہیں تو ابھی ابھی سمجھ میں آ جاتی ہیں لیکن بعض اوقات باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آتیں جس کی وجہ سے میری بہن کافی پریشان ہیں۔ محترم باباجی! کوئی ایسا دھیفہ بتائیں کہ

مکے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنی کزن سے محبت کرتا ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کے والدین عرصہ دراز سے فوت ہو چکے ہیں اور اس کے دادا بھائی ہیں جو ہمیشہ اس کے متعلق غلط سوچتے ہیں۔ میں نے اسی سال گریجویشن کیا ہے اور میرا تعلق انہیں کھاتے پیتے گھراٹے سے ہے جبکہ اس کے بڑے بھائی نے ایک ماؤنٹ اپنی دوسری شادی کرنے کے لیے اس کا رشتہ کسی غیر مناسب جگہ پر کر دینے کی کوشش کی جو نہ بن سکا۔ باباجی! دراصل حقیقت یہ ہے کہ تقریباً دو سال پہلے میری اسی کزن سے میرا نکاح تھا جو خاندانی چٹختش کی وجہ سے نہ ہو سکا اور انہوں نے نکاح سے ایک دن قبل فون پر منع کر دیا تھا جس کے باعث ان لوگوں سے ہمارا جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے ہمارے گھر والوں نے انا کا مسئلہ بنایا ہوا ہے اور ان سے کوئی رابطہ نہیں رکھا۔ ابھی تک بات انجھی ہوئی ہے۔ بہت پریشان ہوں۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ مجھے فکر ہے کہ تمہیں اس کا غیروں میں رشتہ نہ ہو جائے۔ باباجی! آپ جلد مجھے کوئی دھیفہ بتائیں تاکہ میرا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔

ہلا بیٹے فیاض! اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہاری دعا قبول فرمائے۔ نماز میں گڑبڑ آکر دعا کیا کرو۔ نماز فجر کے بعد سورۃ اعراف آیت 26، 29 بار پڑھو اور دعا کرو۔ دھیفہ نہایت سہل دے رہا ہوں تاکہ اس بچے کاموں کے ساتھ بھی دھیفہ جاری رکھ سکے۔ حاجت قبول ہونے تک دھیفہ جاری رکھو۔

□ عبد الغفار۔ ڈنمارک

○ باباجی! میں بہت دور سے آپ سے مخاطب ہوں۔ میری اردو بہت کمزور ہے اس لیے اگر غلطی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔ باباجی! میں 3 سال سے یہاں ڈنمارک میں ہوں۔ پہلے پڑھائی کے ساتھ جاب بھی کر رہا تھا مگر اب پڑھائی چھوڑ دی ہے۔ کچھ عرصہ قبل میری دوستی ایک ڈچ لڑکی سے ہو گئی تھی۔ وہ بہت اچھی ہے اور اچھی پہیلی سے ہے۔ باباجی! میں اور وہ شادی کرنا چاہتے ہیں مگر میرے گھر والے تیار نہیں حالانکہ وہ اسلام بھی قبول کرنے کو تیار ہے۔ والد اور بھائی تو شاید

میرے بہنوئی ہانکل ٹھیک ہو جائیں۔ وٹھنے کی اجازت ان کی والدہ کو دی جائے۔ بابا جی! اس مسئلے کا حل فوری طور پر دے دیا جائے تاکہ میرے بہنوئی جلد از جلد صحت یاب ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تمام نیکیوں کا اجر عطا فرمائے۔ (آمین اٹم آمین!)

بچے بیٹے! اللہ تعالیٰ تمہارے بہنوئی کو کھل صحت عطا فرمائے۔ ان کی والدہ سے کہو کہ نماز کی پابندی کی کوشش کریں۔ نماز عصر اور نماز مغرب کے بعد 7-7 بار سورۃ نصر اور سورۃ طلاق پڑھیں اور دعا کریں۔ بے صاف جینے کا کثرت سے ورد کریں۔ انشاء اللہ کھل شفا ملے گی۔ مدت 41 دن ہے۔

□ وقار عظیم۔ اوکاڑہ

بابا جی! کئی سال پہلے میری والدہ نے آپ کے بارے میں بتایا تھا اب تو ان کے انتقال کو بھی عرصہ گزر گیا۔ وہ آپ کے بارے میں کہا کرتی تھیں کہ بیٹا جب بھی کوئی مسئلہ ہو لوگوں سے کہنے کی بجائے بابا جی کو خط لکھ دیا کرو۔ وہ اللہ کی کتاب سے حل دیتے ہیں۔ بابا جی! آج میں کچھ پریشانیوں سے دوچار ہوں مالی مسائل بھی ہیں اور اخلاقی بھی۔ کاروبار میں نقصان سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ یہی روٹھ کر میکے جا بیٹھی۔ بچے بھی اس کے ساتھ ہیں۔ سمجھا سمجھا کر تھک چکا ہوں۔ ہمارے مہمانی میرے مسائل حل فرمائیں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔

بڑے بیٹے! اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ذرہ بذر شریف بہت پڑھو۔ نماز عشاء کے بعد 21 بار سورہ مریم کی ابتدائی 3 آیات پڑھو اور دعا کرو۔ معاملات میں خاموشی رکھو۔ بیوی کو کچھ عرصہ اس کے حال پر چھوڑ دو۔ یہی بہتر ہے۔ رفتہ رفتہ سب درست ہو جائے گا۔

□ فائزہ کوثر۔ کھروڑکا

بابا صاحب! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور آپ ہمیشہ ایسے ہی ہماری راہنمائی کرتے رہیں۔ (آمین!) میں آپ کا کالم بڑے ہی شوق سے پڑھتی ہوں اور اگر کوئی مسئلہ ہو تو آپ کو لکھ کر راہنمائی

حاصل کرتی ہوں۔ یقین نہیں آتا کہ آج کل کے زمانے میں آپ جیسے لوگ بھی ہیں جو بغیر مطلب کے دوسروں کے کام آتے ہیں۔ بابا صاحب! میں کسی کو پسند کرتی ہوں اور غلطی سے چند بار ان سے باہر بھی ملی ہوں۔ وہ بہت شریف انسان ہیں مگر بابا صاحب! میں اکثر ان سے باہر نہیں مل سکتی کیونکہ یہ غلط بات ہے مگر مجھے پہلے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ میں غلط کر رہی ہوں۔ اب بابا صاحب! میں اگر ان سے باہر نہ ملوں تو وہ بہت پریشان کرتے ہیں۔ اگر باہر ملوں تو پریشانی ہوتی ہے کہ یہ غلط بھی ہے اور اگر گھر والوں کو پتا چلتا ہے تو میری عزت رہ جاتی ہے۔ بابا صاحب! اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے عزت کی زندگی عطا فرمائے اور مجھے رسوائی سے بچائے۔ (آمین!) بابا صاحب! میرے خط کا جواب ضرور دیں تاکہ میں عزت کی زندگی جی سکوں اور نیکی کے راستے پر چلوں۔ بابا صاحب! مجھے کوئی ایسا دیکھنا بتائیں کہ یا تو مجھے وہ چھوڑ دیں یا عزت کے ساتھ لے کر جائیں اور ہمارے لیے جو بھی بہتر ہو اللہ تعالیٰ ویسا ہی فیصلہ فرمائے۔ (آمین!) اور میں جلد ہی اس پریشانی سے باہر نکلوں۔ (آمین!)

بڑے بیٹے! فائزہ! تمہارے فرضی نام کے ساتھ مسئلہ اس لیے شائع کر رہا ہوں تاکہ دوسری بچیوں کو پتہ چھ کر اندازہ ہو کہ ایسے تمام لوگ ایک ماطریتہ واردات رکھتے ہیں۔ محض شخص اپنی عزت سے زیادہ دوسرے کی عزت کا خیال رکھتا ہے۔ فوراً قطع تعلق کرو کیونکہ تمہاری اور تمہارے والدین کی عزت سے بچ کر کچھ نہیں۔ نماز پابندی سے ادا کرو۔ ہر نماز کے بعد 3 مرتبہ بقیہ کی پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 21 دن ہے۔

□ یسرین اسلم۔ سعودی عرب

بابا جان! میں شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عرب آ گئی تھی۔ شروع شروع میں تو اندازہ ہی نہیں ہوا مگر آہستہ آہستہ مجھے پتا چلا کہ میرے شوہر بہت شکی ہیں وہ کام پر جاتے ہوئے مجھے گھر میں لاک کر کے چلے جاتے ہیں بروقت پوچھا تو چپ بے میں بہت پریشان ہوتی ہوں مجھے لگتا ہے کہ میری سانس بند ہو جائے گی۔ گھر والوں کو بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ اللہ کے

انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے اس کے لیے ہمارے دعا کا کثرت سے ورد کرو۔ اللہ تعالیٰ کرم فرمائے گا۔

□ قرۃ العین۔ سلام نوازی

○ بابا جی الاسلام علیکم! میں آپ کی محفل میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ آپ ضرور جواب سے نوازیں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں پڑھتی ہوں مگر بے حد محنت کے باوجود ہر دفعہ کم نمبر آتے ہیں جس کی وجہ سے مجھے شرمندگی اور دکھ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ برائے مہربانی کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میں اس دفعہ کے امتحان میں اچھے نمبر لے سکوں اور میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے والدین میری کوئی بات نہیں مانتے اور والد تو ہم کے مریض ہیں۔ ہر بات پر صاف انکار کر دیتے ہیں۔ میں ان کے لحاظ میں کوئی بات نہیں کرتی۔ میں ہی نہیں میرے بھائی بھی اس بات سے کافی پریشان ہیں۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے والد ہر بات سمجھ اور مان جائیں ان کا وہم ختم ہو جائے۔ آپ کا بہت احسان ہوگا۔

ہذا بنی قرۃ العین! اللہ تعالیٰ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ (آمین!) روزانہ رات کو 8-7 بار دام پانی میں بھگو دو اور نہار نہ اچھی طرح چبا کر کھالو اور ایک گلاس گرم دودھ بھی ضرور پیو۔ نماز فجر کے بعد 11 بار سورۃ فاتحہ پڑھو۔ اپنے والد کی صحت یابی کے لیے دعا کرو اور کسی بھی بات پر بحث مت کرو۔ یہی مناسب ہے۔ وظیفہ تم امتحان کے بعد بھی جاری رکھ سکتی ہو۔

□ منیر احمد۔ چانی

ہذا بنی منیر! نماز فجر اور نماز عصر کے بعد 7-7 تسبیح سورۃ آل عمران آیت 154 کی پڑھو اور تمام حاجات بیان کرو۔ مدت 21 دن ہے۔

□ سائرہ کنول۔ حیدرآباد

ہذا بنی سائرہ! اپنی توجہ صرف تعلیم پر رکھو۔ جن باتوں کو تم بہت اہم سمجھ رہی ہو وہ صرف وقت کا زیاں ہے۔ والدین کی خدمت کرو۔ نماز ظہر اور نماز عصر کے بعد سورۃ بقرہ آیت 138-99-99 بار پڑھو اور دعا کرو

واسطے میری مدد کریں۔ حالات ایسے ہی رہے تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔

ہذا بنی سیرنی! ہمت رکھو۔ نماز کی پابندی رکھو اور زرد شریف بہت پڑھو۔ اس مسئلے پر شوہر سے بات کرو۔ دیکھو جی! اشک کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا! شروع شروع میں دونوں فریق ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پاتے اس لیے کچھ مسئلے مسائل ضرور پیدا ہوتے ہیں مگر رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن اگر کوئی شخص شکی طبیعت رکھتا ہو تو وہ خود بھی اذیت میں رہتا ہے اور دوسروں کو بھی پریشان رکھتا ہے۔ زندگی پریشان رہ کر نہیں گزار دی جاسکتی۔ شوہر کو واضح الفاظ میں بتا دو کہ اس طریقہ کار کے ساتھ گزارا ہو ممکن نہیں۔ مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

□ کبریٰ شان۔ کھڈیاں خاص

○ محترمی و مکرمی بابا جی! السلام علیکم! میں نے آپ کے بارے میں رسالہ "جی کہانیاں" میں پڑھا اور مجھے یہ جان کر دلی خوشی ہوئی کہ اس زمانے میں آپ جیسے نیک بزرگ موجود ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ میرے یہ دو مسئلے ضرور حل کریں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں مگر میں اولاد نہیں نصبت سے محروم ہوں۔ میں نے اپنا کافی علاج کر دیا ہے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں آپ ٹھیک ہیں۔ خاوند نے لیب مرتبہ اپنا نمٹ کر دیا ہے لیکن بابا جی! 15 دن کی دوائی کھانے کے بعد سب دوائی چھوڑ دی ہے یعنی وہ میری اب کوئی بات نہیں مانتا اس لیے بابا جی! آپ مہربانی کر کے مجھے اولاد کے لیے کوئی وظیفہ بتائیں یا تعویذ دیں اور دوسرا مسئلہ کہ خاوند میری طرف توجہ دے اور میری بات مانے اس کے لیے بھی کوئی عمل بتائیں۔ میں تاحیات آپ کی شکر گزار ہوں گی۔

ہذا بنی کبریٰ! اللہ تعالیٰ تمہیں اولاد فریاد عطا فرمائے۔ 7 دن تک نماز فجر اور نماز عشاء کے بعد سورۃ نوح آیات 10-12 ایک ایک تسبیح پڑھو اول و آخر 71-71 بار سنان اللہ اور 71-71 بار استغفر اللہ۔ 7 دن عمل ہونے پر کچھ رقم خیرات کرو۔

کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عقل عطا فرمائے۔ (آمین)

□ حامد علی۔ شہدادکوٹ

بہتر بے حامد اتم اگر اپنے جذبوں میں سچے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مشکلات حل فرمائے گا۔ اس معاملے میں جو طریقہ ہے اسی کو اپنا لے لو اور اپنے بڑوں کو لڑکی کے گھر بھیج دو مگر اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز فجر کے بعد 12 تسبیح یا تسبیح کی پڑھو۔ نصیحت اور دروغ گوئی سے مکمل پرہیز کرو اور صدق خیرات ضرور دیا کرو۔ مدت 21 دن ہے۔ 21 دن بعد لڑکی کے گھر رشتہ بھیج دو۔

□ بشری اشرف۔ گجرات

بلا بلی بشری! سورۃ مائدہ آیات 18 تا 21 44-44 بار نماز عصر اور نماز عشاء کے بعد پڑھ کر ایک چٹلی نمک پر دم کرو اور یہ نمک بھائی کے کھانے میں اوپر سے ملا دو۔ نہایت پابندی کے ساتھ یہ عمل 21 روز کرو کریم ہوگا۔

□ نازی۔ کھوکھر پار، کراچی

بلا بلی نازی! خوش رہو۔ تمہارا مسئلہ صرف یہ ہے

کہ تم بہت حساس ہو۔ بعض اوقات لوگوں کے رویے بھی بہت دکھ دیتے ہیں مگر اپنے آپ کو دکھ دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نماز کی پابندی رکھو اور زور و شریف بہت پڑھو۔ گھر کے تمام افراد کے اوپر سے صدق خیرات ضرور نکالو۔ نماز فجر اور نماز عصر کے بعد 9-9 تسبیح یا سو احد کی پڑھو اور دعا کرو۔ مجھے 21 دن بعد پھر مطلع کرو۔

□ نرینہ۔ ننڈ کراچی

بلا بلی نرینہ! اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے۔ تفسیر کی اجازت سے اور جیسے تم نے لکھا ہے بالکل ایسا ہی کرو۔ تعویذ میں تیار کروں گا مگر اس کے لیے تم مجھے براہ راست خط لکھو تاکہ تفصیل سے جواب دیا جاسکے۔

□ حریم شاد۔ نکان صاحب

بلا بلی حریم! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور پناہ نگہ بہت پڑھا کرو۔ بلی! مجھے تمہارا مسئلہ حل ہوتا محسوس نہیں ہوتا۔ مناسب ہوگا مجھ سے تعویذ منگوالو۔ یہ یہ جوابی خط میں تحریر کیا جائے گا۔

بلا..... بلا

علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ! سب کو اپنی امان میں رکھے۔

بہتر اگر آپ اپنے وطن اور محلے کے مسائل اور دوسری جلدی بیماریوں سے پریشان ہیں؟

بہتر اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خود سے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

بہتر اگر آپ دانتوں کی گونا گوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔

بہتر اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود

ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجہ اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

110 آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ، بہار شاہ ظفر روڈ۔ کراچی



کوئی تو ہو!

بہارِ تازہ کا ہاتھ تھا
برستے بادل کی بارشوں میں
مہکتے آجمل کو سر پہ بوڑھے
اپنے ہونٹوں سے پھول نکالے
چشمِ صبح نویدِ پڑھ کے
کوئی تو آنکھوں کی سرزمین پر
سکھتی نکلیں کے موتی چن کے
جیات ہونٹوں کے مقبروں پر
گلاب رنگوں کے ہار ڈالے
کوئی شفق کے آداس دل سے
میری محبت کا نود سن کے
کوئی تو انا لپٹ کے روئے
کہ اب کہ ہم کو ہی ہر ڈالے
شاعر: ثار احمد حسرت، نور جہاں، لاہور

کیوں وفا کروں میں!

اسے نفرت ہے نہ دیکھوں تو کیا کروں میں
آخر کب تک عشق اس سے بے پناہ کروں میں
وہ محبت کے آئینے تھا اور نہ ہے
پھر کس لیے اس سے ملن کی دعا کروں میں
محبت میری اس کے کس امتحان سے نہ گزری
اب میرا حق ہے نفرت اس سے بے انتہا کروں میں
اپنے روٹھے خوشیاں چھوٹیں
بہتر ہے اب اس کو بھول جانا ارم
جب وہ بے وفا ہے پھر کیوں وفا کروں میں
شاعر: ارم خان۔ امیر و غازی خان

غزل

اسے میری وہ بچپن کی شرارت یاد آجائے
بھی کچھ بھول بھی جائے محبت یاد آجائے
اسے پوچھا اسے چاہا اسے مانگا بھی ہے ہم نے
میری بچی محبت کی عیادت یاد آجائے
کسی کے پیار کی خاطر یہ ہم نے دشمنی کی تھی
اسے میری زمانے کی بخات یاد آجائے
ہمیں وہ جان سے پیارا اسے معلوم ہی کب ہے
میری جہلی محبت کی عنایت یاد آجائے
ہمیں وہ پیار کرتی ہوں اسی پہ جان دیتی ہوں
فرقی اب اسے میری ملاوت یاد آجائے
شاعر: فریدہ فریوسف زئی، لاہور

آخر کیوں

آخر کیوں تم نے ہمیں اپنا بنا دیا تھا
آخر کیوں تم نے سنے دکھائے تھے
تسمیں کھائی تھیں
وہ وہ تو بتاتے جانا
تیرا یوں اچانک بدل جانا
آخر کیوں اچانک ہمیں چھوڑ دیا
ہمارے دل کو توڑ دیا
آخر کیوں!!

شاعر: ظفر اللہ زنگ۔ امیر و غازی خان

مان لو!

مان کہ تم بہت مجبور ہو!
مجھ سے بہت ڈور ہو!
کہ اب ساتھ تم میرا سے نہیں سکتے



اب جب بھی مجھ سے پوچھتا تھا
کہ مجھ سے محبت کتنی ہے تمہیں
اسے میں ہی لکھا کرتی تھی کہ
تمہارے سنگ کتنی خوش ہوں میں
میری زندگی کے بھی رنگ تمہارے نام سے ہیں
اس مجھے تم سے محبت بے حد دے رہا ہے
ابھی کچھ دن ہی تو گزرے تھے
اسے میں نے ہی لکھا تھا
مجھے تم سے محبت اب نہیں ہے

شاعرہ: سحرہ انور علی۔ جنگ صدر

کیا کچھ سیکھا تھا

زندگی میں میں نے کب ہار جانا سیکھا تھا
ہر جانے کو اپنا بیت جانا سیکھا تھا
کامیابیوں کو پس دور ہی سے دیکھا تھا
رک کر سنبھل جانا زندگی سے سیکھا تھا
درو نارسائی میں قہقہے نکھیرے ہیں
خونم آنکھوں سے مسکراتا سیکھا تھا
لوگ کیا سمجھ پاتے زیست کی حقیقت کو
خالی ہاتھ ہو کر میں بادشاہی سیکھا تھا
ہر سے شروع دنیا، بیت پہ قسم دنیا
دنیا درمیاں کی ہے مشکلوں سے سیکھا تھا

شاعرہ: خولہ عرفان۔ مقام نامعلوم

غزل

سوچتا ہوں کہ اسے نیند بھی آتی ہوگی
فقط میری طرح آنسو بہاتی ہوگی
وہ میری شکل میرا نام بھلانے والی
اپنی تصویر سے کیا آنکھ ملاتی ہوگی
اس زمیں پہ ہے سیلاب میرے آنکھوں سے
میرے ماتم کی صدا عرش ہلاتی ہوگی
شام ہوتے ہی وہ چوکٹ پہ جلا کے شمعیں
اپنی پکوں پہ کئی خواب سہلاتی ہوگی

اب پاس میرے تم رہ نہیں سکتے
کہ اب تم زمانے کے رسم و رواج سے لڑ نہیں سکتے
مان لیا کہ بہت سی مجبوریاں
تمہارے قدموں کی زنجیر بن گئی ہیں
سنو جاناں.....
جب دل بدل جائیں تب ہی یہ فرسودہ
مجبوریاں پیدا ہوتی ہیں
ساتھ چلنے والے کبھی بچاؤ میں چھوڑ نہیں کرتے
حالات جیسے بھی ہوں منہ موڑ نہیں کرتے
شو یہ سب بھانے اپنے پاس رکھو اور.....
مان لو
کہ تم بدل گئے ہو!

شاعرہ: ثانیہ ثانی۔ سیالکوٹ

اظہار دوستاں

مجھ سے احباب جب نہانے لے
سیکڑوں غم کے تازیانے لے
جیتا اے امیر شہر مجھے
کیا مرے نقل کے بھانے لے
دوستوں میں مجھے ہیں دشمن بھی
نصیحت کے تازیانے لے
دعوت بدلتا ہے آج کا انسان
ہر قدم پر یہ ہی فسلانے لے
لوگ، چھپ، چھپ کہ وار کرتے ہیں
بے خطا جب نہیں نکلنے لے
میرے شعروں میں خود فریبی نہیں
یہ پہن تم کو شاخسانے لے
شاعر: ادیب سچ چمن۔ حیدرآباد

اسے میں نے ہی لکھا تھا

اسے میں ہی لکھا کرتی تھی کہ میری جاں
میری چاہ تم ہو، میری زندگی کی سب
دعاؤں کا حاصل تم ہو
میرا ارمان تم ہو

میرے تاریک زمانوں سے نکلنے والی
روشنی تجھ کو میری یاد دلاتی ہوگی
شاعر: نذیر خان - کراچی

غزل

تیری جاہت میں ہے وفا کی ہے
ٹوٹنے کی جیسی وفا بھائی ہے
تجھ کو سوچا تھا میں بھادوں کا
پھر مگر یاد تیری آئی ہے
ٹوٹ ہی تو نکل مرا اثاثہ ہے
مری بھر کی مری کمان ہے
تجھ سے سیکھا ہے شاعری کا ہنر
تو غزل ہے، مری ربانی ہے
اپنے آنسو چھپا کے رکھے ہیں
کیوں کہ تو آج مسکرائی ہے
شاعر: ریحان آفاق - حیدرآباد

کاری

اپنے سپنوں اک رانی تھی وہ
خیالوں میں رہ بکادی تھی وہ
آسمان پہ اُڑن بھرتی تھی وہ
کلیوں پہلوؤں کی سہیلی تھی وہ
اس دن خوابوں سے اس کو دگایا گیا
زنجیروں کا زنجیر پہنا دیا گیا
خوابوں کے شہر سے اُسے نکالا گیا
وہ حیران تھی یہ کھل ہو گیا
اُسے پھینکا گیا سچ محل میں
دیت، رواج کی چھری تھی قاتل کے ہاتھ میں
اُسے بیٹا تھا مگر کے پل پل میں
سادری خوشیاں مر گئیں اس کے دل میں
آگے کھائی تھی پیچھے آگ جاتی تھی
محبت سے چپ کی زنجیر پہنائی تھی
بے بسی سے اپنے پیار کو وہ دیکھتی رہتی تھی
اس طرح اک لڑکی کا رزم کی جینٹ بڑھتی تھی
شاعر: نیکل منجو - کراچی

غزل

فرات عشق میں اترے، قبا اپنی اٹھاری ہے
فصلِ غمِ غرب کی جب، سحر تازہ بھاری ہے
تمہارے رخ سے پاتا ہے صبح دم روشنی سورج
تمہارے رخ کے جلووں نے مرنے سستی سنواری ہے
لفظ اک زندگانی تھی، سو کی قرباں تری خاطر
مری آنکھوں سے پوچھو تم، بڑی قیمت تمہاری ہے
بڑی دلکش پیار آئی، مگر بے سود آئی ہے
گستاخِ شبِ غم میں ہر اک ساعت گزاری ہے
قدمِ عمرِ محبت میں ذرا تم سوچ کر رکھنا
اگر یہ زندگی تجھ کو، اسے میرے یاد بھاری ہے
دکھا خورشید کو فاقی زرخِ محبوب کا جلوہ
کہ جس کے حسن نے صورتِ ہر اک گل کی سنواری ہے
شاعر: عمران قاضی - کابل پور موہی، اٹک

غزل

دیکھتے ہیں کدھر جاتے ہیں آنسو
نکسِ حد تک گزر جاتے ہیں آنسو
میتِ روک اچھلتی موجوں کو
نکلے سے مرجاتے ہیں آنسو
محبت دکھائی ہے انہیں آئینہ
رجوں سے پھر سنو جاتے ہیں آنسو
انہی ہے اک لہر آنکھوں میں
چپ چاپ سے اتر جاتے ہیں آنسو
ہر شام ملتا ہے اداسی کا رشتہ فرہاد
تجانی میں بکھر جاتے ہیں آنسو
شاعر: محمد راشد فرہاد - حیدرآباد

غزل

میری کھانسیں کو ستائی ہیں چوڑیاں
ساجن کو صبح و شام بدلتی ہیں چوڑیاں
گنتی ہیں زہر جب بھی چلا جائے اُنھ کے وہ
ہو سانسے تو پھر مجھے بھائی ہیں چوڑیاں
ٹوٹی ہوئی جو ہلتی ہیں کمرے میں ہر جگہ
شاعر: نیکل منجو - کراچی

دل درود کا مارا

دل اس طرح نہ درد کا مارا ہوتا
راہِ اقلت میں اگر وہ مارا ہوتا
ہم ملت آتے زندگی کی طرف
ٹوٹے مگر پیار سے ہم کو پکارا ہوتا
وہ دے دیتا ہاتھوں میں ہاتھ اگر
ہم نے اسے پھر روح میں اُتارا ہوتا
تھی یہی خواہش ہم بھی محبت کرتے
اور محبوب ہمیں جان سے پیارا ہوتا
جو ہو حکم محبت سے بجالاتا ہو
وہ ہی بچہ ماں کو بھی ہے پیارا ہوتا
راہِ اقلت میں جان بھی دے دیتی صبا
تیرے اہلو کا اگر ایک اشارہ ہوتا
شاعرہ: صبا چرال۔ منام، بحرین

آنا

اور تھا کہیں ٹوٹ نہ جائے
میں نے پھرتے وقت
اسی خیال سے
نند کا تجھے
یقین بھی تھا

کرا
میری پکار پر تم
لوٹ آؤ گے
لیکن!
کرتی کرتی ہو جاتی تھی
تمہاری آنا
اور تم اپنا پسند لوگوں میں
پھر کیا باقی رہ جانا تھا
کچھ بھی نہیں
کچھ بھی تو نہیں!

شاعرہ: عزیزہ نعیم۔ کراچی

اُس کی بہت سی یاد دلاتی ہیں چوڑیاں
جب گنگناؤں اُس کی محبت میں، میں بھی
سکھڑوں کی طرح ساتھ یہ گاتی ہیں چوڑیاں
تھی ہیں بھڑکی کی طرح اپنے ہاتھ میں
مجھ کو بھی کبھی تو اُراتی ہیں چوڑیاں
تھی جب وہ مجھ سے تھا ہو بھی تو پھر
اُس کو بہت ادا سے مٹاتی ہیں چوڑیاں
شاعرہ: تمیلہ لطیف۔ جوہاں، سیالکوٹ

غزل

مر پھر خود کو جدا رکھوں گی
دل کا دوازہ کھلا رکھوں گی
ٹو بھی بننے سے لگتا مجھ کو
میں بھی بننے سے لگا رکھوں گی
میں نے سوچا ہے کہ دل سے اپنے
کب تک اس کو جدا رکھوں گی
جب وہ آئے گا میری گلیں میں
سب درود ہام سما رکھوں گی
میں شام غزل ایک دیا
شب کی آغوش میں جا رکھوں گی
شاعرہ: غزالہ جلیل داؤد۔ لوکارہ

محبت راس نہ آئی

مگر مگر کی خاک اُڑائی ہمیں محبت راس نہ آئی
قدم قدم پر ٹھوکر کھائی ہمیں محبت راس نہ آئی
سارا زمانہ جب سوتا ہے چپکے چپکے دل دوتا ہے
جس گنوا یا نیند گنوائی ہمیں محبت راس نہ آئی
دل دیتا ہے صدائیں تھک کو دھونڈ رہی ہیں آنکھیں تھک کو
اپنا مقدر تیری جدائی ہمیں محبت راس نہ آئی
چندا کو میں تاک رہا ہوں رات کے سہرا جاگ رہا ہوں
یاد سے تیری اور تنہائی ہمیں محبت راس نہ آئی
خواب جگر سے لیا ہلا کے چٹا پڑا مجھے ساتھ ہوا کے
مشق میں تیرے مگر گنوائی ہمیں محبت راس نہ آئی
شاعر: حکیم خان حکیم۔ کمال پور موسیٰ، حضرو، اٹک

اس مادہ کی خاص کہانی

فیضِ عشق

امجد جاوید

عشق کے متوالوں کے لیے عشق میں ڈوبی ایک خاص اٹھاس کہانی

تھا۔ وہ اپنی پوری زندگی میں حویلی کی این او پی او پی دیا رہا۔ اس کے پاس کتنے چاند بار ہی جاسکتی تھی۔ یہ آزادی اسے بچپن اور نوجوانی کے درمیانی دور ہی میں بھی ملی تھی۔ جس کی یاریں بہت دھندلی ہی تھیں۔ پھر جیسے ہی اس نے جوانی کی دلیلیز پر قدم رکھا تھا، روایت کی من و مسمیٰ ذخیروں سے اسے پوپا باندھ دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر پاتی تھی۔ اس کے ارد گرد ہزار یوں تن گیا کہ باہر کی خوشگوار فضا بھی اس کے کمرے میں آنے سے گھبراتی تھی۔ وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی حویلی کی دیواروں کے درمیان چند مخصوص جگہیں تھیں، جہاں وہ آ جاسکتی تھی۔ مردان خانے کی طرف تو وہ رش بھی نہیں کر سکتی تھی۔ زنان خانہ، جو ٹھکانے کے کمرے، دالانوں اور پائین باغ پر مشتمل تھا۔ یا پھر اوپری منزل پر وہ جو چند کمرے۔ جن کی چھت پر جانے کی قطعاً اجازت نہیں تھی کہ جہاں تک جا کر وہ کھلے آسمان کو محسوس کر سکتی۔ ان ساری جگہوں پر حویلی کی دوسری خواتین بھی ہوتی تھیں، مگر اس کی جانے پناہ تو محض ایک کمرہ تھا، اوپری منزل پر جو بھی اس کے والدین کا ہوا کرتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت اپنے تن کمرے میں گزرتا یا پھر کمرے کی وہ واحد کھڑکی جہاں سے کچھ منظر اسے

قسط نمبر ۱

حویلی میں سناٹا معمول سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ فضا میں وہی خوف سے بھری ہوئی فرماں برداری کا تاثر کھلا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ حویلی بھی روایت میں جکڑی ہوئی لڑ رہی ہے کہ اگر یہ خاموشی ٹوٹ گئی تو نجانے کون سا طوفان آجائے گا۔ خاموشی دم سارے ہوئے تھی۔ حویلی کے صاف ستھرے در و پام یہ خاموشی خوف سے یوں چپلی ہوئی تھی جیسے سانس لیا بھی سکے گی تو مہربانی کی۔ انہی جیسے زد و کھات میں ناخوشی بہت کچھ محسوس کر رہی تھی۔ ہر آئی جانی سانس میں غزولہاں منجمد میوں اور اسیوں کی خراشیں اسے بے چین کیے دے رہی تھیں۔ یہ ایسے ہی کمرے کھات ہو کر رہتے تھے کہ جب زندگی بارے نہ چاہتے ہوئے بھی جمع تفریق کرنے لگتی۔ کیا کھویا، کیا پایا کا حساب تو چلتا ہی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ لاشعوری طور پر حویلی کے اندر موجود دنیا اور حویلی سے باہر کی دنیا کے بارے میں تجزیہ کرنے لگتی۔ جو اس سے کبھی ہوئی نہیں۔ کا تھا۔ تجزیہ یا موازنہ تو اسی وقت ہو پاتا ہے نا جب ان ساری چیزوں کے بارے میں اچھی طرح معلوم ہو جن کا تجزیہ یا موازنہ کیا جانا ہو۔ اسے تو باہر کی دنیا کے بارے میں تجزیہ ہی نہیں



رہا تھا۔ شاید یہ تعمیر رک جاتی اگر اسے ان سوالوں کا جواب کہیں سے مل جاتا۔ اس لمحے ہوئے دن میں وہ خود برقا بولائے ہوئے اپنے کمرے کی انگوٹھی کھڑکی سے لگی کھڑکی تھی اور مسلسل یہی سوچے چلی جا رہی تھی کہ یہ دن کیسے گزرے گا۔ یہ اتنا طویل کیوں ہو گیا ہے؟

نادی کے کمرے سے باہر کے سارے منظر۔ پہر کی ڈھلتی ہوئی دھوپ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ حویلی سے پار اونچی دیوار سے کافی حد تک ہٹ کر کھیت تھے۔ ان سے کچھ آگے کافی فاصلے پر بستی تھی جس کے کچے کچے گھروں کی چھتیں ہی وہ دیکھ سکتی تھی۔ نیلا آسمان، ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے اور درخت ہی اسے دکھائی دیتے۔ بعض درخت تو اس کے ساتھ ساتھ بڑھ کر تاردار ہو گئے تھے اور کئی سوکھ کر ختم ہو گئے تھے۔ وہ ان مناظر کو اس قدر دیکھ چکی تھی کہ ان میں کوئی نیا بین محسوس ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہاں اگر کوئی چھری ہوا کرتی تھی تو یہ کہ کھیتوں میں فصلیں بدل جایا کرتی تھیں۔ آگے، کتنی فصلوں کو دیکھتی رہ جاتی یا پھر طلوع آفتاب کا منظر، جو کبھی ایک جیسا نہیں ہوتا تھا۔ ہر روز سورج ایک نئے منظر کے ساتھ آتا تھا۔ یہ اس نے تجربہ کر لیا تھا مگر یہاں تک نہیں ضرور تھی کہ کیا سورج غروب بھی ایک نئے منظر کے ساتھ ہوتا ہے؟ کیونکہ وہ ڈوبتے ہوئے سورج کو اپنی کھڑکی سے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ وہ باہر کی دنیا اس کھڑکی سے دیکھ سکتی تھی یا پھر والی اماں سے ہونے والی گفتگو میں، جس میں ہمیشہ خوف ہی ہوتا۔ ذرا دینے والی نصیحتیں ہوتی تھیں۔ اسے تو لفظوں سے دیکھے جانے والی دنیا ہی پیاری لگتی تھی۔ لفظ اسے خود میں جذب کر لیتے، ایک ہی منظر کو وہ خود ہی کئی بار دیکھ لیتی جو لفظوں سے بنائے گئے ہوتے تھے۔ کتابوں اور رسالوں کے جملہ رکوں سے وہ ایک نیا جہاں دریافت کر چکی تھی۔ جو کچھ ان کتابوں اور رسالوں میں سے دنیا اسے کچھ میں آئی، وہ اس کے لیے کسی بھی دیگر لینڈ یا گم گشتہ جنت سے کم نہیں ہوتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کا ذہن حویلی کی روایت بھری زندگی کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے انہی طرح معلوم تھا کہ وہ مجبور محض ہے، ابھی وقت اس کے ہاتھوں میں نہیں تھا۔

"اے نادی!"

دکھائی دیتا تھا۔ اس دن بھی اس کے اندر جیس بہت بڑھ گیا تھا۔ شاید اس کی آنکھوں میں سادوں بھاؤں اتر آیا، مگر ایسے موسم کو خود اس نے آپ روکا ہوا تھا۔ وہ نادی کی سالگرہ کا دن تھا۔ ہر برس وہ خود اپنی سالگرہ کا اہتمام خود ہی بڑے چاؤ سے کیا کرتی تھی، لیکن اس بار تو نادی نے خود ہی دلچسپی نہیں لی تھی، کیونکہ اس بار اس کے اندر ان باغیانہ خیالات نے سر اٹھالیا تھا، جس سے وہ کبھی بھی خود ڈر جایا کرتی تھی۔ اس دن سے ہی نہیں پچھلے کئی دنوں سے وہ انہی باغیانہ خیالات سے لڑتی چلی آ رہی تھی۔ اسے یہ ابھی طرح معلوم تھا کہ اگر اس نے اپنے ان خیالات کا اظہار کر دیا تو وہ ہار جائے گی۔ یہ اس کا اپنا آپ بھی ہو سکتا ہے یا زندگی کی بازی ہو سکتی ہے۔ روایت کی ان دھمکی زنجیروں میں مزید اضافہ بھی ممکن تھا۔ سو وہ اپنے آپ کو یہی دلیلیں دے کر مطمئن کرتی رہی کہ وہ کھوں تو سمجھا کہ حویلی کے دوسرے کیمین اس کی سالگرہ کا دن یاد بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟ اس حویلی میں اس کی اہمیت کس قدر ہے؟ یہ تقریب بھی کیا ہوا کرتی تھی، محض گفتی کے چند لوگ، کیونکہ حویلی کی روایات میں سالگرہ جیسی تقریب منانا کبھی شامل ہی نہیں تھا۔ یہ تو اس کے مرحوم والدین نے ایک بار اس کی سالگرہ منائی تھی۔ ممکن ہے اپنی خوشی کی خاطر یا پھر خدا جانے کیوں؟ وہ بھی حویلی کے محدود افراد کے ساتھ ہار وہ تو شدہ ہے، اس کی نادی ہر برس اس کی سالگرہ مناتی رہی۔ لیکن اس وقت جب اسے شعور نہیں تھا اور شعوری طور پر وہ اپنی نادی اماں کے باعث ہی سالگرہ مناتی آئی تھی۔ اپنی ہی اجازت بھی اسے کیوں کر مل گئی؟ اس کی سمجھ میں تو یہی ہوا آئی تھی کہ وہ بن ماں باپ کے ان کے ساتھ پرورش پا رہی تھی۔ اس کی نادی ہی اس کا سب کچھ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے باغیانہ خیالات کا اظہار نہیں کر پا رہی تھی کہ اس کے سامنے اپنی نادی کا مستحضر چہرہ تھا۔ اس سے تو کسی نے نہیں پوچھا تھا مگر جو اب وہ تو اس کی نادی اماں تھی۔ اس کے ذہن میں بے شمار سوال تھے۔ جو اس کی باقی سوچوں کی بنیاد بن گئے ہوئے تھے۔ دیر دیر سے دیر سے ان پر شکوک و شبہات سے مزین الجھنوں کا مکمل تعمیر ہوتا چلا جا

نادی نے ایک جذب سے کہا تو فرح پلٹ گئی، پھر رک کر جاتے جاتے وہ بہتی چلی گئی۔
 "میں نے بابا سائیں سے بھی عرض کر دیا تھا۔ وہ بھی آنے والے ہوں گے۔ جلدی سے آجا۔"
 "آ جاتی ہوں۔"

نادی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی، پھر اچانک ہی اس نے فیصلہ کر لیا۔ وہ تو نہیں جانتی تھی کہ اس بار اپنے خیالات اور سوچوں کا اظہار کرے، مگر قدرت شاید ایسا چاہتی ہے، ورنہ اگر اس نے اہتمام نہیں کیا تھا تو فرح یوں نہ کرتی۔ اب تو چاہے بھونچال آ جائے یا طوفان، وہ اپنا مطالبہ ضرور کہے گی۔ یہ جوتہ چاہتے ہوئے بھی اہتمام ہو گیا ہے تو یہ اشارہ ہے، تا کہ وہ اپنے دل کی بات کہہ دے۔ فیصلہ کرتے ہی وہ کھڑکی سے پلٹ گئی، کیونکہ اسے تیار ہو کر پیر سائیں کے آنے سے پہلے پہنچنا تھا۔

پورے برس کے دورانے میں نادی کے لیے مختص بنی ایک چھوٹی سے تقریب ہوا کرتی تھی، جس میں اس کے چاچا دادا و شاہ المعروف پیر سائیں خصوصی طور پر شرکت کیا کرتے تھے، ورنہ تو کئی مہینے گزر جاتے اور وہ ان کی صورت نہیں دیکھ پاتی تھی۔ نادی کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جو اپنی ان روایات پر سختی سے پابند تھا جو انہیں اپنے برکھوں سے ورثے میں ملی تھیں۔ یہ روایات کچھ ایسی تھیں کہ جن کے باعث حویلی کی خواتین نہ تو اپنی کوئی حیثیت رکھتی تھیں اور نہ انہیں کسی قسم کا کوئی اختیار تھا۔ حویلی کی چار دیواری کے حصار میں ہی وہ باہر جاتی تھیں۔ پردہ داری کی اس قدر پابندی تھی کہ سورج کی کرنیں بھی انہیں نہ دیکھ سکیں۔ وہ اگر سائیں بھی لیتی تھیں تو گھرانے کے اس سربراہ کی اجازت سے جو ایک روحانی پیشوا ہوتا تھا۔ وہ دربار شریف کا گدی نشین ہونے کے باعث تمام تر فیصلوں کا مجاز تھا۔ وہ فیصلے حویلی کے ہوں، دربار شریف کے ہوں یا کسی کی زندگی موت کے سارے معاملات کا محور بھی پیر سائیں ہی ہوتے تھے۔ مریدین کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ جن سے وہ ہمیشہ رابطے میں رہتے تھے۔ کون ان کے پاس آ رہا ہے تو کسی کے پاس یہ جا رہے ہیں۔ ایک نیٹ ورک تھا جیسے وہ بخوبی چلا رہے

فرح کی آواز پر وہ بے ساختہ چونک گئی، پھر اس کے چہرے پر حیرت دیکھتے ہوئے بولی
 "ہاں، کیا بات ہے؟"
 وہ اس قدر اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ فرح کے آنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا۔

"لو! مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ جیسے خود ثواب زادی کو پتا ہی نہ ہو۔" فرح نے حیرت سے پوچھا، پھر اس کی طرف دیکھ کر حیرت ناک انداز میں بولی۔
 "ہائے! تم ابھی تیار بھی نہیں ہو؟" تب وہ اس کے سوال پر خیالوں نے نکلے ہوئے چونک گئی، پھر جیسے ہی فرح کے پوچھے گئے سوال پر غور کیا تو وہ خوشگوار حیرت میں ڈوب گئی۔ اس لیے نہ سمجھتے والے انداز میں پوچھا۔
 "کیوں، میں نے کیوں تیار ہونا تھا؟"

"ارے واہ! کیا شان بے نیازی ہے، حور شکیل کو، جیسے معلوم ہی نہیں کہ آج تمہاری سالگرہ کا دن ہے۔ تم چاہے بھول جاؤ، مگر میں نے سارا اہتمام کر لیا ہے۔"

وہ یوں چپکتے ہوئے بولی جیسے یہ اہتمام اس نے اپنے لیے کیا ہو۔ تب اس نے حیرانگی سے پوچھا
 "تم، فرح تمہیں میری سالگرہ کا دن یاد تھا؟"
 "آپنی طرح یاد تھا، بلکہ میں تو دعائیں مانگ رہی تھی کہ تمہیں اپنی سالگرہ کا دن یاد نہ آ جائے، اس لیے میں نے چپکے چپکے سارا اہتمام کر لیا؟"

دو خوشی سے ہنستے ہوئے بولی تو نادی نے اس کا مان رکھتے ہوئے جھوٹ بول دیا
 "ہاں! مجھے یاد نہیں تھا۔"

"ہاں نادی! یہی تو ایک دن ہوتا ہے، جس میں ہماری اپنی خوشی ہوتی ہے۔ مجھے تو خیر اجازت نہیں، تمہاری وجہ ہی سے میں خوش ہو لیتی ہوں۔"
 "فرح کہتے کہتے ایک دم سے اداس ہو گئی پھر تیزی سے اپنا سر جھٹک کر بولی۔ "بس تم جلدی سے تیار ہو جاؤ، امی اور دادی اماں دونوں ہی تمہارا نیچے انتظار کر رہی ہیں۔ جلدی سے تیار ہو کر نیچے آ جا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا دی۔ فرح کی دھوپ چھاؤں جیسی کیفیت دیکھ کر اس کے من میں خوشی در آئی۔
 "تم چلو، میں ابھی آتی ہوں۔"

انتظام کر دیا گیا، جو انہی کے مریدین میں سے ایک تھی۔ اس نے نہایت سعادت مندی سے اور ثواب سمجھتے ہوئے، ان دونوں کو پڑھایا۔ یوں فرح اور نادی نے حویلی کی ہی چار دیواری میں میٹرک تک تعلیم حاصل کر لی۔ پھر سائیں اپنی طاقت اور تعلقات رکھتا تھا کہ بورڈ کے پرچے حویلی ہی میں مل کر لیے گئے تھے۔ ایک پورا گاؤں پیر سائیں کی جاگیر تھا۔ نادی نے جتنی دیکھی تھی وہی کورس کی کتابیں پڑھی تھیں، اتنی ہی پسندیدگی سے دیگر کتابیں اور رسالے بھی پڑھے تھے۔ جن کے پڑھتے رہنے سے اب اسے "ہوکا" لگ چکا تھا۔ اس نے حویلی ہی میں موجود ایک خاتون ملازمہ تاجاں مائی کے ذریعے ایسا راستہ پیدا کر لیا تھا کہ جہاں سے وہ باہر کی دنیا سے جو چاہتی منگوا لیا کرتی تھی۔ اس کی اس جرأت کا علم اس کی نادی کو تھا جسے وہ نظر انداز کرتی چلی آ رہی تھی۔ حویلی کی ان چاروں خواتین کی اپنی اپنی دنیا تھی۔ جس میں وہ سمجھوتے کے ساتھ زندگی گزارتی چلی جا رہی تھیں۔ کوئی کسی کے معاملے میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔

☆.....☆

مردان خانے کے صحن میں چند مرد اور خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے چہروں پر عقیدت کے چراغ روشن تھے۔ وہ سب پیر سائیں سے دعا کروانے آئے ہوئے تھے۔ کسی کی کچھ حاجت تھی، کسی کی کوئی خواہش۔ کسی کی کوئی مجبوری اس در تک پہنچ گئی تھی اور کوئی اپنے حالات بھر جانے کی تمنا لے کر وہاں آیا ہوا تھا۔ صحن کے آگے بڑا سارا داران تھا۔ جہاں وہ مریدین خاص موجود تھے جو آئے ہوئے عقیدت مندوں کو ایک ایک کر کے اس کمرے میں بھیج رہے تھے، جس میں پیر سائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ مردان خانے میں اگرچہ بہت سارے کمرے تھے۔ جہاں دور سے آئے مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ باقاعدہ ایک طعام خانہ بھی تھا، جہاں ہر وقت لنگر چلتا رہتا تھا۔ لیکن پیر سائیں کا کمرہ ان سب میں خاص کمرہ تھا۔ اس میں کسی کو اجازت کے بغیر داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ پیر سائیں جب بھی باہر سے مردان خانے میں آتے تو وہیں ٹھہرتے اور پھر وہیں سے چلے جاتے تھے۔ یہ ان کی مرضی پر منحصر ہوتا تھا کہ وہ وہاں کتنی

تھے۔ نادی کے دادا کے بعد اس کے باپ نے گدی نشین ہونا تھا۔ مگر ایک دن قریبی شہر سے واپس آتے ہوئے وہ اپنی بیوی سمیت کار حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔ نادی کے ذہن میں ہمیشہ یہ سوال رہا تھا کہ اس کی والدہ کس کی اجازت سے اور کیوں اس کے باپ کے ساتھ حویلی سے باہر تھی کہ حادثے کا شکار ہو گئی۔ آج تک وہ یہی معاملہ نہیں کر پائی تھی۔ سوال تو ڈیڑھروں تھے، جیسے ایک یہ سوال کہ حویلی کی خواتین کبھی جب چاہے دربار شریف پر حاضری کے لیے چلی جایا کرتی تھیں، پھر انہیں روک کیوں دیا گیا؟ یہ واحد آزادی بھی ان سے کیوں چھین لی گئی تھی؟ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ کیا تھی؟ اسے آج تک سمجھ نہیں آیا تھا اور نہ ہی معلوم ہو سکا تھا۔ شاید وہ بھی زندہ نہ رہتی اگر وہ کار حادثے والے دن اپنی والدی اماں کے پاس نہ ہوتی، ورنہ وہ بھی اپنے والدین کے ساتھ زندگی بار جاتی۔ کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ وہ بھی انہی کے ساتھ اس دنیا سے چلی جاتی۔ ایسے وقت میں کہ جب اسے کسی شے کا بھی شعور نہیں تھا۔ قدرت کو اس کی زندگی منظور تھی۔ نادی اماں نے اسے سنبھالا اور جہاں تک ہو سکا اسے لاڈ پیار سے پالا۔ دادا کے بعد جب اس کے چاچا دادا اور شاہ گدی نشین ہوئے تو ان کی بیوی زہرا بیگم پر پابندیاں کچھ زیادہ ہی ہو گئیں۔ حالانکہ اس وقت وہ ایک بیٹے ظہیر شاہ اور بیٹی فرح کی ماں تھی۔ یوں وہ چاروں خواتین حویلی کی چار دیواری تک محدود تھیں۔ وہ ایک دوسری کے بارے میں نہیں جانتے بوجھتے ہوئے بھی خوش تھیں، کیونکہ اسی میں ان کی بچاؤ اور اسی میں ہی ان کی پناہ تھی۔

ظہیر شاہ کی تربیت پیر سائیں اپنی نگرانی میں کر رہا تھا۔ اسے خوب تعلیم دلوائی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اسے پڑھنے کے لیے لندن بھیج دیا گیا تھا، مگر نادی اور فرح کی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دی گئی، یہ تو نادی جب ذرا باشعور ہوئی تو اس نے اپنی نادی سے مطالبہ کر دیا کہ اسے بھی ظہیر شاہ کی مانند تعلیم دلوائی جائے۔ نادی اماں کے لیے یہ مطالبہ کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔ وہ اسے باقاعدہ کسی ادارے میں پڑھنے کے لیے تو نہ بھیجا سکی لیکن بہت ساری بحث و محبت کے بعد حویلی ہی میں ایک خاتون نیچر کا

تک کہ مردان خانے کے گھن میں کوئی عقیدت مند نہیں رہا۔ جب پھر سائیں اپنے خاص کمرے سے نکلے اور مردان خانے کے گھن میں آگئے۔ تازہ ہوا میں تھوڑی دیر سانس لینے کے بعد وہ زنان خانے کی طرف چل دیے۔

☆.....☆

نادی تیار ہو کر نیچے آئی تو رادی اماں، زہرہ بی اور فرح کو اپنا مختصر پایا۔ وہی اس تقریب کے منتظم تھے اور وہی مہمان تھے اور کسی نے وہاں نہیں آتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں ایک جانب بڑا ڈرائنگ ٹیبل الوداع و اقسام کے کھانوں سے سجایا گیا ہوا تھا۔ کمرے کے درمیان میں بڑے صوفوں پر چھٹی قانون کے نیچے میز پر بڑا سا ایک دھرا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی اپنی والدی اماں کے پاس آٹھنٹھی۔ چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔ گہرے نیلے رنگ کا سوٹ اور بڑی ساری سفید چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ وہ بھی خاموش تھیں۔ اب فقط پھر سائیں کا انتظار تھا جو مردان خانے سے آنے والے ہی تھے۔ اس دوران نادی اپنے مطالبے کا اظہار کرنے کے لیے ہمتیں جمع کرتی رہی۔ اسے معلوم تھا کہ ہمیشہ کی طرح کیک کاٹنے سے پہلے پھر سائیں اس سے اسی کی پسند کے کسی حقے کے بارے میں پوچھیں گے اور وہ ان سے ہمیشہ دعاؤں کی ہی طلب گار رہی تھی مگر اس بار وہ کچھ اور ہی چاہ رہی تھی پہلے تو اسے دعاؤں کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی قیمتی تحفہ مل جانا تھا لیکن اس بار اسے کسی بھی قسم کے تحفے کی امید نہیں تھی۔ اسے یہ احساس بھی تھا۔ اس کا مطالبہ ہی کچھ ایسا تھا کہ جسے کہنے کے بعد ممکن ہے آئندہ کبھی اسے ساگرہ منانے کی اجازت ہی نہ ملے۔

مغرب سے ذرا پہلے پھر سائیں حویلی میں آگئے۔ سلام دعا کے بعد وہ آکر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ وہ چاروں اور گرد بیٹھ گئیں۔ وہ کچھ دیر تک حال احوال پوچھتے رہے، پونجی لادھر ادھر کی باتیں چلتی رہیں، تب انہوں نے کیک کی طرف دیکھا اور نادی سے پوچھا۔

”نادیہ بیٹی! تھوڑا کیا تحفہ پسند کر دو گی۔“ یہ سنتے ہی نادی چند لمحوں کے لیے تو پوری جان سے لرز گئی۔ وہ کچھ آگیا تھا جس کے لیے وہ اپنے اُمید کی ساری ہمتیں جمع کر رہی تھی۔ اس کا وہاں خون ایک دم سے تیز ہو گیا۔

دیر تک قیام کرتے ہیں، ہاں مگر ظہر سے عصر تک کے درمیانی وقت میں وہ وہاں پر ضرور ہوتے تھے۔ جب وہ شہر میں نہ ہوں تب مجبوری ہوا کرتی تھی۔ اس کمرے خاص میں پھر سائیں موجود تھے۔ دھیمی روشنی میں بیٹھا دل اور شاہ کوئی مادرائی مخلوق لگ رہا تھا۔ اس کا دراز قد، بھاری جیش، سفید رنگ کا مخصوص کرتا اور چادر، سر پر تہیاری رنگ کی بڑی سی پگڑی، گلے میں قیمتی موتیوں کی مالا، گھٹنی واڑھی، بھاری موچیں، لمبی زنجیریں اور دائیں کلائی میں سونے کا کڑا تھا۔ گورے رنگ پر نقوش کافی حد تک چمکے تھے۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں شرقی سرخی خمار آلود دکھائی دیتی تھی۔ چند لمبے پہلے ایک خاتون اپنے دکنے سے روکر اور دعا کی درخواست کر کے گئی تھی۔ پھر سائیں نے نہ صرف دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے، بلکہ تعویذ بھی پڑھے تھے۔ دلہن اس کی لگاؤ سامنے گئے وال کلاک پر پڑی، بھی اس نے پاس بڑی ہوئی گھٹنی بجا لی۔ ایک مرید خاص، پیراں دتہ نورانی کسی چھلاوے کی طرح حاضر ہو گیا۔ وہ تقریباً چمکے ہوئے بڑی عاجزی سے بولا۔

”جی حکم پھر سائیں۔“

”ہاں کتنے لوگ ہیں؟“ پھر سائیں نے دھیمے سے ہارمب لہجے میں پوچھا۔

”تھوڑے سے ہیں سرکار۔“ پیراں دتہ نے عاجزی سے بتایا۔

”انہیں جلدی جلدی سے بھیج دو تاج مجھے زنان خانے جانا ہے۔“ اس نے کہا اور آنکھیں موند لیں۔

”سرکار وہ دیوانہ جی بھی آپ سے ملنا چاہتے تھے۔ کہہ گئے ہیں کہ اگر آپ اجازت دیں تو وہ آجائیں۔“ وہ اسی عاجزی سے بولا تو پھر سائیں نے تیزی سے کہا۔

”نہیں، انہیں کہنا کہ مغرب کے بعد آجائیں۔ اب جاؤ، جلدی جلدی لوگوں کو بھیج۔“

پیراں دتہ یہ سنتے ہی انہی ہیروں پر واپس مڑ گیا۔ اس نے باہر آکر لوگوں کو سمجھایا کہ وہ بہت کم وقت لیں۔ پھر سائیں نے کسی ضروری کام سے جانا ہے۔ پھر زیادہ وقت نہیں گزرا، ایک کے بعد ایک کر کے لوگ اُمید جاتے اور پھر نورانی واپس پلٹ آتے۔ یہاں

واقف پیر سائیں نے وقت اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر لیا تھا، اس لیے بڑے اطمینان سے بولا۔

"ابھی تم یہ اپنی ساگرہ کا کیک کاٹو، چند دن بعد سوچ کو نہیں بتاتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔"

"میں انتظار کروں گی پیر سائیں۔" اس نے دل پر جبر کرتے ہوئے مودہانہ انداز میں کہا، پھر کیک کاٹنے کے بعد انہوں نے کیک چکھاما سے دعائیں دیں اور کھانا کھائے بغیر اٹھتے ہوئے بولے۔

"اس بار میں دس تولے سونے کا زیور تمہیں تحفے میں دیتا ہوں۔ زہرہ بی! تمہیں وہ زیور دیے دے گی۔" انہوں نے کہا اور اٹھ کر جانے لگے تو نادیا نے جلدی سے کہا۔

"آپ مجھے پڑھنے کی اجازت دے دیں، آپ کا یہی تحفہ میرے لیے بہت ہی قیمتی ہوگا۔"

پیر سائیں نے اس کی بات محل اور خاموشی سے سنی اور کچھ کہے بغیر چلے گئے۔ تب نادیا اماں نے اس کی جانب دیکھ کر انتہائی حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ تم نے کس امتحان میں ڈال دیا ہے نادیا۔ یہ تو مجھے یقین سے کہہ دیجئے کہ کسی کالج میں جانے کی اجازت نہیں دے گا، مگر تمہاری اس خواہش کے رد عمل میں ہوگا کیا، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھ سے تو بس یہی سوال ہوگا کہ تمہارے انداز میں خواہش پیدا کیسے ہوئی۔"

"انہوں نے اگر انکار کرنا ہوتا تا تو ابھی کر دیتے۔ انہوں نے کچھ سوچ کر ہی....." نادیا نے کہا چاہا، مگر نادیا اماں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اسی خاموشی ہی سے تو مجھے خوف آ رہا ہے۔ وہ کہیں کوئی ایسا فیصلہ نہ کر دے، جس سے تم ساری عمر بچھتا رہو۔" اس کا لہجہ بھگ چکا تھا، جیسے وہ ابھی رو رہی گی۔

"ایسا کیا ہو سکتا ہے۔" اس نے حیرت سے پوچھا "یہ تو میں نہیں جانتی، لیکن یہ ممکن ہے کہ اب تمہاری شادی بہت جلد کر دی جائے۔" انہوں نے کہا۔

"میری شادی ماتی جلدی" اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

"دو ظہیر شاہ سے تمہاری شادی بھی کر سکتا ہے۔ یہ مت بھولو کہ وہ لندن سے چند دنوں کے لیے یہاں آ بھی سکتا ہے۔" نادیا نے یوں کہا جیسے اسے دکھ محسوس ہو رہا ہو۔

"بتاؤ بیٹی! بولو کیا کہہ رہے ہیں شاہ جی؟" زہرہ بی نے دھیمے سے لہجے میں کہا تو نادیا چند لمحوں تک خاموش رہی، پھر پوری جان سے حوصلہ کرتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"پیر سائیں! مجھے کالج میں پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ آپ کا یہ تحفہ میرے لیے اب تک کے تمام تحفوں سے بھاری اور قیمتی ہوگا۔"

اس کا یہ کہنا تھا کہ اچانک گہرا سناٹا چھا گیا۔ یہاں تک کہ سائیں بھی گم ہوئی ہوئی محسوس ہوئیں۔ نادیا اماں سمیت سبکی نے اس کی جانب یوں حیرت سے دیکھا جیسے سب کو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو گیا ہو۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا مطالبہ کر دے گی۔ پیر سائیں نے چونک کر حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ان کے دیکھنے میں انتہائی درجے کی بے یقینی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک ایسے یوں ٹکتے رہے جیسے انہوں نے کوئی کالا ہوا اور اس کے درمیان سے موتی غائب ہو گئے ہوں۔ ابھی پیر سائیں نے خود پر قابو پایا اور خلاف توقع انتہائی نرم لہجے میں گویا ہوا۔

"تم جانتی ہو نادیا بیٹی! تم نے کیا کہا ہے؟ حویلی کی روایات میں ایسا بھی نہیں ہوا کہ یہاں کی خواتین ہا ہر قدم نکال کر اسکول، کالج یا کسی ادارے میں جا کر پڑھتی پھریں۔"

"پیر سائیں! میری یہ خواہش ایسی نہیں ہے کہ جس سے حویلی کی شان میں خدا نخواستہ کمی ہو جائے گی۔" نادیا نے جی کڑا کر کہا دیا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر وہ یہاں کمزور پڑ گئی تو پھر ساری زندگی وہ اپنی کوئی بات نہیں منوا پائے گی۔ پیر سائیں خاموش تھیں۔ وہ ایک جہاں دیدہ اور تجربے کا شخص تھا۔ اس نے نادیا کے مطالبے میں موجود بغاوت کی ہلکی سی روش محسوس کر لی تھی۔ وہ ایک روحانی شخصیت ہی نہیں تھا بلکہ دربار شریف سے ملحقہ زمینوں اور جاگیر کے باعث زمینداروں میں بھی ایک خاص حیثیت رکھتا تھا۔ دوسرے زمینداروں کی مانند سیاست میں دلچسپی لینا ان کی تہذیبی تھا۔ میرٹھ پن اور زائرین کی نفسیات سے

”کیا وہ میری شادی ظہیر سے کرویں گے۔“ نادری کے لیے یہ ایک کشاف حیرت زدہ کر دینے والا تھا۔

”ہاں۔! اس کا بھی خیال ہے، لہذا وہ اس معاملے پر مجھ سے بات بھی کر چکا ہے۔ پہلے تو یہی طے تھا کہ جیسے ہی ظہیر شاہ اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آئے گا۔ تمہاری شادی اس سے کر دی جائے گی۔ لیکن اب.....“ نادری نے جتنی انداز میں کہا تو وہ ایک دم سے خاموش ہو گئی۔

ظہیر شاہ سے شادی کا مطلب تھا کہ باقی زندگی جو بچی کی انجی اونچی اونچی دیواروں میں دفن ہو جائے گی۔ وہ بھی سوچا کرتی تھی کہ شاید ایسے ہی کسی تعلق کے باعث اس کی رہائی ممکن ہو جائے گی، لیکن نہیں یہ اس کا وہم تھا۔ پھر سائیں تو اس کے بارے میں کوئی اور ہی فیصلہ کر چکے تھے۔ نہ ہرہ بی اور نہ فرج تو پہلے ہی مہر بلب نہیں۔ ان کی تو یہ بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان کی کسی بات پر کوئی تبصرہ ہی کر دیتیں۔ تبھی نادری نے عجیب سے لہجے میں ایک دم سے کہا۔

”اوکے۔! میں ان کے فیصلے کا انتظار کروں گی، مگر الحالہ تو اس وقت کو اٹھائے کریں۔ لیں یہ ٹیکہ کھائیں۔“ اس نے ہلکا پوڑ کیا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو، لیکن وہ جتنی دیر بھی ان کے درمیان رہی، بہت ہی بد دل اور بے چین رہی، مگر کسی نے بھی اس موضوع پر بات نہیں کی۔ یہاں تک کہ وہ جلد ہی اپنے کمرے میں آ گئی۔

شادی کے لفظ کے ساتھ جو رہنمائی تاثرات بندھے ہوتے ہیں۔ اس سے ہر لڑکی کے من میں ہلچل ضرور ہوتی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر بیٹھی سسکل سسکل سوچنے چلے جا رہی تھی۔ کانچ جانے کا مطالبہ پس منظر میں چلا گیا تھا۔ وہ اپنی شادی ہی کے بارے سوچتی چلی جا رہی تھی، جو اس کے لیے ذرا بھی خوشگوار نہیں تھا۔ اسے سب سے بڑا گلہ یہی تھا کہ پھر سائیں کے بعد ظہیر شاہ نے گدی نشین ہو جانا تھا اور اس کی زندگی نہرہ بی کی مانند ہو جانے والی تھی۔ ایک بے جان وجود کی مانند جس کا مقصد فقط حکم کی بجا آوری تھا۔ ان کا خاندان کوئی اتنا بڑا نہیں تھا۔ رشتے داروں میں فقط نہرہ بی کا ایک بھائی تھا، جس کی اولاد ان سے چھوٹی تھی۔ ظاہر ہے اگر اس کی شادی ظہیر شاہ سے نہ ہوتی تو پھر سادی زندگی یونہی گزرتا تھی۔ بن بیاضی

قدی، جیسے فرح تھی۔ اس کے بارے میں بھی کچھ گمان تھا کہ اس کی شادی نہیں ہونے والی تھی۔ وہ کسی دوسرے خاندان کی لڑکی بیاہ کر لا سکتے تھے مگر اپنی لڑکی کسی کو نہیں دیتے تھے۔ یہ بھی حویلی کی روایت میں سے ایک روایت تھی۔ وہ گھبرا کر بیٹھ سے اٹھ گئی، کیونکہ نادری انکی زندگی جتنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے کھلی ہار اپنے آپ کو یوں دیکھا، جیسے کوئی انجی کسی کو دیکھ رہا ہو۔ وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ جس میں بھرے بھرے بدن والی بوٹے سے قد کی ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ گداز بدن، سفید شہدہ رنگ، سیاہ مختصر بالے کھنکھسے، جو اس کی کمر تک جھول رہے تھے۔ مناسب سی گردن پر گول چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، ہنس دکاتے ہوئے سرخ لب، مناسب ناک اور بھاری بھاری گداز گال، جس کے دائیں جانب گہرا ڈھیل پڑنا تھا۔ اس نے اپنے دلوں گداز ہاتھوں کی آخری انگلیوں سے اپنے کھنکھسے کو باندھا تو عکس نے اس کا پورا سراپا نمایاں کر دیا۔ اس نے اپنا آنکھ پر دست کیا اور خود کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی کہ کانچ جو بیخارم میں وہ کیسی لگے گی یا پھر دلہن کا لباس اس پر کیسا سجے گا۔ وہ سوچوں ہی سوچوں میں ان ہیولوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اپنے پیٹ پر آ کر سوچنے لگی کہ پتا نہیں آئندہ بچوں میں اس کی قسمت کا فیصلہ کیا ہوگا۔ وہ کانچ جا بھی پائے گی یا نہیں یا پھر اسی چار دیواری میں وہ نئے رشتوں کی زنجیریں پہن کر سکتے رہنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس بات نادری نے بڑی شدت سے اپنے والدین کو یاد کیا تھا۔ جن کا چہرہ بھی اسے یاد نہیں تھا۔ چند تصویریں تھیں، جن سے وہ اپنے والدین کے خال و خد یاد رکھے ہوئے تھی۔ اگر وہ ہوتے تو شاید اسے ہنس مطالبہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ زندگی بھانے اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلنا چاہتی ہے۔ کچھ سوچتے ہوئے ہونیندی داویوں میں کھو گئی۔

☆.....☆

شعب تیار ہو کر ناشتے کے لیے میز پر آن بیٹھا تھا۔ جبکہ اس کی والدہ زبیدہ خاتون کچن میں مصروف تھی۔ برسوں سے یہی معمول تھا کہ ناشتا کرتے ہی وہ گھر

تھا کیونکہ اس نے گھر سے نکل جانے کا وقت ہو گیا تھا۔
 ”شعیب پتر! یہ تمہیں تعیناتی کے آرڈر رکب ملیں
 گے۔؟“ ناشتا کر چکے تو چائے پیتے ہوئے اس کی ای
 نے پوچھا۔

”بس جلد ہی مل جائیں گے۔ مجھے خود بڑا انتظار
 ہے۔“ وہ ہولے سے بولا

”میں اس لیے پوچھ رہی تھی کہ اگر کہیں نزدیک
 تعیناتی ہوئی ہے تو پھر میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔
 لیکن اگر کہیں دور تھے جانا پڑا تو پھر میں تیرے ساتھ ہی
 جاؤں گی۔“ اس کی ماں نے جذب سے کہا۔

”اور یہ جو آپ کی اتنی ساری فوج ہے اس کا کیا کیا
 ہوگا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے کر لیا ہے بندوبست، ایک غریب بیوہ
 ہے۔ اس کے حوالے کر جاؤں گی۔ اب تو ویسے بھی مجھے
 ان کی ضرورت نہیں۔“ تجھے بہت ساری ترقیاں
 ملیں، میری تو اب بھی دکھا ہے۔“ اس نے پھر اسی جذب
 سے کہا تھا۔

”آپ ہی کی دعاؤں کے سہارے چلتا چلا جا رہا
 ہوں۔ میری ماں دعا کرے اور وہ قبول نہ ہو ایسے کیسے ہو
 سکتا ہے۔“ اس نے خالی پیالی داہیں رکھتے ہوئے کہا تو
 اس کی ماں کا دل بھر آیا۔ بھی وہ جلدی سے اٹھ گئی۔ وہ
 نہیں چاہتی تھی کہ اس کی آنکھوں میں آئے خوشی کے آنسو
 اس کا بیٹا دیکھ لے اور یونہی پریشان ہو جائے۔ شعیب
 اٹھا اور اپنی پرانی ہائیک لے کر باہر نکل گیا۔

اس کا رخ بھاء حمید کی درکشاپ کی طرف تھا۔ وہ
 درکشاپ ریلوے اسٹیشن کی محلی جانب محلی ہوئی آبادی
 میں موجود ایک بڑی سی چادر بھاری کے اندر تھی۔ وہاں
 بھاء حمید اور دوسرے چند لوگوں کی ٹیکسیاں اور رکشے
 کھڑے رہتے تھے۔ وہیں ٹکٹنگ اور اس کام سے
 وابستہ دوسرے لوگ ہوتے تھے۔ بھاء حمید نے اپنا چھوٹا
 سادہ فٹر بنایا ہوا تھا۔ جہاں وہ سارا دن لوگوں سے ہمیں
 لگاتے اور ملتے ملا جتے گزار دیتا تھا۔ وہ انہی کی کالونی میں
 رہتا تھا۔ رکشے ٹیکسیاں ہونے کی وجہ سے خود کو ٹرانسپورٹر
 خیال کرتا تھا۔ بنیادی طور پر شریف آدمی تھا لیکن جس دنیا
 سے تعلق رکھتا تھا، اس میں ٹھوڑی بہت غنڈہ گردی کرنا ہی

سے نکل جایا کرتا تھا، کیونکہ سورج طلوع ہونے کے کچھ ہی
 دیر بعد اس کی امی کے پاس دو لڑکیاں آنا شروع ہو جاتی
 تھیں جو ان سے سلائی کڑھائی سیکھتی تھیں۔ ان ماں بیٹے
 کے درمیان ایک خاموش سمجھوتا بن جانے کب سے طے پا چکا
 تھا، جو چلتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بہت چھوٹا تھا، جب اس کے
 والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اس کا باپ ایک مناسب
 عہدے پر فائز سرکاری ملازم تھا۔ اس نے بھلے وقتوں میں
 ایسی جگہ گھر بنالیا تھا جو اس وقت تو عام ساطاتہ تھا مگر وقت
 گزرنے کے ساتھ اب وہ کالونی پورے علاقہ بھرتی جاتی
 تھی۔ والد کے اس دنیا سے طے جانے کے بعد اس کی امی
 نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ چھت کا ہونا قیمت تھا، لیکن
 بینشن کے روپے ملتے نہیں تھے کیونکہ گھر واری چلانے کے
 بعد اپنے اکلوتے بیٹے کو وہ اعلیٰ تعلیم دلوانا سکتیں، جس کا
 خواب ان دونوں میاں بیوی نے کبھی دیکھے تھے۔ اپنے
 شوہر کے خوابوں کی تکمیل کے لیے، اس نے سلائی کڑھائی
 شروع کر دی۔ جس سے ایک طرف اس کی آمدن میں
 اضافہ ہوا تو دوسری جانب اس کی تنہائی کا بدلہ ہو گیا۔ کالونی
 اور اس پاس کے علاقوں کی لڑکیاں اس کے پاس آنے لگیں
 تھیں، جس سے سارا دن ان کے گھر میں جھینڈ لگا
 رہتا۔ خواتین آ جا رہی ہیں۔ لڑکیاں چپک رہی ہیں۔ سینے
 پروٹے کا کام کر رہی ہیں۔ آنا مانا اس کے گھر کے کام بھی ہو
 رہے ہیں۔ سہ پہر کے بعد ان کے آنکھوں میں خاموشی چھا
 جاتی۔ تب وہ بھی گھر واپس آ جایا کرتا تھا، پھر رات سو جانے
 تک دونوں ماں بیٹا خوب باتیں کرتے۔ ماں اپنی خواہشیں
 دہرائی اور بیٹا روزانہ بڑا آدمی بننے کا عزم کرتا۔ باپ کا
 خواب، ماں کی خواہش بن کر اسے سننے کو ملے تو اسے اپنی
 زندگی کا مقصد مل گیا۔ وہ اپنی تعلیم میں اس قدر محو ہوا کہ
 ارد گرد کا ہوش ہی نہ رہا۔ اس نے خود کو پڑھائی کے لیے
 وقف کر دیا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا ہوا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔
 کالج دور میں آتے ہی وہ خود بھی تھوڑا بہت کمانے لگا
 تھا۔ یوں ایک نئی بندھی زندگی بھی جس میں وہ خوش
 تھا۔ تعلیم مکمل کرتے ہی اس نے سی ایس ایس کا امتحان دیا
 تو بڑے اچھے نمبروں میں پاس ہو گیا۔ انٹرویو پاس کیا اور
 ٹریننگ مکمل کر لی ان دنوں وہ تعیناتی کے احکامات کا منتظر تھا
 لیکن پھر بھی وہ معمول کے مطابق تیار ہو کر ناشتے کی میز پر

پر خیاں، اسے میں جائے آ جاتی ہے، پھر لگاتے ہیں کہیں۔ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا اور چھوٹے کو جائے لانے کے لیے آواز دے دی، پھر بھاء خبریں سننا رہا اور اپنی طرف سے ان پر تبصرے کرتا رہا۔ شعیب نے وہاں جائے پناہ اور اپنی آئی ہوئی ڈاک دیکھنے لگا۔ ان میں کچھ ادبی رسالے تھے یا پھر لوگوں کے خط، جنہیں پڑھ کر وہ جواب دینے لگا۔ اس کی ایک بھی دلچسپی تھی جیسے وہ چھپا کر رکھتا تھا۔ وہ شاعری کرتا تھا لیکن نام سے بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ اس کی ایک الگ سے شخصیت بھی ہے۔ یہ دلچسپی بھی اسے یونہی ہو گئی تھی۔

شعیب جس پارک میں جا کر پڑھتا تھا وہیں ایک لادجی عمر لکھادی نجم شیرازی بھی آ جایا کرتے تھے۔ وہ پھر سے کچھ دیر پہلے پارک تقریباً سناٹا ہوتا تھا۔ ایسی خاموشی جو اس کی پڑھائی کیلئے بہت موزوں ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ صاحب کو دیکھتا تھا جو اکثر تنہا آتا، خود میں الجھا رہتا اور پھر چلا جاتا۔ پہلے پہل تو شعیب نے اسے غائر افسانہ ہی سمجھا تھا، مگر آہستہ آہستہ دونوں میں ملایک بڑھی تو نجم صاحب ایک زبردست شاعر لکھے، پھر معاملہ شناسائی سے بڑھا اور اس حد تک آ گیا کہ شعیب کو بھی شاعری میں دلچسپی ہونے لگی۔ ایک دن اس نے پوچھ لی۔

”سر جی۔! وہ کہتے ہیں نا کہ شاعری تب ہوتی ہے جب بندہ عشق میں ناکام ہو جائے۔ تو نجم صاحب جذبات اور احساسات۔“

”ارے میاں، کہاں کی لے بیٹھے ہو آپ، محبت میں ناکامی ہی وجہ شاعری نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی اپنی وسعت نگاہ ہے کہ آپ کہاں تک دیکھ سکتے ہیں۔ قدرت کے مناظر ہیں، فطرت ہے، کائنات ہے۔ اور پھر یہ خود انسان، جو اپنے اندر ایک کائنات ہے۔ اس کے رویے اس کو ہی آپ شاعری میں لے آئیں تو آپ ساری زندگی مختلف چند پہلو بھی غالباً پوری طرح بیان نہیں کر سکتے گے۔“ انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جلیس، یہ تو طے ہو گیا نا کہ کوئی نہ کوئی نارمٹ، وجہ یا مقصد تو ہو گا نا ذہن میں، جس کے گرد شاعری گھومتی ہے۔ لیکن ایک شے ہے ہی نہیں اور اس کے لیے شاعری کرتے چلے جاتا۔“ اس نے باقاعدہ بحث چھیڑ دی۔

پڑتی تھی۔ شاید شعیب اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے کچھ اور کرتا اگر اسے بھاء حمید جیسا ہمدرد شخص نہ ملتا۔ اس نے شعیب کو حساب کتاب لکھنے کے لیے رکھ لیا تھا اور باقاعدہ اس کی تنخواہ مقرر کر دی تھی۔ کبھی شعیب کے والد نے اس کی بہت مدد کی تھی اور وہ اب تک اس کا احسان چکا رہا تھا، اور ایسا کرتے ہوئے وہ بہت خوش محسوس کرتا تھا۔ شعیب بھی اس کے لیے کئی کام کر دیتا تھا، کبھی کسی دفتر کے اور کبھی کسی دفتر کے۔ وہ اس ماحول میں پوری طرح رنج بس گیا تو ڈرامیور نہ ہونے یا پیسوں کی ضرورت کے باعث وہ خود ٹیکسی یا رکشا لے کر نکل جاتا۔ کچھ نہ ہوتا تو ورکشاپ ہی کے ایک کمرے میں پڑا پڑھتا رہتا یا پھر قریبی پارک میں چلا جاتا۔ اگرچہ اس کا مقصد ایک بڑا آفیسر بننا تھا تاہم اسے شعور آ گیا زمانے ہی کو برستے سے ملی تھی۔ روزانہ مختلف لوگوں سے ملنے مان سے واسطہ پڑنے کے باعث نہ صرف وہ زمانے کے تیور سمجھ چکا تھا بلکہ روپے اسے بہت کچھ سمجھا چکے تھے۔ ٹریفک کے دوران وہ کئی کئی دن ورکشاپ نہیں آ سکا تھا۔ اس دن جب اس نے ورکشاپ میں اپنی ہائیک روکی تو بھاء حمید اسے دیکھتے ہی کھل گیا۔

”لوئے آلو شعیب، کیا حال ہے تیرا۔ اب تو کبھی کبھی دکھائی دے جاتا ہے۔“ افسر بن گیا تو پھر کہاں آ سکتے گا۔

”کیوں پھر کیا ہو جائے گا۔“ شعیب نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اؤ نہیں بارہ بندہ معروف ہو جاتا ہے نا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تو ہمیں بھول جائے گا۔“ بھاء حمید نے جلدی سے اپنی بات کی سچا کر دی، پھر اپنے سامنے رکھا ہوا اخبار اٹھا کر اسے دیتے ہوئے بولا، ”لے چل پکڑ اخبار اور سنا خبریں، پتا چلے کہ ملک کے حالات کیا چل رہے ہیں؟“

”بھاء مجھے یہ پتا، آپ کے اس طرح اخبار سننے سے ملک کے حالات درست ہو جائیں گے۔“ اس نے اخبار پکڑتے ہوئے کہا۔

”بات تیری ٹھیک ہے۔ پر بارہمیں معلومات ہوں گی نا حالات کے بارے تو ان کے درست ہو جانے کی امید بھی کر سکتے ہیں نا اور جس شے کے بارے میں پتا ہی نہیں، اس کی امید کہاں، چل تو سنا جلدی سے مولی مولی

"ارے میاں، روایتی باتیں کرتے رہیں، کس نے روکا ہے، لفظ جوڑنا اور ان سے مصرعے ترتیب دینا، روایتی خیالات کو نئے نئے حیران کن دے دینا، یہ الگ بات ہے، آپ نے دریافت کیا کیا؟ یہی دریافت علی آپ کی شاعری کو انفرادیت بخشنے گی۔"

شیب کو بنیادی نکتہ کیا ملا وہ اس پر بہت کچھ سوچنے لگا، یہاں تک کہ ایک دن اس نے ایک نظم کہڑالی، پھر جھنجھٹے ہوئے وہ نظم نجم صاحب کو لا دکھائی۔ انہوں نے بڑے شوق سے وہ نظم دیکھی اور پھر ادنیٰ آواز میں پڑھنے لگے۔

خوابوں میں اتری ہوئی ایک موسم بدن ہی لڑکی نے رات کے پچھلے پہر خاموشی اور برف زدہ سے گول میں مردیوں میں دھوپ کے جیسے لہجے میں یوں خواب کے شہر کنارے بیٹھ کے پتھر پتھر کیوں میں کس پانی میں نکلتی رہوں لن دائروں کو جو میں جاتے ہیں پانی میں چھوٹی کی دیواروں والے گاؤں کے کچے گھر میں، میں بیٹھ کر چوٹی سیڑھی پر دھکیں بجاتی تھک جاؤں میں تنے سے ٹپک لگا کر ہنسون پتھر منور کے نیچے میں سفید گلاب کی پتی پتی دیر تک کرتی رہوں میں ہنرے والے بڑے سے گھر میں، کاشی رنگ کا جوڑا اپنے گوندہ کے لمبی ساری چوٹی، آنکھیں خوب سجاؤں میں سرخ سرخ سے گالوں والے بچوں کے رنگ کیاؤں میں کھلی ہوئی کھڑکی میں بیٹھوں، بادل دیکھوں ابلے ابلے چاند شربت سے آنکھ مارے ہستی رہوں کتنے پہروں میں اپنے خواب شہرے کہہ کر کتنی دیر وہ رہی تھی میں تو کچھ نہیں کہہ سکا اس کو، میری کیا تھی وہ جسم کے بازو میں بیٹھی لذت بیچنے والی تھی وہ میں تو دیکھ رہا تھا، اس کی سوئی موٹی آنکھوں میں نظم پڑھنے کے بعد نجم صاحب نے شیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ وہ خواب ہیں جو ہر ایک لڑکی دیکھتی ہے۔ یہ نیا ہے کہ ایک لڑکے نے لڑکی کے خوابوں کو محسوس کیا، لیکن اس میں جو آخری والے مصرعے میں بات کہی گئی ہے۔ یہاں ساری نظم کی بنیادیں گئی ہیں، جو خوابوں کی تحلیل میں حائل ہوتا ہے۔ یہ جبر جتنا زیادہ ہوگا خواب اتنے ہی شہری ہوں گے۔ احساس و جذبات میں پھیلے

ہوئے خواب زندگی کو تازگی دینے کا سبب بنتے ہیں۔ جسم بیچنے والی کے پاس کچھ نہیں خواب ہیں۔ وہ بھی اندر سے ایک عورت ہے۔ چاہے وہ مثنوی غلیظ ہے اور اس لڑکی کے خواب، جو محسوس اور پاکیزہ ہیں۔ ذرا اسے سوچو، تمہیں زندگی کی اصل روح دکھائی دے جائے گی۔"

وہ نظم جو نجم صاحب نے جذب سے پڑھی اور پھر اس پر تبصرہ کیا، اسی نظم نے شیب کی آئندہ شاعری کا رخ متعین کر دیا۔ وہ سوچتا کہ لڑکیاں کیسے کیسے خواب دیکھتی ہیں۔ کس طرح کی لڑکی کے خواب کیسے ہوتے ہیں۔ وہ خوابوں کی باتیں اپنی شاعری میں کرنے لگا تھا، پھر اس نے ایک خیالی ٹکڑا تراش لیا۔ کئی ساری لڑکیوں کی خرابیاں اس ایک ٹکڑے میں اکٹھی کر لیں۔ چند دن اسے سوچا کہ ہاتھ اس کا، ایک دم سے ٹوب گیا۔ اس نے اس خیالی مجاہد کو یوں ختم کر دیا جیسے نئے ریت کا گھر وندہ توڑ دیتے ہیں۔ اسے ایک عام سی لڑکی سے ہمدردی تھی جو اپنے ہمدرد کے حالات سے فرار حاصل کر کے خوابوں میں پناہ تلاش کر رہی ہے۔ شاید اس کے ذہن میں بچپن میں پڑھی ہوئی کہانی موجود تھی، جس میں ایک شہزادی، ایک ظالم دیو کی قید میں ہوتی ہے۔ کہانی پڑھ کر اسے بڑا غصہ آیا تھا کہ یہ دیو جو ہوتے ہیں، شہزادیوں کو ہی کیوں قید کرتے ہیں۔ اسے شہزادی سے بڑی ہمدردی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ اب اسی شہزادی کے لیے شاعری کرے گا۔ وہ شعر کہتا اور نجم صاحب کو دکھاتا، وہ پسند کرتا اور بڑے مزے سے مشورے دیتا۔ ایک خیالی دنیا انہوں نے تراش لی تھی۔ شیب نے اپنا نظم نام اختر ردالوئی رکھ لیا اور اسی نام سے شائع بھی ہونے لگا، پھر قارئین کی طرف سے تعریف و تحقیر بھرے خطوط اور فون ملنے لگے۔ کئی لوگ اس سے باتیں کرتے۔ یوں ایک دلچسپ مشغلہ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ شیب ایک نیا کردار تخلیق کر کے اس کے حوے لینے لگا۔ چند لوگوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ شیب علی اختر ردالوئی ہے۔ شاید وہ بھاء حمید سے بھی اپنی شاعری چھپا جاتا لیکن نجم صاحب، جن سے وہ شاعری سیکھا کرتا تھا، اور کشاپ آنے لگے۔ وہاں بیٹھ کر چائے پیتے، کپ شپ لگاتے اور شاعری کے پر باتیں ہوتیں۔ بھاء حمید ان دونوں کی

کہا۔ نادیہ چونک گئی۔ اس نے دادی اماں کے لہجے میں اتنی حسرت پہلے بھی محسوس نہیں کی تھی۔ نادیہ نے اپنے آنسو صاف کیے اور بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

”دادی اماں! میں اب کوئی خواہش نہیں کر دوں گی اور نہ کوئی گلہ میری زبان پر آئے گا۔ کوئی شکوہ نہیں سنیں گی آپ۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ان کے گلے لگ گئی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس کے لاشعور میں بغاوت زدہ سوچ کنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔

دن گزرتے چلے گئے۔ اگرچہ نادیہ بدول تھی لیکن وہ پہلے سے زیادہ کتابوں میں کھو گئی۔ وہ ہوتی، اس کا کردار ہوتا، اس کی تنہائی ہوتی اور کتابوں کا ذہن اس کے ارد گرد جمع رہتا۔ اس کی اپنی مخصوص ملازمہ پر نوازشیں بہت ہونے لگیں، جو باہر کی دنیا سے اس کا واحد رابطہ تھا۔ وہی اسے نئی نئی کتابیں اور رسالے لاکر دیتی تھی یا پھر وہ چیزیں جن کی اسے ضرورت ہوتی تھی۔ ایک دن ایسے ہی وہ ایک ادبی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ شاعری کے حصے میں ایک مسئلے پر دو غزلیں ایسی تھیں جو اس کے دل کو چھو گئیں۔ کیا اچھوتا پن تھا ان میں۔ اسے لگا جیسے کوئی اس کے خوابوں کو بڑے حسین انداز میں، لفظوں کے رنگی خلاف میں سجا کر اسے پیش کر رہا ہو۔ اس نے جتنی بار وہ شاعری پڑھی۔ اتنی بار ہی وہ نئے نئے خیالوں میں کھو گئی۔ کوئی شے نئی پیاری ہو جاتی ہے۔ یہ دل کو چھو جانے کے بعد کی کیفیت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ شاعری اس کے دل کو چھو گئی تھی۔ اس نے شاعر کا نام پڑھا۔ ”اختر برومانوی“ کیا شاعرانہ نام ہے اس کا۔ میں نے پہلے بھی اس کا نام نہیں پڑھا۔“ اس نے خود سے سوال کیا پھر اس کے جواب میں نادیہ نے پرانے رسالوں میں اس کی شاعری تلاش کرنے لگی۔ نادیہ کو کہیں کہیں اس کی شاعری دکھائی دی، جسے پڑھنے سے اس کی تنگی مزید بڑھ گئی۔ وہ پہلے انہیں نظر انداز کر گئی تھی۔ اب کی بار پڑھا تو اس کی کیفیات وہی ہونے لگی جو اس کی شاعری پڑھ کر پہلے دن ہوئی تھی۔ ایک دم سے وہ شاعر سے بہت اچھا لگنے لگا۔ چند دنوں میں اسے جتنی شاعری ملی، وہ سب اس نے اکٹھی کر لی۔ زندگی کا ایک نیا پہلو اس کے سامنے وا ہو گیا تھا۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ کوئی اس کے خوابوں کو

باتوں پر بسا کر دے۔ وہ اس کی سمجھ سے بالاتر باتیں ہوتی تھیں۔ شاعری سے متعلق ساری ڈاک و رکشاپ کے پتے پر آتی تھی۔ یوں شاعری شعیب کے گھر سے باہر ہی رہی۔ ٹریننگ کے ان دنوں میں شعیب نے بہت لکھا اور پھر اسی مناسبت سے شائع بھی ہوا۔ اس کی زندگی میں جو ٹھہراؤ تھا۔ خیالی دنیا میں پہنچ کر وہ بہت اچھل محسوس کیا کرتا تھا۔ یوں اس کی زندگی بڑے پرسکون انداز میں گذرتی چلی جا رہی تھی۔

☆.....☆

دوسرے دن کی شام ہی کو جیو سائیں کی طرف سے نادیہ کے لیے بلاوا آ گیا۔ وہ اپنے آپ کو سیٹے، اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے گول کمرے میں جا پہنچی۔ جیو سائیں کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ سلام کر کے ایک جانب کھڑی ہو گئی۔ وہاں صرف دادی اماں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کسی نے اسے وہاں بیٹھنے کے لیے نہیں کہا بلکہ اس کے سلام کرنے کے فوراً بعد ہی جیو سائیں گویا ہوئے۔

”مجھے افسوس ہے جی کہ میں تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق تھنہ نہیں دے پا رہی ہوں، میں تمہیں کالج جانے کی اجازت نہیں دے سکتا، کیونکہ میں اپنی خاندانی روایات کے خلاف نہیں جاسکتا اور نہ ہی کسی کو یہ روایات توڑنے کی اجازت دوں گا۔ آئندہ تم بھی سوچ سمجھ کر اپنی خواہش کا اظہار کیا کرو۔ سب تم جاسکتی ہو۔“

لکھوں میں ستایا گیا فیصلہ سن کر وہ وہاں نہیں رہی۔ سیدھی اپنے کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عودت ہونا کوئی جرم ہے کیا۔ ہماری کوئی خواہش، کوئی ارمان یا کوئی امید نہیں ہوتی۔ ہمیں یہاں دیواروں کے بیچ قید کر کے آخر کیوں رکھا جا رہا ہے۔ سوچ کا یہی سرا بنیاد بن گیا اور پھر تجانے وہ کتنی دیر تک روتی رہی، کافی دیر بعد اس کی دادی اماں اس کے پاس آئی اور دھیرے دھیرے تسکینے لگی۔

”یہ ہماری قسمت ہے جی کہ ہم اس خاندان کا حصہ ہیں۔ ہمیں اس حویلی میں اسی طرح ہی جینا ہے۔ اسی طرح زندگی گزارنے سے سمجھوتا کر لو، اسی طرح جینے کی عادت ڈالو، ورنہ زندگی بہت مشکل ہو جائے گی۔“ انہوں نے بھیکے ہوئے لہجے میں اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے

"جی۔ میں اختر رومانوی بات کر رہا ہوں۔ آپ کون؟" پھر اسی پر کشش لہجے میں پوچھا گیا۔
"میں آپ کی ایک فین بات کر رہی ہوں۔ آپ کی شاعری مجھے بہت پسند ہے۔" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے تیزی سے کہہ دیا۔

"نہ ہے نصیب اکہ ہمارا بھی کوئی فین ہوا اور اس سے بڑی بات کہ میری شاعری آپ کو پسند آئی۔ اس پر میں آپ کا شکریہ ادا کر سکتا ہوں۔" وہی دل کھینچ لینے والی آواز میں شوقی در آئی تھی۔

"اس وقت میں آپ سے فقط دو باتیں پوچھنا چاہتی ہوں۔" نادری نے اظہار سے کہا تھا۔
"جی، کہیے۔ پوچھیے۔" اس نے کہا۔

"ایک بات تو یہ ہے کہ آپ کہاں کہاں شائع ہوتے ہیں۔ میں آپ کی ساری شاعری پڑھنا چاہتی ہوں اور دوسری بات یہ ہے کہ کیا میں آپ سے بھی کئی بات کر سکتی ہوں۔" اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔

"جی، میں ابھی آپ کو ان رسالوں کی فہرست بتائے دیتا ہوں، جہاں جہاں میرا کلام شائع ہوتا ہے اور رہی دوسری بات تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ آپ مجھ سے بات کریں گی۔ ہاں، جب میں مصروف ہوں گا تو آپ کی کارڈ ریسیو نہیں کر پاؤں گا۔" اس نے بڑے خوبصورت انداز میں کہا اور چند رسالوں کے نام گنوا دیے۔

"جی ٹھیک ہے، باقی باتیں پھر بعد میں ہوں گی۔" اس نے جلدی سے کہا اور کسی قسم کا کوئی الوداعی جملہ کہے بغیر ہی فون بند کر دیا۔ نادری نے محسوس کیا کہ وہ پیسے میں بھیگ گئی ہے۔ اسے خود پر قابو پاتے ہوئے کتنا ہی وقت لگ گیا۔ وہ شام اور پھر رات سرشاری میں گزر گئی۔

پھر نادری کا معمول بن گیا۔ پہلے پھل وہ تھوڑی سی بات کرتی رہی تھی، پھر بات پھیل گئی تو باقاعدہ موضوعات پر گفتگو ہونے لگی۔ رات کی تنہائیوں میں لمبی لمبی باتیں خوشوار سرتوں کا باعث بننے لگیں۔ رنگوں اور خوشبو جیسی باتوں میں وہ اکثر بہک چاہا کرتی تھی۔ اسے خیال ہی نہ رہتا کہ وہ کس طرح کی باتیں کرتی چلی جا رہی ہے۔ ایسے میں اختر اسے سنبھال لیتا۔ دن کے وقت جب وہ ان باتوں کو یاد کرتی تو عجیب سے احساس اس سے لپٹ

ہوں کھول کھول کر بیان کر دے۔ وہ اپنی تنہائیوں میں اسے سوچنے لگی۔ یہاں تک کہ نادری کے دل میں یہ خواہش شدت اختیار کر گئی کہ وہ اختر رومانوی سے رابطہ کرے۔ دیکھیں تو سہی کہ گفتگو میں بھی وہ اس کے خوابوں کا ہاتھ تھامے ہوئے ہے مگر فون کا حوالی میں آنا اور رکھنا اتنا ہی ہولناک تھا، جتنا وہ تصور کر سکتی تھی۔ غلط وغیرہ کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اختر رومانوی سے رابطے کی خواہش نہ صرف بڑھتی چلی جا رہی تھی بلکہ اسے بے چین کیے ہوئے تھی، وہاں سیل فون رکھنے کا جرم بھی اسے دہلائے دے رہا تھا، پھر خواہش جیت گئی۔ شاید اس جیت میں اس کے لاشعور میں پڑی بغاوت نے بڑا ساتھ دیا تھا۔ اس کی مخصوص نوکرائی نے ڈھیر ساری نوازشوں کے عوض اسے فون لا کر دے دیا۔ ملازمہ ہی کے بیٹے نے فون پر اسے سیل استعمال کرنے کے سارے طریقے سکھا دیے۔ پھر اس دوپہر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان رسالے والوں کو فون کر دیا۔ جس میں اختر رومانوی کی شاعری چھپی ہوئی تھی۔ کافی دیر باتوں کے بعد اسے اختر کا نمبر مل گیا۔ احساس جرم میں اسے یوں لگا جیسے وہ پہلے صراط سے گزری ہو، مگر رابطہ نمبر مل جانے کی خوشی میں وہ سب کچھ نظر انداز کر گئی۔ جس وقت وہ اختر رومانوی کے نمبر ملا رہی تھی اس وقت جہاں ہاتھ کاپ رہے تھے وہاں دل بھی بڑی بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔

"ہیلو۔! کون بات کر رہا ہے۔" دوسری جانب سے بھاری مردانہ آواز میں پوچھا گیا تو اس کے بدن میں کچلی ہوئی لہر نے اسے ساکت کر دیا۔ خیالوں ہی خیالوں میں نہانے کتنی یاد ہوائی گئی باتیں یوں صاف ہو گئیں جیسے کبھی لفظ اس کی دسترس ہی میں نہیں تھے۔ "ہیلو۔" بھی بولیں کون بات کر رہا ہے؟" دل چیر کر اتر جانے والے لہجے میں کوئی بڑے یاد دہانی انداز میں پوچھ رہا تھا۔ بھی اسے ہوش آ گیا۔ نادری نے پورے وجود کی ہمتیں اکٹھی کیں اور پوچھا۔

"کیا آپ اختر رومانوی بات کر رہے ہیں؟" اس نے محسوس کیا کہ اس کے کانپتے ہوئے لہجے میں لفظ قہر قہر رہا ہے۔

نے پھر سنجیدگی سے کہا۔ آپ وہ کیا بتائے کہ اس نے خود کو پہلے ہی چھپا رکھا ہے اور کبھی نام سے لکھ رہا ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اس نے حیرت ملی مارا منگی سے کہا تب اس نے یونہی بہانہ بتاتے ہوئے کہہ دیا۔
"میں اپنا مجموعہ کلام شائع کراؤں گا۔ تب اس پر تصویر کی لگا دوں گا۔ تب تم دیکھ لینا۔"
"کب..... کب..... شائع ہو گا مجموعہ" اس نے بے چینی سے کہا۔

"جب میرے پاس پیسے ہوں گے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ بے چارے شاعروں کو اپنی کتابیں خود چھپوانا پڑتی ہیں، پھر خود ہی بیچنا بھی پڑتی ہیں۔ میں اتنا معروف شاعر تو ہوں نہیں کہ کوئی پبلشر مجھے مفت میں چھاپ دے۔ میرے جیسا غیر معروف بے روزگار شاعر کتاب چھپوا کر اپنے ہی ہاتھوں ذہنی اذیت نہیں سہ سکتا۔ یہ خود کش حملے والی بات ہے نا۔" اس نے یونہی اوتارنا تک ہاتھتے ہوئے ایک حقیقت بیان کر دی، جو بہت ناگوار تھی۔

"کتنا خرچ آئے گا کتاب پر، وہ میں دے دیتی ہوں۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے آپ کتاب لے آؤ۔" وہ پھر سے اچانک فیصلہ کن انداز میں بولی تو وہ چونک گیا۔ اس لیے نادری کی بات کو نظر انداز کرنا ہوا بولا۔
"اچھا، ہم اس موضوع پر پھر کسی وقت بات کریں گے۔ ہاں اس سے پہلے کیا موضوع چل رہا تھا۔" اس نے پہلوئی کرتے ہوئے کہا تو وہ خراخولہ میں ضدی ہو گئی۔ اس لیے اپنی ادا میں بولی۔

"نہیں! آپ مجھے بتاؤ۔ کتنا خرچ ہو گا۔ اپنا اکاؤنٹ نمبر بتاؤ، میں اس میں رقم بھجوا دوں گی۔" تم یہ سب رہنے دو۔ میں نے کتاب شائع کر دینی ہوگی تو وہ ہو جائے گی۔" اس نے بڑے سکون سے کہا۔
"میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس نے بچوں جیسی ضد کر لی۔

"تو ٹھیک ہے، آ جاؤ اور آ کر مجھے مل لو۔" وہ سکون سے بولا، اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے نہیں مل سکتی۔ یہ مجبوراً خود نادی نے اسے بتائی تھی۔
"آپ کو معلوم ہے کہ میں نہیں مل سکتی۔ آپ کی

جاتے۔ صرف ایک بات اس کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتی تھی۔ اس نے اپنی پہچان اور تعارف نہیں دیا تھا۔ اختر پر یہ واضح نہیں ہو پایا تھا کہ وہ کون ہے؟ نام تو اس نے نادری ہی بتایا لیکن کہاں سے بات کر رہی ہے یہ گول کر گئی۔ یوں ہاتھ کرتے ہوئے انہیں کئی دن ہو گئے تھے۔ نادری کے لیے زندگی کا یہ پہلو اس قدر حسین بن گیا کہ اسے لگا جیسے یہی پہلو حاصل زندگی ہے۔

ایک رات اس کے سن میں ایک خواہش رو آئی۔ جس پر اس نے چند لمحوں سوچا اور پھر فوراً ہی اس کا اظہار اختر سے کر دیا۔ یہ بڑی خوبصورت سی خواہش تھی۔ چلتی ہوئی ہاتھوں کے دوران اچانک اس نے پوچھا۔

"اختر! آپ دیکھنے میں کیسے ہیں؟"

"کیا مطلب۔ ادیکھنے میں انسان ہی لگتا ہوں۔" اس نے بات کو کھتے ہوئے شوخی سے کہا۔

"نہیں، میرا مطلب۔ آپ اتنی خوبصورت اور پیاری شاعری کرتے ہیں کہ دل کو چھو لیتے ہیں۔ اب یہ خواہش کچھ غلط بھی نہیں ہے کہ دیکھنے میں آپ کیسے ہیں؟" اس نے بھی اپنی بات کی وضاحت کر دی۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ کبھی ویسا ہی ہوں جیسے عام انسان ہوتے ہیں۔ ہاں اگر ناک نقشے کی بات کرنی ہو تو میں ٹھیک ہوں۔ کم از کم کہیں سے بے ڈھنگا نہیں ہوں۔" اس نے پھر اسی شوخی میں جواب دیا تھا۔

"میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس نے حتی انداز میں اپنے دل کی خواہش کہہ دی۔

"کیسے دیکھ سکیں گی۔ تم اتنی اور رہتی ہو۔ تم مجھے مل سکتی ہو اور تم میں تمہارے پاس آ سکتا ہوں۔" اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"آپ کی تصویر بھی تو کہیں شائع ہوئی ہوگی نا۔ آپ کسی میگزین میں اپنی تصویر شائع کروادیں، میں دیکھ لوں گی۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں صلاح دے دی۔

"ایسا ممکن تو ہے، لیکن آج تک میں نے تصویر شائع کروائی ہی نہیں۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیوں، کوئی بڑی مشکل معاملہ.....؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، بس یونہی....." اس

منظروں کا حصہ بنی رہی تھی۔ شاید وہ ان منظروں سے اکتا کر سوچنے لگی ہوئی اگر وہ اپنے آپ سے نہ ابھرتی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اختر اس کی فون کال نظر انداز بھی کر سکتا ہے؟ وہ مسلسل کال کر رہی تھی اور وہ ریسپونڈ نہیں کر رہا تھا۔ بل فون بند ہوتا تو اسے ممکن آ جاتا۔ اگر وہ مصروف ہے تو شخص ایک پیغام بھیج دے کہ وہ مصروف ہے۔ پہلے بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے اتنی بار کوشش کی ہو۔ پہلی بار پلٹ کر اس کا رسپانس نہیں دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے طرح طرح کے خیال آنے لگے تھے۔ نبھانے اس کے ساتھ کیا وجہ ہے؟ کیا وہ ناراض ہے؟ ان سوالوں کے جواب میں نبھانے کیسے کیسے خیال اس کے من میں اتر آئے تھے۔ اس نے اپنے اندر ہی سے اٹھنے والے وہم اسے ڈراتے رہے۔ کوئی ایسا متبادل ذریعہ بھی نہیں تھا کہ جس سے وہ کسی بھی معاملے کی تصدیق کر سکتی۔

نادی خود میں ابھی ہوئی تھی۔ اختر ایک فون کال کی دوری پر تھا۔ یہی یقین تھا اور یہی ایک رابطہ وہ اس کے لیے شخص ایک آواز ہی نہیں تھا بلکہ نبھانے تختے خواہوں کی بنیاد بن گیا تھا۔ اس کا لہجہ نادی کے من میں سپنوں کا شہر آباد کر چکا تھا۔ صرف اسی آواز نے اس کے ایوان ذہن میں کتنے چہروں کی تصویریں لگ چکی تھیں۔ ہر چہرہ مکمل تھا مگر وہ کسی سے بھی مطمئن نہ تھی۔ وہ منت نیا چہرہ تخلیق کرتی چلی جا رہی تھی، بس اختر کی آواز تھی جو اس کی ذات کے گرد حصار بن کر چھا گیا تھا اور وہ لفظ لفظ اسے اپنی ذات میں یوں اتار لی چلی جا رہی تھی، جیسے بارش میں بھیگی ہوئی کوئی لڑکی، شفاف پانی کی ٹھنڈک اپنی روح تک محسوس کر رہی۔

نادی کی ابھمن ایک خیال کی وجہ سے تھی جو اس کے ذہن میں دھویں کی مانند پھیل گیا تھا اور اس نے نادی کی ساری سوچیں مفلوج کر دی ہوئیں تھیں۔ اسے یہ خوف لا حق ہو گیا تھا کہ اگر اختر کم ہو گیا اور اس سے رابطہ نہ ہو سکا تو پھر وہ اسے کیسے تلاش کر پائے گی۔ آواز کی جگہ ڈور ٹوٹ گئی تو پھر وہ کس کے سہارے اس تک رسائی پاسکے گی؟ وہ کس طرح کے صحرا میں آگئی ہے۔ جہاں نہ کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی منزل۔ غیر ماڈی سرباب، جسے وہ چھو

تصور دیکھنے کے لیے میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ آپ اپنی تصویر کسی میگزین ہی میں چھپوائیں، مگر اب جبکہ میں کتاب شائع کروانے کی بابت کہہ چکی ہوں تو آپ میری اتنی سی خواہش پوری نہیں کر سکتے۔" نادی نے پورے غلوں نے کہا تھا اس لیے اس کا لہجہ تھوڑا بھیگ بھی گیا۔ "نہیں۔ اس میں ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے یہ قطعاً پسند نہیں کہ کوئی مجھے یہ احساس دلائے کہ میں اپنی کتاب بھی نہیں چھپوا سکتا۔ اس لیے اپنی بے جا ضد چھوڑا اور اس موضوع کو بدل دو۔ ہم کوئی اور بات کرتے ہیں۔" اس نے کالی حد تک سخت لہجے میں کہا تھا تو وہ تیزی سے بولی۔

"اس طرح تو میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ آپ نے میرے غلوں بھرے جذبات کو ٹھکرا دیا ہے۔ میں ایک اچھے دوست کی طرح کام آنا چاہتی ہوں اور آپ۔۔۔"

"صرف اپنی اس خواہش کے لیے کہ مجھے دیکھ سکو۔ خیر ہم بھر بات کریں گے۔ اس وقت فون بند کر دینا ہی بہتر ہو گا۔" اس نے کہا اور کچھ سے بغیر فون بند کر دیا۔ نادی بے جان فون کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس نے پلٹ کر اختر کو کال کی تو اس کا فون بند ملا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ بات نہیں کرے گا۔ اس نے یہی سوچا کہ کل تک اس بات کا اثر زائل ہو جائے گا۔ وہ بارہ وہ ایسے کسی موضوع پر بات نہیں کرے گی جس سے اس کی انا شروع ہو۔ سو اس رات اختر کی باتوں میں بھیگی ہوئی، لیکن اگلی رات اختر نے کوئی رسپانس نہیں دیا۔ کال جلتی رہی مگر اس نے ریسپونڈ کی۔ کیا وہ ناراض ہو گیا ہے؟ پھر کوئی اور معاملہ ہے۔ میں نے اتنی بے جا ضد تو نہیں کی تھی۔ یہی سوچتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی واحد کھڑکی سے آن لگی۔ جہاں آکر وہ اپنے آپ سے اٹھنے لگی۔

کھڑکی سے باہر کے سارے منظر تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ چاند بھی جیسے اس سے روٹھ گیا ہوا تھا۔ جوبلی کی دیوار پر لگے برقی ٹیٹھے جہاں تک روشنی پھیلا سکتے تھے وہاں تک کے سارے منظر اسے اپنے ساتھ جاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ورنہ اس سے آگے کہیں تو اور درختوں پر اندھیرا اتر ا ہوا تھا۔ دور گاؤں کے کچے کچے گھروں میں کہیں کہیں دیے کی مانند روشنی جھلک رہی تھی۔ نبھانے کی دیر تک وہ یونہی ان تاریک

ہے۔ تمہیں عام لوگوں سے ذرا ہٹ کر رہنا ہوگا اور یہ بھی
بھی کالیں تمہیں اب نہ ہوں دیتیں۔ جان چھڑالے
ان سے جو تمہیں رات رات بھر سونے نہیں دیتیں۔" امی
نے ڈھکے پیچھے انداز میں اسے سرزنش کی تھی۔

"بس امی، بس ایک فون کال سننا ہوں۔ یہ فارغ
دن ہیں نا، جب مصروفیت ہوگئی تو یہ خود بخود ختم ہو جائے
گی۔" اس نے ہنسی بے جا سی دہل دے دی تھی۔

"میں جانتی ہوں بیٹا کہ تم کروڑوں کے بہت اچھے ہو،
لیکن بعض اوقات معاملات اس قدر آگے بڑھ جاتے
ہیں کہ بندہ پھر چاہے بھی تو ان سے اپنا دامن نہیں بچا
پاتا۔ جذبات انسان کے بہکاوے کا سبب بھی بن جاتے
ہیں۔ اس احتیاط بہتر ہوتا ہے۔ ہائی تم خود کچھ دار
ہو۔" امی نے بڑے دگلی لہجے میں اسے نصیحت کر دی تا
کہ وہ بخانا طار ہے۔

"ٹھیک ہے امی جیسا آپ چاہیں۔" اس نے
مزید بحث نہ کرنے کی غرض سے فوراً بات مان لی۔

اصل میں شاعری کی وجہ سے بہت سارے لوگ
اسے فون کالز کرتے تھے۔ اسی تہیہ و تنہید کے باعث
اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کی شاعری پڑھنے والوں کا
رد عمل کیا ہے۔ بچانے کتنے لوگ آئے اور گئے۔ کسی سے
ایک آدھ ہار بات ہوتی تھی، کسی سے چند دن یا پھر کوئی
چند ہفتے بات کرتا رہتا۔ یہ لوگ جس طرح آتے تھے اسی
طرح اندھیری دنیا میں غائب ہو جاتے۔ یوں جیسے بھی
ملے ہی نہ ہوں۔ کسی نے خود تعلق توڑ لیا اور کسی سے خود
اس نے بات کرنا پسند نہ کی۔ بات شاعری کے محور سے
ہٹ کر، کسی اور راستے پر ڈالنے کی کوشش ہوتی، شعیب
وہیں رک جاتا۔ یہ فقط نادیہ ہی تھی، جس کے ساتھ تعلق
کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ اس نے فقط شاعری پر بات کی
تھی اور اسی حوالے سے زندگی کو سمجھنا چاہا تھا۔ خود شعیب
کے لیے یہ کردار بہت دلچسپ بن گیا تھا۔

"کیا سوچتے گئے ہو بیٹا۔" امی نے اس کی طرف
غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ چونک گیا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے ایک ہی سانس میں چائے کا
مک حلق میں اٹھ پلٹے ہوئے کہا۔ امی نے مزید کوئی بات نہ
کی اور خالی نگاہیں کرکچن میں چلی گئیں۔ وہ اٹھا اور اپنے

نہیں سکتی۔ فقط اس کا احساس ہے۔ یہ بھی نہ رہا تو وہ کیا
کرے گی؟ انہی لمحات میں کوئی شے تمہیں سے اس کے
اندروں میں گئی تو وہ بے ساختہ چونک گئی، کیا وہ اختر کے لیے
اتنا ہی جذباتی ہوگئی ہے؟ کہیں وہ اس سے محبت تو نہیں
کرتے گی۔ کیا وہ ایک رائیگاں سفر پر چل نکلی ہے؟ وہم،
حیرت اور انکشاف نے اس کے اندر پہل بچا دی۔ وہ خود
کو یقین دلاتے دلاتے تھک کو چور ہوتی چلی جا رہی
تھی۔ اسے لگا جیسے وہ کسی پری کی مانند خوبصورت منظروں
میں اڑتی چلی جا رہی ہے۔ رائیگاں سفر کی محکم اور اس کی
آبلہ پانی کی دھن اس نے پورے وجود میں محسوس
کی۔ جب اس کی آنکھوں سے چشمے اٹل پڑے۔ وہ بے
حس و حرکت کھڑی لان ہار یک منظروں میں جھانکنے لگی جو
اس کے من میں بھی اتر آئے تھے۔ اسے ہوش اس وقت
آیا جب صبح کی اذان اس کے کانوں میں پڑی۔ تب وہ
ماتیس ہو کر کھڑی سے ہٹ گئی۔

☆.....☆

شعیب ہانگ لے کر کمر سے نکلا تو اپنے ذہن پر
خاصا دھاؤ محسوس کر رہا تھا۔ اس کا لہرادہ تھا کہ وہ بھاء حمید
کی درکشاپ چائے گا لیکن پارک سے سامنے سے
گزرتے ہوئے اس نے اپنا لہرادہ بدل لیا۔ اس نے
ہانگ پارک میں کھڑی کی اور خود دھتے قدموں سے
چلا ہوا ایک سنگی ٹھکا پر آ بیٹھا۔ وہ ایک فیصلہ کرنا چاہتا
تھا۔ کیونکہ رات جب وہ کھانا کھا چکا تو اس کی امی بکن
سے چائے بنا کر لے آئی۔ انہی لمحوں میں نادیہ کی کال آنا
شروع ہوگئی۔ اس نے دوبارہ نظر انداز کیا، پھر تیسری بار
اس نے فون "خاموشی" پر لگا دیا۔ اس کی امی بڑے غور
سے اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھی۔ ان کے چہرے پر شجیدگی
تھی ہوئی تھی۔ اس لیے شعیب نے نگاہ اٹھالیا اور کوئی بات
نہیں کی۔ جب اس کی امی نے ہی پوچھ لیا۔

"کون ہنگ کر رہا ہے تمہیں؟"

"کوئی نہیں، امی بس یونہی....." اس سے اپنی ماں
کے سامنے جھوٹ بولا ہی نہیں گیا۔ اس لیے ادھر وہی سی
بات کر کے گرم چائے کا سپ لے لیا۔

"دیکھ۔ اب تو ایک انتظامی آفیسر بن جانے والا
ہے، جس کی اپنی ایک الگ سے منفرد حیثیت ہوتی

"اور اگر میں کسی دن واقعی ہی کم ہو گیا تو؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی کہ میرے ساتھ کیا ہو گا۔ لیکن اتنا احساس ہے کہ میں زندگی کے خوبصورت ترین احساس سے محروم ہو جاؤں گی، جو میری زندگی میں خوشگواریت لے آیا ہے۔" وہ جذب سے بولی

"کیا میرے ساتھ تعلق کو تم اتنی ہی اہمیت دیتی ہو۔" اس کے حیرت سے پوچھا۔ انہی لمحات میں اسے اپنی امی کا خدشہ درست معلوم ہوا۔

"ہاں ایسا ہی ہے اور یقیناً جانیں یہ انکشاف مجھے رات ہی ہوا تھا۔ آپ کے تعلق سے اب میں اپنی تہا اور سچا زندگی میں خوبصورت اور من موہنے خیالوں کا اجوم اپنے ہمراہ پاتی ہوں جو مجھے تہائی کا احساس نہیں ہونے دیتے اور یہ بھی کہ اب مجھے سچا زندگی کی ازیت سہنا پڑتی ہے۔" وہ ہنسنے لگی حد تک جذباتی ہو چکی تھی۔

"فرض کیا میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں تو پھر؟" اس نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

"جب وہ وقت آئے گا تو دیکھ لوں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھیگ گئی تھی، پھر فوراً ہی خود پر قابو پاتے ہوئے بولی "تو میں آئندہ آپ کو ڈسٹرب نہیں کروں گی۔"

"بات یہ ہے نادیر۔ اُمس بے روزگار بندہ نوکری کی تلاش میں ہوں۔ مجھے ان چند دنوں میں ایک نوکری کی امید ہے۔ اگر یہ نوکری لگ گئی تو پھر وقت بے وقت کی مجبوری تو ہو جائے گی؟۔۔۔ راتوں کو پردہ پر تک کیسے باتیں کر سکیں گے۔" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اختر! آپ شاعر ہیں۔ آپ تو اس بات کو ضرور سمجھتے ہوں گے۔ بعض تعلق ایسے ہوتے ہیں اگر ان سے برسوں بات بھی نہ ہو تو بھی تعلق کے برقرار رہنے کا احساس رہتا ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ میں آپ کی کسی کامیابی میں آڑے نہیں آؤں گی۔" وہ پرسکون انداز میں بولی۔

"ٹھیک ہے۔ اگر ہم بات نہ بھی کر سکے تو ہمارے درمیان خوشگوار تعلق کا خوبصورت احساس ضرور رہے گا۔" اس نے کہا اور ایک دم سے پرسکون ہو گیا۔ رات سے جو لاشعوری پریشانی اس سے لپٹی ہوئی تھی وہ ایک

کمرے میں جا کر لٹ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ سارے دن کی جھگی ہوئی ماں اب سو جائے گی۔ اس رات وہ نادیر سے بات نہیں کر سکا۔ اس نے فون بند کیا اور سو جانے کی کوشش کرنے لگا مگر ساری رات وہ یونہی بے چین رہا۔ سوتے جاتے اس نے وہ رات بتا دی تھی۔

وہ پارک کے پرسکون ماحول میں نادیر ہی کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ سچ جب اس نے فون کھولا تو پیٹیا بات کی بھرمار تھی جو رات بھر وہ وقفے وقفے سے بھیجتی رہی تھی۔ اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب وہ کسی سے تعلق نہیں رکھے گا۔ لیکن کیا وہ نادیر کو بھی چھوڑ دے گا؟ سوال اسے خود بے چین کیے دے رہا تھا۔ اس کی زندگی میں آنے والی وہ واحد لڑکی تھی جو بے ضرر ثابت ہوئی تھی۔ وہ جتنی بھی باتیں کرتی وہ سبکی، اس کے پاس کی شاعری کے بارے ہی میں ہوتی تھیں۔ کہیں بھی کسی لالچ کا شائبہ نہیں تھا۔ وہ صرف اور صرف زندگی کے بارے میں باتیں کیا کرتی تھی۔ نادیر نے اپنی ذات کے ارد گرد ایک حصار بنا رکھا تھا اور اس نے بھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو اس حصار میں جھانکنے کی اجازت دے رہی ہو۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے اپنی ذات کو الگ کر کے دکھا ہوا تھا۔ وہ شیخ پر مینڈا بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے اپنے من میں کوئی ایسا تھا کہ سارے دن تک ہی نادیر کے حق میں جا رہے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اس سے ناخوش توڑے مگر اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ انہی لمحات میں نادیر کا پیغام اس کے سیل فون پر آ گیا۔ جس میں یہی سوال تھا کہ آخر وہ اپنی خاموشی کی وجہ تو بتا دے؟ تب جواز نہ ہونے کی کم مائیگی مزید بڑھ گئی۔ شعیب نے لاشعوری طور پر اس کے نمبر پیش کر دیے۔ چند لمحوں بعد ہی رابطہ ہو گیا۔

"اختر۔ ایسی کیا وجہ ہو گئی تھی جو آپ نے فون نہیں سنا۔" نادیر کے لہجے میں انتہائی کھسکاؤ خوف تھا۔

"بس یونہی رات میری طبیعت خراب تھی۔ اب ٹھیک ہوں۔" اس نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

"اوہ۔ اچھے ڈر تھا کہیں آپ کم ہی نہ ہو جائیں۔" وہ جھپکتے ہوئے خوشگوار لہجے میں صاف گوئی سے بولی تو شعیب کو اس کی معصومیت بہت اچھی لگی۔

بدلتا لو..... کہیں اور چلے جاؤ....." وہ بے ربط سے لہجے میں بولی۔

"لیکن کیوں اماں؟" اس نے شدت سے پوچھا تو اس کی امی چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک دم سے خود پر قابو پاتے ہوئے بولیں۔

"اتنی دور..... اگر نہ جاؤ تو بہتر ہے۔ پہلی بار مجھ سے جدا ہو کر اتنی دور جا رہے ہو نا تو عجیب سی حالت ہو گئی ہے میری۔ اتنی دور اگر نہ جاؤ تو بہتر ہے۔" اس کی امی نے پراختیار لہجے میں کہا۔ جب وہ اٹھا اور اپنی ماں کو اپنے ساتھ لگا کر بڑے پیار سے بولا۔

"میں کوشش کروں گا کہ وہاں نہ جاؤں لیکن یہ سرکاری احکام ہیں۔ پہلی بار اچھا نہیں لگتا۔ میں جلد ہی وہاں سے تیار کر دلاؤں گا۔ یا پھر آپ کو بہت جلدی وہاں بلوالوں کا اور اگر آپ میرے ساتھ ہی جانا چاہتی ہیں تو چلیں۔" اس نے حتمی انداز میں کئی سارے آپشن اپنی ماں کے سامنے رکھ دیے۔

"تم بیٹا، جلدی سے تیار نہ ہی کرو دینا، پھر کسی اچھی سی جگہ پر میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔" امی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے کہا تو امی وہاں سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"میں تمہارے لیے چائے بنا رہی ہوں۔"

امی کچن میں چلی گئی تو شعیب سوچ میں پڑ گیا۔ امی نے کبھی بھی ایسے رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اگر ماں اپنے بچوں کے بارے میں جانتی ہے تو بچوں کو بھی ماں کی مدد ملتی ہوئی معمولی سے حالت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ سلامت مگر کے نام پر وہ یوں جذباتی کیوں ہو گئی تھیں۔ یہ شخص اس کی دوری کی وجہ سے تھا پھر کوئی اور بات تھی؟ کچھ تھا، ورنہ وہ یوں ایک دم سے کھوٹ جاتیں۔ ایسا کیا تھا؟ کافی دیر تک سوچتے رہنے کے باوجود اس کی سمجھ میں نہیں آیا، پھر اس کی امی چائے لے آئی تھیں۔ وہ اس موضوع پر بات کرنا چاہتا تھا لیکن اپنی امی کی حالت دیکھ کر وہ ہمت ہی نہ کر سکا۔ یونہی ادھر ادھر کی باتوں میں چائے ختم کر کے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے بہر حال سلامت مگر جانے کی تیاری کرنا تھی۔

لمحے میں اس سے آواز نہ ہو گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ چند دنوں میں نادیر اسے بھول جائے گی۔ جس طرح وہ بہت سارے لوگوں کو بھول گیا ہے۔ نادیر کے لیے فقط یہی تھا کہ دھیرے دھیرے اسے چھوڑ دیا جائے۔ یہاں تو اس کے ہاتھ لگ ہی چکا تھا۔ انہی لمحات میں ایسا کچھ من میں در آیا تھا کہ جس سے پورے وجود میں اٹھنا غبار پھیل گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا، خود اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ پارک سے اٹھا اور بھاہ جمید کی درکشاپ چل دیا۔

انگلے دو دنوں میں وہ بہت مصروف رہا تھا۔ نادیر سے بات ہی نہ کر سکا۔ اسے سلامت مگر نامی لہجے میں جا کر ڈیوٹی کرنے کا حکم نامہ مل گیا تھا۔ سلامت مگر تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا اور وہاں کاسب سے بڑا انتظامی آفیسر متعین ہوا تھا۔ وہ قصبہ لاہور سے بہت دور تھا۔ شعیب سوچ میں پڑ گیا کہ پتا نہیں وہاں کا ماحول کیا ہوگا۔ اس نے پہلے وہ علاقہ نہیں دیکھا تھا۔ ایسے میں وہ اپنے ساتھ امی کو لے کر جائے یا نہیں۔ اسی شش و شنب میں اس نے یہی فیصلہ کیا کہ شروع کے دنوں میں وہ خود وہاں کا ماحول دیکھے گا، پھر بعد میں حالات دیکھ کر اپنی امی کو بلا لے گا۔ وہ گھر آیا تو بہت خوش تھا۔ اس کی امی نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! پھر کہاں ملی تھیں ڈیوٹی میں بھی تمہارے ساتھ جا سکوں گی یا نہیں؟"

"امی۔! یہی تو سوچ رہا ہوں۔ میں نے معلومات لی ہیں۔ وہ علاقہ بہت دور ہے یہاں سے، پتا نہیں کیا ماحول ہوگا سلامت مگر کا۔"

"کیا۔ کیا کہا ٹو نے..... کون سی جگہ ہے۔؟" اس کی اماں نے ہذیبانی انداز میں پوچھا تو شعیب چونک گیا۔ یہ اس کی امی کو کیا ہوا ہے ایک دم سے۔ اس نے جگہ کے بارے میں دوبارہ بتایا تو اس کی امی کی حیرت اتنی شدید تھی کہ چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا، جیسے وہ بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئی ہو۔ شعیب کے لیے یہ رد عمل حیرت انگیز تھا۔ سلامت مگر کے نام سے ان کی یہ حالت ایسی کیوں ہو گئی تھی۔ تبھی اس نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"اماں، کیا ہوا ہے آپ کو۔ آپ کی حالت ایسے کیوں ہو گئی ہے؟"

"جس! کچھ نہیں..... مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تم اپنی ڈیوٹی

☆.....☆

زہیدہ خاتون اپنے کمرے میں اندھیرا کیے جاگ رہی تھی۔ وہ بستر پر بڑی مسلسل سوچتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کے سامنے ایک اور امتحان آگیا تھا۔ زندگی کا ایک طویل حصہ جو اس نے ریاضت میں گزارا تھا، وہ رانچاں جانے والا تھا۔ وہ ماضی، جس سے وہ خود آنکھیں چرا جایا کرتی تھی۔ شعیب سے کیسے بیان کر سکتی تھی۔ اگر بتاتی ہے تو اس کا بیٹا ٹوٹ کر رہ جاتا۔ مٹی مشقت بھری محنت سے اس نے شعیب کو پرانا چڑھایا تھا۔ اپنے بیٹے کو وہ جس مقام پر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اس مقام تک پہنچ گیا تھا۔ اب اگر اس کے ماضی کی جھلک بھی اس پر عیاں ہو جاتی ہے تو وہ اپنے مقام کی ادنیٰ سی پستیوں میں جا گرے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سلامت مگر کا نام سننے ہی اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتی تھی۔ مگر اسے اپنا آپ سنبھالنا پڑا۔ وہ ماضی بے نقاب ہو جانے کے خوف سے خاموش ہو گئی تھی۔ ورنہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ شعیب کسی طور بھی وہاں جائے۔ یہ وہی دیار تھا جہاں اس کا ماضی بکھرا پڑا تھا۔ نجانے اسے کیوں یقین سا ہو گیا تھا کہ اگر وہ سلامت مگر چلا گیا تو کسی نہ کسی حوالے سے اس کا ماضی عیاں ہو جائے گا اور پھر جو طوفان اٹھے گا، اس کا سراسر نقصان ان دونوں ماں بیٹے کا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ شعیب کو سلامت مگر جانے سے روک لے۔ اس کا وہاں جانا اسے قحط قبول نہیں تھا، مگر وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ زندگی اسے کس موڑ پر لے آئی تھی یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ پھر سے اسے سلامت مگر سے واسطہ پڑ سکتا ہے، جہاں پیرسائیں کی حویلی تھی۔ جس میں اس کا بچپن ہی نہیں، جوانی کے ایام بھی گزرے تھے۔

ان دنوں زہیدہ بھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ عام لڑکیوں کی مانند اس کے من میں بھی خوابوں، خواہشوں اور امیدوں کا جہاں آباد ہو چکا تھا۔ یقیناً ان میں اتنی شدت نہ ہوتی اگر وہ بھی عام لڑکیوں کی طرح حویلی کے ارد گرد ہی بستیوں میں سے کسی ایک بستی میں رہتی ہوتی۔ حویلی میں آباد پیر گھرانے کی وہ بھی ایک فرد تھی، لیکن عورت ہونے کے ناتے اس کی ذرا سی بھی

حیثیت نہیں تھی جو ایک عام سی لڑکی کی ہوتی ہے۔ وہ روایات کی زنجیروں میں بندھی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیشہ ایک عام سی لڑکی کی طرح سانس لینے کی آرزو کی تھی۔ وہ پرندوں کی طرح آواز فضاؤں میں اڑنا چاہتی تھی۔ نیلے آسمان کو چھونے کی خواہش کرتی تھی۔ بادلوں میں تیرنے کی آرزو مند تھی، مگر جیسے ہی خود کو دیکھتی، اسے اپنے پر بندھے ہوئے ملتے اور وہ بے بسی سے حویلی کی چار دیواری میں پھڑپھڑا کر رہ جاتی۔ اس کی دنیا محض اتنی سی تھی کہ وہ ہر جمعرات کو دربار شریف پر اپنی ملازمتوں کے ساتھ چلی جاتی۔ وہ پورے جسم پر حجاب اوڑھے ہوتی۔ اس کی آمد پر وہاں موجود خواتین اس کے ارد گرد جمع ہو جاتیں۔ وہ فاتحہ خوانی کے لیے تھوڑی دیر ٹھہرتی پھر پلٹ کر واپس حویلی آ جاتی، بس یہ اس کی کل کائنات تھی۔

پھر ایک دم سے اس کی زندگی میں طوفان آ گیا۔ اس نے کاشف کو پہلی بار دربار شریف پر ہی دیکھا تھا۔ وہ حزار کے اندر کھڑا پورے جذب سے خود دعا تھا اور زہیدہ حذر کے باہر کھڑی جالیوں میں سے اندر دیکھ رہی تھی۔ کاشف کے چہرے پر لگا ہوا پڑتے ہی اس کے دل کی دنیا اٹھل پھٹل ہو گئی۔ یہاں دربار شریف پر آتے جاتے اس نے نجانے کتنے چہروں کو دیکھا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کے من کے موسم میں ذرا سی بھی تبدیلی آجائے۔ اس کے اندر تو ایک طویل خزاں کا موسم بس چکا تھا۔ کاشف پر لگا پڑتے ہی موسم اچانک بدل گیا تھا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ خزاں کے بعد اب بہار کی آمد آ رہی ہے۔ اس نے یوسف اور لیٹا کا قصہ بڑی دفعہ سنا تھا۔ اسے بھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ زبان مصر نے اپنے ہاتھ کیوں کاٹ لیے تھے۔ اگرچہ وہ نہ تو زلیخا تھی اور نہ ہی سامنے کھڑا کاشف یوسف تھا، مگر زہیدہ کو سمجھ آ رہی تھی کہ زبان مصر کی انگلیاں کس طرح کٹ گئی تھیں۔ اونچا لہا تھ، گلابی لٹک، مارتا ہوا سفید رنگ، بھرا جسم، بھاری موچیں، چھوٹے چھوٹے سیاہ بالوں پر سفید جالی دار ٹوپی، براؤن کرتے اور سفید گھیردار شلوار میں وہ کسی اور ہی جہاں کا فرد لگ رہا تھا۔ زہیدہ نے اسے دیکھا اور پھر دیکھتی ہی رہ گئی۔ کاشف نے فاتحہ خوانی کی، کچھ دیر مودب کھڑا رہا اور پھر وہاں سے چلا

کیا۔ زبیدہ کو یوں لگا جیسے اس کا اپنا آپ بھی اسی کے ساتھ چلا گیا ہے۔ وہ وہاں سے حویلی پلٹ آئی لیکن اسے یوں لگا جیسے وہ اپنا سب کچھ وہیں دربار پر چھوڑ آئی ہے۔ انسان کا ایک اپنا پنا ہی تو ہوتا ہے اس کے پاس۔ وہ ہی نہ رہے تو پھر باقی کیا بچتا ہے۔

موسم خزاں میں جذبات کی ہلکی ہلکی پھوار میں جب جہر کے ہار مل چھا جائیں تب پھوار تیز ہارش میں بدل ہی جایا کرتی ہے اور بہار آنے کی نوید مل جاتی ہے۔ ایسے میں سوچوں کی نئی نئی کوئلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ ابھی خوشبو نہیں پھیلی تھی مگر خوشبو کے احساس ہی سے وہ مدہوش ہونے لگی تھی۔ جذبات کی ہارش میں پھیل خوشبو کے احساس سے مدہوش اور محو دوسوچوں کے حصار میں قید وہ خود کو ایک نئے جہاں کا باشندہ تصور کرنے لگی۔ ساری دنیا ایک کاشف کی ذات میں سمٹ آئی تھی۔ جیسے یہ شاید تک نہیں تھا کہ کوئی اسے اتنا ٹوٹ کر چاہنے لگا ہے کہ اس کا اپنا آپ بھی نہیں رہا۔ وہ اگلی جمعرات دربار شریف پر گئی تو کاشف اسے کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ وہ معمول سے کہیں زیادہ وقت وہاں رہی۔ لیکن دیدار نہ پاسکی اور ہاویس لوٹ آئی۔ وہ دل ہی دل میں اسے دیکھنے کی حسرت لیے نجانے کتنی بار دعا کر چکی تھی پھر ایک دن اسے یوں لگا جیسے اس کی ساری دعا میں قبول ہو گئیں۔ وہ حیرت سے پت بٹھا گئی۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوئی تھی، جہاں سے حویلی کے مردان خانے کا تھوڑا سا منظر دکھائی دیتا تھا۔ کاشف وہاں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم پیٹنے میں نہا گئی اور بے ترتیب سانس لے لے کتنی ہی دیر تک اپنے پیٹ پر پڑے سوچتی رہی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔

کاشف محکمہ انہار میں دوسرے درجے کا آفیسر تھا۔ وہ محکمے کی طرف سے سلامت مگر آیا تھا۔ اس وقت زبیدہ کے والد جبر سائیں تھے۔ جنہوں نے اپنی زمینوں کے لیے نہر کے بندوبست کی خاطر محلے کو بٹوایا تھا۔ اسی لیے کاشف اور دیگر اہلکاروں کو مردان خانے میں رہنے کے لیے جگہ دی گئی۔ وہیں سلامت مگر میں ان کا تھن مینے رہنے کا پراجیکٹ تھا۔ وہ سب لوگ صبح کے لکھنے

شام ڈھلے وہیں آتے۔ زبیدہ اور کاشف کی پہلی بار لگا ہیں چار ہوئیں تو پھر یہ آنکھ پھولی چلی گئی۔ وہ سارا دن اس کے انتظار میں گزار دیتی۔ صبح کا ذرا سا وقت یا پھر شام کو تھوڑی سی دیر کے لیے وہ اسے دیکھ سکتی تھی۔ اس سے بات کرنے کی خواہش دن بدن بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی، لیکن حویلی میں رہتے ہوئے ایسا ممکن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ زبیدہ کی خاص ملازمہ شرباں مائی کو اس کی دلچسپی کے محور کے بارے معلوم ہو گیا۔ وہ اس رات سے واقف ہوئی تو ایک راستہ نکل آیا۔ ان دونوں کے درمیان پیغام رسائی کا وہ واحد ذریعہ بن گئی۔ جس کے باعث دونوں میں نفس پر دان چڑھنے لگا۔ شرباں مائی پر تو نوازشات کی بارش ہونے لگی۔ تقریباً وہ مہینے یونہی گزر گئے۔ شرباں مائی کا کما کما کر لگا ہو گیا اور زبیدہ کو احساس ہی نہیں ہوا کہ دن کس طرح گزر گئے۔ ورنہ تو اس حویلی میں دن گزارنا مشکل ہو جاتا کرتا تھا۔ ان دونوں میں حلق اس عروج پر آ گیا کہ اپنے کی خواہش انہیں بے جان کرنے لگی۔

ایک شام زبیدہ کو یہ پیغام ملا کہ مردان خانے میں کوئی نہیں ہے۔ سارے ساٹھی اٹھارے اپنے اپنے گھروں کو گئے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی راستہ نکل سکتا ہے تو آ جائے، موقع ہے۔ پیغام ملتے ہی وہ مائی بے آپ کی مانند تر پنے لگی۔ رات ڈرا گہری ہوئی تو شرباں مائی کی صراحت سے وہ مردان خانے میں جا پہنچی۔ پورے جسم کو وہ بڑی کیا چادر میں لپیٹائے اندھیرے ہی کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ دالان میں کھڑا کاشف اس کا منتظر تھا۔ وہ دونوں آمنے سامنے ہوئے تو کتنی دیر تک وہ ایک دوسرے سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے۔ بس لگا ہوں ہی لگا ہوں میں ایک دوسرے کو اپنے سن میں اتارتے رہے۔ زبیدہ کا دل پورے وجود سمیت دھڑک رہا تھا۔ کتنے ہی لمحے یونہی بیت گئے۔ تب کاشف نے پراعتاد لہجے میں کہا۔

”زبیدہ۔! میں جانتا ہوں کہ ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے۔ جسے نہ تم پار کر سکتی ہو اور نہ میں۔ کیوں نہ ہم اپنے بڑھتے قدموں کو روک لیں، ورنہ پیچھے ہٹنا ہمارا مقدر بن جائے گا۔“

کاشف کے ساتھ حویلی سے بہت دور لاہور کی گنجائش آبادی میں آگم ہوئی۔ کاشف اسے اپنے گھر نہیں رکھ سکا، کیونکہ وہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ بعد میں ہوا بھی ایسے ہی تھا۔ وہ تو نکاح کے بعد ایک الگ گھر میں رہنے لگے اور حویلی والے کاشف کو سناٹا کرتے اس کے گھر والوں تک پہنچ گئے۔ انہوں نے ٹھکانہ دفتر ہی کو زریعہ بنایا تھا۔ کاشف نے چھٹی لے رکھی تھی۔ حویلی والوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ زبیدہ اور کاشف نکاح کر چکے ہیں اور زبیدہ ایک بچے کی ماں بننے والی ہے تو خاموشی چھا گئی۔ کاشف ان کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔ کاشف ہی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ اس کا بڑا بھائی طاہر شاہ ان دونوں کے حق میں تھا لیکن چھوٹا دلا اور شاہ ان کی جان کا دشمن بن گیا تھا۔ یہ تو کاشف کے آفیسر درمیان میں پڑ گئے اور قانونی چارہ جوئی کے بعد بات عدالت تک جانے والی تھی کہ اچانک ایسی خاموشی چھائی تھی کہ جیسے اس کا وجود حویلی والوں کے لیے بھی تھا ہی نہیں۔ وہاں حویلی میں کیا ہوا، کیا نہیں ہوا؟ اسے کوئی خیر خبر نہ ملی تھی۔ وہ ان سے دور کیا ہو گئی کہ سب کچھ بھول کر اپنی دنیا میں کھو گئی۔ یہاں تک جب شعیب چند سال کا ہوا تو کاشف اس دنیا میں نہ رہا۔ زبیدہ نے وہیں بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے سامنے اپنے بیٹے کی پرورش تھی۔ جس میں وہ پوری طرح کامیاب ٹھہری تھی۔ زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی کہ اس کی زندگی میں پھر سے سلامت مگر آگیا۔ وہ سادی رات اپنی بے بسی سے ابھتی رہے تھی۔ جس وقت اذانیں ہونا شروع ہوئیں تو اسے اپنے ماضی سے پھٹا پڑا۔ انہی لمحات میں اس نے ایک دم سے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے بیٹے پر اس وقت تک یہ راز افلا نہیں کرے گی، جب تک حالات ایسا نہیں چاہیں گے۔ ممکن ہے بہت جلد اس کا جادو ہو جائے۔ اس کا راز، راز ہی میں رہے اور اس کا مان یونہی برقرار رہے۔ جب اس نے اپنے بیٹے کے ساتھ نہ جانے کا بھی فیصلہ کر لیا۔ کہیں کوئی جذباتی تھو اس کا ماضی کھول کر نہ دکھ دے اس نے یہ سب طے کیا اور پرسکون ہو کر انہی اور خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئی۔ (جاری ہے)

☆.....☆

مذکب کا یاد کر چکی ہوں۔ ہاں مگر مر سکتے ہوں تو۔ الگ بات ہے۔ اسے میں مست کا لکھا سمجھ کر قبول کر لوں گی۔ اس نے مایوسی کی انجائش کو چھوڑتے ہوئے کہا۔

”جذبے اگر سچے ہوں، تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ میری بات چھوڑو اپنی کہو، صرف باتوں سے یا خیالوں میں فاصلے پار نہیں ہوا کرتے۔ حقیقت کچھ اور ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی عتاب نازل ہو۔ اس نے پورے غلوں سے کہا۔

”آپ مجھے اپنے مضبوط سہارے کا احساس دلا دیں۔ میں آپ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کو تیار ہوں۔ اس سفر میں چاہیں جتنی مشکل آئے۔ وہ محبت سے سرشار لہجے میں بولی۔

”اگر ایسی بات ہے تو چلو، اس دنیا سے نکل چلے ہیں اور دور کہیں اپنی دنیا بسا لیتے ہیں۔“ کاشف نے اچانک فیصلہ کن انداز میں کہا تو وہ پوری جان سے کانپ گئی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ حویلی سے باہر کی دنیا میں بھی سانس لے سکتی ہے۔ کوئی نئی دنیا بھی بن سکتی ہے۔ اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی شادی نہیں ہو پائے گی۔ اس کا احساس بہت پہلے اسے دلا دیا گیا تھا اور اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ ساری زندگی اسی حویلی میں گزرنی ہے۔ یہی وہ لمحات تھے جب زبیدہ نے بھی فیصلہ کر لیا۔

”ٹھیک سے میں تیار ہوں۔“ اس نے ایک دم سے اپنے فیصلے کا اظہار کر دیا۔

”تو جاؤ، وہاں پہلی جاؤ اور اس لمحے کا انتظار کرو، جب میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔“ کاشف نے اس یقین و اعتماد سے کہا کہ پورے وجود سے بھگ گئی۔ وہ انہی قدموں پر پلٹ کر اپنے کمرے تک آن پہنچی اور اسی وقت سے اس لمحے کا انتظار کرنے لگی تھی، پھر وہ بھی نہیں ملے۔ بس ایک دوسرے کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ دن یونہی انتظار میں ٹھہرتے رہے۔ جب ایک شام شرمیں مائی نے زبیدہ خاتون تک یہ پیغام پہنچایا کہ آج رات یہاں سے نکل جانا ہے۔ وہ کھو کھو انتظار کرتی ہوئی اس لمحے تک آن پہنچی، جب اس نے حویلی سے باہر قدم رکھ دیا۔ وہ